مدیر: سید جلال الدین عمری

معاون: سلطان احمد اصلاحی

★ جلد ۶ ★ جنوری ۱۹۸۷ء مطابق ربیع الثانی جمادی الاول ۱۴۰۷ھ ★ شمارہ ۱ ★

فہرست مضامین

اشارات

مقالات

اخبار و افکار

تنقید و تبصرہ

ادارتی امور کے لئے خط و کتابت کا پتہ:
مدیرہ زندگی نو، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ترسیل زر و انتظامی امور کے لئے:
منیجر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵، سوئیوالان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

● سالانہ زر تعاون -/۵۵ روپے ● بیرون ہند -/۲۲۵ روپے انڈین ● فی شمارہ -/5 روپے ●

سرخ نشان علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لئے فوری زر سالانہ ارسال فرمائیں یا اگلا شمارہ کسی اطلاع کے نہ ملنے پر بذریعہ وی۔پی ارسال کیا جائے گا۔

پرنٹر و پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ "زندگی نو" ۱۵۲۵، سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ فون: ۲۷۳۳۴۸ ★ ۲۶۵۳۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارے :

اسلامی تنظیموں کے لیے شوریٰ کی اہمیت

سید جلال الدین عمری

اسلام نے ریاست کا جو تصور پیش کیا ہے، اس میں شوریٰ کو اہم مقام حاصل ہے۔ ریاست کا کوئی اہم اقدام بغیر مشورہ کے نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ (آل عمران: ۱۵۹)	ان سے معاملات میں مشورہ کرو۔ پھر جب پکا ارادہ کر لو تو اللہ پر توکل کرو۔ بے شک اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جو حکم اسلامی ریاست کے لیے ہے کیا وہی حکم امت کے لیے ان حالات میں بھی ہوگا جب کہ وہ ریاستی اقتدار سے محروم ہو یا اس کا اطلاق ان تنظیموں پر بھی ہوگا جو سیاسی اقتدار نہ رکھتے ہوئے بھی اسلامی نہج پر کام کرنا چاہتی ہوں۔ اس کا جواب سورۂ شوریٰ میں دیا گیا ہے۔ سورۂ شوریٰ میں دعوت و تبلیغ، اقامت دین اور اس راہ میں استقامت پر بہت زور ملتا ہے۔ اسی سیاق و سباق میں اللہ کے نیک بندوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا گیا "وامرھم شوریٰ بینھم"۔ یعنی یہ کہ وہ اپنے معاملات آپس کے مشورہ سے طے کرتے ہیں اس کا مفہوم مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا ہے تو وہ جلد بازی نہیں کرتے، کسی فرد واحد کی رائے پر فیصلہ نہیں کرتے بلکہ باہم صلاح و مشورہ کرتے ہیں اور کسی رائے پر اتفاق کے بعد اس کے مطابق اقدام کرتے ہیں۔ (رازی: ۷/۳۹۹۔ خازن: ۶/۱۰۶)

سورۂ شوریٰ مکہ میں نازل ہوئی۔ جہاں دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تربیت کا فرض انجام پا رہا تھا اور حکومت و اقتدار مسلمانوں کو حاصل نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شورائیت ریاستی امور ہی میں ضروری نہیں ہے بلکہ دعوت و تربیت کے مرحلہ میں بھی اس کی پابندی لازمی ہے۔ امت دعوت کے مرحلہ سے لے کر ریاست کے مرحلہ تک اپنے تمام امور و مسائل باہم مشورے سے طے کرے گی۔ اس طرح اسلام نے شروع ہی سے استبدادی اور آمرانہ رجحانات کو ختم کر کے شورائیت کے رجحان کو تقویت پہنچائی ہے اور مسائل کے حل کا صحیح طریقہ یہ بتایا ہے کہ وہ باہم مشورہ سے طے ہوں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی اسلامی تنظیم کے لیے اس کے دور دعوت میں بھی شوریٰ کی کیا اہمیت ہے؟

اسلام نے آمریت کے مقابلہ میں شورائیت کو کیوں ترجیح دی اور تمام اہم اجتماعی امور میں مشورہ کو کیوں ضروری قرار دیا اس کے بہت سے اسباب بیان کیے جا سکتے ہیں۔ بعض اسباب بہت واضح ہیں۔

انسان کی فطرت میں استبداد اور آمریت کے خلاف سخت نفرت پائی جاتی ہے۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ حکومت کا حق اس جیسے کسی ایک فرد یا چند افراد کو حاصل ہو اور وہ محکوموں اور غلاموں کی سی زندگی بسر کرتا رہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے سخت سے سخت آمریت اور استبداد کے زیر سایہ صدیوں زندگی کے دن کاٹے ہیں اور کبھی کبھی اس کی مدح سرائی بھی کرتا رہا ہے، لیکن یہ سب کچھ استبداد کے ڈر اور خوف کی وجہ سے یا اپنے کسی چھوٹے بڑے مفاد کی خاطر تھا۔ اس کے پیچھے محبت اور پسندیدگی کا جذبہ نہ تھا۔ جہاں اقتدار نہ ہو یا کسی فائدہ کی توقع نہ ہو وہاں وہ کسی کے آمرانہ رویہ کو برداشت نہیں کر سکتا۔ شورائی نظام انسان کی اس فطری خواہش کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے کہ جن مسائل سے اس کا بھی تعلق ہے ان میں اسے شریک کیا جائے، اس کے اچھے برے پہلوؤں پر اظہار خیال کا اسے حق ملے اور جن کے ہاتھوں میں اس کے معاملات کی باگ ڈور ہو ان پر تنقید اور ان کے احتساب کے مواقع اسے فراہم کیے جائیں۔

۲۔ کوئی شخص عقل کل نہیں ہوتا۔ وہ سوچنے سمجھنے کی محدود صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتا ہے، اس کی مخصوص ذہنی ساخت ہوتی ہے، اس کی فکری نشو و نما ایک خاص ماحول میں ہوتی ہے جب وہ کسی مسئلہ پر سوچتا ہے تو بالعموم اپنی ان مخصوص ذہنی کیفیات کے ساتھ سوچتا ہے۔ اس کے کچھ پہلو اس کے سامنے ہوتے ہیں اور کچھ پہلو نہیں ہوتے اس لیے کسی بھی فرد کے فیصلوں اور اقدامات میں غلطی کا امکان بہر حال ہوتا ہے۔ مشورہ سے وہ پہلو ابھر کر سامنے آ سکتے ہیں جو اس کی نگاہوں سے اوجھل تھے اس طرح غلطی کا امکان کم سے کم تر ہوتا چلا جاتا ہے اور صحیح نتیجہ تک پہنچنا آسان ہوتا ہے۔ مشورہ کا یہ اتنا بڑا فائدہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص مشورہ سے بے نیاز ہو سکتا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ بے نیاز ہو سکتے تھے، لیکن آپ کا اس معاملہ میں جو اسوہ تھا اسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے یوں بیان کیا ہے:

مارایت احدا اکثر مشورۃ لاصحابہ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم	میں نے کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا۔

(رواہ الشافعی و الترمذی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ائمہ اور خلفاء بھی امت کے عمومی مسائل میں اہل علم سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ امام بخاری نے ان کے طرز عمل کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔

وکانت الائمۃ بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم یستشیرون الامناء من اھل العلم	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ائمہ، امت کے امانت دار اہل علم سے معاملات میں مشورہ کرتے تھے تاکہ زیادہ آسان

فی الامور العامۃ لیاخذوا باسہلہا فاذا وضح الکتاب او السنۃ لم یتعدوا الی غیرہ اقتداءً بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم (بخاری، کتاب الاعتصام باب قول اللہ وامرھم شوریٰ بینھم)

صورت پر عمل کر سکیں، جب کتاب و سنت کی واضح تعلیمات سامنے آجاتیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر عمل کرتے ہوئے کسی دوسری طرف قدم نہیں اٹھاتے تھے۔

اب ذرا براہ راست اقامت دین کے پہلو سے شورائیت کی اہمیت پر غور فرمائیں۔

اسلام نے پوری اُمت پر اقامت دین کی ذمہ داری ڈالی ہے۔ اس کا ایک ایک فرد اس میں شریک ہے۔ نہ تو وہ خود اس سے الگ ہو سکتا ہے اور نہ اسے الگ کیا جا سکتا ہے۔ پوری امت مل جل کر اس ذمہ داری کو اٹھائے گی اور ہر فرد اپنی استطاعت کے لحاظ سے اس میں حصہ لے گا۔ یہ فطری طور پر ایک شورائی عمل ہے، جس میں امت کی مشترک جدوجہد سے ایک بڑے مقصد کی تکمیل ہوتی ہے۔

اس پر ایک اور پہلو سے بھی غور ہو سکتا ہے وہ یہ کہ اسلام نے اجتماعیت پر بڑا زور دیا ہے اور امت کو اجتماعی زندگی گزارنے کی تاکید کی ہے۔ اس کا آخری مقصد دین کی کلی اقامت اور اس کی ہمہ جہتی سربلندی ہے۔ اس اجتماعیت کی بنیاد شورائیت پر رکھی گئی ہے۔ اس میں ہر فرد کو رائے اور مشورہ دینے کا حق حاصل ہے۔ امت کے مشورہ ہی سے یہ اجتماعیت وجود میں آتی اور اپنے فرائض انجام دیتی ہے۔ مطلق اختیارات کسی فرد یا ادارہ کو حاصل نہیں ہوتے۔

اس کے لیے اسلام پورے معاشرہ میں شورائیت کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ اس نے زندگی کے ہر معاملہ میں مشورہ کی ترغیب دی ہے اور اس سے جو مفید نتائج نکلتے ہیں ان کی طرف توجہ دلائی ہے چنانچہ وہ انسان کو اپنے ذاتی معاملات میں بھی متعلقہ افراد سے مشورہ کی تعلیم دیتا ہے اور اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ آدمی کسی سے مشورہ نہ کرے اور اپنی ذاتی رائے پر اصرار کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

من اراد امرا فشاور فیہ وقضی ھدی لارشد الامور (روح المعانی ۲۵/۴۶ بحوالہ بیہقی)

جو شخص کسی معاملہ کا ارادہ کرے اور اس میں مشورہ کے بعد فیصلہ کرے تو اسے اس بات کی راہنمائی ملے گی کہ بہترین پہلو کو اختیار کرے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے۔

ما خاب من استخار ولا ندم من استشار (طبرانی)

وہ شخص ناکام نہیں ہوا جس نے استخارہ کیا اور نہ وہ شخص نادم ہوا جس نے مشورہ کیا

اگر آدمی اپنے ذاتی یا شخصی معاملات میں مشورہ نہ کرے تو اس کا نفع یا نقصان بڑی حد تک اس کی ذات تک محدود رہتا ہے اور سماج پر اس کے اثرات نہیں پڑتے یا کم پڑتے ہیں لیکن جس مسئلہ کا تعلق پوری جماعت سے

جو وہ اس کے ہر فرد کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اس کا اس میں شریک ہونا اور اس سے دلچسپی لینا اجتماعی نظام کا ایک فطری تقاضا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی بہترین حالت یہ بتائی ہے جب کہ اس کے معاملات باہم مشورہ سے طے ہوں گے۔ ارشاد ہے

اذا کان امراءکم خیارکم واغنیاءکم سمحاءکم وامورکم شوریٰ بینکم فظهر الارض خیر لکم من بطنها واذا کان امراءکم شرارکم واغنیاءکم بخلاءکم وامورکم الی نساءکم فبطن الارض خیر لکم من ظهرها۔

(الترمذی ابواب الفتن)

جب تم میں کے بہتر لوگ تمہارے امیر ہوں، تمہارے دولت مند بڑے دل والے اور سخی ہوں اور تمہارے معاملات تمہارے درمیان مشورہ سے طے ہوں تو زمین کے اوپر کا حصہ تمہارے حق میں اس کے نیچے کے حصے سے بہتر ہوگا (یعنی سطح زمین پر تمہارا وجود خیر کا باعث ہوگا) لیکن جب تمہارے بدترین افراد تمہارے امیر ہوں، تمہارے اندر دولت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو بخیل ہوں اور تمہارے معاملات تمہاری عورتوں کے حوالہ ہو جائیں تو زمین کا اندرون تمہارے لیے اس کی سطح سے بہتر ہوگا (یعنی تمہارا مرجانا تمہارے وجود سے بہتر ہوگا۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں،

واللہ ما استشار قوم الا هدوا لافضل ما بحضرتهم (الادب المفرد، ۱/۳۵۸)

قسم خدا کی جب بھی کوئی قوم مشورہ کرے گی تو پیش آمدہ مسائل میں بہتر پہلو کی طرف اس کی راہنمائی ہوگی۔

اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ یہ امت جو ایک اعلیٰ و ارفع نصب العین کے لیے منظم ہوئی تھی اس کی اجتماعیت کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ مدت دراز سے وہ مختلف گروہوں اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے اب تو یوں کہنا چاہیے کہ وہ سخت انتشار کی کیفیت سے دوچار ہے۔ انتشار کی ماری ہوئی اس امت کو کبھی کبھی مختلف چھوٹے بڑے اغراض و مقاصد کے تحت تو منظم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن دین کی سربلندی کے لیے اسے متحد کرنے کی سنجیدہ کوشش کہیں ہوتی نظر نہیں آتی۔ ان حالات میں جو جماعت شعوری طور دین کی اقامت اور سربلندی کے لیے اٹھے اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا نظام صحیح معنوں میں اسلامی خطوط پر قائم ہو، وہ آمریت یا شخصی فرماں روائی سے محفوظ رہے اور اس کے اندر وہ شورائیت پائی جائے جو اسلام کو مطلوب ہے تاکہ آدمی کسی نہ کسی سطح پر رائے اور مشورہ دے سکے اور اپنے جذبات و خیالات کے اظہار میں کوئی گھٹن نہ محسوس کرے۔ اس طرح کی جماعت کے ہر فرد کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ جماعت کے نصب العین کو اپنا نصب العین سمجھے، جماعت کو اپنی منزل کی طرف بڑھنے میں مدد دے، اس کے فروغ و اشاعت کے لیے مفید مشورے دے اور جماعت کو اپنے نصب العین سے کسی حال میں ہٹنے نہ دے اور اس کے کسی اقدام کو نصب العین سے ہٹا ہوا دیکھے تو بروقت

اسے آگاہ کرے۔ اس سے غفلت جماعت کی حق تلفی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت کا فرد ہوتے ہوئے بھی جو اقامت دین کا فرض انجام دینا چاہتی ہے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کر رہا ہے۔

جماعتی زندگی میں مشورہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سے افراد جماعت میں یگانگت کا احساس پیدا ہوتا ہے، انھیں فطری طور پر مسرت حاصل ہوتی ہے کہ ان کے مشوروں کو سنا جا رہا ہے اور انھیں اہمیت دی جارہی ہے اگر ان کے مشوروں کو قبول کرلیا جائے تو ان کی اس خوشی میں اور اضافہ ہوگا لیکن اگر جماعتی ضابطوں کے تحت انھیں قبول نہ کیا جاسکے تو انھیں شکایت نہیں ہوگی۔ جماعتی امور و مسائل طے کرنے میں افراد جماعت کو شریک کرنے سے جماعت سے ان کی وابستگی بڑھتی ہے اور وہ ان مسائل کو اپنے مسائل سمجھتے ہیں۔ مشورہ سے افراد کا علیحدہ رہنا یا ان کا علیحدہ کیا جانا دونوں صورتوں میں جماعتی تعلق کمزور ہوتا چلا جاتا ہے اور سرد مہری اور بے تعلقی پیدا ہونے لگتی ہے۔ جماعت کو زندہ اور توانا رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جماعت سے اس کے افراد کا INVOLVEMENT بڑھے۔ اس کا ایک ذریعہ مختلف امور و مسائل میں ان سے مشورہ کرنا بھی ہے۔ مشورہ کے بعد جو فیصلہ ہو اس کی ذمہ داری سے وہ انکار نہیں کرسکتے۔ عرب کے کسی دانا کا قول ہے کہ "میں نے نہ تو کبھی غلطی کی اور نہ دھوکا کھایا اس لیے کہ جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو میں اپنی قوم سے مشورہ کرتا ہوں جو وہ فیصلہ کرتی ہے اس پر عمل کرتا ہوں اگر میرا اقدام صحیح ہے تو یہ میری قوم کا اقدام ہوگا اور اگر میں غلطی کروں تو یہ غلطی بھی میری قوم کی ہوگی (ابن عربی، مالکی: احکام القرآن ۲/ ۱۰۲) اگر جماعتی امور و مسائل میں افراد جماعت سے مشورہ نہ حاصل کیا جائے یا انھیں نظر انداز کیا جائے تو فطری طور پر ان میں دوری اور اجنبیت کا احساس پیدا ہوتا ہے، انھیں یہ شکایت ہوتی ہے کہ وہ جماعتی معاملات سے بے دخل ہیں وہ اس کے نفع و نقصان میں شریک نہیں ہیں، بغیر مشورہ کے جو پروگرام بنے گا اسے وہ اپنا پروگرام نہیں سمجھ سکتے اور اس کے ساتھ انھیں وہ دلچسپی نہیں ہوسکتی جو اسے روبہ عمل لانے کے لیے ضروری ہے۔

اسلام نے شورائیت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ بڑا پاکیزہ تصور ہے اس میں نصح و خیر خواہی، تعاون اور ہمدردی اور اصلاح حال کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس میں نزاع، کشمکش، سازش اور کسی کو گرانے یا ابھارنے کے محرکات نہیں ہوتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ صاحب امر اور اس کے مامورین کے درمیان قریبی تعلق اور حسن ظن اور اعتماد کی ایسی فضا ہو جس میں غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پرورش نہ پاسکیں۔ صاحب امر مامورین کو مخلص اور خیر خواہ سمجھے۔ ان میں یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کرے کہ اسے ان کے مشوروں کی ضرورت ہے، وہ ان سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، مشورہ دینے پر پست ہمتی کی جگہ ان کی ہمت افزائی کرے۔ ان کے مفید مشوروں کا خوش دلی سے استقبال کرے اور کوئی غلط مشورہ سامنے آئے تو محبت اور حکمت سے اس کی غلطی واضح کرے اور اپنے کسی رویہ سے یہ احساس نہ پیدا ہونے دے کہ وہ کسی کے مشورے کا محتاج نہیں ہے۔ اپنے مامورین سے اس کا تعلق رسمی اور ضابطہ کا نہ ہو بلکہ الفت و محبت کا تعلق ہو اور وہ اس سے دوری اور اجنبیت

کی جگہ قربت اور یگانگت محسوس کریں۔ اچھے اور بُرے امیر کی کتنی عمدہ تصویر اس حدیث میں کھینچی گئی ہے۔

خیار ائمتکم الذین تحبونھم ویحبونکم	تمہارے بہترین امام وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور جو تم سے
وتصلون علیھم ویصلون علیکم وشرار	محبت کریں، جن کے لیے تم دعائیں کرو اور جو تم تمہارے لیے
ائمتکم الذین تبغضونھم ویبغضونکم وتلعنونھم	دعائیں کریں۔ تمہارے برے امام وہ ہیں جن سے تم نفرت کرو اور جو تم
ویلعنونکم (مسلم)	سے نفرت کریں اور جن پر تم لعنت بھیجو اور جو تم پر لعنت بھیجیں۔

دوسری طرف مامورین میں صاحب امر کا احترام ہو، وہ اس کے وقار کو اپنا وقار سمجھیں، ان کے اندر یہ جذبہ ہو کہ وہ اپنے مشوروں سے صاحب امر کی مدد کریں گے، ان کے کسی مشورہ کو قبول نہ بھی کیا جائے تو مخالفت کی روش نہیں اختیار کریں گے اور اختلاف رائے کے باوجود اپنے امیر سے محبت اور تعاون کے جذبہ میں فرق نہ آنے دیں گے حدیث میں یہاں تک کہا گیا ہے۔ من رای من امیرہ شیئا یکرھہ فلیصبر (بخاری ومسلم) مطلب یہ کہ امیر کی کوئی بات ناگوار گزرے تو بھی اس پر صبر کیا جائے اور اس کی اطاعت سے انحراف نہ کیا جائے۔ یہ بات اس لیے کہی گئی ہے کہ کسی بھی نظم اجتماعی کو باقی رکھنے کے لیے اس اطاعت کا پایا جانا ضروری ہے۔ ورنہ وہ قائم نہیں رہ سکتی۔

اخلاص ومحبت کی اسی فضا میں اسلام کے شورائی نظام کی برکات ظاہر ہو سکتی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پاکیزہ جذبات سے ہمارے سینوں کو بھر دے اور زندگی کی آخری سانس تک ہم سب مل کر اس کے دین کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرتے رہیں۔ آمین

(یہ مضمون امراء حلقہ جات ونظمائے علاقہ جات کے ایک اجتماع میں پڑھا گیا جو ۲۶ تا ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۶ء مرکز جماعت اسلامی ہند دہلی میں منعقد ہوا۔ تھوڑی سی ترمیم کے بعد اسے یہاں پیش کیا جا رہا ہے)

قارئین زندگی نو کی خدمت میں

زندگی نو کا یہ پہلا آفسٹ شمارہ ہے۔ اس شمارہ سے اس کی قیمت میں اضافہ کیا جا رہا ہے فی کاپی پانچ روپے Rs 5/- سالانہ زر تعاون پچپن 55 روپے۔ ہندوستان میں دوسرے تمام شعبوں کی طرح کتابت وطباعت کے اخراجات بھی غیر معمولی طور پر بڑھ گئے ہیں۔ ڈاک کی شرح کا اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ زندگی نو آفسٹ پر چھاپنے کا خرچ تو بہت زیادہ ڈیڑھ گنا زیادہ ہے اس لیے امید ہے کہ قیمت میں ناگزیر اضافے کو خوشی دل کے ساتھ گوارا کیا جائے گا۔ اور ہمیں آپ کا پورا تعاون حاصل رہے گا۔ (ادارہ)

مقالات

میں بھی حاضر تھا وہاں

(۱) حکیم خواجہ اقبال احمد ندوی

مولانا مودودیؒ پر لکھنے والے کے سامنے ایک تو ویسے ہی جماعت اسلامی سے اس کے ارکان کی علٰحدگی ایک بڑا سوال تھی۔ پھر مولانا کے انتقال کے بعد جب مولانا منظور صاحب نعمانی کے ساتھ میرے استاد محترم مولانا علی میاں صاحب نے بھی اس معاملہ کو جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کا نقص ثابت کرنے کے لیے حربہ کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تو اس صورت حال میں سب سے پہلے اسی معاملہ سے عہدہ برآ ہونے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس معاملہ پر غور و خوض کرنے کی مولانا علی میاں صاحب اس طرح دعوت عام دیتے ہیں:-

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور اس پر پوری سنجیدگی، کشادہ دلی اور کسی قدر جرأت و ہمت سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جماعت کے تقریباً تمام ان بنیادی ارکان نے جماعت سے علٰحدگی اختیار کر لی جن میں سے اکثر پہلے دن سے اس میں شریک تھے، وہ اس کے دستور کے واضعین اور ملک میں اس کا تعارف کرانے اور اس کے لیے سینہ سپر ہونے والوں میں پیش پیش تھے، وہ اپنے اپنے حلقوں سے (جو ان کو بہت عزیز تھے) کٹ کٹ کر جماعت کے دائرہ میں آئے تھے اور انھوں نے کسی "لومۃ لائم" کی پرواہ نہیں کی تھی اور بانیٔ جماعت مولانا مودودی نے مختلف موقعوں پر نہ صرف ان پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا تھا بلکہ ان کو مخالفین و معترضین کے سامنے بطور سند پیش کیا۔[۱]

ہمیں اس کا پورا علم و تجربہ ہے کہ جماعتوں اور تنظیموں کو یہ مرحلے پیش آتے ہیں، لوگ ان میں شامل ہو کر ان کا ساتھ چھوڑتے ہیں، ان کے مخالف بھی بن جاتے ہیں۔ لیکن جماعت اسلامی کو جو ابتلا پیش آیا اور اس سے اس کے بنیادی ارکان (بالخصوص ان لوگوں نے جن کو کتاب و سنت کا براہ راست علم حاصل تھا) جس تعداد میں اور جس تسلسل کے ساتھ علاحدگی اختیار کی جماعتوں کی تاریخ میں اس

---

[۱] ناظرین کو اس کی تفصیل اسی کتاب کے آخری صفحات سے معلوم ہو جائے گی۔

کی تعمیر بہت مشکل سے ملے گی بلکہ شاید نہ مل سکے گی[1]

اس سوال کا جواب موضوع کے اندر تھا باہر نہیں۔ اور اس کی طرف ابتدا ہی میں اشارہ بھی کر دیا گیا تھا۔ مگر اسے میں اپنی بدقسمتی کے سوا کیا کہوں کہ اس سوال کا حقیقی اور تنہا جواب، اس کام کا تجزیہ ہی تھا جو جماعت اسلامی سے علٰحدگی کے بعد کیا گیا ہے۔ کیونکہ مولانا مودودی کی کوتاہیوں کی بنا پر جماعت سے علٰحدگی کے دعوے کو اسی وقت صحیح تسلیم کیا جا سکتا تھا جب یہ دیکھ لیا جائے کہ جماعت سے علٰحدہ ہونے والے حضرات علٰحدگی کے بعد بھی اللہ کے پورے کے پورے دین پر قائم رہے اور انھوں نے اقامتِ دین کی جدوجہد کو پہلے سے بہتر اور زیادہ منظم طور پر جاری رکھا ہے۔ لیکن اس کے بجائے جب یہ معلوم ہو کہ جماعت سے علٰحدگی کے بعد ہی گاڑی پٹری بدل دیتی ہے۔ اور جماعت سے نکلنے والوں کے دائرہ کار سے اقامتِ دین کی جدوجہد خارج ہو جاتی ہے۔ تو ایسے حضرات کی اپنی کمزوریوں کی رہینِ منت ہی کہا جائے گا۔ ان کی علٰحدگی کو دنیا کی کسی منطق کی رو سے بھی مولانا مودودی کی کوتاہیوں پر محمول نہیں کیا جائے گا۔ مولانا مودودی کی کوتاہیاں آخر کسی شخص کو یہ استحقاق کیسے عطا کر سکتی تھیں کہ وہ جماعت سے علٰحدگی کے بعد اللہ کے دین ہی کی بیخ کنی شروع کر دے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس پورے کام کا احاطہ ممکن نہیں تھا اس لیے میں نے اس جواب کے لیے اس کام کا انتخاب کر لیا تھا جو جماعت سے علٰحدگی کے بعد مولانا علی میاں صاحب اور مولانا منظور صاحب نعمانی نے کیا ہے۔ اتفاق ہے کہ یہ دونوں بزرگ جماعت سے علٰحدگی کے بعد تبلیغی جماعت میں تشریف لے گئے، اس لیے جماعت اسلامی سے علٰحدگی کے حقیقی وجوہ واسباب ہی اس کام میں تلاش کر رہا تھا جو ان دونوں حضرات نے تبلیغی جماعت میں پہنچ کر کیا ہے۔ اس طرح یہ تبلیغی جماعت یا حضرت مولانا الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت پر تنقید نہ تھی بلکہ اس کام کا تجزیہ تھا جو علٰحدگی کے بعد کیا گیا ہے۔ اور یہ اس کام کا ایک نمونہ ہے جسے "زندگی نو" کے خصوصی شمارے" میں بھی حاضر تھا وہاں" میں پیش کر دیا گیا ہے۔ یہ باب اپنی اہمیت کے پیش نظر خود ایک کتاب بن گیا ہے جو رسالہ کے محدود صفحات میں نہیں آ سکتا تھا اس لیے اب ان شاء اللہ اسے کتابی شکل میں شائع ہونے کے لیے دیدیا جائے گا۔ اس سے صرف یہ حقیقت ہی واضح نہیں ہو جاتی کہ یہ دونوں حضرات جماعت اسلامی سے کیوں علٰحدہ ہوئے اور مولانا مودودیؒ کے کیوں مخالف ہیں بلکہ بعض دوسرے حقائق پر پڑے ہوئے پردے بھی اٹھ جاتے ہیں۔ "کتاب وسنت کا براہ راست علم" رکھنے والی دو انتہائی معزز و محترم ہستیوں کے کام کا انتخاب اسی لیے کیا گیا تھا تاکہ جماعت اسلامی سے ان کی علٰحدگی کے حقیقی وجوہ واسباب کو سامنے رکھ کر "کتاب وسنت کا براہ راست علم" رکھنے والے دوسرے حضرات کی جماعت سے علٰحدگی کے اسباب کو سمجھا جا سکے۔ اس غور و خوض کی دعوت خود انھیں حضرات کی جانب سے تھی جس کا حاصل یہاں پیش کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اگر کوئی ایسی بات آ گئی ہو جس سے کسی کو تکلیف پہنچی ہو تو اس کا مجھے سخت افسوس ہے۔ ایسا دانستہ طور پر نہیں ہوا ہے۔ البتہ اس معاملہ پر غور و خوض کرتے ہوئے

---

[1] مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف ص ۷۰

بار بار دل میں یہ سوال پیدا ہوتا کہ آخر کیا بات ہے کہ وہ حضرات جنھیں " ماحول کے اثرات اور عمل و ردِعمل کے سلسلے سے آزاد ہوکر کتاب و سنت کے براہِ راست مطالعہ کا موقع ملا ہے" جماعت اسلامی سے علٰحدگی کے بعد ہی کتاب و سنت کے طریقے سے بھی علٰحدگی اختیار کر لیتے ہیں ؟

اب رسالہ کے صفحات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کتاب کا دوسرا حصہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں دوسری چیزوں کے علاوہ جماعت اسلامی کے پہلے بحران کی تفصیلات بھی آرہی ہیں۔ ان میں دیکھا جا سکتا ہے کہ بحران کس طرح پیدا کیا جاتا ہے۔ بحران پیدا کرنے کے بعد جماعت سے علٰحدگی کی راہ کس طرح ہموار کی جاتی ہے۔ پھر جماعت میں رہتے ہوئے اور جماعت سے علٰحدگی کے بعد مولانا منظور صاحب نعمانی کس طرح کوشش کرتے ہیں کہ جماعت سے علٰحدگی کے حقیقی وجوہ و اسباب مخفی رہیں اور بحران سے متعلق خطوط کی اشاعت نہ ہونے پائے۔ اور یہ سب کر لینے کے بعد مولانا نعمانی صاحب کس طرح متعلقہ خطوط کو شائع کیے بغیر محض ان کے حوالوں سے سنگین نتائج اخذ کرنے اور حقائق کو مسخ کرنے کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ اور میرے استاد محترم مولانا علی میاں صاحب یہ محسوس نہیں کرتے کہ ان کے "رفیقِ محترم" کا یہ وطیرہ " کونوا قوامین بالقسط شہداء للّٰہ" پر عمل نہیں، اس کی خلاف ورزی ہے بلکہ " دینی و علمی، بےلاگ، بے رو رعایت اور صحت مند تنقید" اور " یا ایھا الذین اٰمنوا کونوا قوامین بالقسط شہداء للّٰہ" کا نام لے کر مولانا کا اصرار ہے کہ :

؎ جو کچھ بتائے داغ اسے مان جائیے

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللّٰہ علیہ توکلت والیہ انیب !

تبلیغ کا سلسلہ اس وقت بھی جاری تھا جب میں ندوہ میں رہ کر ادب عربی کی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ چنانچہ جمعرات کو ظہر بعد ہم لوگ مولانا علی میاں صاحب کے ساتھ نکل جاتے اور جمعہ کی شام یا رات تک واپسی ہو جاتی۔ مولانا پہلے مجھے یہ بات بتا چکے تھے کہ مولانا مودودیؒ کا نقص ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ "فیضِ صحبت" سے محروم ہیں۔ اور اب اس نقص کو ثابت کرنے کے لیے واپسی میں مولانا فرماتے " اقبال! سب کچھ کتابوں ہی سے حاصل نہیں ہو جاتا۔ اس کے لیے صحبت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔" اور میں مولانا کے اس بے دلیل دعویٰ کو صحیح تسلیم کرنے سے اس لیے مجبور رہتا کہ مولانا نے خود ہی ہم لوگوں کے دلوں میں یہ بات راسخ کر دی تھی کہ ہدایت کا ذریعہ کتاب و سنت کی تعلیمات ہی ہیں اور قیامت تک رہیں گی۔ اسی طرح مولانا نے مجھے ایسی کتابیں پڑھوا دی تھیں کہ اس قسم کے بلا ثبوت دعووں کی میرے نزدیک کوئی وقعت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ پھر میں سمجھتا تھا کہ تزکیۂ نفوس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصدِ بعثت میں تھا۔ ایسی حالت میں دین میں جس قسم کا تزکیہ مطلوب ہے، اسے کہیں باہر سے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ کتاب و سنت کی تعلیمات پر کما حقہٗ عمل کرنے کے نتیجہ میں حاصل ہو جاتا ہے۔ اور دین کے کامل ہونے کا یہی تقاضا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ اس لیے کوئی شخص اگر صرف کتاب و سنت کی تعلیمات ہی پر عمل پیرا ہے تو اس پر یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کہ

اس کا دین اور علم دین ناقص ہے۔ چنانچہ مولانا کے اس دعوے پر میں معترض ہوتا تو بحث شروع ہو جاتی اور اسی طرح اس کا سلسلہ جاری رہتا۔ اور گو اس بحث سے میرے اسباق تو متاثر نہیں ہونے پاتے تھے پھر بھی استاد محترم کی ہر ہفتے کی بحث کوئی خوشگوار بحث نہ تھی۔ اور اس میں شاید اس بات کا بھی کچھ دخل تھا کہ مولانا اپنے دعوے کو صحیح ثابت کر دکھانا چاہتے تھے مگر دلائل سے اسے ثابت نہ کر پاتے تھے۔ اور اب تو فیض صحبت کی برکات نے مولانا کے یہاں پہنچ کر اسلام کی متضاد تعبیروں کی جو شکل اختیار کر لی ہیں، اس سے یہ بات خود عیاں ہو جاتی ہے کہ کتاب و سنت کے طریقہ کو چھوڑ کر جب کوئی دوسری راہ اختیار کر لی جاتی ہے تو اس کا حشر کیا ہوتا ہے! بہرحال اسی زمانہ میں سرور صاحب کی شدید خواہش ہوئی کہ میں ندوہ سے ان کے گھر منتقل ہو آؤں جو پان دریبہ میں واقع تھا۔ اس لیے میں وہاں آ گیا اور وہاں سے جاکر روزانہ اپنے اسباق پڑھ آیا کرتا تھا۔ سرور صاحب پنجاب کے رہنے والے اور لکھنؤ میں ٹی۔ ٹی۔ آئی تھے۔ وہ مولانا مودودیؒ کے خیالات کے پرزور حامی اور مولانا کے لٹریچر کے پرجوش مبلغ تھے۔ اس سلسلہ میں ان کی کافی رقم بھی صرف ہو جایا کرتی تھی۔ اس زمانہ میں سرور صاحب ہی مولانا کو نیم کے سینکے، عطر اور تمباکو پہنچایا کرتے تھے۔

ڈیڑھ دو ماہ سرور صاحب کے یہاں قیام کے بعد جب مولانا مودودیؒ کی خدمت میں میری روانگی کا دن آیا اور میں مولانا علی میاں صاحب سے رخصت ہونے ندوہ حاضر ہوا تو مولانا نے فرمایا کہ ٹرین تو رات میں جاتی ہے۔ مغرب کی نماز امین آباد پارک میں پڑھنا، نماز کے بعد باتیں ہوں گی۔ اس زمانہ میں مغرب کے وقت امین آباد پارک کی جماعت میں کافی لوگ ہو جایا کرتے تھے۔ مولانا کے حکم پر مغرب کی نماز میں نے امین آباد پارک میں ادا کی لیکن نماز بعد کوئی بات کئے بغیر مولانا ٹہلنے لگے۔ پھر کچھ دیر بعد انھوں نے اشعار پڑھنا، اور ان کی آنکھوں نے آنسو بہانا شروع کر دیا اور میں حیران اور پریشان ہو کر مولانا کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ مولانا کی شخصیت کا میرے لیے یہ ایک بالکل نیا رخ تھا۔ اس میں مولانا نہ مجھے کچھ عرض کرنے کا موقع عنایت فرما سکے نہ ان کی زبان سے ایک لفظ نکل سکا۔ درمیان میں مولانا کچھ دیر بنچ پر بیٹھے رہے پھر ٹہلنے لگے۔ کافی دیر بعد جب اشعار خوانی کا سلسلہ ختم ہوا تو مولانا نے فرمایا "اقبال! اس میں تمہاری کوئی خطا نہیں، یہ خاندان والوں ہی کا قصور ہے کہ جس پر بھروسا کیا، اس نے ساتھ چھوڑ دیا" مولانا پر جو کیفیت اس وقت غالب تھی اس میں اپنی صفائی پیش کرنے کا تو کوئی موقع تھا نہیں اس لیے اپنے متعلق مولانا کا یہ فیصلہ سن کر سلام کر کے انتہائی دلی اذیت کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ مولانا سے رخصت ہو کر تقریباً دوڑتا ہوا میں سرور صاحب کے گھر پہنچا۔ ٹرین کا وقت بھی قریب تھا اور ان حضرات کی زحمت کا بھی خیال ہو رہا تھا جو مجھے رخصت کرنے کے لیے تشریف لانے والے تھے۔ سرور صاحب کے مکان پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ اور دوسرے حضرات اسٹیشن جا چکے ہیں۔ اپنا سامان لے کر میں اسٹیشن پہنچا تو معلوم ہوا کہ میری اس تاخیر سے سرور صاحب اور دوسرے حضرات نے سمجھ لیا تھا کہ مولانا علی میاں صاحب سے ملاقات کے بعد شاید میرا سفر کا ارادہ باقی نہیں رہ گیا۔ بہرحال سرور صاحب نے فوراً ٹکٹ منگا کر دیا اور چند

منٹ بعد ٹرین آ گئی۔ جنگ کا زمانہ ہونے کی وجہ سے کافی ڈبوں میں ملٹری تھی۔ اور جن ڈبوں میں ملٹری نہیں تھی وہ مسافروں سے کھچا کھچ بھرے تھے اس پیسرو صاحب نے مجھے برف کے ڈبہ میں بٹھادیا اس میں بھی کچھ مسافر پہلے سے بیٹھے تھے۔ ٹرین رات کو غالباً سہارنپور اسٹیشن پر رکی تو وہ ڈبہ خالی کرالیا گیا۔ معلوم ہوا اس میں بھی یہاں سے ملٹری جائے گی اب میں پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دوڑ رہا تھا۔ ڈبوں کے دروازے اندر سے بند تھے اور انہیں کھلوانے کی ساری کوششیں بے سود تھیں۔ اس وقت یہ بات بھی نہیں معلوم تھی کہ یہ ٹرین اگر چھوٹ جائے تو میں اسی ٹکٹ پر دوسری ٹرین سے سفر کرسکتا ہوں اس لیے یہی کوشش تھی کہ جس طرح بھی ہو اسی ٹرین میں گھسنے کو مل جائے۔ بہر حال ایک نوعمر طالب علم کو اس طرح یکہ وتنہا اور بے یار و مددگار پریشان دیکھ کر دو مسلمان قلیوں کو ترس آیا اور انھوں نے مجھے اٹھا کر اندر کی مزاحمت کے باوجود کسی طرح کھڑکی میں گھسیڑ دیا اور میں مسافروں کا سر بچا کر ڈبہ میں کود گیا۔ اب بھی کبھی پریشانی کے یہ لمحات یاد آجاتے ہیں تو اپنے ان دونوں محسنوں کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ ڈبہ میں بیٹھنے کے لیے جگہ ملنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا، دونوں پیر فرش پر ٹکانے کے لیے جگہ مل جاتی تو اللہ کا شکر ادا کرتا۔ لکھنؤ سے لاہور تک استاد محترم کے الفاظ کانوں میں گونجتے رہے اور ذہن میں ایک طوفان برپا رہا۔ دنیاوی تعلقات کی بے ثباتی کا بھی شدت سے احساس ہوتا رہا اور یہ خیال بھی پریشان کئے رہا کہ مولانا مودودی سے تو میری ایک ہی دفعہ کی ملاقات ہے، دیکھو وہاں پہنچ کر کیا ہوتا ہے۔ اس طرح خدا خدا کرکے لاہور آگیا۔ اسٹیشن سے نکل کر کچھ دور پیدل چلا مگر یہ اطمینان نہیں تھا کہ ٹھیک راستہ پر چل رہا ہوں راستہ جس سے دریافت کرتا وہ پنجابی میں ہی جواب دیتا۔ اس لیے عافیت اسی میں نظر آئی کہ تانگہ کرلوں۔ تانگہ پر بھی یہی خیالات پریشان کیے رہے۔ تانگہ مولانا کے مکان پر پہنچ کر رکا تو اس کی آواز پر مولانا نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور دیکھتے ہی فرمایا "اخاہ اقبال صاحب آگئے"۔ میرے لئے مولانا کا یہ انداز تخاطب ہی یکسر توقع سے زائد تھا۔ اور اس کے آگے کی کوئی بات تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بہر حال تانگہ والے کو پیسے دے کر اپنی گٹھری سنبھالے میں لان میں داخل ہوا تو دیکھا مولانا میری طرف آرہے ہیں۔ میرے پاس پہنچے تو مجھے دیر تک سینہ سے لگائے رہے۔ اور میں حیرت واستعجاب کے عالم میں کھڑا سوچتا رہا کہ مولانا کے دل کی گہرائیوں میں اخلاص کا کتنا بڑا خزینہ موجود ہے۔ طوفان اب فرو ہو چکا تھا۔ گرد میں اٹے پسینہ میں شرابور، میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس خستہ و پریشان ایک حقیر طالب علم کا ایسا پُرتپاک خیر مقدم مولانا مودودیؒ کے سوا اور کون کرسکتا تھا۔ جزاہ اللہ عنا خیر الجزاء۔

(جاری ہے)

مسلمان اقلیتوں کا مطلوبہ کردار

قرآن و سنت کی روشنی میں[1]

(۳) سلطان احمد اصلاحی

<u>دعوت دین مکہ میں</u> : اوپر دعوت دین کی نمائندہ ' امر بالمعروف ، اور شہادت علی الناس ، سے متعلق جو آیتیں پیش کی گئی ہیں وہ دونوں مدنی ہیں۔ جبکہ مسلمان بڑی حد تک اکثریت میں تبدیل ہو چکے تھے اور آزاد ریاست کی فضا میں سانس لے رہے تھے۔ جس سے خیال کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں پر دین کی تبلیغ واشاعت اور اس کے غلبہ و نفاذ کی کوشش کی فرضیت اسلامی تاریخ کے مدنی دور جیسے احوال و ظروف ہی میں ثابت ہوتی ہے اس طرح مسلمان اقلیتیں، جو اپنے ملکوں میں مظلومیت و مقہوریت کی زندگی گذار رہی ہوں ان سے شہادت حق کی یہ ذمہ داری اس وقت تک کے لیے ساقط یا یہ اس سے مستثنیٰ رہیں گی تا آنکہ ان کے لیے مدنی زندگی کے حالات پیدا ہو جائیں، لیکن یہ خیال اپنی بنیاد کھو بیٹھتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو مکہ کے اندر ہی صاف اور صریح لفظوں میں اور ایک سے زیادہ مقامات پر یہ حکم سنادیا گیا تھا۔ ذیل کی تمام آیتیں مکی اور مصحف کی مکی سورتوں میں شامل ہیں:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ (فصلت: ۳۳-۳۴)

اور اس سے بڑھ کر بھلی بات اور کس کی ہوسکتی ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلموں (فرمانبرداروں) میں سے ہوں۔ اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہوسکتیں تو تم (برائی کو) دفع کرو اس طریقہ سے جو بہتر ہو تو اس کا نتیجہ ہوگا کہ وہ شخص کہ اس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے گویا کہ وہ قریب ترین دوست ہے۔

دوسرے موقع پر اس حکم عام کے سلسلے میں امت کے سربراہ کی حیثیت سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا جس میں اس کے طریقۂ کار کی بھی نشاندہی کی گئی:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ — (لوگوں کو) اللہ کے راستے کی طرف بلاؤ حکمت اور عمدہ نصیحت کے

---

[1] سلسلے کے لیے ملاحظہ ہو زندگی نو دسمبر ۱۹۹۹ء (ادارہ)

الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۝ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ۝ (نحل: ۱۲۵، ۱۲۶)

کے ساتھ اور ان کے ساتھ بحث کرو اس طریقہ سے جو بہترین ہو۔ تمہارا رب خوب پتہ رکھنے والا ہے کہ کون اس کے راستے سے بھٹکا ہے۔ اور وہ خوب پتہ رکھنے والا ہے راہ پانے والوں کا۔ اور اگر تم بدلہ لو تو اسی کے بقدر جتنی کہ تمہارے ساتھ زیادتی کی گئی ہے اور اگر تم سہہ لے جاؤ تو یہ سہہ لے جانے والوں کے لیے زیادہ بہتر ہے۔

نیز فرمایا:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ۝ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ (اعراف: ۱۹۹، ۲۰۰)

عفو و درگذر کو اپناؤ اور بھلائی کا حکم دو اور نا سمجھوں سے واسطہ نہ رکھو اور اگر شیطان کی طرف تمہیں اکساہٹ ہو تو اللہ کی پناہ مانگو۔ وہ بڑا سننے والا، جاننے والا ہے۔

آخری نبیؐ کی یہ خصوصیت بھی مکہ ہی میں بتادی گئی تھی:

الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ ..... (اعراف: ۱۵۷)

امی نبی ہے کہ وہ (اہل کتاب) اپنے ہاں تورات و انجیل میں لکھا پاتے ہیں جو انھیں بھلائی (معروف) کا حکم دیتا ہے اور برائی سے منع کرتا ہے...

اور حضرت لقمان کی زبانی بالواسطہ یہ پیغام بھی لوگوں کو مکہ ہی میں سنادیا گیا تھا:

يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَى مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ۝ (لقمان: ۱۷)

اے بیٹے نماز قائم کرو اور بھلائی (معروف) کا حکم دو اور برائی (منکر) سے منع کرو اور (اس راہ میں) تمہیں جو مشکل اور پریشانی بھی آئے اس کا مقابلہ کرو ضرور یہ بڑے عزیمت کے کاموں سے ہے۔

حق اور صبر کی ایک دوسرے کو نصیحت 'تواصی بالحق والصبر' کے عنوان سے بدلے ہوئے الفاظ میں یہی چیز سورۃ العصر کا مرکزی موضوع تھی، جس سے استدلال کرتے ہوئے اس دور کے فن تفسیر کے نامور عالم مولانا حمیدالدین فراہیؒ نے اس امت پر خلافت کے قیام کے وجوب کو ثابت کیا ہے[1]

پوری انسانی تاریخ میں غالباً تیرہ سالہ مکی زندگی میں مسلمانوں سے بڑھکر دنیا میں کوئی اقلیت مظلوم اور مقہور نہیں رہی۔ ظاہر ہے جب ان سخت ترین حالات میں اقلیت و اکثریت کی کسی تفریق کے بغیر مسلمان امت اس فریضۂ منصبی کو اٹھانے کی پابند رہی، تو بعد کے ادوار اور زمانوں میں اسے اس سے مستثنٰی یا بری الذمہ کیوں قرار دیا جاسکتا ہے۔

اتحاد و اجتماعیت کی تعلیم: امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اور شہادت علی الناس کی یہ ذمہ داری ان دستوں کے

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر سورۃ العصر/ ۶۷، مطبوعہ فیض عام، علی گڑھ ۱۳۶۷ھ

ساتھ افراد کے بس کی بات نہیں ہو سکتی، جس کا حق ان کی منتشر کوششوں سے ادا کیا جا سکے۔ اس کے لیے مقصود یہ ہے کہ یہ امت اجتماعیت کے شیرازے میں کسی رہے اور اس کا اتحاد نمونے کا اور مثالی ہو۔ یہی وجہ ہے جو اوپر کی دونوں آیتوں میں اس فریضہ کی یاد دہانی کراتے ہوئے مسلمان گروہ کو "امت" کے لقب سے یاد کیا گیا، جو اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے اتحاد فکر و عمل کی حامل اجتماعیت کے لیے مختص ہے۔[1] اس کے ساتھ ہی "شہادت علی الناس" کی ذمہ داری کا حکم سنانے سے پہلے پوری امت کو اللہ یعنی اس کے دین کو مضبوطی سے تھامنے کی تاکید کی گئی، جبکہ یہی وہ چیز ہے جو اسلامی اجتماعیت کی بنیاد اور اس کی اصل اساس ہے، "واعتصموا باللہ ھو مولٰکم فنعم المولٰی ونعم النصیر" (۲۲: ۷۸) جس کی وضاحت سورہ آل عمران میں "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کا حکم دینے سے پہلے ان الفاظ کی گئی ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا۔ (آیت: ۱۰۳)

اور (اے ایمان والو) تم سب مل کر اللہ کی رسی (اس کے دین) کو مضبوط تھام لو، اور ٹکڑیوں میں نہ بٹو۔

آگے امت مسلمہ کے وظیفہ منصبی کی یاد دہانی کرائی گئی:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥ (آیت: ۱۰۴)

اور چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور بھلائی (معروف) کا حکم دے اور برائی (منکر) سے منع کرے اور یہی لوگ بامراد ہیں۔

اور اس کے معاً بعد اہل کتاب کی روش سے اجتناب کی تلقین کی گئی۔ جو اللہ کے دین کو چھوڑنے کے نتیجہ میں بے شمار دھڑوں اور گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ اور قیامت تک کے لئے اختلاف و انتشار ان کے مقدر میں لکھا گیا۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (آیت: ۱۰۵)

اور تم ان لوگوں کی طرح سے نہ ہو جو ٹکڑیوں میں بٹ گئے اور لڑائی جھگڑے میں پڑ گئے اس کے پیچھے کہ ان تک کھلی ہوئی نشانیاں پہنچیں۔ اور یہی ہیں کہ ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

ان آیات کے بعد مسلمان امت کے مقصد وجود کو واضح کرنے والی وہ دستوری آیت کریمہ ہمارے سامنے آتی ہے، جس کی تفصیل اس سے پہلے پیش کی گئی، "کنتم خیر امۃ اخرجت للناس..." (آل عمران: ۱۱۰) جس کا مطلب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان شرطوں کے ساتھ جب امت اس فریضے کا حق ادا کرے گی، جبھی وہ اس قابل ہو گی کہ اقوام عالم کے لئے وہ اس مشن کے لئے فارغ ہو اور اس کا حق ادا کر سکے۔ اس پس منظر میں اوپر (آیت ۱۰۴) میں مسلمان امت کو دعوت الی الخیر اور معروف کا حکم دینے اور منکر سے منع کرنے کی جو بات کہی گئی ہے وہ خارج کی اصلاح کے ساتھ اس امت کی داخلی اصلاح کو

[1] تفسیر المنار، ۴/۳۳، دارالمنار، مصر ۱۳۶۶ھ۔

بھی اسی طرح بلکہ مقدم طور پر شامل ہے جس کی تائید ان بے شمار احادیث سے ہوتی ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معروف کا حکم دینے اور منکر سے منع کرنے کو ہر مسلمان کی ذمہ داری قرار دیا ہے۔ مسلمان معاشرے کے اندر یہ کام مسلسل اور کسی انقطاع کے بغیر لازماً انجام دیتے جاتے رہنا چاہئے[1] جس دن سے اس امت کا رشتہ کمزور ہوا تو اس کی اجتماعیت کبھی قائم نہیں رہ سکتی اور اسی روح کو بیدار کرنے کا دوسرا نام امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے۔ جس کی مثالی اور معیاری صورت ہے کہ امت کے اندر خلافت کا نظام قائم ہو کہ اس کے بغیر اجتماعیت کے واقعی ثمرات سے بہرہ اندوز نہیں ہوا جا سکتا۔ اس صدی کے مشہور مفسر مولانا امین احسن اصلاحی نے اس آیت سے اس کے وجوب کو ثابت کیا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

" اس آیت سے امت کے اندر خلافت کے قیام کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پہلا کام جو کیا وہ خلافت علی منہاج النبوۃ کا قیام تھا۔ اس ادارہ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ اس امر کی نگرانی کرے کہ مسلمان اعتصام باللہ کے نصب العین سے ہٹنے نہ پائیں۔ اس کے لیے جو طریقے اس کو اختیار کرنے تھے وہ اصولی طور پر تین تھے۔ دعوت الی الخیر، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، انہی تین سے خلافت راشدہ کے دور میں وہ تمام شعبے وجود میں آئے جو ملت کی تمام داخلی و خارجی ذمہ داریوں کے ادا کرنے کا ذریعہ بنے"[2]

ہم نہیں سمجھتے کہ جس چیز کی مطلوبیت امت کو دور اول میں تھی آج اس کی ضرورت نہیں رہی اور کسی عنوان سے اس میں کسی امتیاز و تفریق کی گنجائش پیدا کی جا سکتی ہے۔

<u>نصب امامت کا وجوب:</u> اسلام قلت و کثرت کی کسی تفریق کے بغیر پوری امت کو امارت و خلافت کے شیرازے میں کسا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ قرآن کے نزدیک نظام امارت کے بغیر اسلامی معاشرہ کا نقشہ مکمل نہیں ہوتا اور خدا اور رسول کی کامل اطاعت کو وہ اس نظام کے وجود پر موقوف بتاتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (نساء: ۵۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو پیروی کرو اللہ کی اور پیروی کرو رسول کی اور اپنے میں سے اصحاب امر کی۔

جس کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان بے شمار حدیثوں سے ہوتی ہے جن میں آپ نے ہر مسلمان کو نظام امارت سے جڑے رہنے کی سخت تاکید کی ہے۔ یہاں تک کہ جس شخص کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہ ہو

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الادب، باب الامر بالمعروف، کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔

[2] تدبر قرآن: ۱/۷۵۰، نور ایڈیشن۔

اس کی موت کو آپ نے جاہلیت کی موت بتایا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک خلافت و امامت کا یہ نظام قائم نہ ہو قلت وکثرت کے کسی امتیاز کے بغیر مسلمان امت کے دنیا و آخرت کے مفادات و مصالح کے تحفظ کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہی وجہ ہے جو علما اسلام نے اس امت کے لئے کسی قید کے بغیر نصب امامت کو واجب قرار دیا ہے عقائد کی مشہور کتاب۔ شرح نسفی میں ہے:

والمسلمون لا بد لهم من امام يقوم بتنفيذ احكامهم واقامة حدودهم وسد ثغورهم وتجهيز جيوشهم واخذ صدقاتهم وقهر المتغلبة والمتلصصة وقطاع الطريق واقامة الجمع والاعياد وقطع المنازعات الواقعة بين العباد وقبول الشهادات القائمة على الحقوق وتزويج الصغار والصغائر الذين لا اولياء لهم وقسمة الغنائم[1]

اور ناگزیر ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایک امام (سربراہ) ہو جو ان کے لئے احکام کا نفاذ عمل میں لائے اور ان کے درمیان حدود اللہ کو قائم کرے۔ ان کی سرحدوں کی حفاظت اور ان کے لشکروں کی روانگی کا اہتمام کرے۔ ان کے صدقات و زکوۃ کی وصولیابی کرے۔ اور جو سرکش، چور اور ڈاکو ہوں انہیں دبا کر رکھے اور جمعوں اور عیدوں کو قائم کرے اور لوگوں کے درمیان جو جھگڑے کھڑے ہوں ان کا فیصلہ کرے اور گواہوں کو قبول کرے جن سے کہ (لوگوں کے) حقوق ثابت ہوں۔ ان کمسن لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی کرے جن کا کوئی ولی نہ ہو اور اموال غنیمت کی منصفانہ تقسیم کا انتظام کرے۔

جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا امت پر نصب امامت کی یہ ذمہ داری اقلیت اور اکثریت کی کسی قید کے بغیر ہے یہاں تک کہ فقہاء نے اغیار کے زیر تسلط ممالک اور علاقوں تک کے مسلمانوں کے لیے بھی، امامت کے قیام کو اسی طرح واجب قرار دیا ہے۔ ہمارے زمانہ میں فقہ حنفی کے اہم ترین مرجع و ماخذ 'درمختار' میں صراحت ہے:

ولو فقد وال لغلبة كفار وجب على المسلمين تعيين وال وامام للجمعة[2]

اور اگر کفار کے تسلط کے باعث کوئی حاکم نہ رہ جائے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ کوئی حاکم اور جمعہ کے لئے امام مقرر کریں۔

جس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ ابن عابدین کہتے ہیں:

واما بلاد عليها ولاة كفار فيجوز للمسلمين اقامة الجمع والاعياد ويصير القاضي قاضيا بتراضي المسلمين يجب عليهم ان يلتمسوا

رہے وہ علاقے جہاں کافر حکمراں ہوں تو مسلمانوں کے لئے (اپنے طور پر) جمعوں اور عیدوں کا قائم کرنا جائز ہے اور مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے قاضی قاضی قرار پا جائے گا پس

[1] مشکوۃ المصابیح، کتاب الامارۃ والقضاء رشیدیہ دہلی [1] صدر الشواہد شرح عقائد نسفی، کتب خانہ فخریہ دیوبند یوپی

[2] درالمختار علی ہامش رد المختار، ۴/۲۷۴۔ در سعادت مطبعہ عثمانیہ

واليامنهم [1] — ان کے اوپر واجب ہے کہ وہ اپنے میں سے کوئی حاکم تلاش کریں۔

مزید فرماتے ہیں:

واذا لم يكن سلطان ولا من يجوز التقلد منه كما هو في بعض بلاد المسلمين غلب عليهم الكفار ... يجب على المسلمين ان يتفقوا على واحد منهم يجعلونه واليا فيولي قاضيا او يكون هو الذي يقضي بينهم وكذا ينصبوا اماما يصلي بهم الجمعة [2]

جب کوئی خلیفہ (سلطان) یا کوئی دوسرا (ذمہ دار) نہ ہو جس کی طرف سے مناصب کا تفویض کیا جانا جائز ہو جیسا کہ مسلمانوں کے بعض علاقوں میں اس وقت ہے جیسے کہ قرطبہ تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک شخص پر متفق ہو جائیں وہ اسے اپنا حاکم قرار دے لیں پس وہ ان کے لیے قاضی مقرر کرے اور یہی (قاضی) ہوگا جو ان کے درمیان تمام معاملات کا فیصلہ کرے گا۔ اسی طرح ان کے اوپر واجب ہوگا کہ وہ (اپنا) ایک امام بنائیں جو ان کو جمعہ پڑھائے۔

اور آخر میں اسی رائے کو سب سے زیادہ پسندیدہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں،

وهذا هو الذي تطمئن القلب اليه فليعتمد [3] — اور یہی بات ہے جس پر دل ٹکتا ہے پس اسی پر اعتماد کیا جانا چاہیے

ایک دوسرے موقع پر بھی انھوں نے یہی بات کہی ہے،

واما بلاد عليها ولاة كفار فيجوز للمسلمين اقامة الجمع والاعياد ويصير القاضي قاضيا بتراضي المسلمين ويجب عليهم طلب وال مسلم [4]

رہے وہ علاقے جن پر کافر حکمراں ہوں تو مسلمانوں کے لئے جمعوں اور عیدوں کا قائم کرنا جائز ہوگا۔ اور مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے قاضی قاضی قرار پا جائے گا اور ان کے اوپر مسلمان حاکم کا مطالبہ کرنا واجب ہوگا۔

جہاں تک امت کے لئے اپنے مقصد وجود اور فریضۂ منصبی کے ادا کرنے کا سوال ہے تو اس کے لئے اس امامت و حلافت کی ضرورت اظہر من الشمس ہے۔ جیسا کہ اس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ قرآن کی واضح شہادت اس کے حق میں ہے جس میں حکومت و اختیار اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم کے طور پر ذکر کیا گیا ہے:

---

[1] رد المحتار على الدر المختار، حوالہ سابق،
[2] حوالہ مذکور
[3] حوالہ سابق [4] رد المحتار على الدر المختار: ۳/۳۵۰۔ محولہ ایڈیشن۔

الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (حج، ۴۱)

وہ کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور بھلائی (معروف) کا حکم دیں اور برائی (منکر) سے روکیں اور معاملات کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

یہ آیت کریمہ جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے امت کے کسی خاص طبقے اور خاص زمانہ کے لیے نہیں بلکہ علی الاطلاق پوری امت کے لیے اور قیامت تک کے لیے اس کا حکم اسی طرح قائم ہے[1]

اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلافت ارضی کے جس عظیم منصب پر فائز کیا اس کا بھی یہ ایک صریحی تقاضہ ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (بقرہ ۳۰)

اور یاد کرو جب اللہ نے فرشتوں سے کہا کہ میں ضرور زمین میں (اپنا) ایک جانشین ٹھہرانے والا ہوں

خلافت ارضی کے اس مقصد کی تکمیل امت مسلمہ کے ذریعہ ہی ممکن ہے جس کے لیے اس کے اندر منصب خلافت کی بحالی ضروری ہے۔ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر نے بجا طور کہا ہے:

وقد استدل القرطبي وغيره بهذه الآية على وجوب نصب الخليفة ليفصل بين الناس فيما اختلفوا فيه ويقطع تنازعهم وينتصر لمظلومهم من ظالمهم ويقيم الحدود ويزجر عن تعاطي الفواحش الى غير ذلك من الامور المهمة التي لا تمكن اقامتها الا بالامام وما لا يتم الواجب الا به فهو واجب[2]

امام قرطبیؒ اور ان کے علاوہ دوسرے علماء نے اس آیت سے (امت میں) خلیفہ کے منصب کی بحالی کے وجوب کو ثابت کیا ہے۔ تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان کے اندر ہونے والے اختلافات کے سلسلے میں فیصلہ کر سکے۔ ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کی داد رسی کر سکے، حدود کا نفاذ عمل میں لائے اور برائیوں کے ارتکاب پر روک لگا سکے۔ اس کے علاوہ دوسری بہت سی چیزیں جن کا برپا کرنا، امام وقت کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اور معلوم ہے کہ جس چیز کے حصول پر کوئی واجب موقوف ہو وہ خود واجب ہے۔

آپ نے دیکھا کہ امام قرطبی اور دوسرے ائمہ امت میں خلافت کے منصب کی بحالی کو پوری امت مسلمہ کے لیے لازم قرار دیتے ہیں۔ اور زمانہ اور علاقہ کی کسی قید کے بغیر و تمام افراد امت پر اسے یکساں طور پر واجب گردانتے ہیں۔

اقلیتوں کی شرکت ۔ عالم اسلام کے مسائل میں

امت مسلمہ کا مقصد وجود جیسا کہ گذرا امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ جو امت پر عائد ہونے والے فرائض کی فہرست میں سر فہرست ہے۔ جبکہ

[1] الجامع لاحکام القرآن للقرطبی بحوالہ الامر بالمعروف والنہی عن المنکر۔ /۹۵۔ شرکۃ الشعاع، الکویت [2] تفسیر ابن کثیر، ۱/۲۱۔

[2] علم اصول الفقہ للخلاف /۱۰۸

فرائض کفایہ کی حقیقت یہ ہے کہ:

فالواجبات الکفائیۃ المطالب بھا مجموع افراد الامۃ بحیث ان الامۃ بمجموعھا علیھا ان تعمل علی ان یؤدی الواجب الکفائی فیھا فالقادر بنفسہ ومالہ علی اداء الواجب الکفائی علیہ ان یقوم بہ، وغیر القادر علی ادائہ بنفسہ علیہ ان یحث القادر ویحملہ علی القیام بہ فاذا ادی الواجب سقط الاثم عنھم جمیعًا واذا اھمل اثموا جمیعًا اثم القادر لاھمالہ واجبًا قدر علی ادائہ واثم غیرہ لاھمالہ حث القادر وحملہ علی فعل الواجب المقدور لہ[1]

جو واجبات کہ بطور کفایہ کے ہیں ان کا مطالبہ فی الجملہ امت کے تمام افراد سے ہے۔ اس طور پر کہ امت کے لیے فی الجملہ ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر اس واجب کی ادائیگی کے لیے کام کرے، پس جو شخص اپنی جان و مال سے اس واجب کفایہ کو ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہو تو اس کے اوپر لازم ہے کہ وہ اسے انجام دے اور جو شخص اپنے طور اس کو ادا کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ قدرت رکھنے والے کو ابھارے اور اسے اس کی انجام دہی پر آمادہ کرے۔ پس اگر یہ شخص اس واجب کو ادا کر دیتا ہے تو ان تمام لوگوں سے گناہ ساقط ہو جائے گا اور اگر وہ چھوڑ دے تو تمام لوگ گنہ گار ہوں گے قدرت رکھنے والا تو اس لیے گنہگار ہوگا کہ اس نے واجب کو چھوڑا جس کی ادائیگی پر وہ قدرت رکھتا تھا اور دوسرا گنہگار اس لیے ہوگا کہ اس نے قدرت رکھنے والے کو ابھارنے اور اسے اس واجب کی انجام دہی پر آمادہ کرنے کا کام چھوڑ دیا جس کی وہ قدرت رکھتا تھا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امت کا ناگزیر جزء ہونے کی حیثیت سے اکثریت کی طرح مسلمان اقلیتیں بھی اس وظیفہ کی ادائیگی میں برابر کی شریک ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ عالم اسلام کے مسائل میں ان کی شرکت بھی ضروری ہے۔ اس مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ جیسا کہ تفصیل گذری۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے امت کے لیے جہاد و قتال کے مراحل سے سابقہ پیش آسکتا ہے کہ اس کے بغیر اس کے ہمہ جہتی تقاضوں کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ سورۂ آل عمران کی آیت کریمہ کنتم خیر امۃ .... (۱۱۰) کی تفسیر میں اس سلسلے میں علماء کی تصریحات گذر چکی ہیں۔ اسی سلسلے کی دوسری آیت کریمہ "ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر..... (آل عمران: ۱۰۴) کی تفسیر میں بھی علامہ ابن جریر طبری نے اس کی صراحت کی ہے:

ولتکن منکم ایھا المومنون امۃ یقول جماعۃ یدعون الناس الی الخیر یعنی الی الاسلام

اور چاہیے کہ تم میں سے اے ایمان والو ایک امت ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یعنی کہ ایک جماعت ہو جو لوگوں کو بھلائی (خیر)

---

[1] حوالہ سابق ۱۰۹/

وشرائعه التی شرعها الله لعباده ویأمرون
یقول یأمرون الناس باتباع محمد صلی الله
علیه وسلم ودینه الذی جاء به من
عند الله وینهون عن المنکر یعنی وینهون
عن الکفر بالله والتکذیب بمحمد وبما جاء
به من عند الله بجهادهم بالایدی والجوارح
حتی ینقادوا لکم بالطاعة[1]

یعنی اسلام اور اس کے احکام و شرائع کی طرف بلانے جنھیں
اللہ نے اپنے بندوں کے لیے مشروع ٹھہرایا ہے اور ان کا
کا حکم دیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یعنی کہ وہ لوگوں کو محمد صلی اللہ
علیہ وسلم اور ان کے اس دین کی پیروی کا حکم دیں جسے کہ وہ اللہ
کے پاس سے کر آئے ہیں اور وہ برائی سے منع کریں، اس کا مطلب
ہے کہ وہ اللہ کے انکار اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ چیز جو
آپ کے پاس سے کر آئے ہیں اس کو جھٹلانے سے منع کریں یہ کام
وہ لوگوں کے بالمقابل ہاتھ اور دوسرے اعضاء وجوارح سے
جہاد کے ذریعہ انجام دیں گے یہاں تک کہ وہ تمہارے پوری طرح
مطیع و منقاد ہو جائیں۔

جہاد کا فرض کفایہ ہونا معلوم و معروف ہے، جس کا مطلب ہے کہ اس کا خطاب اکثریت اور اقلیت کی تفریق کے بغیر امت کے تمام قابل افراد پر ہے[2] اسی کا دوسرا نام قتال اور جنگ ہے۔ اس کے سلسلے میں بھی علماء کی صراحت ہے کہ یہ زمانہ اور جگہ دوسرے لفظوں میں اقلیت اور اکثریت کے کسی فرق کے بغیر بحیثیت مجموعی پوری امت پر فرض ہے جیسا کہ صاحب رد المحتار نے صراحت کی ہے،

ثم اعلم ان الامر بالقتال نزل مرتبا
فقد کان صلی الله علیه وسلم مأمورا اولاً
بالتبلیغ . . ثم اذن لهم بالقتال . . .
ثم امروا به مطلقا وقاتلوا فی سبیل الله
الآیة . واستقر الامر علی هذا . . . یعنی فی
جمیع الازمان والاماکن[3]

جاننا چاہئے کہ جنگ کا حکم ایک ترتیب سے اترا ہے اس لیے کہ
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے تو (پرامن) تبلیغ کا حکم تھا... پھر مسلمانوں
کو جنگ کی اجازت دی گئی... پھر ان کو علی الاطلاق اس کا حکم
دیا گیا (فرمایا) اور اللہ کے راستے میں جنگ کرو۔ الآیہ۔ اور معاملہ اسی
پر رک گیا... یعنی تمام زمانوں اور تمام جگہوں کے لیے۔

معلوم ہوا کہ جس طرح عالم اسلام یا اکثریت کے اسلامی ممالک کے لیے مسلمان اقلیتوں کے مسائل میں شرکت اور ضرورت پڑنے پر ان کے لیے ان کی مدد ضروری ہے، اسی طرح موقع آنے پر اقلیتوں کے لیے بھی اکثریت کے مسلمان ممالک کی ہر طرح سے اخلاقی اور مادی امداد و اعانت ضروری ہوگی۔ مثال کے طور پر اس وقت جب کہ کوئی دشمن اسلام طاقت

[1] جامع البیان فی تفسیر القرآن، ۴/۲۴ [2] رد المحتار علی الدر المختار: ۳/۳۰۳

[3] حوالہ مذکور: ۳/۳۰۴

اکثریت یا اقلیت کے کسی علاقہ پر حملہ آور ہو جائے۔ چنانچہ اس صورت میں ضرورت کے وقت اکثریت اقلیت کے کسی ملک کی
اقلیت کی فکر کیے بغیر پورے عالم اسلام اور پوری امت کے لیے اس حملہ کا پسپا کرنا فرض ہوگا۔ اور کسی ایک خطے کے لوگوں سے
اس کا حق ادا کر دینے سے دوسرے علاقے کے لوگوں کی ذمہ داری ساقط نہ ہوگی۔ علامہ موصوف ہی کے الفاظ ہیں:

ولا ینبغی للامام ان یخلی ثغرا من الثغور من جماعة من المسلمین فیهم غناء وکفایة لقتال العدو فان قاموا به سقط عن الباقین وان ضعف اهل ثغر عن مقاومة الکفرة وخیف علیهم من العدو فعلی من وراءهم من المسلمین الاقرب فالاقرب ان ینفروا الیهم وان یمدوهم بالسلاح والکراع والمال لما ذکرنا انه فرض علی الناس کلهم ممن هو من اهل الجهاد ولکن سقط الفرض عنهم لحصول الکفایة بالبعض فما لم یحصل لا یسقط[۱]

اور امام (حکمراں) کو نہیں چاہیے کہ وہ کسی سرحد کو مسلمانوں کی ایک جماعت سے خالی رہنے دے جو دشمن سے جنگ کے لیے کافی اور اس کی پوری اہلیت رکھتی ہو۔ تو اگر وہ لوگ اس سے عہدہ برآ ہولیں تو بقیہ لوگوں سے یہ ذمہ داری ساقط ہو جائے گی لیکن اگر کسی سرحد کے لوگ کافروں سے مقابلہ کے لیے کمزور پڑ رہے ہوں اور دشمن کی طرف سے انھیں نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو تو جو مسلمان ان کے پیچھے ہیں قریب تر پھر قریب تر تو ان کے اوپر واجب ہے کہ وہ ان کی طرف کوچ کریں اور ان کی اسلحہ، سواری وسامان اور مال ہر طریقہ سے مدد کریں اس لیے کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ یہ جہاد تمام لوگوں پر فرض ہے جو جہاد کی اہلیت رکھتے ہوں لیکن یہ فرض ان سے ساقط ہو جاتا ہے اس لیے کہ کچھ لوگوں کے ذریعہ اس کی ادائیگی کی کفایت ہو جاتی ہے تو جب یہ لوگ اس کے لیے کافی نہ ہو سکیں تو بقیہ لوگوں سے یہ فرض ساقط نہ ہوگا۔

آگے علامہ موصوف اس کی تفصیل ان لفظوں میں کرتے ہیں، جس میں وہ پورے عالم اسلام کو اس ذمہ داری میں شامل قرار دیتے ہیں:

ان الجهاد اذا جاء النفیر انما یصیر فرض عین علی من یقرب من العدو واما من وراءهم ببعد من العدو فهو فرض کفایة علیهم حتی یسعهم ترکه اذا لم یحتج الیهم فان احتیج الیهم بان عجز من کان یقرب من العدو عن المقاومة مع

جہاد جب اس کے لیے نفیر عام ہو جائے تو وہ ان لوگوں پر فرض عین ہو جاتا ہے جو دشمن سے قریب ہوں۔ البتہ وہ لوگ جو دشمن سے دور ہوں تو وہ ان کے اوپر فرض کفایہ ہوتا ہے جسے انھیں چھوڑنے کی گنجائش ہوتی ہے بشرطیکہ ان کی ضرورت نہ ہو لیکن اگر ان کی ضرورت ہو اس طور پر کہ جو لوگ دشمن سے قریب ہوں وہ دشمن کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہوں۔ یا وہ عاجز بھی نہ ہوں لیکن سستی کا

[۱] حوالہ سابق، ۱۰۹/

العدو اولم یعجزوا عنها لعنهم تکاسلوا ولم یجاهدوا فانه یفترض علی من یلیهم فرض عین کالصلوٰۃ والصوم لایسعهم ترکه ثم وثم الی ان یفترض علی جمیع اهل الاسلام شرقاً وغرباً علی هذا التدریج [1]

مظاہرہ کریں اور جہاد نہ کریں تو جو لوگ ان سے قریب ہیں ان پر یہ فرض عین کے طور پر لازم ہو جائے گا۔ جیسے کہ نماز اور روزہ جس کا چھوڑنا ان کے لیے جائز نہ ہوگا۔ اس طرح یہ چیز آگے پھر مزید آگے بڑھتی رہے گی یہاں تک کہ مشرق سے لے کر مغرب تک تمام اہل اسلام پر یہ درجہ بدرجہ فرض ہو جائے گی۔

آخر میں یہ بات بھی ہمارے ذہن سے فوت نہ ہونی چاہئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت کے سلسلے میں جو بشارتیں دی ہیں کہ اس کا ایک طبقہ قیامت تک کے لیے حق پر قائم رہے گا اور اس دین کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتا رہے گا[2] اسلام کے دور اول کی طرح آخری ادوار میں بھی جب یہ دین اسی طرح غربت و اجنبیت کا شکار ہو جائے گا تو کچھ لوگ دنیا سے اس کی اجنبیت کو ختم کرنے کا سامان کریں گے[3] وغیرہ تو آپ کی یہ تمام بشارتیں یعنی بحیثیت مجموعی پوری امت کے لیے اقلیت و اکثریت کی کسی تفریق کے بغیر ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ تجدید و دعوت دین کے کام میں اکثریت کی طرح اقلیتیں بھی برابر کی شریک ہیں اور یہ ذمہ داری دونوں پر یکساں حیثیت میں عائد ہوتی ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے بنیادی مآخذ مسلمان اقلیتوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور ان سے کس مطلوبہ کردار کے طالب ہیں۔ یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ موجودہ حالات کے خاص پس منظر میں اسلامی اخوت کے جذبہ سے پورا عالم اسلام خصوصاً عالم عرب مسلمان اقلیتوں کے لیے بے چین اور مضطرب ہے لیکن اسلام ان سے جس مطلوبہ کردار کا طالب ہے اس کا تقاضا ہے کہ اقلیتیں خود بھی اپنے فرائض کا احساس رکھیں اور امت کے دوسرے اجزاء بھی انھیں اس طرف برابر متوجہ کرتے رہیں۔

مجھے یہ کہتے ہوئے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ہندوستان میں اپنی حد تک مسلمان اقلیت اپنے احوال و ظروف کی رعایت سے اسلام کے اسی مطلوبہ کردار کی ادائیگی کے لیے سرگرم عمل ہے۔ زندہ ملت کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے کے ساتھ وہ عالم اسلام کے مسائل میں دلچسپی اور پوری دنیا کے نقشہ پر اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے کوشاں اور مصروف جد و جہد ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کی ان کوششوں کو قبولیت سے نوازے اور اس کے لیے حالات کو زیادہ سے زیادہ سازگار بنائے جس کے نتیجے میں وہ اپنی ذمہ داریوں کو بہتر سے بہتر طور پر ادا کر سکے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ النبی الامین (ختم شد)

---

[1] حوالہ مذکور: ۳/۲۴۳ [2] مسلم جلد ۱، کتاب الایمان، باب نزول عیسیٰ علیہ السلام، اصح المطابع، دہلی [3] حوالہ سابق کتاب الایمان باب ان الاسلام بدا غریبا۔۔

غیر مسلم اور قرآن سے استفادہ

قاضی اطہر مبارکپوری

اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں جو اہم مسائل در پیش ہیں، ان میں غیر مسلموں کے قرآن مجید چھونے، اس کو پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اِدھر پچھلی چند دہائیوں سے پوری دنیا خصوصاً یورپ اور افریقہ کے ممالک میں اسلام فہمی کے لیے براہ راست مطالعہ کا ذوق اور داعیہ بڑھ رہا ہے، اور اس کے اصل منبع و مأخذ یعنی کتاب و سنّت اور قدماء کی تصانیف سے اسلامی عقائد و اعمال کی جستجو عام ہو رہی ہے کیونکہ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ مستشرقین اور ان کے ہم ذوق اہل علم نے اسلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ خلاف واقعہ یا ناکافی ہے، اس صورت حال کے نتیجہ میں یورپ وغیرہ کی تمام درس گاہوں میں عربی زبان اور تحقیقات اسلامی کے مستقل شعبے کھل رہے ہیں، یہ بات بہت خوش آیند اور امید افزا ہے کہ خود غیر مسلموں میں اسلام فہمی کا ذوق، ان کو عربی زبان اور اسلامی علوم سے بہت قریب کر رہا ہے، ایسی حالت میں ہم مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ ان غیر مسلموں کی زیادہ سے زیادہ مدد کی جائے، اور اسلام فہمی کی راہ میں ان کے لیے آسانی پیدا کی جائے، خاص طور سے ان کے پاس قرآن پہنچانے اور اس کو صحیح طور سے سمجھنے کا زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کیا جائے۔

کئی سال ہوئے بمبئی میں ہمارے پاس جنوبی افریقہ (جوہانسبرگ) سے اس سلسلہ میں لمبا چوڑا استفتاء آیا تھا جس میں یہی سوال تھا کہ ہمارے یہاں کے یوروپین اور افریقین ہم سے قرآن مجید اور اس کا ترجمہ طلب کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے طور پر اسلام کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کریں۔ ان میں اسلام فہمی کا شوق حد سے زیادہ ہے، جب سے یہاں کے مسلمانوں میں دینی شعور پیدا ہوا ہے اور ان کی بستیوں میں اسلامی اور دینی فضا پیدا ہو رہی ہے غیر مسلموں میں یہ ذوق بڑھتا جا رہا ہے، ایسی صورت میں ہم ان غیر مسلموں کو پورا قرآن یا اس کے اجزاء مع ترجمہ کے دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اس کے جواب میں ہم نے اس وقت لکھا کہ قرآن کا ترجمہ دیا جا سکتا ہے، اور اسی وقت سے اس مسئلہ پر

مزید تحقیق و تلاش جاری رہی۔

حالات کی تیز رفتاری اور ضرورت کی شدت نے بڑی حد تک قرآن کریم کو غیر مسلموں کے ہاتھوں میں پہنچا دیا ہے اور وہ اپنے طور پر اس کو پڑھنے اور سمجھنے لگے ہیں، ان کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں عربی زبان کی تعلیم ہو رہی ہے اور دراسات اسلامیہ کا شعبہ قائم ہے، ایسی حالت میں ضرورت ہے کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے، اور کتاب و سنت اور سلف صالحین کے قول و فعل سے روشنی حاصل کی جائے،

قرآن مجید کے ادب و احترام پر ہر مکلّف مسلمان کا عقیدہ و عمل ہے، اور عام مسلک یہی ہے محدث اور جنبی مسلمان اور غیر مسلم قرآن مجید کو ہاتھ نہیں لگا سکتا ہے، البتہ مُحدِث یعنی بے وضو مسلمان اس کو پڑھ سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں سورۂ واقعہ کی یہ آیات قابل توجہ ہیں جن کے بارے میں علمار سلف کے مختلف اقوال ہیں،

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (آیات ۷۵-۸۰)

سو میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے چھپنے کی اور اگر تم غور کرو تو یہ بڑی قسم ہے کہ یہ ایک مکرم قرآن ہے جو محفوظ کتاب میں ہے اس کو بجز پاک فرشتوں کے کوئی ہاتھ نہیں لگانے پاتا ہے، یہ رب العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہے۔

جمہور صحابہؓ، تابعین اور سلف کا قول ہے کہ "لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ" اس قرآن کے بارے میں ہے جو عند اللہ اور آسمان میں ہے، اور مطہرون سے مراد ملائکہ ہیں، یعنی اس آسمانی کتاب الٰہی کو صرف فرشتے ہاتھ لگاتے ہیں سورۂ عبس کی ان آیات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝ (آیات ۱۲-۱۶)

سو جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے وہ ایسے صحیفوں میں ہے جو مکرم ہیں، رفیع القدر ہیں، مقدس ہیں، جو ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں کہ وہ مقرب نیک ہیں،

حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت انس بن مالک، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہم اور مجاہد، عکرمہ، ضحاک، سعید بن جبیر، ابو شعثار، جابر بن زید، ابو نہیک، ابو العالیہ، قتادہ، حماد، سلیمان، اسماعیل سدی، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم وغیرہ رحمہم اللہ کا یہی قول ہے

دوسرے علمار کا قول ہے کہ "لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ" میں مطہرون سے جنابت اور حدث سے پاک لوگ مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ قرآن کو جنبی اور مُحدِث ہاتھ نہ لگائے، ان کا کہنا ہے کہ مذکورہ آیت میں اگر چہ خبر دی گئی ہے مگر اس کا مطلب و معنی طلب ہے اور قرآن کریم سے مراد مصحف ہے جو لکھا اور پڑھا جاتا ہے، صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کے علاقہ

میں قرآن لے کر سفر کرنے سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ دشمن اس کو پا جائے گا۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے عامل حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو جو مکتوب روانہ فرمایا تھا اس میں درج تھا ان لایمس القرآن الا طاہر[۱] یعنی قرآن کو صرف طاہر و پاک شخص ہاتھ لگائے۔[۲]

اس سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے واقعہ سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، جس میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی بہن سے کہا کہ جو کتاب تم لوگ پڑھ رہے تھے مجھے دو، تو بہن نے کہا کہ "انک رجس وانہ لایمسہ الا المطھرون فقم فاغتسل او توضأ فتوضأ ثم اخذ الکتاب فقرأہ" یعنی تم ناپاک ہو اور اس کو پاک ہی لوگ ہاتھ لگاتے ہیں، یعنی تم اٹھو غسل یا وضو کرو، چنانچہ حضرت عمرؓ نے وضو کیا اور قرآن کو پڑھا، دوسری روایت میں غسل کرنے کی تصریح بھی ملتی ہے، چنانچہ قاضی ابن عربی مالکیؒ نے احکام القرآن میں فاغتسل واسلم لکھا ہے۔[۳]

حضرت سلیمان فارسیؓ نے ایک مرتبہ بغیر وضو کے قرآن پڑھا مگر اس کو ہاتھ نہیں لگایا، حضرت سعدؓ نے اپنے لڑکے کو قرآن چھونے کے لیے وضو کرنے کا حکم دیا، حضرت ابن عمرؓ سے بھی یہی مروی ہے، اور امام حسن بصریؒ، امام نخعیؒ بغیر وضو کے مس قرآن مکروہ سمجھتے ہیں۔[۴]

فراءؒ نے سب سے الگ اور ظاہری معنی سے ہٹ کر کہا ہے آیت "لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ" کا مطلب بیان کیا ہے لا یجد طعمہ ونفعہ الا من آمن بہ[۵]، قرآن کی چاشنی اور لذت اور اس کا نفع وہی شخص پائے گا جو اس پر ایمان لائے گا۔

قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی نے لکھا ہے کہ اس آیت کا یہ مطلب کہ قرآن کی لذت وہی لوگ پا سکتے ہیں جو گناہوں سے پاک اور تائب و عابد ہیں صحیح ہے، امام بخاری نے اس کو مختار بتایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اسلام کی لذت اس شخص نے پائی جو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، اور دین اسلام کی حقانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر راضی ہو اگر یہ توجیہ بغیر عقلی و سمعی دلیل کے ظاہر سے عدول ہے۔[۶]

قاضی ابوبکر احمد بن علی جصاص حنفیؒ متوفی ۳۷۰ھ مذکورہ آیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اگر آیت کو خبر پر محمول کیا جائے تو اولیٰ یہ ہے کہ اس میں وہ قرآن مراد ہو جو اللہ تعالیٰ کے یہاں ہے اور مطہرون سے مراد ملائکہ ہیں، اور اگر آیت کو نہی پر محمول کیا جائے اگرچہ یہ بصورت خبر ہے تو ہم سب کے بارے میں عام ہوگی، اور یہی اولیٰ ہے اس لیے کہ صریح روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن حزم کے پاس جو تحریر روانہ فرمائی

۱؎ تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۲۹۸ ۲؎ احکام القرآن ابن العربی ج ۲ ص ۲۳۶ ۳؎ احکام القرآن جصاص ج ۳ ص ۱۱۵ ۴؎ تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۲۹۸

۵؎ احکام القرآن ابن العربی ج ۲ ص ۲۳۶

تھی اس میں "ولا یمس القرآن الا طاہر" تھا اور یہ بھی اسی آیت کی وجہ سے ہوگی کیونکہ اس میں یہ حکم۔

یہ ساری بحثیں مسلمان محدث اور جنبی کے مسِ قرآن کے بارے میں ہیں جو مکلف ہیں اور جن پر شرعی احکام لاگو ہوتے ہیں، اسی کے ساتھ قرآن جہاں ھدی للمتقین ہے وہیں "ھدی للناس" بھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار و مشرکین تک قرآن کی آواز پہنچانے میں جو جد و جہد فرمائی ہے اور اس راہ میں جو مصائب برداشت کیے ہیں ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں، دربارِ رسالت میں جو وفود دین فہمی کے لیے آئے ہیں، ان کے لیے جو اہتمام آپؐ نے فرمایا ہے وہ بھی معلوم ہے، اُن کی دلداری، پذیرائی اس لیے تھی کہ وہ خود دین کی سمجھ حاصل کرنے کے لیے آتے تھے ان کو اپنی امان میں رکھکر قرآن سنانے کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ (توبہ، ۶)

اور اگر کوئی شخص مشرکوں میں سے آپ سے پناہ چاہے تو آپ اس کو پناہ دیں، تاکہ وہ کلام اللہ سن لے، پھر اس کو اس کی پناہ کی جگہ پہنچا دیں، یہ حکم اس لیے ہے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے؛

امام ابوبکر جصاصؒ لکھتے ہیں کہ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ کافر جب ہم سے دین کی حجت اور توحید و رسالت کے دلائل طلب کرے، تاکہ حجت اور دلیل کی روشنی میں توحید و رسالت کو تسلیم کرے، تو ہم پر اقامت حجت اور اللہ تعالیٰ کی توحید، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بیان کرنا ضروری ہے، اور ایسے حربی کافر کا قتل کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس کو امان دینے کا حکم دیا ہے تاکہ کلام اللہ کو سنے، اس کے بعد لکھتے ہیں:

وفیہ الدلالۃ ایضاً علی ان علینا تعلیم کل من التمس منا تعریفہ شیئاً من امور الدین لان الکافر الذی استجارنا لیسمع کلام اللہ انما قصد التماس معرفۃ صحۃ الدین[1]

نیز اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص ہم سے دین کی کوئی بات معلوم کرنا چاہے، ہم پر ایسے تمام لوگوں کو تعلیم دینا فرض ہے، کیونکہ جس کافر نے کلام اللہ سننے کے لیے ہم سے پناہ و امان چاہی ہے اس کا مقصد دین کی صحت کی معرفت ہے۔

موجودہ دور میں بہت سے غیر مسلموں کے بارے میں تقریباً یہی صورت حال ہے کہ وہ تحقیق کے لیے قرآن کو سمجھنا چاہتے ہیں، اور گویا ہم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کو قرآن کی تعلیمات اور توحید و رسالت کے بارے میں بنیادی باتیں بتائی جائیں اس لیے ان کی پذیرائی، دلداری اور تالیف قلب کے ساتھ اسلام کے اصل منبع و ماخذ تک ان کے لیے راہ پیدا کرنی چاہیے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے غیر مسلم کے مسِ قرآن کا مسئلہ سامنے آتا ہے، ظاہر ہے کہ عام حالات میں غیر مسلم کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے، جبکہ وہ اپنے طور پر قرآن چھوتے اور پڑھتے ہیں۔ چنانچہ امام ابوبکر جصاصؒ نے مشہور

---

[1] احکام القرآن ج ۳ ص ۱۱۵ [2] احکام القرآن ج ۳ ص ۱۰۳

تابعی امام ابو قتادہ بن دعامہ سدوسی بصریؒ متوفی ۱۱۷ھ کا یہ بیان نقل کیا ہے:

وقال قتادۃ، لا یمسہ عند اللہ الا المطہرون | جو قرآن عند اللہ ہے اس کو صرف پاک لوگ چھوتے ہیں
فاما فی الدنیا فانہ یمسہ المجوسی، | اور جو دنیا میں ہے اس کو مجوسی اور ناپاک اور منافق
والنجس والمنافق۔[1] | بھی چھوتا ہے۔

امام ابن کثیرؒ نے بھی حضرت قتادہ کا یہ قول معمولی اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے:

لا یمسہ عند اللہ الا المطہرون فاما | جو قرآن عند اللہ ہے اس کو صرف پاک لوگ چھوتے ہیں
فی الدنیا فانہ یمسہ المجوسی | اور جو دنیا میں ہے اس کو نجس مجوسی اور ناپاک منافق
النجس والمنافق الرجس۔ | بھی چھوتا ہے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول صورت حال کی خبر اور بیان واقعہ کے طور پر ہے، یعنی ان کے زمانہ میں بصرہ اور عراق کے دوسرے شہروں میں جو غیر مسلم اور مجوسی وغیرہ آباد تھے اور مسلمانوں سے ان کا اختلاط تھا، وہ اپنے طور پر بوقت ضرورت قرآن کو ہاتھ لگاتے اور پڑھتے تھے، جیسا کہ آج بھی یہ صورت ہے کہ غیر مسلم طابعین و ناشرین قرآن مجید کی طباعت کرتے ہیں، اور ایسے ادارے اپنے طور پر اس کا احترام بھی کرتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قبول اسلام سے پہلے مصحف کو ہاتھ لگانے کے لیے جو وضو یا غسل کیا تھا ظاہر ہے کہ وہ بحالت کفر تھا اور اس کا مقصد ظاہری صفائی اور ستھرا پن تھا، غالباً اسی ظاہری صفائی کے پیش نظر ائمہ احناف میں امام محمدؒ نے غسل کے بعد نصرانی کے مس قرآن کو جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ در مختار میں ہے:

ویمنع النصرانی من مسہ وجوزہ محمد | مس قرآن سے نصرانی کو روکا جائے گا اور امام محمد نے اس کو
اذا اغتسل۔[2] | جائز قرار دیا ہے جبکہ وہ غسل کرلے۔

نیز اسی زمانہ میں کوفہ کے بعض اجلہ تابعین اور ائمہ دین نے نصاریٰ سے اپنے لیے قرآن لکھوایا تھا، ظاہر ہے کہ ان حضرات نے نصاریٰ کی ظاہری صفائی پر اعتماد کرکے یہ کام ان سے لیا تھا، چنانچہ امام ابراہیم نخعیؒ اپنے استاد امام علقمہ بن قیس نخعی کوفیؒ متوفی ۶۲ھ کے متعلق بیان کرتے ہیں:

انہ کان اذا اراد ان یتخذ مصحفا | جب ان کو مصحف کی ضرورت پڑتی تو ایک نصرانی کو
امر نصرانیا فنسخہ۔[3] | حکم کرتے اور وہ ان کے لیے لکھ دیا کرتا تھا۔

اس روایت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علقمہؒ اس عیسائی کاتب سے بار بار مصحف لکھوایا کرتے تھے، اور اس پر ان کو پورا اطمینان تھا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۲۹۸ [2] در مختار مع الشامی ج ۱ ص ۱۸۳ [3] المحلی ابن حزم ج ۱ ص ۸۳

حضرت علقمہ بن قیس رحمۃ اللہ علیہ علماء ربانین میں سے تھے حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت سعدؓ، حضرت حذیفہؓ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور دیگر اجلۂ صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے، حضرت ابن مسعودؓ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور علم و عمل، سیرت و کردار میں ان کے مثنیٰ تھے۔ ان کے حلقۂ درس میں حضرات صحابہؓ شریک ہو کر دینی سوال کرتے اور فتویٰ پوچھتے تھے[1]۔

اسی طرح حضرت عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کوفی متوفی ۸۲ھ نے مقام حیرہ کے ایک نصرانی سے اجرت پر قرآن کی کتابت کرائی تھی، مصنف عبدالرزاق، باب بیع المصاحف میں ہے،

ان عبد الرحمن بن ابی لیلی کتب لہ نصرانی من اھل الحیرۃ مصحفا بسبعین درھما[2]

عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کے لیے حیرہ کے ایک نصرانی نے ایک مصحف ستر درہم میں لکھا تھا۔

حضرت عبدالرحمن بن ابی لیلیٰؒ کوفہ کے کبار تابعین اور ثقات اسلام میں سے ہیں ایک سو بیس صحابہ کی صحبت و معیت سے فیض یاب ہیں، ان کے حلقۂ درس میں بھی حضرات صحابہؓ تشریف لاتے تھے، جن میں حضرت براء بن عازبؓ بھی ہوا کرتے تھے، یہ حضرات نہایت خاموشی اور ادب کے ساتھ ان سے احادیث سنتے تھے، وہ مشہور امام محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کے والد ہیں[3]۔

ان حضرات کے اس عمل پر معاصر ائمہ دین کی طرف سے کسی قسم کی نکیر کا پتہ نہیں چلتا، حالانکہ اس دور میں ہر جگہ علماء فقہا اور محدثین کا جم غفیر موجود تھا اور مختلف فیہ مسائل میں اختلاف رائے ہوتا تھا، ظاہر ہے کہ نصرانی کاتب سے قرآن لکھوانے میں اس کی ظاہری پاکی و صفائی کا لحاظ رہتا ہوگا، جیسا کہ حضرت عمرؓ کے ایک واقعہ میں یہی بات تھی، اور ایسی صورت میں وہ نصرانی کاتب قرآن کو چھوتے اور پڑھتے تھے۔

اس کے باوجود عہد سلف میں بلا کسی شرط و قید ہر محدث و جنبی اور غیر مسلم کے قرآن مجید کو ہاتھ لگانے اور پڑھنے کے جواز میں کوئی صریح قول نہیں ملتا، البتہ حضرت قتادہؒ کا قول "فاما فی الدنیا فانہ یمسہ المجوسی والنجس والمنافق" بتاتا ہے کہ عہد صحابہ و تابعین میں قرآن کو غیر مسلم بھی ہاتھ لگاتے تھے، بعد میں پانچویں صدی کے مشہور ظاہری امام و عالم ابن حزم اندلسیؒ متوفی ۴۵۶ھ بلا کسی قید و شرط کے علی الاطلاق اس کے جواز کے قائل ہیں اور محدث، جنبی اور کافر و مشرک سب کے لیے قرآن چھونے اور پڑھنے کو جائز قرار دیتے ہیں اور عدم جواز کے تمام دلائل کا رد کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

جنبی کے لیے مس قرآن کو ناجائز قرار دینے والوں نے جن آثار سے استدلال کیا ہے ان میں سے کوئی صحیح نہیں ہے،

[1] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۲۷۶ [2] مصنف عبدالرزاق ج ۸ ص ۱۱۴ [3] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۶۰

کیونکہ وہ یا مرسل ہے، یا غیر مستند صحیفہ ہے، یا اس کا راوی مجہول ہے، یا ضعیف ہے[۱]

اور انہوں نے اس قول کے استدلال میں مکتوب نبوی بنام ہرقل کو پیش کیا ہے، جس میں قرآنی آیات ہیں اور نصاریٰ نے ان کو ہاتھ لگایا اور پڑھا ہے، یہ مکتوب مبارک صحیح بخاری کتاب بدء الوحی میں یوں درج ہے۔

"بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم، من محمد عبد اللہ ورسولہ الیٰ ہرقل عظیم الروم، سلام علیٰ مَن اتبع الھدیٰ، اما بعد فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام اَسلِم تَسلَمْ یوتِکَ اللہ اجرک مرتین، فان تولیت فان علیک اِثم الاریسیین یٰٓاَھلَ الکِتَابِ تَعَالَوْا اِلیٰ کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا، وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللہِ، فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ؕ"

اس مکتوب نبویؐ کو نقل کر کے ابن حزمؒ نے لکھا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنہوں نے نصاریٰ کے پاس یہ مکتوب روانہ فرمایا جس میں یہ آیت ہے، حالانکہ آپ کو یقین تھا کہ وہ اس مکتوب کو ہاتھ لگائیں گے[۲]

اس مکتوب کے پیش نظر بعض علماء جُنبی کے لیے ایک دو آیات پڑھنے اور دشمن کے ملک میں قرآن کے بعض اجزاء بھیجنے اور اس کے ساتھ سفر کرنے کے قائل ہیں[۳]

غیر مسلم کو قرآن کی تعلیم دینے کے بارے میں علماء سلف کے مختلف اقوال ہیں، اور بعض مالکی علماء نے غیر مسلم پر دین کی حجت قائم کرنے کے لیے قرآن کی مختصر تعلیم جائز قرار دی ہے اور ضرورت سے زیادہ تعلیم سے منع کیا ہے، انھوں نے مکتوب نبویؐ بنام ہرقل سے استدلال کیا ہے، آخر میں لکھا ہے کہ

وقد نقل النووی الاتفاق علیٰ جواز الکتابۃ الیھم بمثل ہذا[۴]

امام نوویؒ نے نصاریٰ وغیرہ کے پاس اس قسم کے خط لکھنے پر علماء کا اتفاق نقل کیا ہے۔

حنفیہ کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ وہ غیر مسلم کے لیے قرآن کی تعلیم مطلقاً جائز سمجھتے ہیں، درمختار میں ہے:

ویمنع النصرانی من مسہ، وجوزہ محمد اذا اغتسل، ولا باس بتعلیمہ القرآن والفقہ عسیٰ ان یھتدی[۵]

نصرانی کو مس قرآن سے روکا جائے گا، اور امام محمدؒ اس کو جائز قرار دیتے ہیں جبکہ وہ غسل کرلے، اور اس کو قرآن اور فقہ کی تعلیم دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ اس سے ہدایت پا جائے۔

علمائے ہند میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے غیر مسلم کو صرف ترجمۂ قرآن دینا جائز قرار دیا ہے، وہ لکھتے

۱؎ المحلی ج ۱ ص ۸۱ ۲؎ فتح الباری جلد ۱ ص ۳۹ ۳؎ المحلی ج ۱ ص ۸۳ ۴؎ فتح الباری ج ۶ ص ۱۳۳
۵؎ درالمختار ج ۱ ص ۱۸۳

ہیں کہ قرآن مجید کا ترجمہ مسلمانوں کے حق میں قرآن مجید کا حکم رکھتا ہے، اور غیر مسلموں کو تبلیغ کے لیے دینا جائز ہے۔

الحاصل غیر مسلم کے ہاتھ میں قرآن کریم دینے اور اس کو قرآن کریم کی تعلیم دینے کے بارے میں (۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام لانے سے پہلے غسل یا وضو کے بعد قرآن کا چھونا اور پڑھنا، (۲) مکتوب نبوی بنام ہرقل (۳) حضرت قتادہؒ کا بیان، (۴) حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ اور حضرت علقمہ بن قیسؒ کا نصرانی سے قرآن لکھوانا، (۵) امام محمد بن حسن شیبانیؒ کا قول (۶) احناف کے نزدیک غیر مسلم کی ہدایت کی امید پر اس کو قرآن کی تعلیم دینے کا جواز (۷) امام ابن حزم ظاہری اندلسیؒ کے نزدیک علی الاطلاق سب کے لیے مس قرآن کا جواز، ان سب تصریحات کی روشنی میں ایسے غیر مسلموں کو قرآن چھونے اور پڑھنے پر سنجیدگی سے غور کیا جا سکتا ہے جو واقعی ہدایت کے طالب ہیں۔ اور اس کا اپنے طور پر احترام کرتے ہیں۔ ایک بات خاص طور سے قابل غور ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ اور علقمہ بن قیس نے نصرانی سے قرآن لکھوایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد سربراہان ملک کے پاس دعوتی مکاتیب روانہ فرمائے مگر نصرانی سربراہ ہرقل کے مکتوب میں قرآنی آیات تحریر فرمائیں، امام محمد نے نصرانی کو غسل کے بعد قرآن چھونے کی اجازت دی ہے۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے اہل مذاہب کے مقابلہ میں عیسائی اسلام اور مسلمانوں سے زیادہ قریب تھے اور قرآن کا کسی حد تک احترام تھے، اس لیے اہل علم کو ان پر اعتماد تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ قتادہؒ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ، علقمہ بن قیسؒ اور امام محمدؒ علمائے عراق میں سے ہیں جن کے یہاں نومسلموں اور غیر مسلموں کے اختلاط و اجتماع کی وجہ سے نئے نئے مسائل پیدا ہوتے تھے، اور ائمہ دین ان کو کتاب و سنت کی روشنی میں اپنی فقہی بصیرت سے حل کرتے تھے، اس دور میں عراق کے مرکزی شہر کوفہ، بصرہ وغیرہ عجمی و عربی رجال و افکار کا گہوارہ تھے، اور ان میں مذہبی بحث و مناظرہ کی مجلسیں برپا ہوا کرتی تھیں، اسی وجہ سے علماء عراق جدید مسائل کے بارے میں سند اور اسوہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں توسع پایا جاتا ہے۔

(بشکریہ ماہنامہ برہان دہلی، ستمبر ۱۹۸۷ء)

ضروری اعلان

تبادلہ کے اخبارات، رسائل اور مجلات جو مدیر زندگی نو کے نام رام پور کے پتہ پر بھیجے جاتے تھے اب اس پتہ پر ارسال کیے جائیں۔ تبصرہ کے لیے کتابیں بھی اسی پتہ پر بھیجی جائیں۔

مدیر زندگی نو، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ہندوستانی مسلمانوں کا تعلیمی مستقبل

ماضی و حال کی کامرانیوں اور ناکامیوں کی روشنی میں

ڈاکٹر سید عبدالباری *

تاریخ انسانی کے اس حیرت ناک المیہ یعنی ہندوستان ہی نہیں پورے عالم اسلام میں بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے علمی زوال اور حیرت ناک تعلیمی پس ماندگی پر نگاہ ڈالیے تو اگر حساس انسان ہیں تو آپ کی آنکھوں کے پیمانے لبریز اور دل کا ساغر چکنا چور ہو جائے گا اور آپ کو اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی تامل نہ ہوگا کہ کوئی بھی انسانی گروہ جب اپنی اصل و اساس سے کٹ کر الگ ہو جاتا ہے تو تباہی و ذلت کے قعر مذلت میں گرنے سے اسے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ اس موقع پر میرے ذہن کے افق پر اسلام کی تاریخ کے ابتدائی ادوار کے وہ تابناک چہرے اور حرکت و انقلاب سے بھرپور پیکر ابھرتے ہیں جنھوں نے اپنی روشن ضمیری اور عالی دماغی سے انسانی تاریخ و تہذیب کے قافلوں کی امامت کی تھی۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ وہ ملت جس نے مملکت اسپین کے مراکز علم، قرطبہ، طلیطلہ و سالرنو میں مغرب کو سائنس کا پہلا سبق دیا تھا اور جس کے علمی ذوق اور تجسس کا یہ عالم تھا کہ اس نے ۷۵۰ء سے ۱۲۵۰ء تک ۵ سو سال کی مدت میں رازی، عطار، غزالی، مسعودی، ابوالوفا، البیرونی، بوعلی سینا، ابن ہیثم، ابن رشد، طوسی اور ابن نفیس جیسے بے شمار مفکر، فلسفی، سائنس داں اور مورخ پیدا کیے اور بقول پروفیسر عبدالسلام مغرب نے اپنی درس گاہوں میں علم کی شمعیں ان قندیلوں سے جلائیں جو عالم اسلام میں روشن تھیں، اس ملت کو زوال و انحطاط کے یہ دن بھی دیکھنے پڑے کہ اس نے علوم دینی و علوم دنیاوی کو دو حصوں میں بانٹ دیا اور کچھ دنوں تک دنیا کے سارے تغیرات سے آنکھیں بند کیے ہوئے انھیں لکیروں کو پیٹتے رہے جو ان کے بزرگ علم و دانش کے میدانوں میں چھوڑ گئے تھے۔ سائنس اور علوم دنیا سے بھی ان کا رشتہ کمزور ہوتا گیا اور دین بھی فقہی موشگافیوں اور منطقی بحثوں میں الجھ کر اپنی انقلابی صلاحیت کھو بیٹھا اور زندگی کے تنگ و تاریک دائروں میں محدود ہو کر رہ گیا۔ رسول اللہ کا یہ قول ذہنوں سے محو ہو گیا کہ ــــ الحکمۃ ضالۃ المومن یعنی علم و حکمت مومن کی متاع گم گشتہ ہے۔ اور الکندی کی یہ روایت بھی کافور ہو گئی کہ علم جہاں بھی ملے حاصل کیا جانا چاہیے۔ گذشتہ کئی صدیوں کے علمی زوال اور ذہنی انتشار کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ خدا نے مغرب کو قیادت و امامت کے منصب پر فائز کر دیا۔

---

* صدر شعبۂ اردو، جی۔ ایس۔ ایل کالج، اودھ یونیورسٹی، سلطان پور

اس لیے کہ انھوں نے فطرت کی قوتوں پر قابو حاصل کر کے ان سے بنی نوع انسان کی تمدنی زندگی کو دلکش بنانے کی کوشش کی اور مشرق اپنے بوسیدہ جبّہ و دستار کی پیوند کاری میں معروف رہا ہم محوِ حیرت ہیں کہ وہ ملت جس کا نقطۂ آغاز ہی تعلیم و تعلم رہا ہے اور جسے اپنے دماغ کے دریچوں کو کھول کر فطرت کی کتاب کا مطالعہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے وہ تاریخ کے ایک دور میں اس مقام عبرت تک پہنچ گئی کہ شاہ ولی اللہ کے خانوادہ نے جب پہلی بار قرآن حکیم کا فارسی اور اردو زبان میں ترجمہ کیا تو لوگوں نے حیرت و استعجاب اور اندیشہ کی نگاہوں سے دیکھا اور غوغائے تکفیر بھی بلند کرنے سے باز نہ آئے۔

یہ مسئلہ جس پر میں اظہار خیال کی جرأت کر رہا ہوں پوری ملت اسلامیہ کا ایک سنگین و جانگداز مسئلہ ہے۔ یہ وہ گتھی ہے جس کو برصغیر ہی نہیں پورے عالم اسلام میں اہل نظر گذشتہ ڈیڑھ سو سالوں سے برابر سلجھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں مگر ہنوز ملت کے اس درد کا مداوا ٹھیک طرح نہ ہو سکا۔ آج سے ستر سال قبل الہلال کے صفحات پر مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ سطریں پھر میری آنکھوں کے سامنے نمایاں ہو رہی ہیں:۔

"اصلاح و تجدید کا وہ سرِّ مخفی جس کی تلاش میں تمام مصلحین گذشتہ سرگرداں رہے مگر بہت کم افکار عالیہ تھے جن کی اس تک رسائی ہوئی۔ احیائے ملّت کا وہ مقصد عالی جس کو اگر سمجھنے والوں نے سمجھا پر اس کے انجام دینے کی مہلت کسی نے نہ پائی، تحریک دینی کا وہ مشروع عظیم جس کو بایں ہمہ سطوت و وسعت سلطان عبدالحمید نزکا اور خدیو مصر نے سید جمال الدین افغانی سے اس کا وعدہ کیا مگر ہمت ہار دی۔ اصلاح اسلامی کا وہ مطلوب عزیز جس سے دارالخلافت اسلامی کے جوامع خالی ہے اور جس کا جمال اصلاح دس برس کی سعی و جستجو کے بعد بھی جامعۂ ازہر کے ستونوں کو نصیب نہ ہو سکا۔ وہ یوسف گم گشتہ جس کی آرزو تیونس کے جامعۂ زیتونی میں کی گئی مگر پوری نہ ہوئی جس کو مراکش کے جامعۂ ابن خلدون میں پکارا گیا مگر جواب نہ ملا۔ یعنی وہ کہ نامور محمد عبدہ ساری عمر اس کے عشق میں رویا ـــــ وابیضت عیناہ من الحزن فهو کظیم ـــــ مگر اسے پا نہ سکا، قاضی القضاۃ ترکستان نے چالیس برس اس کی حسرت میں کاٹے کہ وا اسفیٰ علی یوسف مگر محروم رہا۔"

لیکن بیسویں صدی کا یہ ربع آخر ملت اسلامیہ کی تاریخ میں ایک مبارک مرحلہ ہے کہ پھر زوال و ادبار کے اصل سبب کی طرف نگاہیں اٹھ رہی ہیں اور پھر اُس کعبۂ مقصود کو پا لینے کی آرزو ہر سینے کے اندر کروٹیں لے رہی ہے۔ اس موقع پر نامناسب نہ ہوگا اگر میں تاریخ اسلامی کے اس روشن باب کا جو رسول اللہ کی حیات مبارکہ سے شروع ہوتا ہے ایک ورق پلٹتا چلوں اور چند سطروں میں قرن اول میں مسلمانوں کی علم دوستی اور اسلام میں علم کی فضیلت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال دوں۔

اسلام کا خمیر ہی تعلیم و تربیت سے اٹھا ہے اور یہ اس کے مزاج کا بنیادی عنصر ہے، رسول اکرمؐ پر پہلی بار جب

وحی نازل ہوئی تو اس کا پہلا لفظ صیغہ امر میں "اقرأ" تھا جس کے معنی ہیں پڑھو اور اس ابتدائی سورہ کی پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ "پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا" اسلام دراصل خالق کائنات کی اطاعت اور پوری انسانی زندگی کو اس کے ضوابط کے سانچے میں ڈھالنے کا نام ہے۔ یہ ضوابط اور یہ اصول ہمیں پیغمبر کے ذریعہ ملتے ہیں اور پیغمبروں سے ملی ہوئی ان ہدایات کی جو انسانی زندگی کی تہذیب وترتیب سے متعلق ہیں ترسیل وتبلیغ اسلام کے ماننے والوں کے فرائض حیات میں داخل ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی خیر کی تلقین اور شر وفساد کی بنیادوں کے انہدام کی جدوجہد ایک مسلمان کا وظیفۂ حیات قرار دیا گیا ہے ظاہر ہے کہ اس وظیفہ کی خاطر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرے کہ وہ حق و باطل کو میز کر سکے۔ معرفت حق کی اس بلندی تک رسائی علم کے زینے کو طے کرنے پر منحصر ہے چنانچہ قرآن مجید میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

"إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (فاطر ۲۸) بے شک خدا سے اس کے ذی علم بندے ہی ڈرتے ہیں۔

ایک مومن ومسلم کے بارے میں یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ علم کی حرارت اور قرطاس وقلم کی توانائی سے محروم ہوگا۔

تعلیم وتعلم کے اہتمام اور اس کی فضیلت پر روشنی ڈالنے والے جو واقعات ہمیں پیغمبر اسلام کے عہد کی تاریخ میں ملتے ہیں وہ خود اس حقیقت کو واشگاف کرتے ہیں کہ اسلام میں حصول علم کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ قرآن حکیم کے نزول کا سلسلہ ۲۳ سال تک جاری رہا اور انسان کے فہم وادراک کے افق کو حیرت انگیز وسعت عطا کرنے والی اس کتاب ہدایت کی تفہیم وتذکیر اور اس کی تحریر واستحضار کے سلسلے میں حضورؐ کے اصحاب نے غیر معمولی اہتمام کیا اور جناب محمد حمید اللہ کے الفاظ میں اصحاب صفہ کی شکل میں جن کی تعداد ۷۰ کے قریب تھی تاریخ انسانی کی پہلی اقامتی یونیورسٹی مسجد نبوی میں وجود میں آئی ؎ اور ان کی تعلیم وتدریس کے لیے باقاعدہ کاتبوں اور اہل علم کی خدمات حاصل کی گئیں۔ پھر بدر کے قیدیوں میں سے جو تعلیم یافتہ تھے ان کو مسلمان بچوں کی تعلیم وتعلم پر مامور کیا گیا اور اس خدمت کے معاوضہ میں ان کو رہائی دینے کا معاہدہ کیا گیا۔ رسول اکرم کے متعدد اقوال تعلیم وتدریس کی اہمیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ آپؐ نے صحابہ کو عبرانی وسریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا اس لیے کہ یہودیوں عیسائیوں اور دوسری غیر مسلم قوموں سے مراسلت اور معاہدوں کے سلسلے میں عربی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کو جاننے کی ضرورت تھی۔ بچوں کو بار بار رسول اکرمؐ نے یہ ہدایت کی کہ وہ اپنے پڑوسیوں سے تعلیم حاصل کریں اور محلہ کی مسجدوں کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ مورخ طبری کے بقول رسول اکرمؐ نے حضرت معاذ ابن جبلؓ کو انسپکٹر آف اسکولز بنا کر یمن بھیجا۔ انھوں نے مختلف اضلاع کا دورہ کیا اور تعلیم وتدریس کے لیے اسکولوں کا بندوبست کیا۔

اسی طرح خواتین کی تعلیم اور بچیوں کی تدریس کے لیے بھی آپؐ نے خصوصی ہدایات دیں۔ ام المومنین حضرت حفصہؓ نے حضورؐ کی اجازت سے لکھنے پڑھنے میں مہارت حاصل کی۔ خواتین کی تعلیم کے لیے ہفتہ میں ایک دن خود حضورؐ نے

معین فرمایا۔ مورخین کے مطابق ۴۳ ایسے اصحاب رسول کے نام آتے ہیں جو آپؐ کے سکریٹریٹ سے متعلق تھے اور آپ کی طرف سے خط و کتابت کرتے تھے اور قرآن حکیم کو لکھنے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسا مذہب، جس کے ماننے والوں کو قرآن حکیم کی ساڑھے سات سو آیتوں میں یعنی قرآن مجید کے آٹھویں حصہ میں یہ ہدایت دی گئی ہو کہ وہ غور کریں اور اپنی عقل کا بہتر استعمال کریں اور جس میں ۲۵۰ آیتیں قوانین سے متعلق ہوں بھلا جہل کو کس طرح برداشت کرسکتا ہے اور لکیر کا فقیر بننے، عقل کے دروازے بند کردینے اور دنیا کے علوم و فنون سے آنکھیں بند کرلینے کی کس طرح اجازت دے سکتا ہے۔ مگر یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ پوری دنیائے اسلام میں ایسی بھی صدیاں گذریں جن میں تحقیق و جستجو کا ذوق مردہ ہوگیا۔ علوم دین اور دنیا کے درمیان سد سکندری حائل ہوگیا اور علامہ رشید رضا مصری کے الفاظ میں علوم آلیہ سے مسلمانوں کا تعلق بڑھ گیا اور منطق و فلسفہ کی دقیق موشگافیوں سے اتنی دلچسپی ہوگئی کہ تمام دوسرے علوم ان میں گم ہوگئے۔ یہاں تک کہ معانی و بلاغت صرف و نحو وغیرہ جیسے خالص ادبی و لسانی علوم کی بحثوں میں بھی بغیر منطق کی ژولیدہ اصطلاحوں اور پیچیدہ اسلوب ادا کے وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھتے تھے۔ بقول مولانا سلیمان ندوی "متاخرین کے حواشی پر حواشی لکھنا اور شرح کی شرح لکھنا مدرسین و علما کا دلچسپ مشغلہ بن گیا" بالفاظ دیگر علوم میں اُپج ایجاد اور اجتہاد فکر و نظر مفقود ہوگئی۔ فلسفہ و معقولات نے قرآن حکیم میں غور و فکر کی جگہ لے لی اور اس وسیع و عریض کائنات پر غور کرنے والے اور علم کو دنیا کی امامت کا وسیلہ بنانے والے مفقود ہوگئے اسپین میں مسلمانوں نے سائنس اور علوم طبعی سے اپنے گہرے تعلق کی بنا پر یورپ کی ذہنی امامت کی تھی اور قرآن و سائنس سے جب ملت بے تعلق ہوگئی تو اس کی ذہنی اور روحانی موت واقع ہوگئی۔ جس زمانے میں ہندوستان ایران اور مشرق وسطی میں مسلمانوں کی بڑی بڑی حکومتیں تھیں ہمارے بادشاہوں کو اس بات کی کوئی فکر نہ تھی کہ یورپ بندوق سازی اور جہاز رانی کے ذریعہ کس طرح ایک طاقتور حریف بن کر سامنے آنے والا ہے۔ عالم اسلام کو اپنی اس غفلت کی سزا کس طرح بھگتنی پڑی اسے چھوڑیئے آپ ہندوستان کی تاریخ پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ۱۸۵۷ء کے پہلے زوال و انتشار کی جو طوفانی لہر آئی اس کا اصل سبب یہی تھا کہ ہمارا علم دین مفلوج اور علم دنیا محدود ہوگیا تھا عوامی سطح پر تعلیم و تدریس کا شوق کس طرح پیدا ہوتا جب کہ مذہب کی سیدھی سادی تعلیمات توہم پرستی کے غبار میں چھپ کر رہ گئی تھیں اور معاشرہ کے سربرآوردہ طبقہ، نوابوں جاگیرداروں اور رئیسوں کو تفریحی مشاغل سے فرصت نہ ملتی تھی، علم و ہنر کی معنویت و افادیت کیونکر ان کی سمجھ میں آتی۔

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے المناک واقعات کے بعد لوگوں کی آنکھیں کھلنے لگیں۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان ہی نہیں عالم اسلام میں بھی مسلمانوں کے انحطاط پر مجموعی حیثیت سے غور کیا گیا اور اس انحطاط کا بنیادی سبب علمی پس ماندگی کو قرار دیا گیا۔ شیخ محمد عبدہٗ مصری اور جمال الدین افغانی نے خصوصی طور پر اپنے عربی رسالہ العروۃ الوثقیٰ[۱] میں مسلمانوں کے تعلیمی انحطاط کا جائزہ لیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اب عروج اور دفع تنزل کا کوئی ذریعہ بجز اس کے نہیں

کہ مسلمانوں کو دین کی صحیح اور مکمل تعلیم دی جائے۔ شیخ عبدالرحمن الکواکبی اور شیخ صعداللہ بن قاضی القضاۃ بلاد ترکیہ نے بھی اس موضوع پر کتابیں لکھیں اور علوم دینیہ کے تنزل وانحطاط اور طریقہ درس وتعلیم کے نقائص سے بحث کی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ موجودہ طریقہ تعلیم کی موجودگی میں کسی طرح امید نہیں کی جا سکتی کہ مسلمانوں کے اندر کوئی صحیح دینی تحریک نشوونما پا سکے لیکن اب بھی عالم عرب میں سائنس اور علوم طبعیہ کی تعلیم کی طرف سنجیدگی سے غور وفکر شروع نہیں ہو سکا ہے حتی کہ شیخ عبدہ جیسے روشن خیال انسان نے بھی جب نئے نظام تعلیم کا خاکہ مرتب کیا تو اس خاکے میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ ان کے مرتب کردہ ابتدائی تعلیم کے نصاب میں ایک جامع اور سہل الفہم نصاب عقائد وفقہ وتاریخ اسلام وسیرت رسولؐ اور سیرت وصحابہ پر مشتمل تھا جو یکسر قرآن کی تعلیمات کے مطابق تھا۔ ایک دوسرا نصاب جو مرشدین ومعلمین ودامیان ورہبران کی صفات پیدا کرنے کے لیے مرتب کیا گیا اس میں فن تفسیر وحدیث، فن اخلاق وآداب دینی اور اصول فقہ وتاریخ قدیم، فن منطق وخطابت واصول مناظرہ اور فن کلام وعقائد ملل شامل تھا۔ شیخ عبدہ کے نصاب میں خاصی جامعیت تھی اور یہ اسلام کو روایتی انداز سے سمجھنے کے بجائے اس کے اصل الاصول تک رسائی کا اہل بنانے والا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ اس میں بھی علوم دنیا کے لیے گنجائش نہ تھی۔

ہندوستان میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں تعلیم وتدریس کے دو نمایاں مکاتب فکر ابھر کر آئے ایک مکتبہ فکر قدیم خیالات کے حامل بزرگوں کا تھا جنھوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔ ان حضرات نے مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں "متاعِ دین کی حفاظت اور سلف کے عقاید وخیالات کی مدافعت کا کام سرانجام دیا۔ ان لوگوں نے دوسرا کام یہ کیا کہ جدید علوم سے لوگوں کو دور رہنے کا مشورہ دیا اور انگریزی زبان اور یورپ کے علوم وفنون کو شجر ممنوعہ قرار دیا دوسری طرف سرسید احمد خاں نے علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد رکھی اور مغرب کا خود اس کے ہتھیاروں سے مقابلہ کرنے کے لیے انگریزی زبان سیکھنے اور یورپ کے جملہ علوم وفنون سے فیض یاب ہونے کی تحریک چلائی۔ سرسید کا دل اس روشن تمنا سے معمور تھا کہ "فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الہ الا اللہ کا تاج سر پر ہوگا"۔ یہ نصب العین نہایت مبارک تھا اور یقیناً اگر اس پر صحیح معنوں میں عمل کیا جاتا تو صدیوں کے ذہنی وفکری تعطل وانحطاط کی کچھ تلافی ہوتی، دینی ودنیوی تعلیم کی تفریق ختم ہوتی اور فکر وتحقیق کے ایسے چشمے ابلتے جس سے خود مغرب سیراب ہونے پر خود کو مجبور پاتا لیکن عملاً علی گڑھ تحریک ہندوستان میں انگریز حکومت کی طفیلی ہو کر رہ گئی۔ حیرت ہے کہ سرسید نے اس ادارہ کی زمام کار ایک انگریز کو سونپ دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فلسفہ اور نیچرل سائنس تو کسی حد تک باقی رہا لیکن لا الہ کا تاج سر سے اتار کر جھولی میں ڈال لیا گیا اور اس ادارہ کا نصب العین ڈاکٹر ذاکر حسین کے الفاظ میں یہ قرار پایا کہ

"اس ملک میں اعلیٰ ومتوسط طبقہ کے افراد کی جتنی تعداد اپنا پیٹ پال لے سرکاری نوکریاں پا کر آرام چین اور بلا تھوڑی سی حکومت کے ساتھ زندگی کے دن کاٹنے کے قابل ہو جائے اچھا ہے"

بالفاظ دیگر ایک ایسا نظام تعلیم وجود میں آیا جس کا مقصود یہ تھا کہ نوجوان لکھنا پڑھنا سیکھ کر سرکاری ملازمت کے قابل ہو جائیں، اپنا پیٹ پالیں اور معاشرت میں مغربی نمونوں کی بھلی بری نقل اتار سکیں۔ مذہب کے سرے سے منکر نہ ہوں مگر اس کی حیات بخش اور زندگی پرور قوت سے محروم رہیں تو حرج نہیں" اس کیفیت کو اکبر نے اس طرح بیان کیا تھا:

بی اے کیا، نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے۔

ظاہر ہے کہ مذہب کی برائے نام اور رسمی انداز کی تعلیم، عافیت پسندی کی سیاست اور غیر ملکی اقتدار کی ملازمت اگر منزل مقصود بن جائے تو نوجوانوں میں بلند ہمتی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے اور وہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم ہی کے الفاظ میں "شہد اعلیٰ انسانیت کے منصب کا اہل خود کو کس طرح بنا سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ ادارہ اور اسی انداز پر قائم ہونے والے مسلمانوں کے دیگر جدید تعلیمی ادارے" معاشرت میں اندھی تقلید، مذہب میں کھوکھلی رسمیت، سیاست میں محکومیت پسندی پیدا کرنے، علم میں ذوق تحقیق اور فنون میں ذوق تخلیق سے نوجوانوں کو بے بہرہ رکھنے اور کم زور جسم بے نور دماغ اور بے سوز دل پیدا کرنے کے نہایت کامیاب کارخانے ثابت ہوئے۔ دوسرے الفاظ میں اس تعلیمی نظام میں روٹی کمانے کے کام کو آدمی بنانے پر فوقیت دی گئی علی گڑھ اس مقصد میں ضرور کامیاب ہوا کہ اس نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے الفاظ میں مسلمانوں کو اپنی دنیا درست کرنے کے قابل بنا دیا اور ان کے اندر تعلیم جدید سے بہرہ مند ہو کر اپنی معاشی و سیاسی حیثیت کو تباہی سے بچانے کی اہلیت پیدا کر دی علی گڑھ کے تعلیمی نظام کی یہ خامی تھی کہ وہ ایک مرکب علمی قوت بن کر ایک کلچر کی خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا اور طلبا کے ذہن کو متضاد و مخالف سمتوں میں کھینچتا تھا۔ اس میں تھیالوجی کے عنوان سے اسلامیات پر جو کتابیں رکھی گئیں ان میں اسلام کے اصولوں کو عصری مسائل پر منطبق کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اس لیے وہ جدید اذہان کو اپیل کرنے سے معذور تھیں چنانچہ "مسلم یونیورسٹی کی دینی و دنیاوی تعلیم بحیثیت مجموعی بالکل ایسی ہے کہ آپ ایک شخص کو از سرتاپا غیر مسلم بناتے ہیں پھر اس کی بغل میں دینیات کی کتابوں کا ایک بستہ دیدیتے ہیں تاکہ آپ پر اس کے غیر مسلم بنانے کا الزام عاید نہ ہو"۔[۱۵]

حیرت ہے کہ جدید علوم میں اس طرح کی دینی تعلیم کی پیوند کاری کی حمایت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بھی اپنی تصنیف "نظام تعلیم و تربیت" میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں نے بزرگوں کے اسی طرز عمل کو پیش کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ دینیات کی عمومی تعلیم کے لیے انگریزوں سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی نظام میں جب تین یا زیادہ سے زیادہ چار کتابوں کا پڑھ لینا کافی خیال کیا گیا تھا اور زیادہ وقت غیر دینی علوم کے اس حصے کو جس کے اکثر نظریات و مسائل مسترد ہو چکے ہیں کم از کم دنیا میں ان کی مانگ باقی نہیں رہی ہے نکال کر عصر جدید کے مقبول علوم اور عصر حاضر کی دفتری زبان انگریزی کے نصاب کو قبول کر کے مذہب کی تعلیم کو انھیں تین کتابوں کے

مطابق باقی رکھتے ہوئے دینی و دنیاوی تعلیم کے مدارس کی تفریق کو ختم کر دیا جائے"۔ اس وقت عام طور پر لوگوں کے سوچنے کا یہی انداز تھا کہ جدید سماجی سیاسی اقتصادی علوم میں کسی نہ کسی طرح اسلامی تعلیمات کی پیوندکاری کر دی جائے لیکن یہ بات ان حضرات کے ذہن سے محو ہو جاتی تھی کہ متضاد اشیاء کا مرکب تیار کرنے کے نتائج کیا برآمد ہو سکتے ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں دیوبند اور علی گڑھ سے غیر مطمئن اذہان نے تعلیم و تدریس کی ایک نئی شاہراہ بنانے کی کوشش کی اور ندوہ وجود میں آیا۔ اس کی تشکیل کا محرک علامہ سلیمان ندوی کے الفاظ میں یہ تھا کہ قدیم و جدید اہل دین اور ارباب دنیا کی غلط اور غیر اسلامی تقسیم اور ان کی باہمی آویزش کو ختم کرنے کی سعی کی جائے اور علوم دینیہ اور جدیدہ کو مدارس دینیہ کے نظام تعلیم میں داخل کیا جائے" لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ ندوہ بھی دین و دنیا کی تفریق ختم نہ کر سکا اور وسعت نظر رکھنے والے افراد یہاں زیادہ دن ٹھہر نہیں سکے۔ سید محمود کے الفاظ میں جو انھوں نے ندوہ کی تاسیس کے موقع پر کہے تھے کہ "ہمارے دو کام ہیں دین اور دنیا، دنیا کا کام ہم نے اپنے ذمے لے لیا ہے اور دین کا کام ندوہ کر رہا ہے"۔ ندوہ بھی حقیقتاً دین کے روایتی دائرہ میں محدود ہو کر رہ گیا۔ یہ سچ ہے کہ اس کو نہایت متحرک و ہوش مند شخصیتوں کا تعاون شروع میں حاصل ہوا اس کی بنیادوں کو مستحکم بنانے میں ایک طرف شبلی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں جو علی گڑھ سے سرسید کے آخری دور میں بیزار ہو گئے تھے اس لیے کہ وہاں ان کو خیالات کی وسعت، سچی آزادی اور بلند ہمتی کا فقدان نظر آتا تھا۔ اسے وہ فقط کوٹ پتلون کی نمائش گاہ تصور کرنے لگے تھے۔ شبلی کے علاوہ ابوالکلام نے بھی ندوہ کو اپنی توقعات کا محور بناتے ہوئے الہلال میں اظہار خیال فرمایا تھا کہ:

"اس کا مقصد یہ ہے کہ اس سے جو علماء فارغ التحصیل ہو کر نکلیں وہ اپنے علوم میں ماہر ہونے کے علاوہ دوسری زبانوں سے بھی کسی قدر آشنا ہوں تاکہ ایک طرف وہ اشاعت اسلام جیسے مقدس و مہتم بالشان فرض کو ادا کر سکیں دوسری وہ ان غیر مذہب والوں کے حملے سے بھی واقف ہوتے رہیں اور ان کے جوابات دیتے رہیں جو اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اسلام کو دنیا والوں کی نگاہ میں نہایت کمزور و ضعیف ثابت کریں"۔

ندوہ نے عربی زبان و ادب کی تعلیم کے لیے نیا نصاب مرتب کیا اور درس نظامی کی بھول بھلیوں سے قوم کو نجات دلائی۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے روشن خیال علماء کی ایک جماعت بھی پیدا کی مگر زمانہ جس رفتار سے گرہی و فساد کی طرف ترقی کر رہا تھا اس کا یہ حضرات مقابلہ نہ کر سکے۔ موجودہ یونیورسٹیوں میں پڑھائے جانے والے عمرانی علوم کو اس ادارہ میں جگہ نہیں دی گئی اور ان علوم کا قرآن و حدیث کی روشنی میں مطالعہ کرنے کی کوشش نہیں شروع کی گئی اور نہ یہ جاننے کی فکر لاحق ہوئی کہ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں جو نظام معاشرت، نظام معیشت، نظام سیاست اور تدبیر مملکت وجود میں آتا ہے اس کے خط و خال کیا ہیں۔ مزید براں نہ سائنس کی طرف توجہ دی گئی نہ آثار فطرت کے مشاہدہ اور قوانین فطرت کی دریافت کا کام کیا گیا نہ قرآن کی روشنی میں یورپ کے نظریات اور نام نہاد سائنٹفک خیالات

کے تنقیدی جائزہ کی ضرورت محسوس کی گئی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے الفاظ میں "اگر اس دور میں نصاب میں اصلاح بھی کی گئی تو اس حد تک کہ کچھ کتابوں کو نصاب سے خارج کر کے کچھ دوسری کتابوں کو داخل کر دیا جائے اور قدیم علوم کے ساتھ تاریخ جغرافیہ معاشیات و سیاسیات وغیرہ علوم کی کچھ کتابیں طلبہ کو پڑھائی جانے لگیں، عناصر تعلیمی کے تناسب میں ترمیم کر کے بعض اجزا رگھٹائے اور بعض بڑھائے جائیں یا میٹرک تک انگریزی تعلیم شامل کر دی جائے" مولانا کے نزدیک لوگوں نے اس پہلو سے غور نہیں کیا کہ اس طرح وہ دنیا کی امامت و قیادت کی اہلیت رکھنے والے انسان ہرگز نہ پیدا کر سکیں گے۔ مولانا نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ امامت کا دامن ہمیشہ علم سے وابستہ رہا ہے اور انسان کو بحیثیت ایک نوع کے زمین کی خلافت ملی ہے علم کی وجہ سے۔ ایشیا اور مشرق کی دیگر اقوام کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ وہ صرف اپنے کانوں سے کام لے رہے ہیں، آنکھوں اور دماغوں کو معطل کر رکھا ہے۔ مولانا مودودیؒ اہل ندوہ کو مخاطب کرتے ہوئے رقم طراز ہیں " آپ کے ہاں مدت ہائے دراز سے علم کی جو حالت تھی اس میں بصر و فواد دونوں معطل تھے اور سمع کا کام بھی صرف پہلے کی حاصل شدہ معلومات فراہم کرنے تک محدود تھا۔ بخلاف اس کے ناخداشناس یورپ علم کے میدان میں آگے بڑھا اور اس نے سمع سے آپ سے بڑھ کر کام لیا اور بصر و فواد کا کام پچھلی ڈھائی تین صدیوں میں تمام تر اس نے انجام دیا اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ وہ امام بن گیا اور آپ مقتدی بن کر رہ گئے۔ آپ کی دینی تعلیم کے تمام مراکز ابھی تک اپنی اسی غلطی پر اڑے ہوئے ہیں جس نے آپ کو اس درجہ پر پہنچایا ہے۔ آپ کے یہاں علم محض علوم اوائل کے پڑھانے تک محدود ہے ندوہ او رازہر نے اصلاح کی طرف قدم بڑھایا مگر اس کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ سمع کا دائرہ حال کی معلومات تک بڑھا دیا جائے۔ بصر و فواد پھر بھی معطل کے معطل رہے۔ . . . اس طرح آپ گھٹیا قسم کے نہ سہی بڑھیا قسم کے مقتدی بن جائیں گے مگر امامت بہر حال آپ کو نہیں مل سکتی۔"

ندوہ کے بعد مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح کے رُخ پر ایک اور قدم اٹھایا گیا اور جامعہ ملیہ ۱۹۲۰ء میں وجود پذیر ہوا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن نے اس کی تاسیس کے وقت ارشاد فرمایا تھا:

"اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔"

بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرہ میں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو گئی تھی کہ تعلیم کسی نہ کسی کلچر کی خادم ہوتی ہے۔ ایسی مجرد تعلیم جو ہر رنگ اور ہر صورت سے خالی ہو آج تک دنیا کی کسی درس گاہ میں نہ دی گئی اور نہ آج دی جا رہی ہے اور یہ کہ دین و دنیا کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مسیحیت میں یہ بات ممکن ہو تو ہو لیکن اسلام میں ممکن نہیں۔ اسلامی تمدن کی ابتری کا اصل سبب یہ ہے کہ ایک مدت سے دنیوی علم و عمل سے علم دین کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے اور مولانا سعیدؒ

کے الفاظ میں "ضرورت ہے کہ مغربی علوم و فنون کے صالح اجزا کو جذب کر کے اسے اپنی تہذیب کا جزو بنا لیا جائے اور فلسفہ سائنس معاشیات، قانون اور دیگر علوم و فنون میں ایسے ماہرین پیدا ہوں جو زندگی کے مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے حل کریں اور اسلامی افکار و نظریات اور قوانین حیات کو روح عصر کے لحاظ سے از سر نو مرتب کریں"

یہ خیال اس لیے بھی پیدا ہوتا ہے کہ ملت اسلامیہ اپنی انفرادیت اور تشخص کو برقرار رکھ سکے اور اپنے فکری و نظریاتی وجود کو گم نہ کر دے جیسا کہ ڈاکٹر ذاکر حسینؒ صاحب نے ۱۹۳۵ء میں کاشی ودیا پیٹھ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ارشاد فرمایا تھا۔

"مسلمان ہندوستانی قوم کا جز ہونے میں فخر محسوس کرتے ہیں مگر وہ ایسا جز ہونا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔۔ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حالت میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں۔"

اس عہد میں یہ شعور پھر تازہ ہوا کہ تعلیم محض کتابوں کی دنیا میں غرق ہونے یا چلتے پھرتے کتب خانے بن جانے کا نام نہیں۔ اس کا اصل مقصد اچھے اور سچے انسان پیدا کرنا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان کے سامنے کوئی نہ کوئی تمدنی نصب العین ہو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جوبلی اجلاس میں ۱۹۳۷ء میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ

"تعلیم نام ہی اس کا ہے کہ متعلم کے کل قوائے جسمانی و ذہنی کی ترتیب کر کے اس میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور اسے تمدنی زندگی کے کل شعبوں کا محرم بنا کر اس میں اپنی استعداد کے مطابق حصہ لینے کے لیے تیار کیا جائے لہٰذا تعلیمی نظام کی تشکیل اسی وقت ممکن ہے کہ جب جماعت کے سامنے کوئی تمدنی نصب العین ہو۔"

یہ تمدنی مطمح نظر کیا ہو اور تمدنی زندگی کی کثرت میں کس طرح وحدت کو تلاش کرے، حقائق کو پرکھ سکے، سچائیوں کو پہچان سکے، یہی وہ مسئلہ تھا جس میں جامعہ بھی زیادہ دور تک ملت اسلامیہ کا ساتھ نہ دے سکا۔ نصب العین کے تعین کی ضرورت تو محسوس کی گئی مگر اس کا تعین نہ کیا جا سکا۔ حالانکہ اس کے روشن خیال بانیوں کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ "دنیا ہے اس حقیقی عدل و مساوات کا پیغام سننے اور اس کا عملی تجربہ دیکھنے کے لیے بے تاب ہے جو ایک امی نبیؐ نے دنیا کو سنایا اور دکھایا تھا ۔۔۔"

اس احساس کے ساتھ ساتھ لوگ یہ بھی ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ قوم کے نونہالوں میں مذہب کی تخلیقی و تعمیری قوت کا احساس پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ وہ کل کائنات اور زندگی میں اپنی حیثیت کا حقیقی تعین کر سکیں اور ملت نے انسانی و عالمی فرائض کا علم حاصل کر سکیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسینؒ نے نئی تعلیم کا جو خاکہ ثانوی درجہ کے طلبہ کے لیے پیش کیا اس کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"ہماری ثانوی تعلیم کا نیا نظام طلبا کے افق افکار کو متعین کرنے اور وسعت دینے اور انھیں اپنے نصب العین سے آگاہ کرنے، انھیں ماضی کا رمز شناس بنانے اور ان میں مستقبل کا امانت دار ہونے کا احساس پیدا کرنے کے لیے تمام مدارس میں اپنے دین اپنی تاریخ اور اپنی زبان کی تعلیم کا خاص اہتمام رکھے گا۔"

ذاکر صاحب نے مسلمانوں کے ایک تابناک تعلیمی مستقبل کا خواب زندگی بھر دیکھا۔ اس کے لیے عمر بھر جدوجہد بھی کی اور اعلیٰ درجہ کے ایثار و قربانی کا بھی مظاہرہ کیا۔ وہ ایک پیدائشی معلم و مربی تھے۔ انھوں نے ایک مثالی استاد کے خدوخال کو اپنی جادو اثر زبان میں اس طرح نمایاں کیا ہے ــــ "استادوں کے پاس قوم کے دل کی کنجیاں ہوتی ہیں۔ ان کی شخصیت کے جادو سے اجاڑ دلوں سے حیات تازہ کے چشمے ابلتے ہیں اور متحیر و متلاشی نوجوانوں کی شب تاریک جستجو بے شمار راہنما تاروں سے جگمگا اٹھتی ہے۔"

اس امر میں ڈاکٹر ذاکر سے زیادہ بلندیٔ فکر سے قوم کو خطاب کرنے والے دوسرے مفکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے آزادی سے قبل مسلمانوں کی تعلیم کے میدان میں متعدد تجربوں اور ان کی ناکامیوں کا جائزہ لیتے ہوئے اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لیے ایک ایسی تعلیم کا خاکہ پیش کیا تھا جو اس عہد کے سائنٹفک تقاضوں کو بھی پورا کر سکے اور بین الاقوامی افق پر ملت اسلامیہ کو دفاعی کے بجائے اقدامی پوزیشن عطا کر سکے۔ ذاکر صاحب کی طرح مولانا مودودیؒ نے بھی اس طرح کے تعلیمی نظام میں معلم کے بنیادی رول پر زور دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ[۱۴]

"معلم اگر اسلامی روح سے خالی ہوگا تو طلبا میں اسلامی اسپرٹ کیسے پیدا ہو سکتی ہے طلبا کی سیرت و کردار کے اصل معمار اساتذہ ہیں اس لیے ضروری ہے کہ صاحب کردار اور ذی علم اساتذہ کا مسلم اداروں میں تقرر کیا جائے اور انھیں اپنی اس ذمہ داری کا احساس دلایا جائے کہ وہ خواہ کسی فن کے ماہر ہوں اور خواہ کوئی مضمون پڑھا رہے ہوں اپنے سامنے اسی نصب العین کو رکھیں کہ انھیں اپنے اداروں سے ایسے افراد کو تیار کرنا ہے جو دنیا کے معاملات میں بھی سرخرو ہوں اور آخرت کی زندگی میں بھی کامیاب ہوں اور عزت و برتری کی شاہراہ پر ہمیشہ قدم بڑھاتے رہیں۔"

جامعہ ملیہ کے بانیوں نے بہت سے سنہرے خواب دیکھے تھے بالکل اسی طرح جس طرح علی گڑھ اور ندوہ میں سنہرے خوابوں نے لوگوں کے افق تصور کو منور کر دیا تھا۔ لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ وہ تمام علوم جو ملک کے ان تمام اداروں میں پڑھائے جا رہے تھے اور جن کی غرض و غایت فقط یہ تھی کہ کسی طرح لوگوں کو سرکاری ملازمت کے لائق بنا دیا جائے یہاں بھی جیوں کے تیوں داخل ہو گئے اور ظاہر ہے کہ تاریخ، جغرافیہ، طبیعات، حیاتیات، حیوانیات، ارضیات، ریاضی، ہیئت، معاشیات، سیاسیات و قانون اگر اس طرح پڑھائے جائیں کہ کہیں خدا کا نام بھی نہ آئے، نہ آفاق و انفس کے آثار پر اس طرح نظر ڈالی جائے کہ یہ آیات الٰہی ہیں، نہ قوانین طبعی کا اس طرح ذکر آئے کہ یہ ایک حکیم کے بنائے ہوئے قوانین ہیں نہ واقعات کی توجیہ اس طرح کی جائے کہ اس میں ایک قادر و توانا کا ارادہ کام کر رہا ہے

علمی علوم میں اس مقصد کا کہیں نشان پایا جائے کہ ان سے خدا کی رضا کے مطابق کام لینا ہے تو پھر نوجوان کے ذہن میں خود بخود یہ سوال پیدا ہوگا کہ دینیات اور خدا سے متعلق چیزوں کو آخر نصاب میں شامل کیوں کیا گیا۔"

ضرورت تھی کہ ہمارے اہل علم از سرنو حقائق کو مرتب کرتے اور ان سے نتائج اخذ کرتے ایسے نتائج اسلامی تعلیمات کی معنویت اور موجودہ دور میں ان کی افادیت سے نوجوان ذہنوں کے افق کو روشن کرسکتے حصول علم کے ساتھ دنیا کی امامت کے لیے مطلوب صلاحیت اور معاشرہ کا ایک حساس ذمہ دار اور مہذب رکن بننے کے لیے مطلوبہ صفات اپنے اندر پیدا کرتے۔ ان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی اور مغرب کی ذہنی غلامی سے نجات حاصل کرتے۔ —— (جاری ہے)

فرمان اورنگ زیبؒ برائے تحفظ مندر

یہ فرمان شہنشاہ اورنگ زیب کی طرف سے ابوالحسن حاکم بنارس کو سلطان محمد بہادر کی معرفت بھیجا گیا تھا۔ اس فرمان کا مضمون حسب ذیل تھا:

"ہماری پاک شریعت اور سچے مذہب کی رو سے یہ ناجائز ہے کہ غیر مذہب کے قدیمی مندروں کو گرایا جائے ہماری اطلاع میں یہ بات لائی گئی ہے کہ بعض حاکم بنارس اور اس کے گرد و نواح کے ہندوؤں پر ظلم و ستم کرتے ہیں اور ان کے مذہبی معاملات میں دخل دیتے ہیں اور ان برہمنوں کو جن کا تعلق پرانے مندروں سے ہے ان کو ان کے حقوق سے محروم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ حکم دیا جاتا ہے کہ آئندہ سے کوئی شخص ہندوؤں اور برہمنوں کو کسی وجہ سے بھی تنگ نہ کرے، نہ ان پر کسی قسم کا ظلم کرے۔ ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۰۶۵ھ"۔ (خاتمہ پر دستخط اور مہر شہنشاہ اورنگ زیبؒ ثبت ہے)

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

ارشادات، مضامین اور تقریریں، ص ۱۶۶۔۱۶۷

ناشر مکتبہ دینیہ، دیوبند، یوپی

حکمت تبلیغ اور طریق کار

حکیم محمد اسلم صدیقی *

حق کے داعی کے لیے یہ ضروری ہے کہ مخاطب کی فہم کا لحاظ رکھتے ہوئے اس انداز میں اس سے بات کرے کہ اس میں دردمندی و دل سوزی و ہمدردی اور خوش خلقی کے ساتھ شفقت اور خلوص کا پہلو بھی نمایاں ہو۔ اور مخاطب کو اس کا یقین ہو جائے کہ یہ سب کچھ اسی کی فلاح و بہبود اور نفع رسانی کے لیے ہے۔ اور داعی کی اس میں خود کی کوئی غرض اور مفاد پوشیدہ نہیں ہے۔

یہ اصول زندگی کے ہر مرحلہ میں پیش نظر رہنا چاہیے، خصوصاً راہ حق کے داعی کے لیے تو اس اصول پر کاربند ہونا ازبس ضروری ہے۔

لیکن اکثر دیکھا گیا ہے ایک اچھی اور مفید بات بھی مخاطب سے اس طور پر کی جاتی ہے کہ سننے والے پر اچھا اثر ہونے کے بجائے خراب تاثر پیدا ہوتا ہے۔

یہ تصور کہ مخاطب چونکہ کم سمجھ اور گمراہ ہے اور اخلاق رذیلہ میں مبتلا ہے اس وجہ سے اس کی ذات کو بُرا سمجھا جاتا ہے۔ اور اپنی ذات کو اس سے بلند و بہتر اور اخلاق حمیدہ سے متصف گمان کیا جاتا ہے۔ بس یہی تصور اور فکر، نفس معاملہ کو بگاڑ دیتا ہے۔ لیکن کسی داعیٔ حق کا رویہ اور انداز فکر ایسا نہیں ہوتا۔

داعیٔ حق کی تو پوری کوشش اور فکر یہ ہوتی ہے کہ اس کی گفتگو اور طرز عمل ایسا ہو کہ سننے والے میں قریب ہونے کے بجائے دوری وضد اور ہٹ دھرمی کا جذبہ نہ پیدا ہونے پائے۔

طریق اور حکمت تبلیغ کے متعلق، خالق کائنات نے جو انسانی طبائع اور خصوصیات کا سب سے زیادہ جاننے والا ہے، اس نے ایسی واضح ہدایات ارشاد فرمائی ہیں جو ہر طرح مکمل اور مفید ہیں۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (النحل ۱۲۵)

تو اپنے رب کی راہ پر پکی باتیں سمجھا کر اور نصیحت سنا کر بھلی طرح اور الزام دے ان کو جس طرح بہتر ہو۔

* سابق منیجر دواخانہ طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ کو اس آیت میں تعلیم دی جا رہی ہے کہ لوگوں کو راہ ہدایت پر لانے کے کیا طریقے اختیار کرنا چاہئے۔ اس کے لیے تین نہایت اہم اور مؤثر طریقے ارشاد فرمائے گئے ہیں۔

۱۔ حکمت ۲۔ موعظتِ حسنہ اور ۳۔ جدال بالتی ہی احسن

چنانچہ حکمت کی صورت یہ ہے کہ راہِ ہدایت کی دعوت نہایت محکم، مضبوط اور عام فہم انداز میں حکیمانہ دلائل کے ساتھ پیش کی جائیں، جن کو سن کر سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص یا لوگ سرِ تسلیم خم کر دیں۔

۲۔ موعظتِ حسنہ۔ مخاطب سے مؤثر، پُر درد اور رقت انگیز انداز میں نصیحت کی جائے تاکہ وہ سمجھے کہ یہ دردمندی اور اخلاص میرے ہی نفع کے لیے ہے۔ یہ نرم خوئی، دل سوزی اور تڑپ، ہمدردی و شفقت اور حسنِ اخلاق، اکثر سنگدلوں کو بھی موم کر دیتے ہیں اور اس سے مطلوب و مدعا حاصل ہو جاتا ہے۔

۳۔ جدَال بالّتِی ھِیَ اَحْسَن۔ یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ سارے انسانوں کے طبائع اور مزاج یکساں نہیں ہوتے۔ بعض فہیم و دانا و متحمل مزاج و بردبار اور نیک ہوتے ہیں اور حق بات سننے اور سمجھنے کے لیے آمادہ اور تیار ہوتے ہیں۔ اور بعض، کج فہم و ضدی اور بات بات میں الجھنے اور کٹ حجتی کرنے والے ہوتے ہیں۔

پہلے طبقے کے لوگوں کے لیے حکمت اور موعظتِ حسنہ کی راہ اختیار کی جاتی ہے اور دوسرے طبقے کے لوگوں سے جب سابقہ پڑے تو ان کے لیے حکمت و موعظتِ حسنہ کا طریق کار ناکام ثابت ہوتا ہے اس لیے ان کے واسطے جدال بالتی ھی احسن کا طریقہ اختیار کرنے کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اس طبقے سے بہترین طور پر تہذیب و شائستگی کے دائرے میں رہتے ہوئے حق شناسی اور انصاف کے ساتھ کھلے دلائل اور ثبوت سامنے رکھے جائیں اور ان کی غلط اور ناروا طرزِ زندگی کے گوشوں کو اجاگر کر کے ان کو قائل کیا جائے۔ لیکن یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہے کہ گفتگو اور بحث کا طرز دل آزار و جگر خراش نہ ہو اور نہ ہی خشونت و ضد اور بداخلاقی برتی جائے۔ کیونکہ اس طریقہ سے معاملہ طول پکڑ لیتا ہے اور فائدہ بھی کچھ نہیں ہوتا اور آیندہ کے لیے داعی حق کے لیے گفتگو کی راہ مسدود ہو جاتی ہے۔ اسی لیے داعیٔ حق ہمیشہ ایسے طرزِ عمل سے گریز کرتا ہے۔

مخاطب تک صحیح بات اور راہِ حق کو واضح اور واشگاف طور پر پہنچا دینا، داعیٔ حق کے لیے بس کرتا ہے۔ قبول و رد کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ اس پر عائد نہیں کرتا۔

ابوطالب، جو رسول کریم صلی اللہ وسلم کے انتہائی محسن و شفیق اور محبوب چچا تھے اُن کے متعلق آنحضورؐ کی آخری وقت تک یہ کوشش اور خواہش رہی کہ وہ ایمان لائیں۔ ابوطالب کی وفات کے آخری لمحات میں آپؐ نے ان سے فرمایا: "چچا! بس ایک ہی فقرہ کہہ دیجئے کہ قیامت کے دن میں آپ کے حق میں گواہی دے سکوں، میرے مہربان چچا! صرف لا الٰہ الا اللہ کہہ دیجئے۔" لیکن ابوطالب ایمان نہیں لائے اور آنحضورؐ کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور

ابوطالب نے آبائی دین پر جان دی۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شدید غم اور رنج ہوا۔ دل کو سخت چوٹ لگی۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (قصص رکوع ۶) "تم جس کو چاہو، ہدایت نہیں کرسکتے۔ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔"

رب ودود و کریم اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جانگسل غم واندوہ کے متعلق کیسی تسلی اور تشفی آمیز کلمات ارشاد فرماتا ہے:

"سو کہیں، تو گھونٹ ڈالے گا اپنی جان کو ان کے پیچھے، اگر وہ نہ مانیں گے اس بات کو (یعنی اللہ کی بات) پچھتا پچھتا کر"۔ (کہف رکوع ۱)

حکمتِ تبلیغ کے متعلق اللہ تعالیٰ کی ایک اور ہدایت، طریق کار کی وضاحت کے لیے پیش کی جاتی ہے۔ یہ ہدایت اور حکمتِ تبلیغ فرعون جیسے باغی و سرکش اور مدعیٔ ربوبیت سے گفتگو میں نرمی اور لینت اختیار کرنے کے لیے فرمائی گئی ہے۔ ارشاد ہوا:

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰى ۝ (طٰہٰ رکوع ۲) "سو کہو اس سے بات نرم، شاید وہ سوچے یا ڈرے۔"

ایسے باغی و سرکش سے بھی حق کی بات کہنے میں نرمی اور لینت کی رعایت کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے۔ تاکہ وہ "سوچے" کیونکہ سوچنے کا موقعہ تو اسی وقت ملتا ہے جب بات کرنے والا نرمی، دلسوزی و ہمدردی اور خلوص سے پیش آئے۔ اور "ڈرے"۔ جب سوچنے کی توفیق حاصل ہوگی تو گفتگو کا صحیح مقصد واضح ہوگا جس کے نتیجے میں گمراہ اپنے انجام سے خوفزدہ ہوگا۔

داعیٔ حق کے پیشِ نظر، اصل مقصد ہوتا ہے اور اس کے لیے وہ اللہ کی بخشی ہوئی ہدایت اور بہترین صلاحیت استعمال کرتا ہے۔ فطرتاً وہ اپنی جدوجہد اور سعیٔ پیہم کی کامیابی اور خوش انجامی کا خواہاں ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسا اور یقین واثق رکھتا ہے کہ اس کی سعی رائیگاں نہ جائیگی اور انجام کار کو اللہ پر چھوڑتا ہے۔

ان ہدایات ربانی اور حکمتِ تبلیغ حق کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعٰلمین کا رویہ اور طرزِ عمل بھی ملاحظہ کیجیے۔

۹ھ میں طائف کے قبیلہ ثقیف کا ایک وفد مدینہ میں حاضر ہوا اور رسول اللہ صلعم کے سامنے اسلام قبول کرنے کی عجیب و غریب شرائط پیش کیں جو یہ تھیں،

"(۱) عشر نہیں دیں گے (۲) نماز نہیں پڑھیں گے (۳) جہاد میں شریک نہ ہوں گے (۴) اُن پر علاوہ اُن کے

آدمیوں کے، کسی اور کو حاکم نہ بنایا جائے اور (۵) ان کی سرزمین کو فوجی گذرگاہ (یا چھاؤنی) نہ بنایا جائے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ تمام شرائط نہایت تحمل اور سکون کے ساتھ سنیں اور ارشاد فرمایا۔ تمہاری سب شرطیں منظور ہیں مگر اس دین میں کوئی بھلائی نہیں جس میں رکوع نہ ہو۔ "لَاخَيْرَ فِيْ دِيْنٍ لَا رُكُوْعَ فِيْهِ" یعنی نماز نہ پڑھنے کی شرط کے علاوہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی سب شرطیں منظور فرمالیں۔ اور نماز کی شرط قبول نہ کرنے کے متعلق آنحضورؐ نے جو جواب ارشاد فرمایا وہ کس درجہ دل سوزی اور ہمدردی کے جذبہ سے بھرپور تھا۔ جو اثر سے خالی نہ رہا۔ اور اس وفد نے نماز کی شرط منظور کرلی۔

آنحضورؐ کے اصحاب کو ان شرائط کے ساتھ کسی کا ایمان قبول کرنا عجیب معلوم ہوا۔ لیکن آنحضورؐ کی نظر دور رس اور مستقبل کو دیکھ رہی تھیں، آپؐ نے صحابہ کو یہ کہہ کر مطمئن فرمایا۔ "جب یہ لوگ اسلام میں داخل ہو جائیں گے تو اس کے بعد صدقہ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔" (ابوداؤد عن وہب)

ان شرائط کے منظور کرنے کے سلسلہ میں آنحضورؐ کی حکمت اور مصلحت یہی تھی کہ نماز تو روزانہ پنج وقتہ فرض عبادت ہے، اس لیے نماز نہ پڑھنے کی شرط تو کسی طرح بھی منظور نہیں کی جا سکتی لیکن عشر جو سال میں ایک بار ادا کرنا ضروری ہے وہ بھی ہر شخص کے لیے نہیں۔ جو صاحبِ نصاب ہو ان کو ادا کرنا ہوتا ہے اور جہاد بھی جو فرض کفایہ ہے ہر شخص پر واجب نہیں۔ واجب بھی ہو تو اس کے خاص مواقع ہیں اور ہر روز اس کی نوبت نہیں آتی۔ اس لیے ان دو باتوں پر ان کو مجبور نہیں فرمایا گیا۔ اور جو دوا در شرائط تھیں ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

وفد کے ایمان لانے کے بعد دیکھا گیا کہ نہ صرف نماز بلکہ تمام ارکانِ اسلام کو وہ لوگ دوسرے مسلمانوں کی طرح پوری رضا و رغبت کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔

اسی طرح جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا قاضی بنا کر روانہ فرمایا تو روانگی کے وقت ہدایت فرمائی جس کا مفہوم تھا "پہلے ان لوگوں سے نماز کے لیے کہنا جب نماز پڑھنے لگیں تو زکوٰۃ کے لیے کہنا اور زکوٰۃ میں چن چن کر اچھا مال نہ لے لینا" یہاں بھی رسول اللہؐ نے طریق کار کی حکمت بتلائی ہے۔

شراب اور سود کی حرمت کے احکام بھی بدفعات آہستہ آہستہ نازل ہوئے۔ ابتداءً اس سے کلیتًا تعرض نہیں کیا گیا اور نہ ممنوع فرمایا تاکہ دیرینہ عادات کے ترک کرنے کے لیے طبیعت آمادہ و تیار ہو جائے۔

چنانچہ حضرت عائشہؓ سے مروی حدیث ہے کہ: "قرآن میں پہلے مفصل سورتیں اتریں جن میں جنت اور جہنم کا ذکر ہے یہاں تک کہ جب لوگوں کے دل اسلام کے لیے ہموار ہو گئے تو حرام و حلال کی آیتیں نازل ہوئیں۔ اگر پہلے ہی یہ حکم نازل ہوتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے کہ ہم شراب نہ چھوڑیں گے اور اگر پہلے ہی حکم اترتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم زنا کبھی نہ چھوڑیں گے۔" (بخاری باب تالیف القرآن)

رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہوا اور اسی سال مکہ اسلامی اقتدار کے تحت آگیا تھا۔ اس سال جو حج ہوا وہ پہلا حج تھا لیکن وہ بدستور جاہلی رواج قدیم کے مطابق ہوا۔ اس کے بعد ۹ھ میں جو دوسرا حج ہوا تو وہ اس طرح ہوا کہ مسلمانوں نے اور مشرکین نے اپنے اپنے طریقے کے مطابق انجام دیا۔ پھر جب ۱۰ھ میں تیسرا حج ہوا جو حجۃ الوداع کے نام سے اسلامی تاریخ میں مشہور ہے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلی بار اس حج میں بنفس نفیس شریک ہوئے اور یہ پورے اسلامی طریقہ پر انجام پایا۔ آنحضورؐ پہلے اور دوسرے حج میں شریک نہیں ہوئے کیونکہ ان میں شرک اور جاہلی طور طریقے شامل تھے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب موسم حج آیا تو ارشاد فرمایا: "مجھے پسند نہیں کہ میں حج کروں اور مشرکین بیت اللہ میں آئیں گے اور برہنہ ہو کر حج کریں گے۔ جب تک یہ ختم نہ ہو میں حج نہیں کروں گا۔" حالانکہ حج فرض ہو چکا تھا۔

دوسرے حج کے موقع پر آنحضورؐ نے ابوبکر صدیقؓ کو حاجیوں کے قافلہ کی قیادت سپرد فرما کر روانہ کیا۔ اسی دوران میں یہ آیت نازل ہوئی۔

إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا (توبہ رکوع ۴) — "مشرک جو ہیں، سو پلید ہیں سو نزدیک نہ آنے پائیں مسجد الحرام کے اس برس کے بعد"

تو آنحضورؐ نے حضرت علیؓ کو مکہ روانہ کیا اور حکم دیا کہ حج کے اجتماع میں یہ اعلان کریں کہ "اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لیے نہ آئے اور نہ اب کوئی شخص برہنہ حالت میں کعبہ کا طواف کرے۔"

ان تمام تفصیلات سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے برحق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک دعوت و تبلیغ اور دیگر معاملات میں حکیمانہ طریق کار کی کیسی نازک اور لطف رعایتیں پیش نظر رہتی تھیں جنھیں ہر داعی حق کو مشعل راہ بنانا نہایت ضروری ہے۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ

اختیاری سول کوڈ

محمد مسعود عالم قاسمی

اپریل ۱۹۸۵ء کو شاہ بانو مقدمہ میں ملک کی عدالت عالیہ نے نہ صرف مسلم پرسنل لا کے خلاف ایک غیر دانش مندانہ فیصلہ صادر کیا بلکہ حکومت کو یہ مشورہ دینا بھی ضروری سمجھا کہ وہ جلد از جلد یکساں سول کوڈ نافذ کرے اور اس معاملہ میں عوام کی آمادگی کا انتظار نہ کرے، مسلمانوں سے یہ امید کرنا کہ وہ اپنے پرسنل لا میں خود سے ترمیم و اضافہ کریں گے غلط ہے۔

مسلمانوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں اس فیصلہ کے خلاف احتجاج کیا۔ اور اس کو بدلنے کے لیے کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کیا، مسلمانوں کی صدائے احتجاج سے ایوان پارلیامنٹ بھی گونج اٹھا، اور بالآخر پارلیامنٹ نے مسلم مطلقہ بل منظور کر کے مسلمانوں کے مجروح جذبات کو مندمل کرنے کی کوشش کی، مگر ساتھ ہی ایک ایسی خبر اس نے سنائی جس کی وجہ سے مطلقہ بل کے پاس ہونے کی نا تمام خوشی بھی کافور ہو گئی۔ وزیر قانون مسٹر اشوک سین نے مئی ۱۹۸۶ء کو لوک سبھا میں مذکورہ بل پر بحث کے دوران یہ انکشاف کیا کہ حکومت ایک "اختیاری سول کوڈ" OPTIONAL CODE) تمام شہریوں کے لیے تیار کرے گی۔ وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی نے بھی پارلیامنٹ کا مانسون اجلاس شروع ہونے سے پہلے حزب مخالف کے ممبران کو یہ خوش خبری سنائی کہ اختیاری یونیفارم سول کوڈ کا مسودہ تیار کر لیا گیا ہے پھر ۳۰ مئی ۱۹۸۶ء کو INDIA TO DAY کے ایک انٹرویو میں مسٹر گاندھی نے یقین دلایا کہ اس مسودہ کو جلد ہی قومی بحث کے لیے پیش کیا جائے گا۔ تازہ ترین اطلاع کے مطابق بل کا مسودہ اب پارلیامنٹ کے سامنے بس آنے ہی والا ہے۔ اور قومی بحث مختلف شکلوں میں جاری ہے ۷ / اکتوبر کو بار کونسل نے اس مسئلہ پر بحث کے لیے ایک قومی اجتماع منعقد کیا، اجتماع میں حصہ لینے والوں کی اکثریت نے سول کوڈ کو ضروری قرار دیا اور اسے جلد از جلد نافذ کرنے کا مطالبہ کیا، حالانکہ اس سے پہلے خود مسٹر گاندھی اس بات کا اظہار کر چکے تھے کہ سول کوڈ لانے کا حکومت خود کوئی ارادہ نہیں رکھتی بلکہ اس کی شروعات مختلف گروہوں کی طرف سے ہونا چاہئے۔

قومی بحث: مسلم مطلقہ بل کے پاس ہو جانے سے یہاں کی اکثریت کو جو صدمہ پہنچا تھا اس کی تلافی کرنا حکومت کے لیے بہت ضروری تھا۔ غالبًا اسی لیے اختیاری سول کوڈ کے سلسلہ میں اس قدر عجلت سے کام لیا جا رہا ہے تاکہ "قومی دھارا" کی حفاظت بھی ہو سکے اور اکثریت کے غم و غصہ کو بھی ٹھنڈا کیا جا سکے۔ چنانچہ اس مسودہ کا اعلان ہوتے ہی "قومی اخبارات" نے حمایت میں مذاکرے، اداریے اور تبصرے لکھنے شروع کر دیئے اور "قومی دانشوروں" نے اس کی بنیاد مضبوط کرنے اور نوک پلک درست کرنے کا ذمہ لے لیا۔ تاکہ جب اپنے وقت پر بل پارلیامنٹ میں منظوری کے لیے پیش ہو تو فضا کچھ اس طرح سازگار ہو چکی ہو کہ کسی مخالف نقطۂ نظر کا ذرہ برابر وزن محسوس نہ کیا جا سکے۔

عدالت عالیہ کے سابق جج وی۔ آر۔ کرشنا ائر نے اس کی سب سے زیادہ پرزور انداز میں وکالت کی ہے ان کا کہنا ہے کہ "ایک ملک ایک قومیت ایک شہریت اور ایک ہی قانونی نظام اصولی ہے"۔ اور اس نصب العین کو متعین کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اسے کئی مرحلوں میں حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ پہلے مرحلہ میں تمام گروہوں کو عائلی قوانین کے بارے میں بنیادی اصول انصاف کی تعلیم دی جائے اور ان اصولوں کی تعلیم دی جائے جو بین الاقوامی سطح پر اختیار کیے جا چکے ہیں۔ دوسرے مرحلہ میں ایک کوڈ از سر نو مرتب کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی "اسپیشل میرج ایکٹ" کی طرح اختیاری سول کوڈ کو نافذ کیا جائے، جب مناسب وقت آ جائے اور عوام کی ایک بڑی تعداد اسے قبول کرنے تو یکساں سول کوڈ نافذ کر دیا جائے۔ (9.E. Sunday edition june 29,1986)

کرشنا ائر کی طرح دوسرے "قومی دانشوروں" کا بھی یہ خیال ہے کہ ملک میں جتنے پرسنل لاز ہیں ان کا بہتر اور مفید حصہ لے لیا جائے اور اس کی بنیاد پر سول کوڈ تیار کیا جائے تاکہ ہر اکائی یہ سمجھے کہ سول کوڈ کی تشکیل میں خود اس کا بھی حصہ ہے بعض دانشور اس سلسلہ میں اس قدر بے چین ہیں کہ وہ اختیاری سول کوڈ ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ لازمی سول کوڈ کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے ہیں گویا جبری سول کوڈ کے نفاذ سے پہلے اختیاری سول کوڈ کا عبوری وقفہ بھی ان کے لیے قابل برداشت نہیں ہے (9.E. Sunday edition june 29 1986)

دلیلیں اور نظیریں: اختیاری سول کوڈ کی حمایت میں مختلف قسم کی دلیلیں اور نظیریں پیش کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ دستور ہند کے رہنما اصول کی دفعہ ۴۴ میں سفارش کی گئی ہے کہ اسٹیٹ اپنے شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ فراہم کرے گی،

"THE STATE SHALL ENDEAVOUR TO SCURE FOR THE CITIZONS UNIFORM CIVIL CODE THROUGH OUT THE TERRITORY OF INDIA"

دستور کی اس سفارش کی رو سے یکساں سول کوڈ قومی یکجہتی کے لیے حد درجہ ناگزیر ہے اور اس کو حاصل کرنے

کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ جمہوری دور میں اسے اختیاری رکھا جائے تاکہ ملک کی مختلف اکائیاں اس کے قبول کرنے میں کوئی جبر نہ محسوس کریں اور اس درمیانی مدت کے گزرنے کے بعد اس کی مخالفت آسان نہ رہے۔

دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت ۱۹۵۴ء میں Special marriage act پاس کر چکی ہے جو ایک اختیاری چیز ہے۔ جو لوگ اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں ان کو اس کی اجازت ہے خواہ ان کا اپنا پرسنل لا اس کی اجازت دیتا ہو یا نہ دیتا ہو۔ اس ایکٹ کے تحت ایک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان شادی ہو سکتی ہے (حالانکہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا) اسپیشل میرج ایکٹ ایک اختیاری تجربہ تھا جو محدود پیمانہ پر کیا گیا اختیاری سول کوڈ بھی ایسا ہی تجربہ ہے جسے وسیع پیمانہ پر کیا جائے گا اور اس کے بعد اسپیشل میرج ایکٹ منسوخ ہو جائے گا۔ اسی طرح مسلم مطلقہ بل میں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اگر دونوں فریق دفعہ ۱۲۵ کے تحت فیصلہ کرانا چاہیں تو ان کو اس کی اجازت ہوگی۔ عمومیت کے ساتھ اختیاری سول کوڈ بھی ایک اجازت ہی ہوگی تیسری دلیل کا حاصل یہ ہے کہ ہندوستان کا کوئی گروہ کسی ایک پرسنل لا پر عمل نہیں کرتا بلکہ مختلف علاقائی رسوم اور قوانین کی پیروی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ مسلمان بھی پورے مسلم پرسنل لا پر عمل نہیں کرتے کشمیر کے مسلمان شریعت لا کے پابند نہیں ہیں۔ مالابار کے مسلمانوں کا ایک گروہ مروما کا تائم ہندو قانون کی پیروی کرتا ہے۔ اور گویا یہ تمام گروہ بشمول مسلمان ۱۸۶۵ء میں برطانوی حکومت کے طے کردہ یونیفارم سول کوڈ کے پیرو ہیں۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ ہر گروہ اپنے علاقائی یا مذہبی پرسنل لا پر عمل کرتا ہے ان پرسنل لاز میں ایسی خامیاں ہیں کہ بسا اوقات فرد کو کما حقہ انصاف نہیں ملتا اس لیے فرد کو اس کی اجازت ملنی چاہئے کہ وہ ایسے قانون کے مطابق اپنے مسائل کا فیصلہ کرائے جو انصاف دے سکے اور یہ ضرورت اختیاری سول کوڈ سے پوری ہو سکتی ہے،

مخاطب کون ہے؟ "قومی یکجہتی یا قومی دھارا" چونکہ ہندوستان کا قومی مسئلہ ہے اس لیے اختیاری سول کوڈ کا تعلق علی العموم ہر اس شہری سے ہے جو ہندوستان کے جغرافیائی حدود میں جی رہا ہے۔ یعنی بحیثیت فرد ہر شہری اور بحیثیت قوم ہر لسانی اور تہذیبی گروہ اختیاری سول کوڈ کا مخاطب ہے، مگر سچ پوچھئے تو اس کے اصلی مخاطب مسلمان ہی ہیں جن کے مسلسل احتجاج اور جد وجہد کی وجہ سے حکومت کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور مسلم مطلقہ بل منظور ہوا۔ اور اسی بل کے منظور ہونے کے نتیجہ میں ملک کی اکثریت اضطراب اور بے چینی کا شکار ہو گئی۔ قومی ایکتا خطرے میں پڑ گئی اور قومی دھارا کو سخت نقصان پہنچا، ٹائمز آف انڈیا کے مطابق یہ اس غلطی کی تلافی ہے جس کا ارتکاب حکومت نے مسلم مطلقہ بل پاس کر کے کیا تھا (اداریہ)۔ اس بل کا پاس ہونا یوں بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کے پاس ہی وہ مذہبی اور تہذیبی سرمایہ ہے جو ان کو انضمام کی کوششوں سے الگ رکھتا ہے، اور اپنی انفرادیت کا احساس ان میں پیدا کرتا رہتا ہے۔ جس کا ختم ہونا از حد ضروری ہے۔ رہے دوسرے لوگ تو ان کے حق

میں یہ کسی اعتبار سے بہتر ہے کیونکہ ان کا مذہبی قانون اتنا غیر فطری اور جبری ہے کہ اس سے نجات حاصل کرنا ہر صورت میں ضروری ہے بنیز چونکہ وہی "ہندوستانی قوم" بھی ہیں اس لیے سارے فوائد ان ہی کے حصہ میں جائیں گے۔ نقطۂ نظر بدلنے کی ضرورت ہے۔ درحقیقت اختیاری سول کوڈ ایک غیر ضروری کوڈ ہے اگر اس کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنا کہ باور کرایا جا رہا ہے تو اسے اختیاری نہیں بلکہ جبری ہونا چاہئے۔ اور دفعہ ۴۴ کی سفارش کو حتمی طور پر نافذ کر دینا چاہئیے پھر اس سوال پر بھی غور کیا جانا چاہئیے جو دستور ہند کی تشکیل کے وقت ڈاکٹر امبیدکر کے سامنے مسلمان قانون دانوں نے اٹھایا تھا اور مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیے جانے کا مطالبہ کیا تھا۔ جب تک اس دفعہ سے مسلمانوں کو مستثنیٰ نہیں قرار دیا جاتا اس وقت تک سول کوڈ خواہ جبری ہو یا اختیاری، حکومت ہند مسلمان کی ہمدردیاں حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ یہ ان کے مذہبی تشخص کی بقا کا مسئلہ ہے جس کے ختم ہو جانے کے بعد ان کی زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی موقع ملا ہے مسلمانوں نے اس دفعہ کے خلاف اپنے خیالات اور جذبات کا برملا اظہار کیا ہے۔ اسپیشل میرج ایکٹ کا پاس ہو جانا اس کی نظیر نہیں ہے کہ اختیاری سول کوڈ بھی پاس ہو جائے، مسلمانوں نے اس وقت بھی اس کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور آج بھی اسے اسلام کے خلاف تصور کرتے ہیں۔ یہی غلطی مطلقہ بل میں بھی موجود ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ان غلطیوں کی تلافی کی جائے نہ کہ بار بار اسے دہرایا جائے۔ رہے وہ علاقائی قوانین جو بعض مسلمانوں میں شریعت کے علی الرغم رائج ہیں تو ان کے بارے میں دو باتیں عرض ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ گوا کے مسلمان ایک جبری صورت حال سے دوچار ہیں، پرتگیزی حکومت کے زمانہ میں ان پر جو پابندیاں عائد تھیں افسوس یہ ہے کہ آزادی کے بعد بھی وہ برقرار رہیں وہاں کے مسلمان خود ان پابندیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بے چین ہیں: پچھلے دنوں شریعت مہم کے دوران گوا کے مسلمانوں نے بھی سول کوڈ سے آزادی اور اسلامی قانون کی پیروی کے لیے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا اور اس کے نفاذ کا مطالبہ کیا۔ گوا کے اس سول کوڈ کا جسے ہمارے دانشور حضرات پورے ہندوستان پر لاگو کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہاں ہندوؤں کو چند شرائط کے ساتھ ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت ہے اور مسلمانوں کے لیے ایک سے زیادہ شادی پر پابندی ہے، اور شادی اٹوٹ بندھن ہے اس کا رجسٹریشن بھی لازمی ہے، اگر طلاق کی ضرورت ہو تو طلاق ممکن نہیں ہے جب تک مدعی فریق ثانی پر یہ سنگین الزام نہ لگائے کہ وہ بدکردار ہے۔ کیا ان تمام باتوں کو قبول کرنے کے لیے یہ حضرات تیار ہیں؟

کشمیر کے مسلمان مسلم پرسنل لا ہی کے پیرو ہیں بجز یہ کہ "خانہ داماد" کی رسم جس کی رو سے داماد گھر کا ایک فرد اور وراثت کا حقدار ہے، کی پیروی کرتے ہیں۔ اسی طرح کالی کٹ کے شمالی حصوں میں مروکا تھایم جو خانہ داماد ہی کی ایک شکل ہے بعض مسلمانوں میں رائج ہے مگر ان دونوں رسموں کی قباحت سے لوگ واقف ہو رہے ہیں اور

ان سے نجات پانے کا رجحان خاص طور پر پچھلے دنوں شریعت مہم کے دوران بڑھا ہے۔ نیز یہ کہ اگر ایک غلطی کسی فرد یا گروہ سے سرزد ہو تو اس کی اصلاح ہونی چاہیے نہ یہ کہ اس کی بنیاد پر مسلم پرسنل لا کا متبادل لانے کی کوشش کی جائے۔ یہ کونسی منطق ہے کہ اگر ایک شخص کسی بنا پر قانون کے کسی ایک دفعہ پر عمل نہیں کر رہا ہے تو اسے پورے قانون سے دست بردار ہونے کا مشورہ دیا جائے۔ رہی یہ بات کہ پرسنل لا سے لوگوں کو انصاف نہیں ملتا، تو ایسے کتنے لوگ ہیں جن کے لیے حکومت پریشان ہے، ان کے لیے سیدھا راستہ یہ ہے کہ وہ جس پرسنل لا کو اپنانا چاہیں اس کو علی الاعلان اپنا لیں اور جسے چھوڑنا چاہیں علی الاعلان چھوڑ دیں۔ بالفاظ دیگر اگر چند مسلمان ایسے ہیں جن کو مسلم پرسنل لا پر اطمینان نہیں ہے تو وہ اسلام سے دست بردار ہو کر کوئی مذہب اختیار کرلیں یا مذہب ہی کی قید سے آزاد ہو جائیں۔ پھر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ جو بھی قانون بنایا جائے گا چاہے وہ کتنا ہی معیاری سمجھا جائے اس کے بعض پہلوؤں کو بعض لوگ ناپسند ضرور کریں گے۔ کیا اس کے لیے اُس قانون ہی کو ختم کر دیا جائے گا؟

موجودہ صورت حال میں اگر یہاں کے پرسنل لاز میں تبدیلی کر کے سول کوڈ نافذ کیا جائے تو اس کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کیا ہوگا کہ ہر گروہ میں انتشار برپا ہوگا مذہبی شیرازہ منتشر ہوگا اور معاشرہ کا مزاج بگڑتا چلا جائے گا۔ ملک میں بسنے والی کوئی اکائی اگر اس طرح افراتفری کا شکار ہوگی تو لازماً اس کا اثر ملک و ملت کی اجتماعیت پر بھی پڑے گا اور ایک پر امن اور محبت بھری فضا کا بکھرتا ہوا نظر آئے گا۔ پھر ملکی سالمیت کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہوتی۔

آپ بھی سوچیے:۔ اس بحث کا سب سے اہم پہلو مسلمانوں سے متعلق ہے۔ (۱) اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور شریعت اسلامیہ ایک متوازن قانون حیات ہے، اس کو از اول تا آخر ماننا اور اس پر عمل کرنا مومن کا فریضہ ہے۔ اختیاری سول کوڈ اس شرعی قانون کی علی الاطلاق حاکمیت کو ختم کر دیتا ہے مسلمان اسے کسی حال میں تسلیم نہیں کر سکتے۔ انھیں ایک آواز ہو کر یہ اعلان کرنا چاہیے کہ ہم نہ اسلام کا متبادل سوچ سکتے ہیں اور نہ اسلامی قوانین کا متبادل اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ اسلام کو کمزور کرنے اور مسلمانوں کو دین کی راہ سے ہٹانے کی ایک خوبصورت سازش ہے (۲) اگر اسلام مسلمانوں کا پسندیدہ دین ہے اور وہ اس پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں تو ان کو پوری زندگی میں اسلام کی پیروی کرنی ہوگی، اللہ کے ہر حکم کی اطاعت ضروری ہوگی، تمام فیصلے قرآن و سنت کے مطابق کرنے اور کرانے ہوں گے، اس لیے ان کو چاہیے کہ وہ غیر اسلامی عدالتوں میں اپنے مقدمات نہ لے جائیں۔ بلکہ شرعی عدالتوں سے رجوع کریں اور جہاں شرعی عدالت کا قیام عمل میں نہ آسکا ہو وہاں وہ متقی علماء سے رجوع کریں۔ (۳) جو لوگ اسلام پر یقین رکھتے ہوئے بھی صرف اس بنا پر اپنے مقدمات غیر شرعی عدالتوں کے سپرد کر دیتے ہیں کہ ان کو اپنے حق میں فیصلہ ملنے کی امید ہوتی ہے، ہماری دینی اور سماجی ذمہ داری ہے کہ ہم ان کو سمجھائیں اور بتائیں کہ دنیا کے نقصان کے مقابلہ میں آخرت کا نقصان بہت بڑا ہے۔ اور یہ کہ بعض معاملات میں اللہ کی اور بعض معاملات میں طاغوت کی پیروی دعویٰ ایمان سے کسی طرح میل نہیں کھاتی۔ (۴) مسلمانوں میں دینی تعلیم و احکام بالخصوص وہ مسائل جن کا روز مرہ کی زندگی سے تعلق ہے عام کرنے کی ضرورت ہے اس سلسلہ میں تقریریں، تحریریں، دورے، مذاکرے اور ملاقاتی

مہم وغیرہ کے ذریعہ منظم کوشش کی ضرورت ہے۔ نیز ان لوگوں کے مسائل میں دلچسپی لے کر شرعی رخ دینے کی ضرورت ہے جو اپنے مسائل نادانی یا فوری جذبہ کے تحت باطل عدالتوں تک لے جاتے ہیں اگر ان کی مدد کی گئی تو انشاء اللہ یہ ایک مفید عمل ہوگا۔ اور باطل سے مدد لینے کی نوبت نہ آئے گی (۵) مسلمانوں نے جس ہمت واستقلال اور صبر کے ساتھ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف مہم چلائی تھی وہ ایک عارضی چیز نہ سمجھی جائے بلکہ اسی جوش وجذبہ کے ساتھ یونیفارم سول کوڈ کے خلاف بھی کمربستہ ہو جائیں۔ اس کا انتظار نہ کریں کہ جب تک اختیاری ہے ہم اسے اختیار ہی نہ کریں اور جب جبری ہو جائے گا تو ہم میدان میں کود پڑیں گے۔ کیونکہ اس وقت معاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہوگا۔ اور ہماری آواز نقار خانہ میں طوطی کی طرح بے وزن ہو جائے گی۔ پھر یہ جدوجہد اس وقت تک سرد نہ ہو جب تک خود یہ منسوخ نہ ہو جائے یا مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ قرار نہ دے دیا جائے۔ (۶) اس وقت مسلم معاشرہ بے یقینی کی صورت حال سے دوچار ہے مزید براں اس کو تباہی سے دوچار کرنے کی مختلف سمتوں سے سازشوں کا جال پھیلایا جا چکا ہے، دولت، عہدہ اور دوسری لالچ کے ذریعہ غلام خریدے جا رہے ہیں اور منافق بنائے جا رہے ہیں، ان کو پہچاننے کی ضرورت ہے، سازش کے تمام دروازوں کو اور ان سے برآمد ہونے والے منافقوں پر روک لگانے اور ان کے ساتھ اسلامی دستور کے مطابق معاملہ کرنے کی ضرورت ہے۔

(۷) علما اور دانشوروں سے گذارش ہے کہ وہ وقت کی نزاکت کو محسوس کریں اور اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اجتماعی زندگی میں ہر غلطی کا خمیازہ نسلوں کو بھگتنا پڑتا ہے، اس لیے وہ اسلام کے آگے کسی بھی قانون کو بالادستی حاصل کرنے کا موقع نہ دیں اور اسلامی قوانین کی تعبیر اور تنفیذ کا حق کسی بھی ایسے ادارہ کو نہ دیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں رکھتے۔

بہترین بات

مسلمانوں میں جب تک عوام کے اندر سے ملک وملت کا حقیقی درد رکھنے والے غریب کارکن آگے نہ آئیں گے اور ان کے اندر سے جاگیردارانہ سیاست کی ملوکانہ روایت ختم نہ ہوگی، اس قوم کی شب تاریک کی کبھی سحر نہ ہوگی۔

سید اسعد گیلانی

(بحوالہ سید مودودیؒ، بچپن، جوانی، بڑھاپا ص ۱۷۲۔ مطبوعہ پاکستان)

تنقید و تبصرہ

نام کتاب، عقیدہ مہدویہ مراسلت مابین سید محمد روشن و سید عبد القادر

صفحات ۹۲، بڑی تقطیع، کتابت طباعت غنیمت، قیمت سات روپیہ

ناشر: ادارہ تبلیغ و اصلاح معاشرہ مسلمانان ہند حیدرآباد

زیر تبصرہ کتاب عقیدہ مہدویہ، مناظرہ یا کلام کی کوئی کتاب نہیں ہے جو مہدوی عقائد کو موضوع بحث بنا کر مرتب کی گئی ہو بلکہ ایک طرح کی دعوتی اور اصلاحی مراسلت ہے جو محترم جناب سید عبد القادر صاحب اور سید محمد روشن صاحب قبلہ اہل ہستیرہ (مہدوی گروہ کے پیشوا) کے درمیان ۱۹۸۲ء میں ہوئی تھی۔ پوری کتاب اٹھارہ مراسلات ایک تجویز اور ایک دیباچہ پر مشتمل ہے۔ ان مراسلات کی ابتدا ایک دینی اور اصلاحی جذبے سے ہوتی ہے اور اختتام بھی اسی پر ہوتا ہے۔ یوں تو اس مجموعہ مراسلات کو "عقیدہ مہدویہ" کا نام دیا گیا ہے تاہم اس کے مکاتیب سے نہ صرف مہدوی عقائد بلکہ مذہبی فرقوں کی حالت، مذہبی پیشواؤں کی ذہنیت، اصلاحی کوششوں اور تحریکوں کی مخالفت، اور مخلص کارکنوں کی مزاحمت کے بہت سے عبرتناک پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ محترم سید عبد القادر صاحب کا جماعت اسلامی ہند سے بہت قریبی تعلق رہا ہے، ان مراسلات کے ذیل میں انھوں نے ایک طرح سے جماعت کی دعوت بھی پیش کر دی ہے۔

ان مکتوبات کا محرک ایک تجویز ہے جو جناب عبد القادر صاحب اور جناب قادر خاں صاحب (سابق صدر انجمن مہدویہ) نے مل کر ساکنان محلہ چنچل گوڑہ (حیدرآباد) کی اصلاح کے لیے پیش کی تھی۔ تجویز کا خلاصہ یہ ہے کہ ٹی وی، سینما، لاٹری، جوا، جھوٹی شان و شوکت، فضول خرچی، مہلک رسوم، حرام آمدنی، اور دیگر غیر اسلامی اعمال سے کراہتے ہوئے معاشرہ کو سدھارنے کی کوشش کی جائے۔ اور اس کا آغاز ایسے اجتماعات سے کیا جائے جن میں اسلام کے تقاضے ذہن نشین کرائے جائیں۔ مختلف مذہبی فرقوں کے مخصوص عقائد کو زیر بحث لائے بغیر اسلامی نظام زندگی کے بڑے حصہ پر جو قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے، توجہ مرکوز کی جائے۔ ان اجتماعات کو خطاب کرنے کے لیے علماء کرام اور دیگر معتبر شخصیات کو دعوت دی جائے۔

مذکورہ دونوں حضرات اس تجویز کے متعلق لوگوں کی رائیں معلوم کرنے کے لیے محلہ کے ممتاز حضرات تک پہنچے، ان میں ایک قبلہ سید محمد روشن صاحب بھی تھے، موصوف کو یہ گوارا نہ تھا کہ مہدوی فرقہ سے تعلق رکھنے والا آدمی اپنی اصلاحی کوششوں کا مخاطب عام مسلمانوں کو بنائے ان کے نزدیک اصلاحی کوششیں صرف مہدوی فرقے

دائرہ میں ہونی چاہئے۔ چنانچہ اولاً انھوں نے مجوز کے کچھ الفاظ کو غلط معنی پہنا کر اعتراض کیا، اور جب ان کی غلط فہمی دور کی گئی تو وہ اس پر برہم ہوئے کہ مہدوی جماعت سے الگ ہو کر مجوز جماعت اسلامی میں کیوں شامل ہو گیا (حالانکہ محترم عبدالقادر صاحب ضابطہ میں جماعت کے رکن نہیں رہے)، کہ اس کی وجہ سے "مہدوی قوم کے نوجوان گمراہ ہو رہے ہیں چاہئے تو یہ تھا کہ مہدویت کو سہارا دیتے اور اسے زندہ کرنے کی سعی کرتے۔

جناب عبدالقادر صاحب نے واپسی میں ازراہ انکسار ایک معذرت نامہ لکھ بھیجا مگر اس کا جواب اس انداز میں دیا گیا کہ وہ جوابی مراسلت کا باعث بن گیا۔ قادر خاں صاحب بعد میں تجویز سے دست بردار ہو گئے، اس لیے صاحب معاملہ صرف عبدالقادر صاحب رہ گئے۔

مراسلت کی زبان میں جہاں ایک جانب سے الزامات کی بوچھاڑ، غم و غصہ کا اظہار اور ذاتیات سے بحث ہے وہاں دوسری جانب سے مخاطب (روشن صاحب) کی عزت و احترام، عرفی حیثیت، اور اسلامی ادب کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ مجوز قرآن و سنت کی بنیاد پر امت کی سوئی ہوئی حس کو بیدار کرنے کی دعوت دیتا ہے، اور قبلہ و مرشد اہل ہستیرہ مہدوی عقیدہ کی موجودہ شکل کو اختیار کرنے اور اسی کی اشاعت کو اسلام قرار دیتے ہیں اس لیے مجوز کے لیے بھی سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ عقیدہ مہدویہ کے مہلک رجحانات اور باطل تصورات کا محاسبہ کرے اور ان کی کمزوری مخاطب پر واضح کرے۔

مہدوی فرقہ کے بانی سید محمد جونپوری (م ۹۱۱ھ) ایک جید اور متقی عالم تھے، ان کی دینی اور اصلاحی خدمات مسلم ہیں لیکن اس کے ساتھ انھوں نے "مہدی موعود" ہونے کا عجیب و غریب دعویٰ بھی کیا، البتہ قرآن و سنت کو اپنا مذہب بھی قرار دیا اور قرآن و حدیث کی اشاعت اور نفاذ ہی کے لیے مخلص کارکنوں کی ایک جماعت تیار کی، ان کا قول ہے "مذہب ما کتاب اللہ و سنت رسول اللہ" بلکہ یہاں تک کہا کہ "اگر کوئی شخص بندہ سے کوئی چیز نقل کرے تو چاہئے کہ اس کو دیکھ لے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے کلام کے مطابق ہے یا نہیں" مگر ان کے پیروکاروں نے قرآن و سنت کو ایک طرف رکھ کر ان کی ذات ہی کو مرکز ایمان بنا لیا، اور جہاں لا کر ان کو کھڑا کیا وہ ان مکتوبات کی روشنی میں اس طرح ہے:

(۱) سید محمد جونپوری مہدی موعود اور خلیفۃ اللہ ہیں

(۲) وہ معصوم عن الخطا ہیں

(۳) قرآن اور مہدی ہمارے امام ہیں

(۴) یہ دونوں ہر لحاظ سے کافی ہیں۔

(۵) امامت واحدہ کے دو شریک قرآن اور محمدؐ کی طرح تیسرا شریک مہدی (جونپوری) اپنے دو شریک کے ساتھ خود بھی مستقل بالذات امام ہے

(۶) سید محمد (مہدی) محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے باطن یعنی "ولایت محمدیہ کے لیے خدا کی طرف سے قائم" (خلیفہ) مامور ہوئے ہیں۔

(۷) بزبان ختم نبوت احکام شریعت کی تبلیغ بتعلیم وحی جبرئیل تھی اور انا رسول اللہ کا دعویٰ تھا اور بزبان مہدیت "الہام بلا واسطہ" ہے۔

(۸) سید محمد (مہدی) نے مومنین و مومنات کو جن کاموں کی تعلیم و تلقین قرآن کے احکام کے تحت فرمائی ہے ان پر عمل کرنا رضاکارانہ نوعیت کا نہیں بلکہ شریعت کی اصطلاح کے مطابق فرائض کے درجہ میں داخل ہے۔

(۹) محمد (مہدی) کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے لیے شرط ہے۔

(۱۰) محمد جونپوری کو مہدی قبول نہ کرنے والا کافر ہے۔

بعض حضرات نے تو ان سے یہ تک منسوب کر دیا کہ "انا رب العالمین" (نعوذ باللہ)۔ ان عقائد پر جناب عبد القادر صاحب نے قرآن و سنت کی روشنی میں تفصیلی گفتگو کی ہے، اگرچہ انھوں نے سید محمد جونپوری کے دعویٰ "مہدویت" سے تعرض نہیں کیا ہے مگر انھوں نے اس کی دوسری تفصیلات سے متعلق اپنی رائے ظاہر کی ہے اور بطور نتیجہ لکھا ہے "یہ ایک افسوسناک تاریخی حقیقت ہے کہ اس جماعت (مہدوی) نے رفتہ رفتہ تمسک بالکتاب والسنۃ کی طرف کم اور مہدی علیہ السلام کی شخصیت کو منوانے کی طرف زیادہ توجہ دینی شروع کر دی اور آج نتیجہ یہاں تک پہنچ گیا کہ کتاب و سنت تو رہ گئی ایک طرف، مذہب مہدویہ ایک نکاتی فارمولا بن گیا ہے یعنی مہدی علیہ السلام (محمد جونپوری) کو ماننے کا اقرار کرنا"

ولایت کا مسئلہ اہل تصوف، اہل تشیع اور مہدوی حضرات کے یہاں یکساں اہمیت کا حامل ہے، مکتوبات میں اس مسئلہ پر بھی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ سید عبد القادر صاحب نے ثابت کیا ہے کہ "ولایت" کوئی منصب نہیں ہے جو اللہ کی طرف سے کسی کو عطا ہوتا ہو۔ بلکہ یہ ایک رضاکارانہ کام ہے جہاں اقل ترین ذمہ داریوں سے جنھیں شریعت کی اصطلاح میں فرائض کہا جاتا ہے کچھ زائد ذمہ داریاں اٹھانے کا تقاضا کرتا ہے۔

مراسلات میں ذیلی مقصد کے طور پر جماعت اسلامی کا متعدد بار تذکرہ آیا ہے جناب عبد القادر صاحب نے جماعت کے دستور، روداد اور پالیسی کے حوالے سے مخاطب کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے اور پھر ایک ایسا سوال کیا ہے جو اس طرح کے تمام دینی حلقوں سے جواب کا طالب ہے: "کیا جماعت اسلامی سے ہٹ کر دنیا بھر کی دیگر (ملحدانہ و مشرکانہ) پارٹیوں میں شامل ہو کر ان کے باطل مقاصد کو پورا کرنے کا ذکر کر دینے سے ایمان پر کوئی آنچ نہیں آتی اور اگر آتی ہے تو صرف جماعت اسلامی کے ساتھ تعاون کرنے سے آتی ہے؟"

حیدرآباد کی دینی فضا میں مہدویت جس طرح موضوع بحث رہتی ہے دوسری جگہوں پر شاید اس طرح نہیں ہے اس لیے دوسرے لوگوں سے زیادہ اس کتاب کی اہمیت حیدرآباد کے مسلمان محسوس کر سکتے ہیں۔ اگر کتاب جدید اسلوب پر مرتب کی جاتی اور کتابت و طباعت کا بہترین انتظام ہوتا تو اس کی افادیت دو چند ہو جاتی تاہم موجودہ شکل میں بھی کتاب لائق مطالعہ اور قابل استفادہ ہے۔ ضرورت ہے کہ عصبیت اور عقیدت کے اندھے جذبات سے بالاتر ہو کر کتاب کا مطالعہ کیا جائے۔

(محمد سعود عالم قاسمی)

★ جلد ۶ ★ فروری ۱۹۸۷ء مطابق جمادی الثانی ۱۴۰۷ھ ★ شمارہ ۲ ★

فہرست مضامین

ادارتی امور کے لئے خط و کتابت کا پتہ:
مدیر "زندگی نو" پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ترسیل زر و انتظامی امور کے لئے:
منیجر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵، سوئیوالان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

● سالانہ زر تعاون -/۵۵ روپے ● (بیرون ہند) -/۲۲۵ روپے انڈین ● فی شمارہ = 5/ روپے ●

سرخ نشان، علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لئے فوری زر سالانہ ارسال فرمائیں یا اگلا شمارہ کسی اطلاع کے نہ ملنے پر بذریعہ وی۔ پی ارسال کیا جائے گا۔

پرنٹر، پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ "زندگی نو" ۱۵۲۵، سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ فون: ۲۷۳۳۴۸ ★ ۲۶۵۳۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ایس۔ آئی۔ او کی کل ہند کانفرنس

سید جلال الدین عمری

اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن (S.I.O) طلباء اور نوجوانوں کی ایک کل ہند تنظیم ہے۔ ۲۶، ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۸۶ء کو اس کی پہلی کل ہند کانفرنس بنگلور میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں تقریباً چالیس ہزار مندوبین نے شرکت کی اور عام اجتماعات میں ساٹھ ستر ہزار کی حاضری رہتی تھی۔ یہ عظیم کانفرنس اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے ملک میں ہونے والی دوسری کانفرنسوں سے کافی مختلف تھی۔ آج کے دور میں نوجوان کھیل کود اور تفریح کے لیے مجتمع ہو سکتے ہیں، کسی ایکٹر یا ایکٹرس کو دیکھنے اور سننے کے لیے اکٹھا ہو سکتے ہیں یا کسی ہنگامہ اور توڑ پھوڑ کے لیے یکجا ہو سکتے ہیں۔ کسی سنجیدہ، متین اور باوقار کام کے لیے ان کا جمع ہونا مشکل ہے۔ لیکن یہ ان نوجوانوں کی کانفرنس تھی جو اسلام کو اپنا نصب العین سمجھتے ہیں اور جسے دنیا میں زندہ اور غالب کرنے کی تڑپ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس کانفرنس کو دیکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اسلام کس قسم کا ذہن و مزاج اور اعلیٰ ذوق پیدا کرتا ہے اور آج کے عام نوجوانوں سے یہ نوجوان کتنے مختلف ہیں۔

کانفرنس کا پروگرام مربوط اور گٹھا ہوا تھا۔ اس میں افتتاحی اور صدارتی خطبات، "S.I.O کی رپورٹ" "ہمارے خوابوں کا ہندوستان" اور "نیا نظام تعلیم" پر سمپوزیم اور سمینار اور ملی مسائل پر بحث ہوئی۔ اپنے افتتاحی خطبہ میں محترمی مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند نے جو S.I.O کے سرپرست اعلیٰ بھی ہیں، اختصار کے ساتھ ان تمام مسائل کا بڑی عمدگی سے احاطہ کر لیا تھا جو کانفرنس میں زیر بحث آنے والے تھے۔ اس طرح کانفرنس کو ایک رخ دے دیا تھا۔ اس موقع پر آپ نے امت مسلمہ کے مقصد حیات اور جماعت اسلامی ہند کے قیام کی غرض و غایت بھی بیان فرمائی۔ شروع ہی میں S.I.O کا ذکر کرتے ہوئے جب یہ فرمایا کہ:

"اس کانفرنس میں شرکت کو میں اپنے لیے ایک عظیم سعادت سمجھتا رہا ہوں اور عمر کے جس مرحلے میں میں داخل ہو چکا ہوں اس میں اپنے عزیز طلبہ کی صحبت اور معیت میں جو راحت و سکون مجھے میسر آتا ہے اس کا مجھے کوئی اور بدل نظر نہیں آتا۔ میری بہت سی تمنائیں اور امیدیں اس وقت ان طلبا اور نوجوانوں ہی سے وابستہ ہیں اور میرے بیشتر سپنے خوابوں کا مرجع بھی زیادہ تر یہی لوگ ہیں"

تو آنکھیں نمناک ہو گئیں اور بہت سے بزرگوں نے محسوس کیا ہو گا کہ یہ ان کے دل کی آواز اور جذبات کی صحیح ترجمانی ہے۔

ایس آئی او جماعت اسلامی کی سرپرستی میں کام کر رہی ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محترم نے فرمایا کہ:

میں یہاں واضح کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ سرپرستی اس معنیٰ میں ہرگز نہیں ہے کہ ان کے خود اپنے سوچ وبچار اور اس کے مطابق فیصلہ کرنے پر کچھ بے جا قیود عائد کی جائیں۔ اس بارے میں ان کو پوری آزادی حاصل ہے۔ چنانچہ ان کا دستور خود ان کا اپنا ہی طے کردہ ہے اور اسی طرح اپنی پالیسی اور پروگرام بھی وہ خود ہی اپنی صواب دید کے مطابق طے کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جہاں وہ خود جس معاملہ میں ضرورت محسوس کرتے ہیں ہم سے مشورہ کے بھی طالب ہوتے ہیں جس سے ہمیں گریز نہیں ہوتا ہے اور ان کے دستور کے مطابق اگرچہ امیر جماعت اسلامی ہند اور امرائے حلقہ جات علی الترتیب ان کے سرپرست اعلیٰ اور سرپرست قرار دیئے گئے ہیں لیکن دستوری طور سے ان سرپرستوں کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ وہ اس بات پر نظر رکھیں کہ تنظیم اپنے اغراض ومقاصد کے مطابق صحت مند خطوط پر اپنے کاموں کو انجام دے رہی ہے یا نہیں ؟ یا وقت پر اپنی نگرانی میں ان کے عہدہ داروں کا انتخاب وغیرہ کرائیں۔"

کانفرنس کا مرکزی موضوع "اسلام برائے امن ترقی ونجات" تھا۔ خاص اس عنوان کے تحت یہ بتانے کی کوشش کی گئی کہ آج دنیا امن وامان کی پیاسی ہے لیکن مغرب جس فلسفۂ حیات پر عمل پیرا ہے اور جسے مشرق نے بھی آنکھیں بند کرکے قبول کرلیا ہے اس کے ذریعہ امن کا قیام عملاً ممکن نہیں ہے۔ وہ ہر ظلم وناانصافی کے لیے وجہ جواز فراہم کرتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام امن وسلامتی کا پیامبر ہے۔ اس لیے بدامنی اور فساد کی ماری ہوئی اس دنیا کو اسلام کی شدید ضرورت ہے۔ اسی سے صحیح معنیٰ میں امن قائم ہوسکتا ہے۔ اسلام سائنسی ترقی کی راہ میں مانع نہیں ہے۔ اس نے ایسے اصول فراہم کیے ہیں جو انسان کو تباہی سے بچاتے اور صحیح ترقی کی راہ دکھاتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے سائنس کے بہت سے شعبوں میں امامت وراہ نمائی کا فرض انجام دیا ہے اور نوع انسانی کی بہترین خدمت کی ہے۔ اسلامی قدروں کو قبول کرکے سائنس کی ترقی بھی ہوسکتی ہے اور دنیا پر تباہی کے جو بادل منڈلا رہے ہیں وہ بھی چھٹ سکتے ہیں۔ اسی طرح انسان نجات کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہا ہے۔ یہ اس کی روح کی طلب ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ سوائے اسلام کے کہیں اس طلب کے پورا کرنے کا سامان نہیں ہے۔ اسلام ہی میں انسان کی نجات پوشیدہ ہے۔ اسے قبول کرکے ہی وہ اپنی روح کی پیاس بجھا سکتا ہے۔ تعلیم سے متعلق سمینار میں فاضل مقررین نے دو باتوں پر زور دیا۔ ایک یہ کہ دنیا کے اور ملکوں کے مقابلہ میں ہمارے یہاں تعلیم کا اوسط بہت کم ہے۔ حکومت کی توجہ بھی اس طرف اتنی نہیں ہے جتنی کہ ہونی چاہیے اس معاملہ میں مسلمان اور بھی پیچھے ہیں۔ جب تک وہ علمی میدان میں آگے نہیں بڑھیں گے سماج میں باوقار زندگی نہیں گزار سکتے۔ دوسری بات جس پر سمینار میں زور دیا گیا وہ یہ تھی کہ موجودہ تعلیم اخلاقی بے راہ روی کی طرف لے جارہی ہے۔ اس لیے مذہبی اور اخلاقی تعلیم کو اس کا ایک ضروری حصہ ہونا چاہیے۔ یہاں ایک اور حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے۔ وہ یہ کہ نوجوان سماج کا ایک حصہ ہیں۔ پورا سماج بگڑا ہوا ہو تو وہ اس بگاڑ سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ لازماً اس سے متاثر ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ سماج کے غلط اثرات سے انھیں کیسے محفوظ رکھا جائے۔ اس سوال کی طرف راقم توجہ کی گئی حالانکہ زیادہ گہرائی کے ساتھ اس کا جائزہ لینے کی ضرورت تھی۔ بعض مقررین نے ہمارے پورے نظام تعلیم ہی پر نظر ثانی کی ضرورت ظاہر کی۔ اس بات کا بھی اظہار کیا گیا کہ تعلیمی اداروں کو آزاد ہونا چاہیے اس میں حکومت کی مداخلت صحیح نہیں ہے۔

ملی سیشن کے تحت، ملت کا اتحاد اور اس کے معاشی مسائل وغیرہ زیرِ بحث آئے۔ یکساں سول کوڈ کا مسئلہ اس وقت ملت کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ فطری طور پر اس کا ذکر تفصیل سے آیا اور اس خیال کا اظہار کیا گیا کہ ملت اسے کسی قیمت پر برداشت نہیں کرے گی۔

ان پروگراموں میں جماعت اسلامی ہند کے قائدین اور S.I.O. کے نمایاں افراد کے علاوہ جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب، جناب سید شہاب الدین صاحب، جناب عزیز سیٹھ ایم۔پی، پروفیسر طاہر محمود، ڈاکٹر اے۔این عمر کٹی، جناب ابراہیم خلیل اللہ، جناب اسماعیل تابش مدیر پاسبان وغیرہ نے شرکت کی۔ تعلیمی سمینار میں بنگلور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر شنکر رائن نے حصہ لیا۔ "ہمارے خوابوں کا ہندوستان" کے عنوان کے تحت سمپوزیم میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نمائندے مسٹر سوامی جی نے اظہار خیال کیا۔ بنگلہ دیش اور نیپال کی اسلامی تنظیموں کے نمائندے بھی اجلاس میں موجود تھے۔ انھوں نے اپنی تنظیموں کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ ملک سے باہر کے جن افراد نے شرکت کی ان میں یوسف الاسلام سابق cat stevens (لندن) کی شخصیت نے سب کو متاثر کیا۔ ان کی گفتگو سے احساس ہوتا تھا کہ انھوں نے اسلام کو اچھی طرح جذب کیا ہے اور اس کی وہ اچھی طرح ترجمانی کرسکتے ہیں۔

کانفرنس میں بچوں کا بھی ایک پروگرام تھا جسے کافی پسند کیا گیا۔ ایک شعری نشست بھی تھی۔ اس میں معروف اسلامی شاعر جناب حفیظ میرٹھی کے دیوان "متاعِ آخرِ شب" کا اجراء محترمی جناب افضل حسین صاحب قیم جماعت اسلامی ہند کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

پروگرام جس طرح مرتب کیا گیا اور اس میں وقت کے اہم اور نازک مسائل کو جس بڑے پیمانہ پر چھیڑا گیا تھا وہ بہت اہمیت کا حامل تھا لیکن اس سے زیادہ اہم کانفرنس سے نوجوانوں کی دلچسپی تھی۔ دن بھر لگاتار کوئی نہ کوئی پروگرام ہوتا تھا صرف نماز اور کھانے کے لیے وقفے ہوتے تھے، شب میں بھی اجلاس ہوتے تھے اس وجہ سے صرف چند گھنٹے آرام کے ملتے تھے۔ آج کے نوجوان جس قسم کے پروگراموں میں دلچسپی لیتے ہیں کانفرنس اس سے خالی تھی۔ بلکہ اس لحاظ سے اسے ایک خشک اور غیر دلچسپ کانفرنس کہنا چاہیے۔ لیکن اس میں شریک ہونے والے نوجوانوں کی طرف سے کسی قسم کی اکتاہٹ یا غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کسی بھی مرحلہ میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ مسائل ان کے اپنے مسائل ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ مسائل حل ہوں۔ جس روز یہ مسائل ہمارے ملک کے نوجوانوں کی اکثریت یا اس کی خاصی بڑی تعداد کے سنجیدہ غور و فکر کا موضوع بن جائیں گے اور اسے وہ صحیح طریقے سے حل کرنے کی کوشش شروع کردیں گے۔ اس ملک کی قسمت بدلنے لگے گی اور ایک نئی صبح کے آثار نمودار ہو جائیں گے۔

پورے اجلاس پر دینی روح چھائی ہوئی تھی۔ بعد نماز فجر قرآن مجید یا حدیث کے درس سے پروگرام کا آغاز ہوتا تھا۔ کانفرنس کے پہلے روز اسی خاکسار کا درس قرآن تھا۔ اس نے سورۂ حجر کی آخری آیتوں کا درس دیا۔ ایک مختصر سا دعوتی اور تربیتی نوعیت کا مقالہ اس نے S.I.O. کے ارکان کے اجتماع میں بھی پڑھا۔ یہ مقالہ زندگی نو کے اسی شمارہ میں شائع ہو رہا ہے۔

آڈیٹوریم میں نماز باجماعت کا پورا اہتمام تھا۔ وہ منظر بڑا پرُ مسرت ہوتا تھا جب ہزاروں نوجوان ایک ساتھ اپنی جوان اور روشن پیشانیاں اپنے پروردگار کے سامنے جھکا دیتے تھے۔ نمازوں کے بعد کوئی نہ کوئی حدیث ترجمہ کے ساتھ سنائی جاتی تھی جس سے مختصر سے وقت میں دین کے مختلف پہلو سامنے آجاتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان نوجوانوں میں کتاب و سنت کی پابندی کا جذبہ موجزن تھا۔ انھیں اس بات کی فکر دامن گیر رہتی تھی کہ شریعت کے خلاف کوئی قدم اٹھنے نہ پائے۔ آج کے دور فتن میں کسی نوجوان گروہ کے اندر شریعت کی پابندی کے اس جذبہ کا پایا جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔

اس کانفرنس کا اہتمام نوجوانوں نے کیا، اس کا نظم بھی ان کے ہاتھوں میں تھا۔ ہر چیز سے قرینہ اور سلیقہ نمایاں تھا۔ اتنے بڑے اجتماعات میں کھانے کے نظم میں بڑی دشواری پیش آتی ہے اس کی وجہ سے دوسرے پروگرام متاثر ہوتے ہیں لیکن کھانے کا نظم اس طرح کیا گیا تھا کہ اس سے دوسرے پروگرام متاثر نہ ہوں۔ ہر چیز میں صفائی ستھائی کا اہتمام تھا۔ اگر بعض موانع نہ ہوتے تو شاید نظم کو اور بھی بہتر بنایا جا سکتا تھا۔

ان نوجوانوں میں صبر و ضبط اور اطاعت امر کی خوبی بھی دیکھنے میں آئی۔ بہت سے نوجوان اجتماع سے قبل ہفتوں اس کی تیاری میں اور اجتماع کے بعد اس کے مختلف کاموں کے سمیٹنے میں لگے رہے۔ رات دن ان تھک کوشش کی۔ کانفرنس کے دوران جس نوجوان کو جس ڈیوٹی پر لگا دیا گیا اسے پورا کرنے کی اس نے اپنی حد تک بھرپور کوشش کی۔ بعض اور معاملات میں بھی اس صبر و ضبط کے مظاہرے دیکھنے میں آئے۔ اجتماع کا پروگرام زیادہ تر اردو میں ہوتا تھا۔ دو ایک تقریریں انگریزی میں بھی ہوئیں لیکن نظم و ضبط کا یہ عالم یہ تھا کہ اس میں وہ نوجوان بھی خاص طور پر کیرلا کے نوجوان، پابندی سے شریک ہوتے تھے جو اردو نہیں سمجھتے تھے حالانکہ ان کی تعداد شاید ایک تہائی سے کم نہ ہوگی۔ ملیالم میں تقریروں کا مختصر سا خلاصہ بھی کبھی کبھی بیان ہو جاتا تھا۔ یہ صرف اطاعت اور نظم و ضبط کی پابندی کا جذبہ تھا ورنہ ایک ایسے اجتماع میں گھنٹوں شریک رہنا جس میں مقررین کی زبان ہی سمجھ نہ آئے آسان کام نہیں ہے۔ بڑے بڑے لوگ اس وقت صبر کا دامن چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

۲۷ دسمبر کی شب میں رات کا اجلاس چل ہی رہا تھا کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھوڑی دیر بعد بجلی بھی غائب ہو گئی لیکن جب اعلان کیا گیا کہ نوجوان صبر و ضبط کا مظاہرہ کریں اور اپنی جگہ خاموش اور سکون کے ساتھ بیٹھے رہیں تو پابندی اور ہمت کے ساتھ یہ نوجوان بیٹھے رہے۔ کسی قسم کی بھگدڑ یا افراتفری دیکھنے میں نہیں آئی۔ جب اجتماع ختم ہوا تو پورے وقار اور سکون کے ساتھ لوگ اپنی قیام گاہوں کی طرف لوٹے۔ لیکن اجتماع گاہ میں کہیں بارش سے بچنے کا کوئی سامان نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ یہ نوجوان مختلف تعلیمی اداروں، مساجد اور دوسرے مقامات پر پہنچے۔ زیادہ تر اسی اجتماع گاہ میں بارش میں بھیگتے رہے۔ بارش رات میں تین بجے ختم ہوئی۔ جاڑے کی بارش میں بھیگنے کے بعد کی کیفیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ خیال ہو رہا تھا کہ اب شاید آخری روز کی کارروائی ملتوی کرنی پڑے۔ لیکن یہ دیکھ کر لوگ حیرت میں پڑ گئے کہ صرف ایک گھنٹہ کی تاخیر سے پھر پروگرام شروع ہو گیا اور نوجوان اسی جوش و خروش کے ساتھ اس میں شریک ہو گئے۔ اس دن کے مختلف پروگراموں میں

جن قائدین نے خطاب کیا بیشتر نے اس جرأت وہمت کی تعریف کی، اور بنگلور کے عوام پر بھی اس کا اچھا اثر پڑا۔
بنگلور کے اخبارات و رسائل کا رویہ بھی بڑا اچھا رہا۔ انگریزی کے وہی اخبارات جن کے دہلی کے ایڈیشن مسلمانوں کے ساتھ ایک طرح کا تعصب برتتے ہیں اور ان کے زیادہ اہم اجلاسوں کی رپورٹنگ کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ ان ہی اخبارات کے بنگلور کے ایڈیشنوں میں اس کانفرنس کی کافی تفصیل سے رپورٹنگ ہوئی۔ اردو اخبارات تو اس کے ذکر سے بھرے رہتے تھے۔ اس اجلاس کے سلسلے میں مقامی انتظامیہ نے بھی کافی تعاون کیا۔

اس طرح کے اجتماعات میں کارکنوں کی ترغیب و تشویق کی وجہ سے بہت سے وہ لوگ بھی شریک ہو جاتے ہیں جو اسلام سے گہری وابستگی نہیں رکھتے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان اجتماعات سے ان کی ذہنی الجھنیں رفع ہو جاتی ہیں اور دین سے ان کا تعلق مضبوط ہو جاتا ہے، البتہ اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ ان اجتماعات کی پاکیزہ فضا سے ان کے اندر دینی رجحان ابھرتا ہے اور وہ بسا اوقات اس پر سنجیدہ غور و فکر کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ امید ہے اس اجتماع سے بھی اس طرح کا رجحان ضرور پیدا ہوا ہوگا اسے بڑھانے اور تقویت پہنچانے کی ضرورت ہے۔

اس کانفرنس کا بڑا فائدہ مجھے یہ نظر آیا کہ جو نوجوان اس میں دین سے اپنے تعلق ہی کی بنا پر شریک ہوئے تھے، خدا کا شکر ہے ان ہی کی تعداد زیادہ تھی، ان میں ایک جوش، امنگ اور ولولہ پیدا ہوا ہے۔ وہ دین پر چلنے، اس کی دعوت عام کرنے اور اسے قائم و غالب کرنے کا جذبہ لے کر اٹھے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ S.I.O. اس جذبہ سے کہاں تک فائدہ اٹھاتی ہے؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کی مدد فرمائے۔

اجتماعیات کا ایک اہم نکتہ

"جن لوگوں کو اجتماعیات کا کچھ تجربہ ہے وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ جو جماعت قوم کی اجتماعی اصلاح کے منصوبہ کے ساتھ اٹھے اس کی کامیابی کے لیے سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ اس کا عملی پروگرام اس کی جماعتی قوت و صلاحیت کے بالکل ہم وزن ہو۔ جس کی قوت صرف سیر بھر بوجھ اٹھا سکتی ہو اس کے اوپر من بھر بوجھ لاد دینا پرلے سرے کی حماقت ہے۔ جو لوگ دین اور دیانت، دونوں سے عاری ہوتے ہیں ممکن ہے اس طرح وہ اپنے بعض ذاتی مقاصد پورے کر لیتے ہوں، لیکن اس قسم کے اصحاب الاغراض کے ہاتھوں اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔"

(مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ)

تدبر، لاہور، سلسلہ نمبر ۱۹، نومبر ۱۹۸۶ء

میں بھی حاضر تھا وہاں

۲

حکیم خواجہ اقبال احمد ندوی

میں مولانا کی خدمت میں جیسا تھا اسی بے سروسامانی کی حالت میں پہنچ گیا تھا۔ اس لیے کوشش کے باوجود میرے کپڑے مولانا جیسے صاف وشفاف نہ رہ سکتے تھے، لیکن مولانا کے دسترخوان پر یا ان کی مجلس میں جس میں ذی حیثیت لوگ بھی موجود رہتے تھے میری کم حیثیتی کبھی میرے لیے وجہ خفت نہ بن سکی۔ مولانا کبھی کسی تقریب میں گئے تو مجھے ساتھ لے گیے اور اپنے قریب ہی بٹھایا۔ کوئی میرے متعلق دریافت کرتا تو ہمیشہ مجھے اپنے سفر ندوہ کی یادگار بتاتے۔ میری دنیا اب تک کتابوں اور ندوہ تک محدود تھی اور یہاں ایک وسیع تر دنیا سے سابقہ درپیش تھا۔ شاید اسی لیے شروع میں مولانا نے مجھے اپنے قریب ہی رکھا۔ میرے پہنچنے کے چند دن بعد ہی مولانا نے مجھے شاہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ مفصل ہدایات کے ساتھ پڑھنے کے لیے دے دی تھی اور یہ فرما دیا تھا کہ جہاں کہیں عبارت یا مفہوم سمجھ میں نہ آئے ان سے دریافت کر لیا کروں۔ چنانچہ میں ان کے باہری کمرہ میں بیٹھا اسے پڑھتا رہتا تھا اور جہاں ضرورت ہوتی جا کر دریافت کر لیتا۔ پھر کچھ دن بعد فارغ اوقات میں اپنے کتب خانہ کی فہرست تیار کرنے کا کام میرے سپرد کر دیا تھا۔ اس زمانہ میں مولانا قرآن مجید کا بڑا تفصیلی مطالعہ فرما رہے تھے۔ فہرست بناتے ہوئے میں جب شعرائے عرب کے دواوین پر پہنچا تو مولانا کے کتب خانہ میں کلام عرب اور اس کی شروح کا وسیع ذخیرہ دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا۔ میں نے سوچا کہ اس مصروفیت کے عالم میں مولانا کو کلام عرب پڑھنے کا موقع کہاں سے مل جاتا ہوگا۔ پھر جلد ہی مجھے کلام عرب کا مصرف معلوم ہو گیا۔ جب قرآن مجید کے بعض الفاظ کے مفہوم کے سلسلہ میں ایک بزرگ کی علمی تحقیق منصۂ شہود پر آئی تو اس میں بڑے بلند بانگ دعووں کے ساتھ قرآن کے ایک لفظ کا مفہوم، اس مفہوم کے خلاف متعین کیا گیا تھا جو قدیم مفسرین سے لے کر معاصر مفسرین قرار دے چکے تھے۔ تو میں نے دیکھا کہ قرآن مجید اور احادیث میں وہ لفظ جہاں جہاں آیا ہے وہ آیتیں اور احادیث مولانا الگ الگ شیٹ پر تحریر فرما رہے ہیں۔ پھر مفسرین محدثین اور اہل لغت نے جو مفہوم اس لفظ کے بتائے ہیں، انھیں مولانا دوسری

شیٹ پر لکھتے جاتے ہیں۔ اب تمام شیٹ سامنے رکھی ہیں اور مولانا ایک ایک دیوان اٹھاتے ہیں اور آگے پڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور جس جس شعر میں وہ لفظ آیا ہے وہ سب اشعار شاعر کے نام کے تحت لکھتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ سارے دیوان ختم ہو جاتے ہیں۔ اب مولانا ایک ایک دیوان اٹھاکران کے اندر آئے ہوئے اشعار کا مطلب لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ساتھ ہی شعر کا مطلب متعین کرنے کے سلسلہ میں شعر کے اندر آئے ہوئے اگر کسی دوسرے لفظ کے متعلق ضرورت ہوئی تو لغت کی طرف رجوع کرتے جاتے ہیں پھر اس لفظ کا قرآن و حدیث اور کلام عرب کے استعمال اور لغت و تفاسیر سے جو مفہوم متعین ہوتا ہے اسے اختیار کرتے ہیں۔ قرآن کے ایک لفظ کا مفہوم متعین کرنے کے سلسلے میں میں نے دیکھا ہے کہ مولانا کبھی کبھی دس بارہ دن کلام عرب، لغت، تفاسیر اور احادیث کا مطالعہ کرتے رہے۔ اس زمانہ میں کوئی مولانا کے کمرہ میں آتا تو یہی سمجھتا کہ تحقیق الفاظ کے علاوہ انھیں دنیا کی کسی دوسری چیز سے کوئی سروکار نہیں۔ قرآن کے کسی لفظ کا مفہوم متعین کرنے کے سلسلہ میں مولانا تفرد کو درست نہ سمجھتے تھے اور اس معاملہ میں ان کی شدت اور التزام کی یہ کیفیت تھی کہ کسی لفظ کا مفہوم لغت اور کلام عرب کا استعمال کچھ بھی بتلائے مگر جب تک اس کی تائید سلف کے کسی مفسر کے یہاں نہ مل جائے وہ اس مفہوم کو قبول نہ کرتے تھے۔ مولانا کی عادت کسی کام کو درمیان میں چھوڑنے کی نہ تھی۔ انھیں جو کام بھی پیش آجائے پہلے اس سے نپٹ لیتے تو آگے بڑھتے تھے وہ آج کا کام کل پر نہ چھوڑتے تھے۔

مولانا کے ساتھ کچھ دن رہتے ہوئے میں نے اپنی بعض کمزوریوں پر تو قابو حاصل کر لیا تھا البتہ میری ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی جھجک ابھی دور نہ ہوئی تھی۔ لیکن مولانا نے کبھی کچھ کہا نہیں۔ ان کی اصلاح کا انداز نرالا تھا۔ ایک دن عبدالرحیم صاحب کے یہاں جن سے میں انگریزی پڑھتا تھا، کوئی تقریب تھی۔ جس میں محلہ کے دوسرے حضرات کے علاوہ میں، مولانا اور ان کے پڑوسی ظفر اقبال صاحب مدعو تھے۔ سب لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ظفر اقبال صاحب نے دریافت کیا۔ مولانا! اقبال صاحب کے لیے آپ نے کورس کیا تجویز فرمایا ہے؟ مولانا کا جواب تھا۔ کورس کیا ابھی تو میں نے ان کے لیے "فورس" تجویز کیا ہے۔ اور یہ ضرب میری جھجک کے لیے ایسی کاری ثابت ہوئی کہ اس کے بعد اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہ گیا۔

اسی طرح ایک بار دہلی جاتے ہوئے مولانا تانگہ پر بیٹھ گئے تو مجھ سے فرمانے لگے۔ دہلی میں مجھے ہفتہ عشرہ لگ جائے گا۔ فلاں کتاب میری واپسی سے پہلے چھپ جاتی تو بہت اچھا ہوتا۔ میں نے دریافت کیا مولانا! اس سلسلہ میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟ فرمایا کتابت روزانہ جتنی ہوتی رہے، اسے کاتب کے یہاں سے لاکر اور تصحیح کر کے پریس بھیجتے رہیے۔ بیشتر حصہ دیکھ کر میں پریس بھیج چکا ہوں۔ میں نے عرض کیا بہتر ہے یہ کام میں انشاء اللہ کر لوں گا۔ فرمایا لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کاتب کے یہاں اور پریس پیدل نہ جائیں۔ سائیکل رکھی ہے دو دن میں آپ اسے چلانا سیکھ لیں

اور سائیکل ہی سے جائیں۔ مولانا کی یہ بات سن کر جب میں خاموش ہو گیا تو مولانا نے مسکرا کر باواز بلند ایک شعر پڑھا اور خدا حافظ کہہ کر دہلی روانہ ہو گئے۔ واپسی پر کتاب چھپ جانے کے ثبوت میں مطبوعہ کتاب کا ایک نسخہ پیش کر کے جب میں عرض کرنے لگا۔ مولانا کتاب ملاحظہ فرمائیں تصحیح میں ایک شوشہ کا بھی فرق نہیں رہ گیا ہے تو فرمانے لگے۔ اقبال صاحب اشاعت کتاب کی اطلاع سے پہلے مجھے آپ یہ بتائیں کہ سائیکل چلانا آپ کو آ گیا یا نہیں؟ اور جب میں نے عرض کیا مولانا! کاتب کے یہاں تو میں دوسرے دن صبح ہی سائیکل سے پہنچ گیا تھا۔ تب بہت خوش ہوئے اور دریافت کرتے رہے کہ کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔

مخاطب کی بات کو جس صبر کے ساتھ سننے کا مولانا کے اندر وصف تھا شاید ایسا وصف کم ہی لوگوں کے حصہ میں آیا ہو۔ بات کرنے والا چاہے جتنی دیر تک لایعنی بات ہی کرتا رہے لیکن مولانا درمیان میں ایک لفظ بھی نہ بولتے۔ وہ جب بالکل خاموش ہو جاتا تب ہی مولانا بولنا شروع کرتے۔ شروع شروع میں تو چند دن مولانا کی اس خاموشی کا مطلب میں نے یہ نکالا کہ شاید مولانا کے پاس ان دلائل کا جواب ہے ہی نہیں۔ مگر پندرہ بیس منٹ کی گفتگو میں دلائل کے ڈھیر کا جہاں انھوں نے دو تین جملوں میں تجزیہ کیا تو جواب دینے سے پہلے ہی معلوم ہو گیا کہ سارے دلائل ہوا میں تحلیل ہو گئے ہیں۔

مولانا کی ہمہ گیر عبقریت نے ان کے خصوصی میدان کے علاوہ علوم و فنون کے دوسرے شعبوں کو بھی اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اور ہر جگہ ان کی عبقری شان نمایاں تھی۔ میں نے انگریزی زبان کے بعض اسکالرز کو انگریزی زبان کے بعض الفاظ کے اوپر مولانا سے گفتگو کرتے سنا ہے۔ اور یہ طویل گفتگو مولانا جس صبر و سکون کے ساتھ سن رہے تھے اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس مقام پر مولانا کے لیے مجال گفتگو نہیں۔ گفتگو ختم ہوئی اور مولانا نے کچھ کھنکار کر آہستگی کے ساتھ بات کرنی شروع کی تو خیال ہوا کہ دو چار جملوں میں مولانا اس کے متعلق کچھ ارشاد فرما کر بات ختم کر دیں گے۔ لیکن دو ہی تین جملے کچھ رک رک کر اور آہستگی سے ادا ہونے کے بعد مولانا کی گفتگو نے اپنی طبعی شکل اختیار کر لی اور مولانا نے ہر لفظ کے اصل مفہوم، بعد کی صدیوں میں مفہوم کی تبدیلیوں اور ہر لفظ کے پشت پر جو تاریخ تھی اس پر روشنی ڈالنا شروع کی تو یہ اسکالرز بیٹھے حیرت سے مولانا کا منہ تکتے رہے اور میرا خیال ہے کہ انھیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ان کی فیلڈ میں بھی اس "مولوی" کی جگہ پیچھے نہیں آگے ہی ہے۔

اسی طرح مولانا کے مطالعۂ قانون کے سلسلہ میں میرے ایک نہایت محترم دوست مجھے اکثر اپنے ایک قریبی عزیز کے تاثرات سنایا کرتے ہیں۔ یہ عزیز ایک مغرب زدہ نوجوان تھے اور الہ آباد یونیورسٹی میں قانون کے ایک ذہین طالب علم تھے اجتماع ہر دوارہ کے موقع پر مولانا نے "کوڈیفکیشن آف اسلامک لاز" پر غور و خوض کرنے کے لیے وکلا حضرات کی ایک میٹنگ طلب فرمائی تھی۔ اس میٹنگ میں الہ آباد شہر کے مسلم وکلا بھی مدعو تھے اور شریک اجتماع وکلا میں یہی ان عزیز

کو جب یہ اطلاع ملی کہ کوئی مولوی صاحب ہیں جنھوں نے اسلامی قانون کی تدوین و تبویب پر گفتگو کرنے کے لیے وکلا حضرات کو مدعو کیا ہے تو بڑا تعجب ہوا۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ کوئی "مولوی" ماہر قانون سے ہدایہ اور شرح وقایہ پر تو کچھ بات چیت کر سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک قانون کی تدوین و تبویب کا معاملہ ہے۔ تو یہ فن قانون سے متعلق ایک امر ہے جس میں نہ تو ایک غیر ماہر قانون، قانون کے ماہرین کو کوئی مشورہ دے سکتا ہے نہ ہی اس پر کوئی باوزن گفتگو کر سکتا ہے۔ بہر حال ان کے کچھ بزرگ اور دوست واحباب میٹنگ میں شریک ہو رہے تھے۔ اس لیے یہ بھی تعجب اور تفنن کے ملے جلے جذبات کے ساتھ میٹنگ میں پہنچ گیے۔ میٹنگ شروع ہوئی اور مولانا نے اسلامی قانون اور اس کے متعلقات پر گفتگو کرنے سے پہلے اپنی بات کا آغاز اسلامی قانون کی دنیا کے تمام رائج قوانین پر برتری اور فوقیت سے شروع کیا اور اپنے دعوی کے ثبوت کے طور پر اسلامی قانون کا گریک اور رومن لاز سے جو دنیا کے تمام مروجہ قوانین کے باوا آدم سمجھے جاتے ہیں، تقابل شروع کیا۔ اور پھر ان قوانین کے بنیادی نقائص کی نشاندہی کرنے کے لیے انھوں نے ان اتھارٹیز کا انتخاب فرمایا جو گریک اور رومن لا پر آخری سند سمجھی جاتی ہیں۔ یہ عزیز اپنے بعض اساتذہ کے لکچروں میں کبھی کبھار ان اتھارٹیز کے ناموں کا صرف حوالہ ہی سنے ہوئے تھے۔ اس لیے مولانا نے اپنی گفتگو کی ابتدا جب ان اتھارٹیز پر تنقید سے شروع کی تو یہ چونکے۔ پھر یہ بھرپور تنقید جیسے جیسے آگے بڑھنے لگی یہ عزیز اپنے دل میں کہنے لگے یا اللہ! "یہ مولوی" ہے یا جنات! جس نے نہ صرف یہ کہ گریک اور رومن لا کو پڑھ رکھا ہے بلکہ اس پر اتنا کمانڈ ہے کہ ماہرین قانون کے مجمع میں اس اعتماد کے ساتھ تنقید کر رہا ہے اور ایک زبان بھی ایسی نہیں جو یہ کہہ سکے کہ مولانا! آپ گریک اور رومن لا کی ترجمانی ٹھیک طور پر نہیں کر رہے ہیں۔ مولانا بول رہے تھے اور سارے ماہرین قانون ان کا منہ تک رہے تھے۔ پھر مولانا آخر میں جب اسلامی قانون کی تدوین و تبویب پر پہنچے تو ان عزیز کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اب اس مرحلہ پر تو یہ ماہرین قانون، مولانا کی کچھ رہنمائی فرمائیں گے لیکن اس مرحلہ پر بھی ماہرین قانون بس سامع ہی بنے رہے۔ اور اللہ کا حکم ایک "مولوی" کی یہ قانون دانی ایک مغرب زدہ نوجوان کی زندگی کا رخ موڑنے کا ذریعہ بن گئی۔ وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔ اللہ کی بخشی ہوئی یہ غیر معمولی صلاحیتیں جس شخص کو بھی حاصل ہوں، اسے ہم نابغۂ روزگار کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

مولانا کی مجلس کی خصوصیت تھی کہ جو شخص جس عزت و احترام اور شفقت و محبت کا مستحق تھا وہ اپنے حق سے محروم نہ رہنے پاتا۔ مخاطب چاہے جیسے ہی بات کرے لیکن جواب میں مولانا کے منہ سے ایک لفظ بھی ایسا نہ نکلتا جس سے اس کے جذبات کو ٹھیس لگے۔ کوئی شخص مولانا کے جواب سے مطمئن ہو سکتا یا نہ ہو سکتا مگر ان کی شرافت نفس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ میرے سامنے مولانا سے ملاقات کرنے بعض ایسے حضرات بھی تشریف لائے جن کے نظریات مولانا کے نظریات سے مختلف تھے۔ چنانچہ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی اپنے داماد کے ساتھ بھی اور تنہا بھی تشریف لائے۔ اور یہ طویل گفتگو مختلف فیہ مسائل تک بھی پہنچ جاتی رہی۔ لیکن مولانا سندھی صاحب کے اپنے نظریات

میں انتہائی شدید ہونے کے باوجود بھی مسلہ کی بات چیت ہمیشہ نہایت خوش گوار ماحول ہی میں ہوئی۔ مولانا سندھی صاحب مولانا سے بڑی محبت فرماتے تھے۔ اسی طرح مولانا بھی ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مولانا سندھی صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد، مولانا دیر تک ان مصائب پر تاسف فرماتے رہے جو مولانا سندھی صاحب کو برداشت کرنے پڑے تھے۔ اور تفصیل سے مجھے روس کے وہ حالات بتاتے رہے جن سے مولانا سندھی صاحب کا ذہن متاثر ہوا تھا۔

ایک دن جوش ملیح آبادی بھی مولانا سے ملنے تشریف لے آئے۔ جوش صاحب نے مجھ سے مولانا کا کمرہ دریافت کیا اور اندر تشریف لے گئے۔ نصف گھنٹہ کے بعد مولانا نے مجھے بلا کر جوش صاحب کے لیے اپنی کتابوں کا ایک سٹ لانے کو کہا۔ میں کتابیں پیک کرکے لے گیا تو مولانا انھیں غور سے کتابیں پڑھنے اور سنجیدگی کے ساتھ اسلام کو سمجھنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ جوش صاحب گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مولانا کے کمرہ میں رہے پھر کتابوں کا پیکٹ لے کر واپس تشریف لے گئے۔

مولانا کی ہمہ گیر شخصیت اپنے اندر بے شمار گوشے رکھتی تھی اور ہر گوشہ کا یہ حال ہے کہ

؎ کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

ایسی صورت میں ان کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ تو ممکن نہیں۔ البتہ بعض گوشوں کی طرف اشارے ضرور کیے جا سکتے ہیں۔ مولانا کی شخصیت میں "حسن طبیعت" اور "سوز دروں" نے مل کر ایک نہایت دلآویز حسین امتزاج کی شکل اختیار کرلی تھی۔ کوئی شخص موجود ہوتا اور موقع و محل کی مناسبت سے یا اپنی کسی حرکت سے مزاح کا موقع فراہم کر دیتا تو مولانا اس کا لطف لینے سے نہ چوکتے۔ لیکن کوئی شخص موجود نہ ہوتا اور وہ اپنے خط میں اس قسم کا بڑے سے بڑا موقع فراہم کر دیتا تو مولانا اس سے اس طرح گذر جاتے جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ مولانا کی کسی علالت کے دوران، ایک بار میں انھیں خطوط سنا رہا تھا اور وہ جواب املا کرا رہے تھے۔ خطوط سناتے ہوئے میں جب ایک ایسے صاحب کے خط پر پہنچا جو اپنی لڑکی کی شادی کے مسئلہ میں بہت فکرمند تھے مگر اس بات کو انھوں نے اس طرح لکھا تھا کہ میں اپنی لڑکی کی شادی کے درپے ہوں۔ میں نے اس جملہ کو پڑھا تو مولانا نے فرمایا کیا؟ میں نے دوبارہ جملہ پڑھ دیا تو فرمایا اچھا، اچھا۔ آگے پڑھیے۔

مولانا کی ڈاک میں ایسے خطوط بھی آتے رہتے تھے جنھیں پڑھتے ہوئے ہنسی کا ضبط کرنا مشکل ہو جائے اور ایسے بھی جنھیں پڑھ کر طبیعت جھلا اٹھے۔ اور ایسے بھی جنھیں پڑھتے وقت غصہ کا ضبط کرنا مشکل ہو جائے۔ مگر مختلف اقسام کے ان خطوط کو پڑھتے وقت میں نے مولانا کے ہونٹوں پر نہ کبھی مسکراہٹ دیکھی نہ ہی ان کے چہرے پر کبھی جھلاہٹ اور غصہ کا کوئی اثر دکھائی دیا۔ وہ ہر چیز سے انتہائی سکون کے ساتھ گذر جاتے اور جو کام کی بات ہوتی اس کا جواب دیتے اور لایعنی باتوں سے کوئی تعرض نہ کرتے۔ مولانا کے نام آیا ہوا کوئی خط قطع نظر اس کے کہ وہ کس انداز میں لکھا گیا ہے اور

کن مسائل سے متعلق اس کے ذریعہ مولانا کی رائے طلب کی گئی ہے، کبھی جواب سے محروم نہ رہتا۔ چنانچہ مولانا کی خدمت میں اپنے پہنچنے کے تھوڑے ہی دن بعد ایک مرتبہ جب میں اپنی کتاب کے کسی مشکل مقام کو سمجھنے کے لیے مولانا کے کمرہ میں داخل ہوا تو وہ ایک خط کے مطالعہ میں مشغول تھے۔ متعلقہ مقام مجھے سمجھانے کے بعد مولانا نے وہ خط یہ کہتے ہوئے میری طرف بڑھا دیا "دیکھیے یہ صاحب کیا فرماتے ہیں؟" میں نے وہ خط لے کر مشکل سے چند سطر اس کی پڑھیں اور جب ہنسی کا روکنا ناقابل برداشت ہو گیا تو میں وہ خط لے کر مولانا کے کمرہ سے باہر نکل آیا۔ یہ طویل اور بدخط تحریر کسی عربی مدرسہ کے فاضل کی تھی جو اپنی مزید تعلیم کے لیے مصر یا کسی دوسری جگہ کے لیے جلد عازم سفر تھے اور وہاں جانے سے پہلے مولانا سے مفصل ملاقات کے خواہش مند تھے۔ مگر ان کی یہ سیدھی سادی بات، ان کے غیر مانوس استعاروں، بے ہنگم تشبیہات اور اس مصنوعی زبان میں جسے پڑھنے کے بعد ہنسی کا ضبط کرنا مشکل ہو جائے، ایسا گم ہو گئی تھی کہ اس تک میری رسائی نہیں ہو سکی۔ اور میں نے واپس جا کر ان کے بعض مضحک جملے مولانا کو سنا دیے۔ مولانا اس وقت کسی دوسرے خط کا جواب لکھنے لگے تھے اس لیے مجھ سے وہ خط لے کر انھوں نے رکھ لیا اور کچھ کہا نہیں۔ تیسرے دن اس خط کے جواب کا لفافہ میرے حوالہ کرتے ہوئے مولانا نے مجھے آئندہ اس قسم کی غلطی سے بچنے کی ہدایت فرمائی جو میں نے متعلقہ خط کو سمجھنے کے سلسلہ میں کی تھی۔

اسی طرح ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ ایک صاحب کے ایسے طویل خط کے جواب میں جو ان کی عبادت و ریاضت کی تفصیلات اور ان کے کانوں میں "بشارت" کی ان آوازوں کی تفصیل پر مشتمل تھا، کہ "تم جبرئیل ہو" مولانا نے ان کے لیے محض ایک "حریرہ" کے تجویز کر دینے، سوتے وقت سر پر "روغن کدو کا ہو" کی مالش کرنے اور "ریاضت" سے اجتناب کی تاکید پر اکتفا کر لیا تھا۔ اور آخر میں تحریر کر دیا تھا کہ ۴۰ دن تک اس ہدایت پر وہ سختی سے عمل پیرا ہوں۔ انشاءاللہ ۴۰ دن سے پہلے پہلے ان کے کانوں میں آوازوں کا آنا بند ہو جائے گا۔

مولانا کی ڈاک میں ایسے خطوط بھی آتے رہتے تھے جن میں بعض اخلاقی کمزوریوں میں مبتلا اشخاص، ان برائیوں سے نجات پانے کے لیے مولانا کا مشورہ طلب کیا کرتے تھے۔ اس قسم کے خطوط لکھنے والوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے جن کی تعلیم و تربیت، وضع قطع اور ان برائیوں کے درمیان کوئی جوڑ نہ ہوتا۔ لیکن میں نے ایسے خطوط سنتے وقت، مولانا کے چہرے پر کرب کے سوا اور کوئی دوسری چیز نہیں دیکھی۔ جواب میں تو مولانا جو مناسب حال مشورہ رہتا وہ دے دیتے لیکن بعد میں کبھی میں نے مولانا کو اشارہ و کنایہ میں بھی ان چیزوں کا تذکرہ کرتے نہیں سنا۔ مولانا کی یہ روش صرف خطوط کے معاملہ ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ زندگی کے عام معاملات میں بھی وہ اسی روش پر بڑی سختی سے عمل پیرا رہے۔

اسی طرح کا ایک معاملہ، مولانا اور طبقۂ علماء کے درمیان کے ایک بزرگ کی رفاقت کا ہے۔ اپنے عنفوان شباب میں مولانا ان بزرگ کے خلوص و للہیت سے بہت زیادہ متاثر تھے اور دل سے ان کا ادب و احترام کرتے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ اس زمانہ میں ایک بہت اہم مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مولانا کو متعلقہ مسئلہ کے ان دو رخوں کے درمیان جو

نمایاں ہو کر سامنے آگئے تھے، بہت نمایاں تضاد محسوس ہوتا تھا۔ جب کہ یہ بزرگ نہ صرف یہ کہ متعلقہ تضاد کے قائل نہیں تھے بلکہ وہ اس کے داعی بھی تھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے بہت ٹھیک ہو رہا ہے۔ چنانچہ مولانا اور ان بزرگ کے درمیان بحث و تمحیص ہوتی رہتی تھی مگر یہ بزرگ دلائل شرعیہ سے مذکورہ تضاد کو رفع کرنے سے قاصر رہتے تھے۔ پھر ڈیڑھ مہینہ کی بحث و تمحیص کے بعد بھی معاملہ جہاں تھا وہیں باقی رہا تو مولانا نے مجبور ہو کر اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے قلم کا سہارا لیا۔ مضمون کی پہلی قسط شائع ہوئی تو اس کا نوٹس نہیں لیا گیا۔ دوسری قسط شائع ہوئی تو اس کا شدید ردعمل ہوا اور ہر طرف چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ پھر رات کے بارہ ۱۲ بجے مضمون کی آخری قسط مکمل کرنے میں جب مولانا منہمک تھے تو یہ بزرگ مولانا کے کمرہ میں تشریف لے آئے۔ ان کی اس ناوقت کی زحمت فرمائی سے مولانا کو سخت ندامت ہوئی اور مولانا عرض کرنے لگے۔ مولانا! آپ نے یہ زحمت کیوں فرمائی؟ کوئی ضرورت تھی تو مجھے کیوں نہیں طلب فرما لیا؟ میں فوراً حاضر ہو جاتا۔ فرمانے لگے کوئی کام نہیں تھا۔ بس لیٹے لیٹے یوں ہی یہ خیال ہوا کہ کبھی تمہارا کمرہ نہیں دیکھا اور چلا آیا۔ بہر حال تم اس کا کوئی خیال نہ کرو اور اطمینان سے بیٹھو۔ پھر یہ بزرگ بیٹھ کر کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور جب چلنے لگے تو ایک تھیلی نکال کر مولانا کے آگے رکھ دیا اور فرمانے لگے۔ اسے رکھ لو یہ جو تم نے لکھنا وکھنا شروع کر دیا ہے، اس کو بند کر دو۔ مولانا نے عرض کیا مولانا! تھیلی مسئلہ کے حق ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔ آپ دلائل شرعیہ سے میری غلطی مجھ پر واضح کر دیں تو میں جس شدت سے اب تک اپنا نقطۂ نظر واضح کر چکا ہوں کل ہی اس سے زیادہ شدت سے اپنے نقطۂ نظر کی تردید کر دوں گا۔ پھر بھی یہ بزرگ یہی فرماتے رہے۔ کہ بحث نہ کرو۔ جو کہتا ہوں آپ مان لو۔ اور یہ لکھنا وکھنا بند کر دو۔ مگر مولانا کی حیات میں وہ تھیلی ہی نہ بن پائی جو ان کا منہ بند کر سکے اس لیے ان کے قلم کا منہ کیا بند ہوتا۔ البتہ یہ بزرگ کچھ دیر بیٹھے جھک مارتے رہے پھر پشیمان ہو کر چلے گئے۔

ایک دینی رہنما کی طرف سے خلوص و للّٰہیت کا یہ مظاہرہ، ایک ایسے حساس نوجوان کے لیے جسے ابھی اسلام کے مطالعہ کا پورا موقع نہیں مل سکا تھا، ایک ایسا حادثہ تھا جو اسے اسلام سے دور پھینک دینے کے لیے بہت کافی تھا مگر زندگی کے ایسے نازک موڑ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے اُس نقش نے جو بچپن ہی سے دل و دماغ پر بیٹھا ہوا تھا دستگیری کی اور جن قدموں کے لیے پیچھے ہٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، انھیں سہارا دے کر آگے بڑھا دیا۔ پھر مولانا کے خلاف جب کفر کے فتوں کی ہوا چلی تو یہ بزرگ دوسروں سے پیچھے نہیں رہے مگر مولانا نے جس صبر کے ساتھ دوسروں کی نوازشوں کو برداشت کیا اسی صبر کے ساتھ اپنے ایک بزرگ کی نوازش کو بھی برداشت کر لیا۔ اور ان کے نوک قلم پر ایک لفظ بھی ایسا نہیں آسکا جو اس حادثہ کی طرف اشارہ کرنے والا ہو۔

اسی طرح "جماعت اسلامی" کے ایک ذمہ دار فرد اور ہمارے لاہور اور دار الاسلام کے ایک رفیق اور مولانا کے درمیان کی رفاقت کا معاملہ ہے۔ ان کی بعض "اخلاقی کمزوریوں" کا جب مولانا نے شدید نوٹس لیا تو انھوں نے

دارالاسلام میں رہ کر بھی اور دارالاسلام سے جانے کے بعد بھی "جماعت" کی بساط لپیٹ دینے اور مولانا کے خلاف بدگمانیاں پھیلانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اور ان کو ہی نہیں شاید کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہو کہ ان کی اس حرکت کی اطلاع، مولانا کو ان رفیق کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے انتہائی قابل اعتراض خطوط بھیج کر کی گئی تھی، مگر مولانا نے اپنے خلاف بدگمانیوں اور جماعت کے نقصان سب کو برداشت کر لیا۔ لیکن ان کے متعلق کچھ لکھنا یا ان کے خطوط کو شائع کر دینا تو کجا، کبھی ان کی اس حرکت کا تذکرہ بھی زبان پر لانا گوارا نہ کیا۔

اسی طرح مولانا اور ان کے ایک رفیق کے درمیان کی مراسلت کا معاملہ ہے۔ چنانچہ اس مراسلت کو بنیاد بنا کر جب مولانا اور "جماعت اسلامی" کے خلاف شکوک و شبہات پھیلانے اور غلط فہمیاں پیدا کرنے کی مہم شروع ہوئی تو اس مہم کے مختلف مراحل میں متعلقہ مراسلت کو شائع کرنے کی اجازت طلب کرنے والے مولانا مودودی کے خطوط کے جواب میں بھی جب وہ رفیق اس مراسلت کو صیغۂ راز میں رکھے جانے کی اپنی سابقہ درخواست کا اعادہ ہی کرتے رہے تو مولانا مودودی نے ایک قدیم رفیق کی التجاؤں کا پاس و لحاظ کر کے ان نقصانات کو برداشت کر لیا جو ان کی شخصیت اور "جماعت اسلامی" کو پہنچ رہے تھے۔ اور صرف یہی نہیں کہ اس مراسلت کو شائع کر کے شکوک و شبہات کے دفتر کو ہمیشہ کے لیے بند کر دینے سے باز رہے ——— کیونکہ متعلقہ مراسلت کی اشاعت سے ان کے ایک قدیم رفیق کے عیوب کی پردہ دری ہو جاتی ——— بلکہ اپنی مجلس میں بھی کبھی ان چیزوں کا تذکرہ تک زبان پر لانا پسند نہیں کیا جو وہ رفیق "دارالاسلام" میں کر کے گئے تھے۔ دوسروں کے عیوب کی پردہ دری مولانا کے مقام سے فروتر تھی۔

نظافت مولانا کا مزاج بن گئی تھی۔ اور اسے حسن طبیعت کے ساتھ سوز دیوں کے امتزاج کی برکت کے سوا اور کیا کہوں کہ یہ چیز اپنے ساتھیوں ——— جن میں ہر مزاج اور ہر طبیعت کے افراد شامل تھے ——— میں سے کسی کو ذلیل و حقیر سمجھنے کا باعث نہ بن سکی۔ اور دوسروں کے متعلق کیا کہوں میں خود اپنے مطالعہ اور اپنے کاموں میں مست رہتا تھا اور مجھے دوسری چیزوں کی کچھ زیادہ سدھ بدھ نہ رہتی تھی۔ جاڑوں کے دن تھے۔ مولانا کا پورا گھر دہلی جا رہا تھا۔ چلتے وقت مولانا نے مجھ سے فرمایا۔ ہم لوگ کئی دن کے لیے دہلی جا رہے ہیں۔ آپ رات کو میرے کمرہ میں آ کر لیٹ رہا کیجئے گا۔ میں نے عرض کیا، بہتر ہے میں لیٹ رہوں گا۔ فرمایا اپنا بستر لانے کی ضرورت نہیں، کمرہ میں بستر ہے۔ مجھے خود اپنے کپڑوں کے زیادہ شغاف نہ ہونے کی بنا پر مولانا کے بستر پر لیٹنے سے کچھ تکلف سا تھا اس لیے میں نے عرض کیا کہ کمرہ کا بستر لپیٹا ہوا رکھا ہوگا۔ اسے کھولنے کی کیا ضرورت ہے، میں اپنا کمبل وغیرہ لیتا آؤں گا اور لیٹ رہوں گا۔ فرمایا میں اپنا بستر ساتھ نہیں لے جا رہا ہوں میرا بستر بچھا ہوا ہے اسی پر آ کر لیٹ رہئے گا۔ اب اس کے آگے تو کسی عذر کی گنجائش تھی نہیں اس لیے عرض کیا بہتر ہے۔

مولانا کی خدمت میں حاضری سے قبل، مولانا کی زندگی کے متعلق جو بات کان میں پڑ چکی تھیں، ان کی بنا پر مولانا کا بستر دیکھ کر خیال پیدا ہوا کہ اس پر لیٹتے ہی تو اندر دھنس ہی جاؤں گا۔ لیکن مولانا کا بستر تو ایک متوسط درجہ کے گھر کے بستر سے

زیادہ نرم نہ نکلا۔ نیچے ایک کمبل بچھا ہوا تھا اوپر ایک صاف وشفاف چادر تھی اور دو لیا ہی صاف و شفاف تکیہ، لحاف کی جگہ ایک ہلکی سی دلائی رکھی تھی جس میں روئی کے بجائے پر بھرے ہوئے تھے۔ اور ایک کمبل یہ تھی سخت سردی میں مولانا کے بستر کی کل کائنات۔ اور پھر کئی راتیں مولانا کے کمرہ میں ان کے بستر پر لیٹ کر ان کی زندگی کی ہر چھوٹی بڑی چیز کے متعلق سوچتا رہا۔ یہ تھا مولانا کا وہ بستر جس کے متعلق کیا کیا قیاس آرائیاں نہ ہوئی ہوں گی۔

مولانا سے ملاقات کرنے جس قسم کے لوگ تشریف لاتے رہتے تھے ان میں اہم شخصیتیں بھی ہوتیں اور غیر اہم بھی، غنی بھی ہوتے اور فقیر بھی، اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہوتے اور کم پڑھے لکھے لوگ بھی، دینی درس گاہوں کے اساتذہ بھی ہوتے اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر بھی، بڑے زمیندار بھی ہوتے اور معمولی کاشت کار بھی مقدس ہستیاں بھی ہوتیں اور سیہ کار بھی۔ اور تشکیل جماعت سے پہلے چونکہ مہمان خانہ کا باقاعدہ نظم نہیں تھا اس لیے ان مختلف حیثیت وصلاحیت کے لوگوں کا مولانا کے دستر خوان پر اجتماع بھی ہو جایا کرتا تھا۔ اور مولانا کے ہر چھوٹے بڑے کام کی طرح، مولانا کا دستر خوان بھی مولانا کی شخصیت کا آئینہ دار تھا چنانچہ یہ تو تھا ہی کہ مولانا کی مجلس میں ہر شخص جس عزت واحترام اور شفقت ومحبت کا مستحق ہوتا وہ اس سے محروم نہ رہنے پاتا۔ لیکن مولانا کے دستر خوان پر اس سے بھی آگے ہر چھوٹے بڑے کی حیثیت مولانا کے مہمان کی ہوتی اور ایک مہمان اور دوسرے مہمان کے درمیان وہ کوئی فرق نہ کرتے۔ اور کھانے پینے کی ادنیٰ واعلیٰ اشیاء سے لے کر مولانا کے لطف وعنایات تک کسی چیز میں بھی ان کے کسی شریک دستر خوان کا حصہ "دور کا جلوہ" نہ ہوتا۔ مولانا کا دستر خوان تھا تو ایک اوسط درجہ کا دستر خوان لیکن اپنی نفاست، خوش سلیقگی اور حسن ترتیب کی بنا پر اسے ایک امتیازی شان حاصل تھی۔ مولانا کے دستر خوان پر سب سے زیادہ لذیذ ان کی باتیں ہوتیں۔ برادر محترم ملک غلام علی لقمہ بہت چبا چبا کر کھانے کے قائل تھے اس لیے مولانا کو ان کا ساتھ دینے کے لیے دیر تک دستر خوان پر بیٹھنا پڑ جاتا۔ ایسے مواقع پر جب سب لوگ ملک صاحب کا ساتھ دینے کے لیے دستر خوان پر بیٹھے ہوتے تو کبھی کبھی مولانا ہنس کر ایسی باتیں کرتے جس سے ہمت شکنی کے بجائے ملک صاحب کی ہمت افزائی ہوتی۔ دریافت خیر وعافیت کے بعد استفسارات کے نتیجہ میں مولانا کے دستر خوان پر دنیا جہاں کے موضوعات، جدید کتب واخبارات اور رسائل کے اہم حصے پھیل جاتے اور مولانا ہلکے پھلکے جملوں میں ہر چیز پر تبصرہ کر ڈالتے۔ اس طرح لذت کام ودہن کے ساتھ ساتھ دل ودماغ کے لیے بھی غذا کا سامان فراہم ہو جاتا۔

مولانا کو پخت وپز کے باب میں بھی کچھ درک تھا۔ کبھی کھانوں پر بات چل پڑتی تو مولانا کھانوں پر نہ صرف یہ کہ بات کرتے رہتے بلکہ بعض چیزوں کے پکانے کی ترکیب بھی بتا دیتے چنانچہ مولانا کی یہ واقفیت ایک موقع پر ہم لوگوں کے بڑے کام آئی۔ دارالاسلام میں ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ وہاں کی تمام خواتین بیک وقت اپنے اپنے میکے تشریف لے گئیں اور جو آدمی ہم لوگوں کا کھانا پکاتا تھا وہ بھی اپنے گھر چلا گیا اور ہم لوگ کھانا پکانے کے معاملہ میں بالکل اناڑی تھے

چاول تو کسی طرح پکا پکا لیا بھی لیتے لیکن روٹی پکانا کسی کو نہ آتا تھا۔ پھر باہر سے مہمان بھی آتے رہتے جن کا اکرام بھی ضروری
رہتا لیکن مولانا کی رہنمائی میں ہم لوگوں کو چاول پر خوب خوب جوہر دکھانے کے مواقع ملے مشق چاول ہی پر ہوتی لیکن دونوں
وقت بحر و قافیہ بدلتے رہتے۔ یہ لیل و نہار تھے جب دہلی سے اقبال حسین صاحب تشریف لائے۔ رات کے کھانے پر جب
انھیں تفصیلات معلوم ہوئیں تو فرمانے لگے مولانا حکم ہو تو کل میں آپ لوگوں کو گوشت کریلا کھلاؤں۔ مولانا نے جواب دیا
اقبال صاحب اس سے اچھی اور کیا بات ہوسکتی ہے لیکن پہلے یہ بتلائیے کہ آپ کا گوشت کریلا کہیں کریلا اور نیم چڑھا
تو نہیں ہو جائے گا۔ اقبال صاحب بڑے اعتماد کے ساتھ بتاتے رہے کہ ترکیب ایسی ہے کہ پکنے پر پتہ لگانا مشکل
ہو جائے گا کہ کریلا ہے یا کدو۔ اقبال صاحب کے اس طرح اطمینان دلانے کے بعد مولانا نے مجھے حکم دیا کہ فجر بعد ہی
جاکر گوشت اور خرید لاؤں۔ پھر اقبال بھی گوشت کریلا تیار کریں۔ چنانچہ میں فجر بعد ہی پٹھان کوٹ جاکر گوشت اور
کریلا لے آیا۔ پھر اقبال صاحب جو بتاتے رہے اس میں حیرت اور تفریح کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ان کا ہاتھ بٹاتا
رہا، ہیڈ باورچی تو اقبال صاحب ہی تھے، میری حیثیت تو صرف ان کے معاون کی تھی۔ مولانا کئی بار آکر اقبال صاحب
کے کمالات دیکھ گئے لیکن دخل کسی چیز میں نہیں دیا۔ اسی طرح رفقاء بھی آتے جاتے رہے۔ اقبال صاحب ایک ماہر
باورچی کی طرح "دیگ" اترنے سے پہلے "دیگ کے چاولوں" کے کمالات بیان کر کرکے اشتہا کو تیز کرتے رہے۔ آخر
میں سب لوگ کھنچ آئے اور جیسے ہی اقبال صاحب نے فرمایا "تیار ہے"، سب لوگ دیگچہ اٹھا لے گئے۔ چاول پہلے ہی
پک چکا تھا اقبال صاحب آج اپنی پوری جولانی طبع پر تھے اس لیے ماہر باورچی کے فرائض انجام دیتے ہوئے نفیس
نے سب کی پلیٹوں میں گوشت کریلا نکالا۔ اب جو ہر شخص جلدی جلدی لقمہ منہ کو لے گیا تو ہنستے ہنستے بے دم، اور
اقبال صاحب ہنسنے میں سب کے آگے۔ اقبال صاحب کا گوشت کریلا واقعی کریلا اور نیم چڑھا ہو گیا تھا۔ بہر حال کسی
طرح سب نے اس نوش جان کیا اور اس مزہ نے اس اضمحلال کو دور کر دیا جو چاول کھاتے کھاتے پیدا ہو گیا تھا۔
پھر اقبال صاحب کی بے پناہ محبت دوسروں کی مدد کرنے کا غیر معمولی جذبہ اور ان کی دوسروں کو کھانا
پکاتے دیکھ کر اس سے اخذ کردہ تراکیب چاول خوری کی اس مہم میں ہم لوگوں کے
لیے بڑا سہارا ثابت ہوئیں۔ اب جو ٹیم بھی میدان میں اترتی اقبال صاحب عملاً اس کی مدد کرتے۔ پھر اللہ نے روٹی
پکنے کا بندوبست کر دیا۔ اس طرح یہ مرحلہ ہنسی خوشی گذر گیا۔

دارالاسلام مجھے پہنچے ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ ایک دن فجر بعد نظر جو اٹھی تو دیکھتا کیا ہوں کہ مولانا
لدے پھندے مہمان خانہ کی طرف تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے دوڑ کر مولانا کے ہاتھ سے کیتلی، پیالیاں چائے کے
دوسرے لوازمات اور اسٹوو کو لیا اور عرض کیا مولانا خیریت تو ہے کہاں تشریف لیے جا رہے ہیں؟ فرمایا آپ ہی
لوگوں کے پاس آ رہا تھا۔ آج آپ لوگوں کو چائے پلانے کا ارادہ ہے۔ میں سامان لے کر اندر پہنچا۔ مولانا

اور ان کے ساتھ یہ چائے کا ساز و سامان دیکھ کر سب لوگ اٹھ پڑے اور ہر شخص کوشش کرنے لگا کہ چائے وہ بنائے لیکن مولانا نے یہ کہہ کر کہ آپ حضرات بیٹھ جائیں اور پہلے یہ دیکھ لیں کہ چائے کیسے بنتی ہے، پھر چائے بنائیے گا سب کے جوش و خروش کو ٹھنڈا کر دیا۔ سب لوگ مجبورًا بیٹھ گئے۔ پھر مولانا نے خود ہی اسٹو جلا کر پانی گرم کیا کھولتے ہوئے پانی سے کیتلی اور پیالیوں وغیرہ کو دھو کر ان کا پانی خشک کیا۔ اس کے بعد دوسرا پانی اسٹو پر چڑھا کر چائے کو دم کیا اور کیتلی کو سرپوش سے ڈھک کر دودھ گرم کرنے لگے۔ درمیان میں بتلاتے گئے کہ اس زاویہ سے بھاپ اوپر اٹھنے لگے تو پتی ڈالنے کے لیے تیار ہو جائیے اور اس زاویہ سے اٹھنے لگے تو فورًا پتی ڈال کر برتن اتار لیجئے اور اس میں ذرا سی بھی تقدیم و تاخیر ہوئی تو چائے گئی۔ دودھ گرم ہو گیا تو مولانا نے خود ہی چائے بنا کر سب کو دی۔ اس طرح جب تک مولانا کے بچے واپس نہیں آ گئے، مولانا روز فجر بعد تشریف لے آتے اور خود چائے بنا کر ہم لوگوں کو پلاتے اور ہم سب کا حال "تک تک دیدم دم نہ کشیدم" کا سا رہتا۔ مولانا کسی کو کچھ کرنے ہی نہ دیتے۔ مولانا کی بنائی ہوئی چائے پی کر معلوم ہوا کہ ہم لوگ اب تک چائے نہیں پیتے رہے بلکہ جھک مارتے رہے۔ آہ! آں قدح بشکست و آں ساقی نماند (جاری ہے)

آخری نبی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات

سلطان احمد اصلاحی

زندگی کی وسیع جہتوں کا احاطہ کرنے والی حضرات انبیاء علیہم السلام کے اوصاف وخصوصیات کا مطالعہ نامکمل رہے گا جب تک سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف وخصوصیات پر بھی ایک نظر نہ ڈالی جائے۔ جن کے ذریعہ اس دین قدیم کا اقصائے عالم میں بول بالا ہوا۔ اور دنیائے انسانیت کے سامنے اسے اپنی واقعی تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہونے کا موقعہ ملا۔

حکم خدا کی بے لاگ پیروی:

قرآن میں سورۂ احزاب آخری نبیؐ کے حقوق کے بیان کی سورہ ہے۔ جس میں امت محمدیہ کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ گذشتہ قوموں کی تقلید نہ کرکے اپنے نبیؐ کے ادب واحترام کا حق ادا کرے گی۔ پچھلی امتوں نے اپنے نبیوں کی ناقدری کی۔ انھیں طرح طرح سے ستایا اور ایذا پہنچائی۔ اس امت کو حکم ہوا کہ ان کی روش کے برعکس اپنے رسولؐ پر عقیدت ومحبت کے پھول نچھاور کرکے ہی وہ دنیا وآخرت کی سعادتوں سے اپنے کو ہمکنار کرے گی۔ اسی حق شناسی کی خاطر قرآن نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ان اوصاف وخصوصیات کا ذکر بڑے وجدانگیز انداز میں کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۝ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُم مِّنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا ۝ (۴۵-۴۷)

اے نبی ہم نے تم کو گواہی دینے والا، خوشخبری سنانے والا، ڈرانے والا، اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن چراغ بناکر بھیجا ہے۔ اور اہل ایمان کو خوشخبری سنادو کہ اللہ کی طرف سے ان کے لیے بڑا انعام ہے۔

ان اوصاف عالیہ کے بیان کے بعد ہی اگلی آیت میں فرمایا:

وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ وَدَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا

اور کافروں اور منافقوں کی بات نہ مانو اور ان کی ایذا رسانی سے صرف نظر کرو۔ اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ اور اللہ کی

(احزاب ۴۰) کی ذمہ داری کافی ہے۔

جس کا صاف مطلب ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ان اوصاف عالیہ کا حق اسی وقت ادا کر سکتے ہیں اور یہ ان اوصاف کا لازمی اور صریحی تقاضا ہے کہ وہ خدائی شریعت کو بے کم وکاست اور کسی ایک شوشے کی تبدیلی کے بغیر لوگوں تک پہنچا دیں۔ اور مخالفتوں کے طوفان کی کوئی بے پروا کیے بغیر اپنی پوری زندگی میں خدائی احکام و فرامین کی بے لاگ پیروی کو لازم پکڑلیں۔ ماحول اور حالات کی ناسازگاری اور سماج کے کسی دباؤ کے نتیجے میں آپ اپنی جگہ سے ایک انچ ہٹنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ اور کوئی بڑی سے بڑی دھمکی اور ڈر آپ کو اس سلسلے میں ایک لمحہ کے لیے بھی متاثر نہ کر سکے۔ اور ہو بھی کیسے سکتا تھا جبکہ آپ کو تاکید کردی گئی تھی کہ جملہ معاملات زندگی میں آپ خدائی شریعت کے پابند ہوں گے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ٥ (جاثیہ ۱۸-۱۹)

پھر ہم نے تمہیں ٹھہرایا ہے ایک الگ شریعت پر سو تم (پوری پوری) اس کی پیروی کرو۔ اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو نہیں جانتے۔ اللہ کے مقابلہ میں وہ تمہارا کچھ بھلا نہ کر سکیں گے۔ اور یہ، ظالم ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور اللہ ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس داعئ حق کے پیغام کا ابتدائی نکتہ ہی یہ تھا کہ دین حق کے بے کردار مخالفین تمہیں خدا کے راستے سے ایک انچ ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ٥ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ ٥ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ٥ عُتُلٍّۢ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ٥ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ٥ (قلم ۱۰-۱۴)

اور تم بات نہ مانو جھوٹی قسم کھانے والے رسوائے زمانہ کی۔ بڑا عیب چیں لگانے بجھانے میں یکتا۔ حد درجہ بخیل سرکش اور گنہگار، درشت خو اور سب سے بڑھ کر بد نسل اسے عزہ اس کا ہے کہ، وہ مال والا اور بیٹوں والا ہے۔

فلا تطع المكذبين ٥ ودوا لو تدهن فيدهنون ٥ (ايضا ۸-۹)

تو جھٹلانے والوں کی بات نہ مانو۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم نرم ہو جاؤ تو وہ بھی نرمی دکھائیں۔

مخالفین دعوت کو ہمیشہ کے لیے مایوس کر دینے کے لیے آخری مجمع کے ذریعہ یہ اعلان کرا دیا گیا کہ میں اس کتاب اور اس کی لائی ہوئی شریعت میں شمہ برابر تبدیلی کا مجاز نہیں۔ مجھے اس ضابطہ حیات کو بے کم وکاست پوری دنیائے انسانیت تک پہنچانا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنی پوری زندگی میں کسی کمی بیشی کے بغیر اس کی پوری پوری پیروی کرنی ہے۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ

اور جب ان پر ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں کھلی

لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝

(یونس ۱۵)

ہوئی تو وہ لوگ جو ہم سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ لاؤ اس کے علاوہ کوئی دوسرا قرآن۔ یا اس میں ترمیم کر لو۔ کیونکہ مجھے اس کا اختیار نہیں کہ میں اپنے جی سے اس میں ترمیم کروں۔ میں تو پیروی اسی کی کروں گا جس کی مجھ تک وحی کی جا رہی ہے میں ڈرتا ہوں اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں ایک بڑے دن کے عذاب سے۔

تبیین احکام : اسی طرح پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف بھی قرآن نمایاں طور پر بیان کرتا ہے کہ زندگی کے جملہ امور و مسائل کے سلسلے میں خدائی احکامات و ہدایات کو کھول کر بیان کرنا آپؐ کی بعثت کے اہم مقاصد سے ہے۔ دنیائے انسانیت فکر و عمل کی جن کجرویوں میں گرفتار ہے اور زندگی کے مختلف دائروں میں جادۂ اعتدال سے ہٹے ہوئے جو طریقے اور ضابطے اس نے اختیار کر رکھے ہیں، اس کو اس بھنور سے نکال کر خدائی مرضیات کی صحیح شاہراہ پر لگا دینا اور انفرادی واجتماعی زندگی کے تمام معاملات و مسائل میں خدائی احکام و ہدایات کی روشنی دکھا دینا، آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وہ اہم ترین خصوصیت ہے جس کا قرآن نے ایک سے زائد مقامات پر ذکر کیا ہے۔ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کو خطاب کرکے ارشاد ہوا،

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۡ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

(آیت ۱۹)

اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا ہے جو تمہارے لیے باتوں کو کھول کر بیان کرتا ہے رسولوں کے ایک وقفہ کے بعد تاکہ تم (آئندہ) نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت سنانے والا یا ڈرانے والا نہیں آیا۔ تو معلوم ہو کہ تمہارے پاس ضرور بشارت سنانے والا اور ڈرانے والا آگیا ہے۔ اور اللہ کو ہر چیز پر قدرت ہے

علامہ رشید رضا مصری نے آیت پاک میں باتوں کو کھول کر بیان کرنے (تبیین) کو جملہ معاملات اور زندگی کے تمام دائروں تک وسیع مانا ہے:

وھٰذا ھو الرسول محمد النبی العربی الامی الذی لم یتعلم شیئا، وھو یبین لکم علی فترۃ ای انقطاع من الرسل، وطول عھد علی الوحی، جمیع ما تحتاجون الیہ من امر دینکم

یہ رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، عرب کے امی نبی جنہوں نے کبھی کوئی چیز نہیں سیکھی پڑھی۔ وہ تمہارے لیے رسولوں کے سلسلے کے منقطع اور عرصۂ دراز سے آسمانی وحی کے رکے رہنے کے بعد وہ تمام چیزیں کھول کر بیان کر رہے ہیں

فما يصلح به أمر دنياكم من العقائد الحق التي أفسدتها عليكم نزعات الوثنية، والأخلاق والآداب الصحيحة التي أفسدها عليكم الإفراط والتفريط في الأمور المادية والروحية، والعبادات والأحكام التي تصلح بها أموركم الشخصية والاجتماعية[1]

جن کی تمہیں ضرورت ہے اپنے دین کے معاملے سے اور جس سے کہ تمہاری دنیا سنور سکے. برحق عقائد جن کے اندر تمہارے اوپر بت پرستی کے حملوں نے خرابیاں پیدا کر دی ہیں، اور صحیح اخلاق و آداب جن کے سلسلے میں مادی اور روحانی امور کے سلسلے میں افراط و تفریط نے تمہارے لیے گڑبڑیاں پیدا کر دی ہیں، اسی طرح یہ پیغمبر تمہارے لیے عبادات و احکام کو کھول کر بیان کرتے ہیں جس سے کہ تمہارے انفرادی و اجتماعی جملہ امور و معاملات سنور جائیں۔

آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی خصوصیت اسی سورہ میں دوسرے مقام پر بدیں الفاظ بیان کی گئی ہے:

يَآ أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ قَدْ جَآءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ ۝

(آیت : ۱۵)

اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا ہے جو تمہارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے ان بہت سی چیزوں کو جنھیں تم چھپاتے تھے کتاب کی. جبکہ بہت سی چیزوں سے وہ صرف نظر کرتا ہے. ضرور تمہارے پاس آگئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کھلی ہوئی کتاب۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اہل کتاب یہود و نصاریٰ کی چھپائی ہوئی باتوں کے کھولنے کا مطلب ہے کہ زندگی کے مختلف دائروں سے متعلق جن بے شمار احکام و قوانین پر انھوں نے پردہ ڈال رکھا تھا، اور اپنی خدا بیزاری اور دنیا داری کے سبب جن سے پہلو تہی کرنے کو وہ تقاضائے دانش مندی سمجھتے تھے، آخری رسول ان کے اس خبث باطنی کو آشکار کرنے کے ساتھ، آخری طور پر ان کے چھپائے ہوئے احکام و قوانین کو روشنی میں لاتا اور دنیائے انسانیت کو ان سے روشناس کراتا ہے. اس مقام پر رسولؐ کی اس صفت "تبیین" کا مطلب وعظ و تلقین نہیں بلکہ احکام و قوانین کا واضح بیان ہے۔ صاحب جلالین نے صراحت کی ہے:

(قد جاءكم رسولنا) محمد (يبين لكم) شرائع الدين[2]

'تمہارے پاس آگئے ہیں ہمارے رسول یعنی محمدؐ جو تمہارے لیے کھول کر بیان کر رہے ہیں، یعنی (جملہ معاملات زندگی سے متعلق) دین کے احکام و قوانین

---

[1] تفسیر المنار: ۶/۳۱۹ [2] تفسیر الجلالین/۱۳۹ نیا ایڈیشن

یہی حقیقت ہے جس کی تفصیل سورۂ اعراف میں بیان کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ اخلاقی اور قانونی ہر دو پہلو سے بالکل دیوالیہ ہو چکے تھے۔ یہ قوم فکری زوال کا بھی شکار تھی اور عملی طور پر بھی یہ زوال کی آخری حدود کو چھو چکی تھی۔ بھلائیوں (معروف) سے اسے بیر تھا اور برائیوں (منکر) کی یہ رسیا ہو چکی تھی۔ اس کی قانونی زندگی اور بھی اتھل پتھل کا شکار تھی، اس نے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے رکھا تھا اور قانون میں بے جا موشگافیاں کر کے اس کے سلسلے میں اپنے اوپر عجیب عجیب جکڑبندیاں عائد کر دی تھیں۔ آخری نبیؐ کے ذریعہ اسے ان تمام مصیبتوں سے نجات ملی۔ جس نے ان کے سامنے حق و صواب کے راستے کو بالکل روشن کر دیا اور ان کی اخلاقی اصلاح کے ساتھ احکام و قوانین کے دائرے میں ان کی اصلاح و درستگی کا حق ادا کر دیا۔ ان خصوصیات کے حامل نبیؐ کی مخلصانہ پیروی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت خاص کا مستحق گردانا:

قَالَ عَذَابِيٓ أُصِيبُ بِهِۦ مَنْ أَشَآءُ ۖ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ ٱلزَّكَوٰةَ وَٱلَّذِينَ هُم بِـَٔايَٰتِنَا يُؤْمِنُونَ ۝ ٱلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ ٱلرَّسُولَ ٱلنَّبِيَّ ٱلْأُمِّيَّ ٱلَّذِي يَجِدُونَهُۥ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي ٱلتَّوْرَىٰةِ وَٱلْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِٱلْمَعْرُوفِ وَيَنْهَىٰهُمْ عَنِ ٱلْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ ٱلْخَبَٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَٱلْأَغْلَٰلَ ٱلَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ

(۱۵۶ - ۱۵۷)

فرمایا کہ میرا عذاب میں اس سے دوچار کروں گا جسے چاہوں۔ اور میری رحمت ہر چیز تک پھیلی ہوئی ہے۔ تو ضرور میں اسے لکھوں گا ان لوگوں کے لیے جو ڈرتے ہیں، جو زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو (آج آخری) رسول امی نبی کی پیروی کرتے ہیں جسے یہ اپنے ہاں تورات و انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔ جو انھیں بھلائی کا حکم دیتا ہے اور انھیں برائی سے منع کرتا ہے۔ ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور گندی چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتا ہے۔ اور ان کے اوپر سے ان کے بوجھ کو اتارتا اور ان بیڑیوں کو کاٹتا ہے) جو ان پر تھیں۔

اور یہ کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کا خصوص نہیں، بلکہ آخری رسولؐ کی یہ ذمہ داری پوری انسانیت کی نسبت سے ہے۔ گروہ انسانی میں فکر و عمل کے پائے جانے والے بے شمار اختلافات اور اخلاقی اور قانونی زندگی کے تہ در تہ تضادات، ان میں سے ہر ایک معاملے میں صحیح راستے کی نشاندہی اور حلال و حرام کی توضیح، آخری پیغمبر کی بعثت کے بنیادی مقاصد سے ہے۔ قرآن میں ان احکام و ہدایات کا اجمالی بیان ہے اور رسولؐ اس کی تفصیل پیش کرتا ہے:

ؔ تفسیر الجلالین / ۳۵۱

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (نحل: ۴۴)

اور ہم نے تم تک یاد دہانی (قرآن) اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے لیے (جملہ معاملات زندگی سے متعلق) اس چیز کو کھول کر بیان کر دو جو ان تک اتاری گئی ہے اور تاکہ وہ غور کریں۔

آگے یہی بات ان الفاظ میں کہی گئی ہے:

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (نحل: ۶۴)

اور ہم نے تمہارے اوپر جو کتاب (قرآن) اتاری ہے تو اسی لیے کہ تم ان کے (مشرکین عرب) کے لیے جملہ معاملات زندگی سے متعلق ان تمام چیزوں کو کھول کر بیان کر دو جن میں کہ ان کا جھگڑا ہے۔ اور یہ ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔

اس آیت کریمہ میں کتاب (یعنی قرآن) کو اتار کر رسولؐ کو اس کے مخاطبین میں برپا جن اختلافات کے سلسلے میں صحیح موقف کی وضاحت کا حکم دیا گیا ہے، اس کا تعلق صرف افکار و عقائد ہی سے نہیں۔ بلکہ اس میں ان کی قانونی نظام کے اختلافات کی توضیح بھی اسی طرح شامل ہے۔ اس لیے کہ اس سے پہلے قوم عرب کی اپنی شرک و بت پرستی کے معاملے میں خودمختاری کے ذکر کے ساتھ تحلیل و تحریم کے قانونی دائرے میں بھی اس کی خودمختاری کا اعلان ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ (نحل: ۳۵)

اور جن لوگوں نے شرک کیا انھوں نے کہا کہ اگر اللہ چاہتا تو اس کے سوا ہم کسی دوسری چیز کی پرستش نہ کرتے نہ ہم ایسا کرتے نہ ہمارے آباء و اجداد۔ اور نہ ہم اس کی مرضی کے بغیر (اپنے جی سے) کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ صرف آخری نبیؐ کی بات نہیں، بلکہ ہر دور اور ہر زمانہ میں جو رسول بھی آئے تو اسی لیے کہ مخاطب قوم میں فکر و عمل کی جملہ بے اعتدالیوں کو ختم کر کے ان کے سامنے منشا الٰہی کو واشگاف انداز میں بیان کر دیں، اور اخلاقی اور قانونی زندگی کے ہر دائرے سے متعلق وہ تفصیلی احکام و ہدایات فراہم کر دیں، جس کے بعد اسے کسی دوسری سمت دیکھنے کی حاجت نہ رہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (ابراہیم: ۴)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو اس کی قوم کی زبان میں تاکہ وہ ان کے لیے (تمام معاملات زندگی میں) باتیں کھول کر بتا سکے۔ تو اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہ پر لگاتا ہے۔ اور وہ بڑا غلبہ والا، حکمت والا ہے۔

فصل خصومات: دیگر انبیا علیہم السلام کی طرح آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی یہ وہ خصوصیت ہے جو انسانی زندگی میں حضرات انبیا علیہم السلام کے وسیع کردار کا پتہ دیتی ہے۔* سورہ مائدہ میں قرآن کی صورت میں یہ آخری شریعت کے آجانے کے بعد تورات و انجیل کی منسوخی کا اعلان کرتے ہوئے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا
لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا
عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ
اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ
مِنَ الْحَقِّ ۭ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً
وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ
اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ
مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ
مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ
بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ
وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ
مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ
بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ
لَفٰسِقُوْنَ ۝ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ
وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝

(المائدۃ : ۴۸-۵۰)

اور ہم نے تم تک کتاب (قرآن) اتاری ہے حق کے ساتھ جو مصداق ہے اپنے سے پہلی کتاب (توراۃ) کا اور اس پر نگراں ہے سو اب تم ان کے (اہل کتاب کے) درمیان فیصلہ کرو اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا ہے اور اس حق کے مقابلہ میں جو تمہارے پاس آگیا ہے ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک الگ شریعت اور طریقہ ٹھہرایا ہے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک جماعت بنا تا لیکن (اس نے ایسا نہیں کیا) تاکہ تم کو آزمائے اس میں جو اس نے تم کو دیا ہے۔ سو تم بھلائیوں کی طرف لپکو۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے۔ سو وہ جتا دے گا اس سے جس میں کہ تم جھگڑتے تھے۔ اور یہ کہ (اب) تم ان کے درمیان فیصلہ کرو اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ اور تم ان سے بچو کہ کہیں وہ تم کو آزمائش میں نہ ڈال دیں اور اس کے کسی حصہ سے تم کو ہٹا نہ دیں جو اللہ نے تم تک اتارا ہے۔ اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ اور تم ان سے بچو کہ کہیں وہ تم کو آزمائش میں نہ ڈال دیں اور اس کے کسی حصے سے تم کو ہٹا نہ دیں جو اللہ نے تم تک اتارا ہے سو اگر اب بھی یہ منہ موڑیں تو سمجھ لو اللہ اب یہی چاہتا ہے کہ انھیں ان کے کچھ گناہوں کا مزہ چکھائے۔ اور ضرور زیادہ تر لوگ نافرمان ہیں۔ کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ تو اللہ سے بڑھ کر بہتر فیصلہ اور کس کا ہو سکتا ہے ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھیں۔

جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری صرف اسی قدر نہ تھی کہ آپ خدائی دین کو بے کم و کاست لوگوں تک پہنچا دیں۔ بلکہ الٰہی شریعت کا نفاذ بھی آپ کے ذمہ اسی طرح تھا۔ انسانوں کے کسی طبقہ کی مرضی اور خواہش کا کوئی لحاظ کیے بغیر آپ کی ذمہ داری تھی کہ لوگوں کے معاملات آخری شریعت کے مطابق فیصل کریں۔ اور اس طرح اس کا ایسا بول بالا کریں کہ پوری انسانی دنیا میں اس کے عطا کردہ قانونی نظام کی بالادستی قائم ہو جائے۔ دوسرے مقامات پر بھی قرآن نے آپ کا یہی مرتبہ و مقام واضح کیا ہے :

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ۝ وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝

(النساء : ۱۰۵ - ۱۰۶)

ضرور ہم نے تم تک کتاب (قرآن) اتاری ہے حق کے ساتھ تاکہ تم تمام انسانوں کے درمیان فیصلہ کرو اس کے مطابق جو اللہ نے تمہیں دکھایا ہے۔ اور تم (اس سے منہ موڑنے والے) خیانت کاروں کے لیے جھگڑنے والے نہ ہو۔ اور اللہ سے گناہوں کی معافی چاہو۔ ضرور اللہ بڑا معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ ۖ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۖ وَقُلْ آمَنتُ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِن كِتَابٍ ۖ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ۝

(شوریٰ : ۱۵)

سو اس لیے تم بلاؤ (لوگوں کو اللہ کی طرف) اور جمے رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور تم ان کی (اہل شرک کی) خواہشات کی پیروی نہ کرو اور کہو کہ میں ایمان رکھتا ہوں اس پر جو اللہ نے اتاری ہے کتاب یعنی (قرآن) اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف سے کام لوں۔ اللہ ہی ہمارا رب ہے اور تمہارا بھی۔ ہمارے لیے ہمارے کام ہیں اور تمہارے لیے تمہارے کام۔ ہمارے اور تمہارے درمیان اب کوئی حجت بحث نہیں۔ اللہ ہم دونوں کو اکٹھا کرے گا۔ اور اسی کی طرف پلٹنا ہے۔

مسلمان امت پر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ وہ حق ہے جس میں کسی قسم کی ڈھیل اور تساہل اور بچ نکلنے کا کوئی سوال نہیں۔ راہ ایمان پر گامزن رہنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی آپ کے ہر حکم اور ہر فیصلے کو دل کی پوری آمادگی کے ساتھ تسلیم کرے :

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ

اور کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کے لیے سزاوار نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول فیصلہ کر دیں تو انھیں اپنے

الخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ — معاملہ کا اختیار رہ جائے۔

(احزاب: ۳۶)

اِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔ (نور: ۵۱)

ایمان والوں کی بات تو بس یہ ہونی چاہئے کہ جب انہیں بلایا جائے اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ وہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ یہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مانا۔

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝ (النساء: ۶۵)

سو تیرے رب کی قسم یہ اہل کتاب، ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک کہ تمہیں ثالث نہ بنائیں ان جملہ معاملات میں جو کہ ان کے درمیان اٹھیں۔ ساتھ ہی یہ اپنے جی میں کوئی تنگی نہ پائیں اس سے جو تم فیصلہ کر دو۔ اور یہ پوری طرح سر تسلیم نہ خم کر دیں۔

سیاسی راہبر: اس کے ساتھ ہی قرآن صاف لفظوں میں آپ کو سیاسی رہبر کا مقام عطا کرتا ہے۔ جملہ معاملات زندگی میں انبیاء کی پیروی ہر نبی کی دعوت میں بلا استثناء موجود رہی ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (نساء: ۶۴)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو اسی لیے کہ (جملہ معاملات زندگی میں) اس کی پیروی اختیار کی جائے اللہ کے حکم سے۔

آخری رسولؐ کے سلسلے میں بھی قرآن نے یہ تاکید کی کہ اللہ کی پیروی حق ادا کرنے کے لیے اس کے رسول کی بے لاگ پیروی ضروری ہے:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَمَنْ تَوَلّٰی فَمَآ اَرْسَلْنٰکَ عَلَیْھِمْ حَفِیْظًا (نساء: ۸۰)

اور جس نے رسول کی پیروی کی سو ضرور اس نے اللہ کی پیروی کی۔ اور جو کوئی روگردانی کرے تو ہم نے اے رسول پر آپ کو پہرے دار بنا کر نہیں بھیجا ہے۔

رسول کے قانونی حق کے علاوہ اس سے محبت و تعلق کا بھی یہ ایک صریح تقاضا ہے۔ جس کی کوتاہی کر کے آدمی اپنے کو صحیح ایمانی حالت پر باقی نہیں رکھ سکتا:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ

کہو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو سو تم میرے پیچھے چلو تو اللہ بھی تم سے محبت کرے گا اور تمہارے لیے تمہارے گناہوں کو بخشے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ کہو کہ پیروی

وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ٥ — کرو اللہ کی اور رسول کی سو اگر یہ منہ موڑیں تو معلوم ہو کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

(آل عمران: ۳۱-۳۲)

جملہ معاملات زندگی میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بے لاگ پیروی کی ان تاکیدات کے ساتھ سورۂ نساء کے اندر قرآن نے اسے 'اولوالامر' کی اطاعت کے ساتھ جوڑ کر بیان کیا ہے جس کا مطلب ہے کہ 'سیاسی رہبری' اپنے پورے مفہوم میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا حق ہے جسے کسی بھی درجے میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ آپ امت کے مربی و محسن اور اس کے روحانی پیشوا ہونے کے ساتھ، اسی طرح اس کے سیاسی اور پارلیمانی رہبر بھی ہیں۔ جن کے کسی حکم اور کسی اشارے سے کسی مسلمان کو سرتابی کی مجال نہیں۔ آپ کی اس "سیاسی رہبری" کو تسلیم کیے بغیر کوئی شخص ایمان واسلام کا حق ادا نہیں کرسکتا، بالکل اسی طرح جیسا کہ وہ خدانخواستہ آپ کی محبت وعقیدت اور ادب واحترام میں کمی کرکے اس کی ادائگی سے قاصر رہتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (آیت ۵۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو پیروی کرو اللہ کی اور پیروی کرو رسول کی اور اپنے میں سے اصحاب امر کی۔ سو اگر تمہارا جھگڑا ہو کسی چیز میں تو اس (معاملہ) کو لوٹاؤ اللہ اور رسول تک اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔ یہ تمہارے لیے زیادہ اچھا اور انجام کار کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے۔

نظام کفر و شرک کے لیے آخری چیلنج:

اسی کے پہلو بہ پہلو قرآن و حدیث کے مطالعے سے آپ کی ایک اور حیثیت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ آپ قیامت تک کے لیے نظام کفر وشرک کے لیے آخری چیلنج ہیں۔ ایک خاص پہلو سے آپ کی بعثت کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ دنیا کے تمام ادیان اور تمام نظامہائے فکر وعمل پر آپ کے لائے ہوئے دین اور اسلام کا بہ وجوہ غلبہ واستیلاء ہو جائے۔ اور تمام ادیان باطلہ اور خدا بیزاری اور انکار خدا پر مبنی افکار ونظریات کے لیے زمین ایسی تنگ ہو جائے کہ ان کے لیے کہیں سر چھپانے کے لیے جگہ نہ رہے۔ پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کا یہ وہ لازمی اور ناگزیر جزء ہے جس کی تکمیل کا ذمہ اس خداوند ارض وسما نے لے رکھا ہے جس کے دست قدرت کا اسیر یہ تمام عالم آب وگل ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی مشیت کی تکمیل کے لیے ہمہ وقت منتظر ہے۔ اور دنیا کی کسی بڑی سے بڑی طاقت کی مجال نہیں جو اس کے کسی ارادے میں آڑے آنے کی جرأت کرسکے۔

جس کا لازمی تقاضا ہے کہ تمام ادیان اور جملہ نظامہائے فکر و عمل کے بالمقابل، علاوہ دلیل اور برہان اور علم و معرفت کے، اس دینِ برحق کو سیاسی غلبہ اور اقتدار کی قوت و شوکت بھی حاصل ہو:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۝ (توبہ: ۳۳)

وہی ہے (اللہ) جس نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت اور دینِ حق دے کر تاکہ اسے تمام دوسرے دینوں پر غالب کر دے۔ خواہ یہ چیز مشرکوں کو کتنی ہی ناگوار ہو۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ رشید رضا مصری نے بجا طور پر کہا ہے:

ومعناه انه تعالیٰ یعلی هذا الدین ویرفع شانه علی جمیع الادیان بالحجة والبرهان، والهدایة والعرفان، والعلم والعمران، وکذا السیادة والسلطان ولم یکن لدین من الادیان مثل هذا التاثیر الروحی والعقلی والمادی والاجتماعی والسیاسی الا الاسلام وحده[1]

اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو بلندی عطا کرے گا اور اس کے معاملہ کو اونچا اٹھائے گا دوسرے تمام ادیان و مذاہب اور نظامہائے زندگی پر، دلیل و برہان کے پہلو سے، ہدایت و عرفان کے پہلو سے، علم و تمدن کے پہلو سے اور ساتھ ہی سیادت و قیادت اور حکومت و اقتدار کے پہلو سے ... اس سے پہلے کسی دوسرے دین و مذہب کو روحانی، عقلی، مادی اجتماعی اور سیاسی ہر پہلو سے وہ اثر آفرینی حاصل نہ ہو سکی۔ یہ چیز تنہا صرف اسلام کے حصہ میں آئی۔

امام رازیؒ ایک دوسرے انداز سے اس سے بہت پہلے اس حقیقت کی نشاندہی ان لفظوں میں کر چکے ہیں:

واعلم ان ظهور الشئ علی غیره قد یکون بالحجة وقد یکون بالکثرة والوفور وقد یکون بالغلبة والاستیلاء ومعلوم انه تعالیٰ بشر بذلک ولا یجوز ان یبشر الا بامر مستقبل غیر حاصل وظهور هذا الدین بالحجة مقرر معلوم فالواجب حمله علی الظهور بالغلبة[2]

معلوم ہونا چاہئے کہ کسی چیز کا دوسری چیز پر غلبہ کبھی تو حجت و برہان کے پہلو سے ہوتا ہے اور کبھی کثرت و فراوانی کے پہلو سے اور کبھی غلبہ و استیلاء کے پہلو سے اور معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (آیت بالا میں) اس کی خوش خبری سنائی ہے۔ اور خوش خبری جو سنائی جاتی ہے تو وہ کسی ہونے والی بات کی سنائی جاتی ہے جو بروقت حاصل نہ ہو۔ حجت و برہان کے پہلو سے اس دین کا غلبہ اور تفوق طے شدہ اور معلوم و معروف ہے تو ضروری ہے کہ اس غلبہ و تفوق کو (سیاسی) بالادستی اور (دنیوی) قوت و شوکت پر محمول کیا جائے۔

---

[1] تفسیر المنار ۱۰/۳۹۱۔ [2] مفاتیح الغیب: ۴/۴۲۷)

سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی کے ہاتھوں لائے ہوئے دین حق کے بالمقابل انسانیت کے آغاز سے لیکر قیامت تک جو ادیان و مذاہب اور افکار و نظریات پائے گئے اور آئندہ پائے جا سکتے ہیں، ان کا دو ہی عنوان ہے. شرک اور کفر. حق تعالیٰ کی ذات و صفات میں غیروں کو ساجھی مان کر اس کی احدیت و حمدیت کو سبوتاژ کرنے کا نام شرک اور انکار خدا اور خدا بیزاری پر مبنی جملہ نظامہائے فکر و عمل کا جامع عنوان کفر ہے. اس آیت کریمہ میں اہل شرک کی مرضی کے علی الرغم (ولو کرہ المشرکون) فو ماکر نظام شرک پر دین اسلام کے بہمہ وجوہ غلبہ کی بات کہی گئی ہے. دنیا کے دوسرے باطل افکار و نظریات پر اس دین حق کے غلبہ و تسلط کی بشارت اس سے پہلے کی آیت کریمہ میں دی گئی ہے. جس میں قرآن نے اقصائے عالم پر پھیلے ہوئے اہل کفر کی مرضی کے علی الرغم نور اسلام کے اتمام کی بشارت دی ہے،

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ٥

(التوبہ : ۳۲)

یہ (دین کے دشمن) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (اسلام) کو بجھادیں اپنے منہ سے. اور اللہ کو اس کے سوا ہر بات سے انکار ہے کہ وہ اپنی روشنی کو پورا کرکے رہے خواہ یہ چیز کافروں کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو.

ان آیات کریمہ سے پہلے مشرکین مکہ اور سرزمین عرب کے یہود و نصاریٰ کا ذکر ہے، جنھوں نے انحراف و انکار خدا پر مبنی تمام طرح کی گمراہیوں کو اپنے اندر سمیٹ رکھا تھا. دوسرے مقام پر بھی شرک و کفر کی جملہ صورتوں کے جامع اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے ذکر کے بعد قرآن نے ان دونوں ہی نظاموں کے علم برداروں کی مرضی کے علی الرغم ان کے پسندیدہ ادیان و افکار پر دین اسلام کے بہمہ وجوہ غلبہ کی بات دہرائی ہے.

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ٥

(صف : ۸-۹)

یہ (دشمنان دین) چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی (اسلام) کو بجھادیں اپنے منہ سے. حالانکہ اللہ اپنی روشنی کو پورا کرکے رہے گا خواہ یہ چیز کافروں کو کتنی ہی ناگوار ہو وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا ہے تاکہ اسے دوسرے تمام ادیان و مذاہب پر غالب کردے خواہ یہ چیز مشرکوں کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو.

حدیث کے اندر بھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی وصف بیان ہوا ہے اور اسے آپؐ کا ایک مغلق نام تجویز کیا گیا ہے کہ آپؐ کے بعد قیامت تک کے لیے نظام کفر و شرک کو کہیں سر اٹھانے کا موقعہ نہیں ملے گا. حضرت جبیر بن مطعم کی روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ،

ان لی اسماء انا محمد وانا احمد وانا

میرے بہت سے نام ہیں. میں محمد (تعریف کیا ہوا)

الماحی الذی یمحو اللہ بی الکفر الخ (متفق علیہ[1])

(میں احمد (بہت تعریف کرنے والا) ہوں، میں ماحی (مٹانے والا) ہوں یعنی وہ جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کفر و شرک اور دوسری تمام گمراہیوں کو نیست و نابود کرے گا۔

دور اول میں آپ کی اس خصوصیت کا ظہور کس طرح ہوا۔ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے علامہ ابن قیم فرماتے ہیں:

فالماحی، هو الذی محا اللہ به الکفر ولم یمح الکفر باحد من الخلق ما محی بالنبی صلی اللہ علیه وسلم، فانه بعث واهل الارض کلهم کفار، الا بقایا من اهل الکتاب وهم بین عباد اوثان، ویهود مغضوب علیهم، ونصاری ضالین، وصابئة دهریة، لا یعرفون ربا ولا معادا، وبین عباد الکواکب، وعباد النار، وفلاسفة لا یعرفون شرائع الانبیاء ولا یقرون بها، فمحا اللہ سبحانه برسوله ذلک حتی ظهر دین اللہ علی کل دین وبلغ دینه ما بلغ اللیل والنهار وسارت دعوته مسیر الشمس فی الاقطار[2]

پس 'ماحی'، وہ ہے جس کے ذریعہ اللہ نے کفر کو مٹایا۔ اور مخلوق میں کسی کے ذریعہ اس نے کفر کو نہیں مٹایا جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کے مٹانے کا اہتمام ہوا۔ اس لیے کہ جس وقت آپ کی بعثت ہوئی زمین والے تمام کے تمام کافر تھے۔ سوائے اہل کتاب کے بچے کھچے لوگوں کے۔ لوگ یا تو بتوں کے پرستار تھے، یا خدا تعالیٰ کے غضب کردہ یہود یا گمراہ نصاریٰ۔ یا صابی لوگ جو دہریہ تھے جو نہ خدا کو مانتے تھے، نہ آخرت کے قائل تھے۔ دوسرے ستارہ پرست اور آگ کے پجاری تھے۔ ورنہ فلاسفہ تھے، جنھیں انبیائی شریعتوں سے آشنائی تھی، نہ وہ ان کا اقرار کرتے تھے پس اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ ان سب کو مٹا دیا یہاں تک کہ اللہ کا دین دوسرے تمام دینوں (اور نظامہائے فکر و عمل) پر غالب آ گیا۔ اس کے دین کی شعاعیں وہاں تک پہنچیں جہاں تک کہ دن رات کی گردش ہے۔ اور آپ کی دعوت کی کرنوں سے اقصائے عالم منور ہوا۔

جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بعد کے ادوار میں آپ کی اس خصوصیت کے مضمرات کتنے وسیع ہوں گے۔ اور کس طرح شرک و بت پرستی کے ساتھ فکر و عمل کے ان تمام دھاروں کو روئے زمین سے مٹا دینا آپ کے عین فریضہ منصبی

[1] بحوالہ مشکوۃ المصابیح، کتاب الفتن، باب اسماء نبی صلی اللہ علیہ وسلم وصفاتہ موطا جلد ۲ کتاب الجامع، باب اسماء نبی صلی اللہ علیہ وسلم، نیز مسند احمد ۴/۸۰، ۸۱، ۸۴ [2] ابن قیم الجوزیہ، زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، ۱/۹۴ تحقیق و تخریج شعیب الارنؤط عبد القادر الارنؤوط موسسۃ الرسالہ، بیروت، طبع ثامنہ ۱۹۸۵ء۔

میں شامل ہوگا جو کسی بھی انداز اور کسی بھی عنوان سے انسان کو خدا سے دور اور اسے اس سے بیزار کرنے والے ہوں

آپؐ کی اس حیثیت کا لازمی تقاضا ہے کہ آپؐ معروف معنوں میں صرف دعوت و تبلیغ اور وعظ و ارشاد ہی کے مرد میدان نہ ہوں، بلکہ تلوار کا پرتلا بھی آپؐ کے ہاتھ میں لازماً موجود ہو اور روئے زمین پر بندگی رب کے نفاذ اور نظام شرک و کفر کے استیصال کے لیے مسلح جدوجہد بھی آپؐ کے عین فرائض منصبی میں شامل ہو۔ یہی حقیقت ہے جس کی نشاندہی آپؐ نے دوسری حدیث میں فرمائی ہے:

بعثت بالسیف حتی یعبد اللہ لاشریک لہ وجعل رزقی تحت ظل رمحی وجعل الذلۃ والصغار علیٰ من خالف امری[1]

مجھے تلوار دے کر بھیجا گیا ہے۔ یہاں تک کہ پورے روئے زمین پر تنہا اللہ کی بندگی کی جائے اور اس کا کوئی ساجھی نہ ہو۔ اور میری روزی میرے نیزے کے سائے تلے رکھی گئی۔ اور ذلت و رسوائی اس کا مقدر ٹھہرادی گئی جو میرے معاملہ کی مخالفت کرے۔

اور یہی حقیقت ہے جسے دوسرے مقام پر آپؐ نے بدیں الفاظ واضح فرمایا ہے:

امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ ویؤمنوا بی وبما جئت بہ فاذا فعلوا ذٰلک عصموا منی دماءھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللہ[2]

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں اور مجھ پر ایمان لائیں اور جو (ہدایت) میں لے کر آیا ہوں اسے مانیں۔ پس جب وہ ایسا کر دیں تو میری طرف سے ان کی جان اور مال کی حفاظت کی ضمانت ہے سوائے اس کے کہ ان پر کوئی حق عائد ہوتا ہو۔ (اس سے ہٹ کر) ان کا حساب اللہ کے اوپر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ دلوں کا حال تو اللہ ہی کو معلوم ہے کہ ظاہری طور پر ایمان و اسلام کا اقرار کر کے بھی آدمی اپنے اندر کفر و نفاق کو چھپائے ہو سکتا ہے، اس لیے اس صورت کو تو اللہ کے حوالہ کئے بغیر چارہ نہیں، لیکن اس سے ہٹ کر جب تک لوگ اسلام کے مقابلہ میں اپنے حق خود اختیاری سے دست بردار نہ ہوں گے، اسلام سے ان کی حالت جنگ قائم رہے گی۔ خدا کی سرزمین میں وہ اس کے عطا کردہ دین کی نعمت سے محروم رہ کر ہی زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انھیں اس کا حق ہے لیکن شرک و کفر کی غلاظت میں خود گرنے کے ساتھ دوسرے بندگان خدا کو انھیں اس میں گرانے کی اجازت نہ ہوگی۔ اسلام کی عطا کردہ سہولتوں اور رعایتوں کے ساتھ وہ مغلوب و

[1] مسند احمد، ۲/ ۵۰، ۹۲ [2] مسلم جلد ۱ کتاب الایمان، باب الامر بقتال الناس حتی یقولوا الخ۔ نیز مسند احمد: ۲/ ۳۴۵، ۳۹۴

بے اختیار ہوکر تو بیشک رہ سکتے ہیں، لیکن خدا کی زمین پر اس سے منہ موڑنے کے ساتھ اس سے اکڑ کر چلنے کا حق انھیں حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس طور پر کہ اپنے کو جہنم میں گرانے کے ساتھ انھیں دوسرے بندگان خدا کو بھی اس میں جا دھکیلنے کا انھیں پورا موقعہ اور سہولت میسر ہو اگر وہ پرامن طور پر اپنی اس حیثیت کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں تو پیغمبر اسلام اور اس کے امتیوں کی تلوار ان سے اس کا فیصلہ کرائے گی۔ مسلح جدوجہد سے ان کی قوت وشوکت اس طرح پامال کر دی جائے گی کہ خدا کی سرزمین پر ان کے لیے اکڑ کر چلنے اور باغی اور سرکش بن کر رہنے اور دوسرے بندگان خدا کو اس راہ پر لگانے کا دور دور تک کوئی موقعہ نہ رہے۔

وقٰتِلُوْهم حتی لاتکون فِتنةٌ ویکون الدِّیْنُ لِلّٰہِ (بقرہ، ۱۹۳)	اور ان سے (دین کے دشمنوں سے) جنگ کرو یہاں تک کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہوجائے۔
وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَاتَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (انفال: ۳۹)	اور ان سے (اعدار اسلام سے) جنگ کرو یہاں تک کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہوجائے۔

صدر اول میں اسلام ان تمام حیثیتوں سے اپنی حقانیت کا لوہا منوا چکا ہے۔ اور جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے، قیامت سے پہلے ایک بار پھر ہمہ گیر شکل میں اس دین حنیف کا اقصائے عالم پر بول بالا ہوگا۔ زمین کا چپہ چپہ اسلام کا کلمہ پڑھے گا۔ اور روئے زمین پر کہیں کفر وشرک کا نشان نہ ہوگا[۱]۔ لیکن اس سے پہلے بھی اسلام کے نام لیوا جہاں اور جب کہیں اس دین سے اپنی بے آمیز وفاداری کا ثبوت فراہم کرکے، زمین پر غلبہ واستیلار کی سنت الٰہی کی شرط پوری کردیں گے تو یقیناً دیر نہ ہوگی کہ نظام عالم کی باگ ڈوران کے ہاتھ میں ہوگی۔ اور پوری دنیا پر ان کا پھریرا لہرائے گا۔ نظام شرک وکفر نیست ونابود ہوکر رہے گا۔ اور اس کے نام لیوا ؤں کے لیے کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ مل سکے گی۔ غلبہ وتسلط اس دین کا خاصہ ہے۔ اس کے علم بردار جب کبھی اس راہ کی اپنی داخلی رکاوٹوں کو دور کردیں گے۔ نصرت وفتح مندی ان کے ہم رکاب اور کامیابی وکامرانی ان کے قدم چومنے کے لیے منتظر ہوگی۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہر دور اور ہر زمانے کے لیے ہے کہ؛

الاسلام یعلو ولا یعلیٰ[۲]	اسلام سر اٹھا کر رہنے کے لیے آیا ہے۔ جھک کر رہنے کے لیے نہیں آیا ہے۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر: ۲/۳۴۹، ۳۵۰

[۲] بخاری تعلیقات۔ جلد ۱۔ کتاب الجنائز۔ باب اذا اسلم الصبی فمات ہل یصلی علیہ الخ / ۸۰۔ قال السہارنفوری محشی الکتب واخرجہ الدار قطنی بسند صحیح۔ جوالا مذکور۔

ہندوستانی مسلمانوں کا تعلیمی مستقبل

۲

ڈاکٹر سید عبدالباری

آزادی سے قبل ملک میں بہت سے مسلم ادارے وجود میں آئے۔ انھوں نے مسلمانوں میں تعلیم کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں گرانقدر خدمات انجام دیں لیکن چونکہ ان اداروں میں وہی مضامین جوں کے توں پڑھائے جانے لگے جن کی بازار میں مانگ تھی اور اس بات کی سنجیدگی سے کوشش نہیں کی گئی کہ تعلیم کو اعلیٰ مقاصد کا تابع بنایا جائے چنانچہ ان اداروں سے بکثرت ایسے نوجوان فارغ ہو کر باہر آتے رہے جن کے ذہن میں بقول سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سرے سے اس امر کا کوئی تصور نہیں تھا کہ انسانی زندگی کا کوئی مقصد بھی ہونا چاہیے یا ہو سکتا ہے۔ مقصد کے سوال کو وہ محض فلسفیانہ یا شاعرانہ مسئلہ سمجھتے ہیں اور عملی حیثیت سے یہ طے کرنے کی کوئی ضرورت ان کو محسوس نہیں ہوتی کہ آخر دنیا کی زندگی میں ہماری کوششوں اور محنتوں سے اور ہماری دوڑ دھوپ کا کوئی منتہا اور کوئی مقصود بھی ہونا چاہیے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دیکھ کر میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگتا ہوں کہ اس نظامِ تعلیم کو کس نام سے یاد کروں جو پندرہ بیس سال کی دماغی تربیت کے بعد بھی انسان کو اس قابل نہیں بناتا کہ وہ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کا کوئی مصرف اور اپنی کوششوں کا کوئی مقصود معین کر سکے بلکہ زندگی کے کسی نصب العین کی ضرورت ہی محسوس کر سکے"

ظاہر ہے کہ انسان خلا میں نہیں رہ سکتا۔ اس طرح کے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد جو ذکاوت کی متاعِ گراں سے بہرہ مند تھی آزادی سے قبل کے ہندوستان میں اشتراکیت کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھ گئی اور مسلسل ترقی پسندی کے طلسم کی اسیر ہوتی رہی۔

غرض ہمارے تعلیمی ادارے بظاہر ملت کی فلاح و بہبود اور اسلام سے نوجوانوں کے رشتے کو مضبوط بنانے کے لیے وجود میں آئے لیکن وہ مغرب کے مادہ پرستانہ اور خدا بیزار کلچر کی خدمت انجام دیتے رہے۔ دوسری طرف ہمارے دینی تعلیمی اداروں میں صدیوں سے تعلیم و تعلم کے محاذ پر دفاعی انداز اختیار کر لیا گیا۔ بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی سے ہی یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا جب کہ یونانی فلسفہ کی یلغار کو روکنے کے لیے ہمارے اہل علم دفاعی پوزیشن میں آگئے تھے۔ انیسویں صدی تک آتے آتے منطق و معقولات اور علم مناظرہ پر ساری قوت صرف ہوتی رہی۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ کے اس دور میں ملت کی یہ ایک ناگزیر ضرورت تھی کہ اسلامی عقاید و یقینیات کا غیر اسلامی نظریات کے مقابلہ میں دفاع کیا جائے۔ اٹھارویں صدی کے

نصف آخر میں خود شاہ ولی اللہ نے اسلام کی دلائل و براہین کے ہتھیار سے دفاع کی کوشش کی تھی اور ان کی مشہور تصنیف حجۃ اللہ البالغۃ منظر عام پر آئی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی میں آزادی سے قبل تک ہمارے علماء حق پادریوں اور آریہ سماجیوں سے مناظرہ پر اپنی پوری قوت صرف کرتے تھے اور اس طرح کی مشق تحریر پر مذہبی تعلیم کے مدارس میں خاص توجہ دی جاتی تھی تاکہ اس میدان کے مردان کار تیار ہو سکیں۔ ہنگامی طور پر گویہ طریق علاج درست تھا لیکن جراثیم کش دواؤں کے بعد مریض کو اپنے جسم کی توانائی کے لیے کچھ مقویات کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس کے لیے ظاہر ہے کہ مثبت اقدام کی ضرورت تھی جس سے غفلت برتی گئی مثبت اقدام کے لیے لازم تھا کہ ہماری نئی نسلوں کو قرآن سے صحیح معنوں میں روشناس کرایا جائے اور ان کو تسخیر کائنات میں معاون ثابت ہونے والے طبعی علوم میں مہارت حاصل کرنے کے مواقع مہیا کیے جائیں تاکہ وہ غور و فکر اور تلاش و تجسس کی صلاحیت پیدا کر سکیں اور ان کے اندر سائنٹفک طور سے سوچنے کی لیاقت فروغ پائے۔ یہ علوم دفاع کے بجائے ہندوستانی مسلمانوں کی اقدامی پوزیشن میں کھڑا کر دیتے اور چھوٹے چھوٹے مسائل اور ذرا ذرا سے اختلافات میں الجھنے کے بجائے وہ زمانے کی امامت کا خواب دیکھنے لگتے۔

آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو پھر اسی طرح کے آشوب و ابتلا سے گزرنا پڑا جیسے کہ ۱۸۵۷ء میں ان کو پیش آئے تھے۔ اب تعلیم کے ساتھ ان کی محبوب زبان اردو کا مستقبل خطرہ میں پڑ گیا۔ حکومت نے سیکولرزم کو اساس قرار دے کر از سر نو نصاب تعلیم مرتب کرایا۔ سیکولر کلچر کی یہ تشریح کی گئی کہ اس میں ہندوستان کے تمام مذاہب کی دائمی قدروں کی جھلک ہوگی اور اس ملک کی ثقافتی بوقلمونی کو برقرار رکھا جائے گا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ کلچر کو عقائد و یقینیات سے الگ کرنا ممکن نہ تھا۔ اس ملک میں مختلف گروہ متضاد سمتوں میں سفر کر رہے تھے۔ تعلیم و تہذیب کے امور میں ان کا ایک ساتھ چلنا اسی وقت ممکن تھا جب کہ ہر گروہ کو اس کے تہذیبی ورثے اور اپنے نظام فکر و عمل کو برقرار رکھنے کی اجازت دی جاتی۔ لیکن ہوا یہ کہ اکثریت نے اقلیتوں کو دبانا شروع کر دیا اور اپنے عقاید و اقدار اور دیو مالا کو آزاد ہندوستان کے سرکاری اداروں میں تعلیم کی اساس بنا دیا گیا۔ شمالی ہند کے تقریباً تمام صوبوں میں مسلمان بچوں کو لئے نظام تعلیم میں اپنی مادری زبان میں پڑھنے لکھنے اور اپنے آبا و اجداد کے عقاید و ایمانیات سے روشناس ہونے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

آزادی کے بعد ہندوستان کو اپنے اس دعویٰ کی صداقت علمی حیثیت سے ثابت کرنی تھی کہ وہ مغرب سے سیاسی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے بعد ذہنی غلامی سے بھی چھٹکارا پائے گا۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس دعویٰ کی صداقت کا کھلا عملی ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔ یہ ضرور ہے کہ ملک کے بہت سے دانشور ماضی بعید کی تہذیب و تاریخ کے احیا کی باتیں کرنے لگے اور ایک نئی زندگی اور نئے سماج کا خواب دیکھنے دکھانے لگے لیکن اس مرحلہ میں اگر لوگ طرح طرح کی پیچیدگی اور تضاد کی گرفت میں آ گئے۔ مغرب سے ذہنی مرعوبیت جیوں کی تیوں برقرار رہی۔ ہمارے ملک کے اہل نظر میں مغرب کے طرز فکر اور اس کی نظریاتی اساس کو چیلنج کی صلاحیت مفقود تھی۔ مذہب کو فرد کی ذاتی زندگی کا ایک معاملہ یورپ کے مادہ پرستانہ

کو پھر تقریباً اتحاد ہندوستان میں بھی یہی سارا رنگ نمودار ہونے لگے اور مذہب فرد کی زندگی کا ایک محدود مشغلہ بن گیا۔ ہندوستان کے اہل فکر کا بڑا طبقہ اس خام خیالی میں مبتلا ہو گیا کہ مذہب انسانوں کو جوڑنے والی طاقت نہیں بن سکتا اور گہری مذہبیت ان کے نزدیک زیادہ تر نارواداری اور فتنہ و فساد کے رجحانات کو فروغ دیتی ہے اور اس سے ایسے شعلے اٹھتے ہیں جو احترام آدمیت کے خرمن کو خاکستر کر دیتے ہیں۔ معاشرتی اور تمدنی زندگی کے مختلف شعبوں سے مذہب کو بے دخل کر دینے کے نتیجے میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا جس کو پُر کرنے کے لیے رنگ و نسل، لسانیت و علاقائیت کے جذبات سامنے آ گئے۔ آدمی آدمی کے بیچ اجنبیت اور بے گانگی کی فصیلیں حائل ہو گئیں اور نفرت، نااتفاقی اور نفاق کی ایسی خوفناک اور زہریلی ہوائیں چلیں جن سے پوری فضا میں ضیق النفس (suffocation) کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ جدید نسلیں اخلاق و کردار کی ٹھوس بنیادوں سے محروم ہونے لگیں۔ مذہب کے نام پر ماضی بعید سے دیومالا، توہمات اور ضمیات کا ایک انبار برآمد کر کے نئی نسلوں کے ذہن و دماغ پر مسلط کر دیا گیا۔ اس سے مذہب کی صورت اور بھی مسخ ہو گئی۔ ہر فرد کے دل میں یہ بات بیٹھنے لگی کہ معاشی فارغ البالی کی منزل تک رسائی ہی ہندوستان کو دنیا کے ممالک کی صفوں میں ممتاز مقام عطا کرے گی اور اس کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے اس لیے کہ انسان کا پیٹ اگر بھرا ہوا ہو تو وہ بہت سے اخلاقی و روحانی عیوب سے خود بخود چھٹکارا پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک کی زمام اقتدار ہوتی ہے اس کو رسل و رسائل کے تمام ذرائع پر قدرت حاصل ہوتی ہے اور ان کے طرز فکر کا معاشرہ پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ اقدار اپنے وزن و وقار سے محروم ہونے لگیں اور بے کردار انسانوں کی بھیڑ میں دن بدن اضافہ ہونے لگا۔ کردار سازی کے ادارے یعنی ملک کی تعلیم گاہیں اپنی ذمہ داری ادا کرنے سے قاصر تھیں اور وہاں تعلیم و تربیت کا ایسا ماحول مفقود تھا جو کردار کی تعمیر و تشکیل میں معاون ہوتا ہے۔ مذہب کو تعصب، تنگ نظری اور نارواداری کا مرکب قرار دے کر شہر بدر کر دیا گیا۔ عقاید و اقدار کے وہ سانچے توڑ دیئے گئے جو انسان کو حُبّ الوطنی، شرافت، وسیع النظری اور فراخ حوصلگی اور ایثار و قربانی کے اوصاف سے مزین کرتے ہیں۔

آزادی کے بعد سیکولر ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں اپنی نئی نسلوں کا مستقبل تباہ ہوتا ہوا دیکھ کر مسلمانوں کو اب ایک اور دفاعی جدوجہد کے لیے تیار ہونا پڑا اور ابتدائی اسٹیج پر خود کفیل مدارس و مکاتب کا قیام اور ان کی مالی کفالت کا بوجھ اٹھانے کے لیے مسلم معاشرہ کو سامنے آنا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمان اقتصادی میدان میں مسلسل ہزیمت و پسپائی کا سامنا کر رہے تھے ۱۹۶۱ء کے بعد تابڑ توڑ فرقہ وارانہ فسادات اور ان میں تباہ ہونے والے خاندانوں کی آبادکاری اور امداد کے معاملہ میں مزید مالی گرانباری کا ملت کو سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ان تمام مسائل کا ہندوستانی مسلمانوں نے بڑی پامردی سے سامنا کیا۔ یوپی و بہار میں اور ملک کے کچھ دوسرے صوبوں میں آمریت طرح طرح کے ستم ڈھا رہی تھی۔ اس صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے دینی تعلیمی تحریک کا آغاز ہوا۔ قاضی عدیل عباسی مرحوم نے بستی میں ایک تاریخی کانفرنس منعقد کی اور ہر مکتبہ خیال کے لوگوں کو متحد ہو کر اس مسئلہ کو حل کرنے کی دعوت دی

مکاتب کا ایک جال گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ میں بچھا دیا گیا۔ یوپی میں اس تحریک کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی اور قاضی صاحب نے گھوم گھوم کر پورے اتر پردیش کے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا:[۵]

"کوئی قوم اپنا تشخص اپنی امتیازی خصوصیت اور اپنی تہذیب و زبان اور اپنے معتقدات باقی رکھنا چاہتی ہے تو اُسے دوسری قوموں یا حکومتوں کے سہارے کو چھوڑ کر خود اپنی انتھک محنت و اخلاص کے ساتھ جہد و جہد اور ذاتی مفادات سے بلند ہو کر سرگرمی سے کام کرنا ہوگا اور اسے زندگی کا اوّلین مقصد بنانا ہوگا۔"

قاضی صاحب اور ملت کے بے شمار عزت مند افراد کی جد و جہد رنگ لائی اور یوپی و بہار میں مسلمان اپنی دینی تعلیم کے معاملہ میں اپنے پیروں پر کھڑے ہوگئے۔ بقول قاضی صاحب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیاسے کو پانی مل گیا۔ صرف یوپی میں ۸ ہزار مکاتب اس تحریک کے نتیجہ میں قائم ہوئے جن میں ۵ لاکھ بچے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ گاؤں گاؤں میں عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ اسباب تعلیم و تدریس مہیا کئے گئے اور غریب عوام نے اپنے کندھوں پر مکاتب کے جملہ اخراجات کا بوجھ اٹھالیا۔ دوسری طرف اس دینی تعلیمی تحریک نے قانونی اعتبار سے کئی رکاوٹوں کو دور کیا۔ مسلمان بچوں کو پانچویں درجہ تک جبری تعلیم اور زبردستی سرکاری اسکولوں میں بھرتی کیے جانے کے قانون سے نجات ملی۔ یوپی میں حکومت کو اس بات پر متوجہ کیا گیا کہ جب دستور ہند کی دفعہ ۲۸ کے تحت کسی بھی سرکاری ادارہ میں کسی قسم کی مذہبی تعلیم نہیں دی جاسکتی تو پھر کیوں ایک خاص مذہب کی دیومالا اور اس کی تہذیب و عقاید کو تمام بچوں کے ذہن پر تھوپنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس کا کسی حد تک تدارک بھی ہوا مگر مکمل طور پر سیکولر نصاب تعلیم حکومت سرکاری اسکولوں کے لیے نہیں مرتب کراسکی۔

ابتدائی تعلیم کے ماسوا جب ہم ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے احوال کا آزادی کے بعد جائزہ لیتے ہیں تو آزادی کے بعد اس میدان میں مسلمانوں کے حیرت ناک انحطاط کا پتہ چلتا ہے۔ حال ہی میں شمیم شاہ صاحب نے پورے ملک میں ابتدائی درجات سے ڈگری کی سطح تک مسلمانوں کے قائم کردہ اور ان کے زیر انتظام چلنے والے اسکولوں کالجوں کا جائزہ لیا ہے اس سے خاصے چونکا دینے والے انکشافات ہوئے ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ خالص دنیاوی اور سیکولر قسم کی تعلیم کے معاملہ میں بھی ہندوستان کے مسلمان کس قدر پس ماندہ ہیں اور ان کے علم و تمدن کا قافلہ دوسروں کے مقابلہ میں کس قدر سست گام ہے۔ جب خدا نے انھیں اس ملک کے خزائن کی کنجیاں حوالے کی تھی تو وہ اپنے لیے اسباب عیش و تنعم مہیا کرنے سے فراغ حاصل نہ کرسکے۔ چنانچہ آج کوئی بھی ایسا مقام نہیں جسے بغداد و قاہرہ جیسی علمی برگزیدگی اور وقار حاصل ہو۔ انگریزوں کے دور اقتدار میں بھی جب کہ جاگیرداروں تعلقہ داروں اور نوابوں کی ایک بڑی تعداد بے پناہ مالی وسائل سے اور فراغت و فراوانی سے بہرہ مند تھی صرف چند تعلیمی ادارے اور کچھ ہی بڑے مدارس وجود میں آسکے۔ آزادی کے بعد دیگر قوموں نے اپنے وسائل سے حکومت کے ہر طرح کے تعاون سے مستفید ہو کر بے شمار اسکول اور کالج قائم کیے مگر مسلمان فریاد و ماتم

کرتے ہے کہ حکومت ان پر مہربان نہیں۔ بدقسمتی سے اس وقت جو اسکول اور کالج ہیں ان کی حالت خستہ ہے۔ یہ سب مالی بحران، عمارت کی کمی اور معقول اسٹاف کے فقدان کے سبب بڑی کس مپرسی کے عالم میں ہیں۔ شمیم شاہ نے پورے ملک میں مسلمانوں کے کالجوں اور اسکولوں کی مجموعی تعداد ۵۹۰ شمار کی ہے۔ اس میں ۔ ڈگری کالج ہیں باقی ہائی اسکول یا انٹر کالج۔ ان میں ۱۸ اسکول تو ۱۹۰۰ء سے قبل قائم ہو گئے تھے۔ ۴۴ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان قائم کیے گئے اور ۳۶۹ اسکول و کالج آزادی کے بعد قائم کیے گئے ان اداروں میں ۵۸ طالبات کے لیے ہیں اور طالبات کی مجموعی تعداد طلباء کی تقریباً ایک تہائی ہے۔ مسلمان بچوں اور بچیوں کی بڑی تعداد آٹھویں کلاس کے بعد تعلیم چھوڑ دیتی ہے اور گھٹتے گھٹتے ان کی تعداد ڈگری سطح تک فقط ۲۵ ہزار رہ جاتی ہے۔ مسلمانوں کے اسکولوں اور کالجوں کی بڑی تعداد شمال میں واقع ہے جہاں مسلمان تعلیمی اعتبار سے جنوبی ہند کے مسلمانوں سے آگے ہیں۔ بچوں اور بچیوں کے اونچے درجات تک تعلیم جاری رکھنے میں جو رکاوٹ بنتے ہیں ان میں ایک بڑا سبب اقتصادی عدم استحکام ہے اور والدین روزی کے حصول کے کاموں میں ابتدائی تعلیم کے بعد ہی بچوں کو لگا دینے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ ایک بڑا سبب بچوں اور بچیوں کو تعلیم سے محروم کرنے والا یہ بھی ہے کہ انھیں ان کے اساتذہ اور سرپرست تعلیم سے بددل کر دیتے ہیں اور اسے نہایت دشوار اور جگر سوز کام بتاتے ہیں۔ مزید براں معاشرہ میں ایک عام احساس یہ بھی ہے کہ اونچی ڈگریاں بیکار ہیں اس لیے کہ ان کے حصول کے بعد بھی ملازمت نہیں ملتی۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کے بعد کسی صنعت و حرفت میں کوئی ہنر سیکھنے کے لیے بچوں کو لگا دیا جائے۔ معاشرہ جب کسی بلند نصب العین سے محروم ہو جائے اور تعلیم کو انسانی کردار کی تشکیل کا وسیلہ سمجھنے کے بجائے اسے فقط روزی روٹی کے حصول کا ایک آلہ کار تصور کیا جائے تو اس طرح کی پست حوصلگی ظہور میں آتی ہے۔ ہمارے بچوں اور بچیوں کی اعلیٰ تعلیم سے محرومی میں جہاں ان کے والدین کی اقتصادی خستہ حالی اور ایسے فلاحی اداروں کے فقدان کو دخل ہے جو اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں وظائف عطا کرے، وہیں ہمارے موجودہ ابتدائی و ثانوی اداروں کا وہ بے کیف اور مردہ خانوں جیسا متوحش کن ماحول بھی ذمہ دار ہے جہاں تعلیم و تدریس کو وقت گذاری کا ایک مشغلہ تصور کیا جاتا ہے اور جہاں اساتذہ کی ایک بڑی تعداد اس طرح اپنے فرائض کو ادا کرتی ہے جیسے کوئی قلی کسی آدمی کے بوجھ کو جلد از جلد ٹھکانے لگانے کی کوشش کرتا ہے ملک کے ۔ ڈگری کالجوں پر جنھیں مسلمان چلا رہے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ مسلمان طلبہ و طالبات داخلے کے لیے نہیں ملتے اور ان میں آدھی سے زائد جگہیں دیگر اقوام کے بچوں اور بچیوں سے پُر کی جاتی ہیں چنانچہ ایک جائزہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ٪ ۹۹ غیر مسلم طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں یہی صورت حال خود مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی بھی ہے جہاں آبادی کے تناسب سے مسلمان طلبہ و طالبات کی تعداد میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے جبکہ دیگر مذاہب کے متعلمین کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس وقت ملک میں مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کی اقتصادی و تمدنی افادیت نہایت محدود ہو گئی ہے اور اس بات کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی ہے کہ ان اداروں کو مسلمانوں کے لیے اقتصادی

اقتباسات کو جاذب نظر بنانے، تعلیم کو سہل الحصول بنانے اور تعلیم کا رشتہ ان کے کلچر سے جوڑنے کی جدوجہد کی جائے۔ ہمیں اس بات پر حیرت ہے کہ ان اداروں میں خود اردو کے فروغ کی طرف خصوصی توجہ نہیں کی گئی جو اس وقت پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی واحد رابطہ کی زبان ہے اور ان کی ثقافتی انفرادیت کی علامت ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو میڈیم سے تعلیم دینے میں دو مسائل سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اردو میں ٹیکسٹ بک ملنا دشوار ہے دوسرے یہ کہ سکنڈری ایجوکیشن کے بعد اعلیٰ تعلیم کے مراحل میں ان کو اردو میڈیم کو خیرباد کہنا پڑتا ہے۔ خود مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ میں اس کی سہولت نہیں دستیاب ہے۔ آزادی سے قبل کی عثمانیہ یونیورسٹی کے قسم کا کوئی اعلیٰ ادارہ ملک میں باقی نہیں رہا۔ لیکن اگر کوئی قوم یہ سنجیدگی کے ساتھ محسوس کرے کہ اس کے نوجوانوں کی تخلیقی صلاحیتوں کی عمیق نشوونما ان کی مادری زبان میں ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم دلانے پر منحصر ہے تو اس طرح کی تمام دقتوں پر عبور حاصل کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان تعلیمی اداروں میں صرف ۵۰ فیصد ایسے ہیں جن میں اخلاقی تعلیم کا بندوبست ہے اور یہاں طلباء وطالبات کو اپنی تہذیب اپنے عقاید اور اپنی اقدار کا ایک محدود اور ناقص پیمانہ پر ادراک ہوتا ہے۔ ان میں ایک چوتھائی ادارے ایسے ہیں جنھوں نے اخلاقی تعلیم کا الگ سے نصاب مرتب کرایا ہے اور بہت کم ادارے ایسے ہیں جنھوں نے اس نصاب کی روشنی میں متعین طور پر کتابوں کا بندوبست کیا ہے۔ بیشتر ایسا ہو رہا ہے کہ اخلاقی تعلیم کے اوقات کو دیگر مضامین کی تدریس کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اب ایسے حضرات بھی نہیں رہے جو اپنے ملی اداروں میں اخلاقی تعلیم کے لیے اعزازی طور پر اپنی خدمات کو پیش کریں اس جائزہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کی گاڑھی کمائی سے وجود میں آنے والے اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے قائم ہونے والے اداروں میں صرف ایک چوتھائی ایسے ہیں جو ملت کے نونہالوں کی ایک بنیادی ضرورت کی کسی حد تک تکمیل کر رہے ہیں۔ باقی ادارے ملک کے سیکولر نصاب تعلیم کی تدریس اور ڈگریاں تقسیم کرنے کی دوکانوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ کسی قوم کی پست حوصلگی اور زبوں حالی کا اس سے زیادہ واضح اشاریہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب علم کا رشتہ مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں امامت سے برقرار نہ رہے اور کوئی قوم اپنے نونہالوں کو صرف روزی روٹی کے حصول کا اہل بنانے کے لیے تعلیم دلانا اپنا مقصود سمجھے تو اسی طرح کی صورت حال سامنے آئے گی جیسی کہ اس وقت ہے۔

مسلمانوں کے اداروں کی زبوں حالی صرف اخلاقی تعلیم کی حد تک محدود نہیں بلکہ سیکولر علوم میں سائنس اور ریاضی سے بھی زبردست غفلت برتی جا رہی ہے اور ایک کثیر تعداد ایسے اداروں کی ہے جہاں سائنس فقط نام کے لیے ہے۔ فیل ہونے والے طلبا کی ایک کثیر تعداد انھیں دو مضامین میں اپنی نااہلی کا ثبوت دیتی ہے اور یہ بات اب ضرب المثل بنتی جا رہی ہے کہ مسلمان بچوں کو سائنس اور ریاضی نہیں آتی ہے۔ دور حاضر میں سائنس سے بے تعلقی کسی قوم کی ذہنی موت کے مماثل ہے۔ نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام نے اپنے ایک خطبہ میں اسی حقیقت کی طرف بڑے بلند

الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

"آج بھی جب کہ ہم سب یہ محسوس کرتے ہیں کہ فنون (ٹیکنالوجی) میں مہارت کے بغیر طاقت کا حصول ناممکن ہے ہم یہ نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ کوئی قریب راستہ نہیں ہے۔ جب تک سائنس کی بنیادی تعلیم ہماری معاشرت کا ایک لازمی جز نہیں بنے گی ہم سائنس کا استعمال کرنے سے قاصر رہیں گے۔ یہ سمجھنے کے لیے کسی غیر معمولی عقل کی ضرورت نہیں کہ جو لوگ بغیر بنیادی سائنس کے ہمیں ٹکنالوجی میں مہارت حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہیں وہ ہمارے دوست اور بہی خواہ نہیں"

ماضی بعید میں جس قوم نے سائنس کی اس درجہ سرپرستی کی ہو کہ تقریباً ۵، ۶ سو سال تک پوری دنیائے انسانیت پر اس کی علمی برتری کا پرچم لہراتا رہا ہو اور دنیا کی تمام قوموں نے سائنس اور اس سے متعلق فنون کا مدتوں تک جس سے درس حاصل کیا آج ہندوستان میں اس کی نوجوان نسلوں کے لیے افسوس کا مقام ہے کہ سائنس کی تعلیم کا حصول ایک مسئلہ لاینحل بن جائے۔ ہندوستان کو چھوڑیے پوری دنیائے اسلام پر نظر ڈالیے تو وہاں بھی اسی اندوہناک صورت حال سے آپ دوچار ہوں گے اور بقول پروفیسر عبدالسلام بین الاقوامی معیار پر سائنس دانوں کی جو تعداد ہمارے ملکوں میں ہونی چاہئے کہیں تو اس کا دسواں حصہ ہے اور کہیں صرف ایک فیصد مختلف قدرتی وسائل سے مالامال مسلم ممالک اپنے یہاں کی ساری ترقیاتی اسکیموں کے لیے غیر ملکی ماہرین پر آج تک منحصر ہیں۔ بظاہر طرح طرح کی تمدنی چہل پہل ان ملکوں میں نظر آتی ہے لیکن کسی طرح کی فنی مہارت ان ملکوں کے اندر نہیں ابھر رہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارا ذہن غلامانہ اور تاجرانہ ہے اور سائنس کی تعلیم کے لیے جس پر مشقت اور پر صعوبت ریاضی کی ضرورت ہے اس کا ہم اپنی نئی نسلوں کو عادی نہیں بنا رہے ہیں۔ مزید براں ابھی تک ہمارے اس طرز فکر میں بھی تبدیلی نہیں آئی ہے کہ سائنس کو ہم اپنے مذہبی نظام فکر و عمل سے الگ کر کے خالص دنیاوی یا مادی شے تصور کرتے ہیں جبکہ صحیح معنوں میں معرفت حق کا یہ سب سے بڑا سب سے موثر اور سب سے زیادہ انقلاب آفریں ذریعہ ہے مگر اس انداز سے ابھی سائنسی علوم کی تشکیل جدید نہیں کی جا سکی ہے جو اسے قرآن کے منشا و مقصد سے ہم آہنگ بنا دے۔ ہمارے نوجوان باصلاحیت اور ہونہار ہیں مگر وسائل مفقود ہیں اور بہت سے ابھرتے ہوئے نوجوانوں کو مالی دقتوں کے سبب اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ ختم کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ علی گڑھ میں سو سال قبل سر سید مرحوم نے سائنٹفک سوسائٹی اسی غرض سے قائم کی تھی اور اس سے خاصا فائدہ پہنچا۔ ضرورت ہے کہ اس طرز کے ادارے دوبارہ وجود میں آئیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس طرح کا احساس اب ملت کے اہل فکر کے اندر پیدا ہو رہا ہے۔ حال ہی میں علی گڑھ میں یوپی، بہار، ہریانہ، مدھیہ پردیش اور راجستھان کے مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کے سربراہوں اور منتظموں کی ایک کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس میں جو ریزولیوشن منظور کیے گئے اگر وہ روبہ عمل لائے گئے تو یقیناً سائنس کی تعلیم میں خاطر خواہ پیش رفت ہو سکے گی۔ اس میں اساتذہ کی تربیت کے لیے ریفریشر پروگرام اور ورکشاپ کے انعقاد پر زور دیا گیا ہے۔ مسلم اسکولوں میں (Vocational Education) داخل کرنے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور سائنس کی تعلیم کو معیاری بنانے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ باصلاحیت مسلم طلبا کا پتہ چلانے اور ان کے لیے وظائف

اور خصوصی کوچنگ کے اہتمام پر زور دیا گیا ہے۔ اس کانفرنس کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ مسلم ادارہ اپنا پرائمری اسکول بھی شروع کرے اور تمام اداروں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ اپنے مذہبی، لسانی اور تہذیبی کردار کے نشوونما کی فکر کریں اور اپنے کلچر اور اقدار حیات کی تعلیم کا ہر قیمت پر بندوبست کریں۔ اردو میڈیم کے ذریعہ جملہ مضامین کی تعلیم کے امکانات کو روشن بنانے کی جدوجہد کرنے کی ضرورت بھی محسوس کی گئی۔ مسلمانوں کے جملہ تعلیمی اداروں کے ایک خود مختار سنٹرل بورڈ بنانے کی تجویز بھی سامنے آئی ہے۔ اس طرح کی تعلیمی کانفرنسیں اگر منعقد ہوتی رہیں اور ان میں مذکورہ بالا مسائل کو عملی جامہ پہنانے کی تدابیر پر غور ہوتا رہے تو اس سے مسلمانوں کا تعلیمی مستقبل روشن ہو سکتا ہے۔

ہمارے ملک کو آزادی حاصل کیے ہوئے ۴۲ سال گذر چکے ہیں اور ان ۴۲ سالوں میں تعلیمی و تمدنی، معاشی و معاشرتی اور سیاسی و ثقافتی اعتبار سے سب سے زیادہ زبوں حالی کا اگر کسی کو سامنا کرنا پڑا ہے تو وہ مسلمان ہیں۔ ادھر ملک کے اخبارات و جرائد میں یہ بات عام گفتگو کا موضوع رہی ہے کہ مسلمان تعلیمی و اقتصادی اعتبار سے اتنے زیادہ بد سے بدتر مقام تک کیوں گرتے جا رہے ہیں۔ تعلیمی انحطاط کا لازمی نتیجہ اخلاقی انحطاط ہے اور ہم اس معاملہ میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ ملک کے سرکاری اداروں یا مشن اسکولوں سے ملت کے جو نونہال علم حاصل کر کے باہر آتے ہیں ان سے بیکاروں کی بھیڑ میں اضافہ کے سوا کوئی فیض ملت کو نہیں پہنچ رہا ہے۔ ان کے اندر اپنی تہذیب اپنی زبان اور اپنے معاشرہ کے لیے جذبۂ ایثار جذبۂ ہمدردی اور جذبۂ تعمیر تخلیق کی کوئی رمق نہیں نظر آتی۔ اس نسل کے اندر نہ علم و فن کی دوڑ میں آگے نکل جانے کا حوصلہ ہے اور نہ اپنی ملت کے درد کا مداوا بننے کی آرزو۔ ان میں زیادہ تر تعلّی کے فساد میں مبتلا ہیں اور ذہنی مرعوبیت و احساس کمتری کی آلائشوں سے داغدار ہیں۔ مسلمانوں کی اس خراب حال نسل کو دیکھ کر حضورؐ کی یہ حدیث یاد آتی ہے۔

کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ (بخاری)

بچہ تو ایک فطرت معصوم پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین اس کو یہودی و نصرانی بنا دیتے ہیں۔

اس فساد عظیم کے لیے نوجوان نسل سے زیادہ وہ پختہ کار افراد ذمہ دار ہیں جو اپنی معاشی دوڑ دھوپ سے اتنا وقت نہیں فارغ کر سکتے کہ اس درد کا مداوا سنجیدگی کے ساتھ تلاش کریں۔ تعلیم کے معاملہ میں ہماری پوری قوم آج تک بیساکھیوں کے سہارے چل رہی ہے۔ اور اپنی ضروریات کے سلسلے میں خود کفیل بننے کی قطعاً کوشش نہیں کر رہی ہے۔ لوگوں کے دلوں میں یہ خوف ہے کہ ہم مشنریوں کی طرح اچھے اور معیاری ادارے نہیں قائم کر سکتے اور اس کے لیے اچھے افراد کی خدمات نہیں حاصل کر سکتے۔ چنانچہ سرکاری اسکولوں اور عیسائیوں کے کانوینٹ میں اپنے نوجوانوں کا مستقبل تباہ کرنے کے لیے خوشی خوشی بھیج دیتے ہیں بلکہ ہم میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو کانوینٹ میں تعلیم دلانا جاہ و حشم کے اظہار اور اپنے عزو وقار کی نمائش کے لیے ضروری خیال کرتا ہے حالانکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ان غیر ملکی بو باس رکھنے والے اداروں میں ان کی نسلوں کا مستقبل سراسر تباہ ہو رہا ہے۔ ان کی ذہنی نشوونما ان اداروں میں اس طرح

ہوتی ہے کہ ان کے اندر کسی طرح کی کوئی تخلیقی اپج اور اسلامی تہذیب واقدار کے لیے کوئی جذبۂ احترام باقی نہیں رہ جاتا۔
میں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی دینی ودنیاوی تعلیم کی جو تصویر پیش کی وہ بظاہر بڑی دھندلی ہے لیکن پندرہویں
صدی ہجری کا آغاز اس ملت کے لیے نئی بشارتیں اور نشاۃ ثانیہ کے تازہ امکانات لیکر ہوا ہے۔ اس موقع پر اقبال کا یہ
شعر یاد آرہا ہے ؎

اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامان وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہان پیر دیکھ

مادہ پرستانہ تہذیب اور سیکولر وخدا بیزار تمدن دم توڑ رہا ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں اب از سر نو معنویت و مقصدیت کی تلاش جاری ہے اور سرمایہ داری واشتراکیت کی لائی ہوئی تباہ کاریوں سے زمین کا گوشہ گوشہ کراہ رہا ہے اب اس کرۂ ارض پر محیط تاریکی کے سمندر میں روشنی کے جزیرے ابھر رہے ہیں۔ اسلام کے چہرہ سے روایات وتوہمات کا بوسیدہ وسیاہ پردہ ہٹا کر اس کے جلال وجمال سے از سر نو دنیا کو روشناس کرانے کی کامیاب کوششیں جاری ہیں۔ اس طلسم سے جس میں مغرب نے مبتلا کر دیا تھا نجات مل چکی ہے کہ مذہب فرد کی انفرادی زندگی کا ایک رویہ ومعاملہ ہے اب اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت سے سمجھنے وسمجھانے کی کوششیں کامیابی سے ہمکنار ہو چکی ہیں۔ اب مسلمانوں کی فکر وتحقیق کا قافلہ اس منزل میں ہے کہ اس دور کی معاشرتی، اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی زندگی میں بھی اسلام کی معنویت اور اس کی ایک جدید ترین معاشرہ اور مثالی اسٹیٹ قائم کرنے کی صلاحیت کو نظریاتی اور عملی دونوں پہلوؤں سے واشگاف کیا جائے۔ فکر وتحقیق اور حرکت وعمل کے قافلے یقیناً ماحول کے جملہ مسائل کو اپنی گرفت میں لے کر رہیں گے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کو بھی یہ بڑھتے ہوئے قدم یقیناً پایاب کریں گے۔ زندگی کو مختلف خانوں میں بانٹ کر غور کرنے کا سلسلہ ختم ہوگا اور زندگی کے تمام شعبوں کی سرگرمیاں جو ایک بلند نصب العین اور اخلاص عمل کے ساتھ ہوں گی عبادت تصور کی جائیں گی پھر ہمیں یقین ہے کہ مسلمانوں کا دین ان کی دنیا سے الگ نہ رہ جائے گا پھر دینی تعلیم کے روایتی مدارس اور سیکولر تعلیم کے اسکولوں اور کالجوں کی جگہ ایسے ادارے وجود میں آسکیں گے جہاں مختلف علوم وفنون کی چٹانوں سے اسلام کی اخلاقی وروحانی تعلیمات کے چشمے ابل پڑیں گے۔ ان چشموں سے سیراب ہونے والی نسل ذہنی، روحانی اور جسمانی ہر اعتبار سے موجودہ نسل سے زیادہ صحت مند زیادہ توانا اور حرکت وعمل کی صلاحیتوں سے زیادہ لبریز ہوگی۔

جی چاہتا ہے کہ اس موضوع پر جو ملت اسلامیہ کے فروغ وارتقاء سے متعلق ایک نہایت ہی اہم اور فوری توجہ کا مستحق موضوع ہے سلسلہ کلام جاری رہے لیکن کبھی کبھی طول کلام بھی آدمی کے خلوص کو مشتبہ کر دیتا ہے اس لیے بقول اقبال یہی خاتمہ کلام ہے ؎ فروزاں ہے سینہ میں شمع نفس، مگر تاب گفتار کہتی ہے بس

[احمد آباد میں ایک تعلیمی سمینار میں یہ مقالہ پیش کیا گیا]

حوالہ جات

۱۔ الہلال۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۲۸ر جنوری ۱۹۱۴ء

۲۔ مقدمہ صحیفہ ہمام ابن منبہ (انگریزی) ڈاکٹر محمد حمید اللہ حبیب اینڈ کمپنی حیدرآباد ۱۹۶۴ء ص۹

۳۔ تعمیر حیات لکھنؤ۔ ندوۃ العلما نمبر

۴۔ الہلال۔ ابوالکلام آزاد ۲۸ جنوری ۱۹۱۲ء

۵۔ تعلیمی خطبات۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ مکتبہ جامع دہلی۔ ص۴۳

۶۔ تعلیمات۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ مکتبہ جماعت اسلامی ہند رامپور

۷۔ نظام تعلیم و تربیت، مناظر احسن گیلانی

۸۔ تعمیر حیات، لکھنؤ۔ ندوۃ العلماء نمبر

۹۔ تعلیمات، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مکتبہ جماعت اسلامی ہند

۱۰۔ موج کوثر شیخ محمد اکرام فیروز سنز لاہور

۱۱۔ تعلیمی خطبات۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ مکتبہ جامع نئی دہلی۔ ص۲۲

۱۲۔ 〃 〃 〃 〃 ص۲۶

۱۳۔ 〃 〃 〃 〃 〃

۱۴۔ تعلیمات، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مکتبہ جماعت اسلامی ہند

۱۵۔ عدیل عباسی کردار کا غازی۔ مرتبہ اختر بستوی۔ شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی۔ گورکھپور۔

۱۶۔ بریڈ نیس ہفت روزہ۔ دہلی۔

ہم تحریکِ اسلامی کے کارکن کیسے بنیں؟

سید جلال الدین عمری

آیئے اس سوال پر غور کرنے سے پہلے اسی سے متعلق ایک اور سوال پر غور کرلیں۔ وہ یہ کہ کیا اسلام ایک تحریک ہے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہو تو اوپر کا سوال بامعنی ہوگا ورنہ اس کے کوئی معنی نہیں ہوں گے۔ اسلام کو جب ایک تحریک کہا جاتا ہے تو اس کی مخالفت دورِ جدید کے علم برداروں کی طرف سے بھی ہوتی ہے اور بعض مذاہب کے حاملین کی طرف سے بھی۔ دورِ جدید اسلام کو ایک مذہب سمجھتا ہے اور مذہب کے بارے میں اس کا تصور یہ ہے کہ یہ پوجا پاٹ اور کچھ روایات اور مراسم کا مجموعہ ہے جو لوگ اسے مانتے ہیں اس پر عمل کرسکتے ہیں لیکن زندگی کے اور معاملات سے نہ تو اس کا کوئی تعلق ہے اور نہ ہونا چاہیے۔ آج پوری دنیا کا اجتماعی اور سیاسی نظام اسی تصور پر مبنی ہے کہ مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہے۔ اجتماعی زندگی اس سے الگ رہے گی۔ مذہب کے بارے میں اس رویہ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ اگر مذہب دنیا کے اجتماعی امور و معاملات سے متعلق ہوگا تو دنیا فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن جائے گی۔ لیکن تعجب ہے یہ بات وہ لوگ کہتے ہیں جنھوں نے خود دنیا کو فتنہ و فساد سے بھر رکھا ہے۔ اس وقت دنیا میں جو بگاڑ ہے وہ مذہب کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ خدا بیزاری اور مذہب دشمنی کے یہ کڑوے کسیلے پھل ہیں جو انسان کو چکھنے پڑ رہے ہیں بلکہ انھیں سے وہ پیٹ بھرنے پر مجبور ہے۔

یہ تو ہے مذہب کے بارے میں دورِ جدید کا نقطۂ نظر۔ اس کے ساتھ بعض مذاہب اور ان کے حاملین نے بھی یہ تصور دینے کی کوشش کی کہ مذہب اصلاحِ روح کے تزکیہ اور طہارت کے لیے ہے۔ یہ مقامِ بلند اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ انسان دنیا اور اس کے مسائل سے بے تعلق نہ ہوجائے اور نفس اور اس کی خواہشات کو پوری طرح کچل نہ دے۔ اس کے لیے خاص قسم کی ریاضتیں وجود میں آئیں، مشقیں اور تجربات ہونے لگے اور روحانی ترقی کے چاہنے والے دنیا کو چھوڑ کر پہاڑوں، غاروں اور جنگلوں میں چلے گئے۔ اس سے رہبانیت کا ایک پورا نظام وجود میں آیا۔ یہ نظام دورِ جدید کے تصورِ مذہب کو تقویت پہنچاتا رہا اس لیے اسے پھلنے پھولنے کے مواقع بھی فراہم ہوتے رہے۔ اس طرح عملاً ایک نے ایک جذبے اور دوسرے نے دوسرے جذبہ سے مذہب کو انسان کی اجتماعی زندگی سے بے دخل کردیا۔ اسلام کو جو ہم تحریک کہتے ہیں تو ان دونوں نظریات کی تردید

کرتے ہیں اور انھیں غلط اور باطل قرار دیتے ہیں۔

تحریک نام ہے کسی مقصد کے لیے حرکت اور جد و جہد کا۔ یہ مقصد جس نوعیت کا ہوگا اسی نوعیت کی جد و جہد ہوگی۔ اسے بعض مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس وقت پورے سماج میں بے ایمانی اور رشوت پھیلی ہوئی ہے۔ فرض کیجیے آپ اس کے خلاف کوئی اصلاحی تحریک چلانا چاہتے ہیں تو اس کا ایک خاص میدان ہوگا یا تعلیم کو عام کرنے کی تحریک آپ کے پیشِ نظر ہو تو یہ کام خاص حدود میں ہوگا یا کوئی سیاسی تحریک چلانا چاہیں تو اس کا بھی ایک دائرہ ہوگا۔ لیکن اسلام انسان کو پوری طرح بدل دینے کا نام ہے۔ اس کی شخصی زندگی کو بھی اور اجتماعی زندگی کو بھی۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی انقلابی تحریک ہے جو انسان کو نفس اور خواہش کی غلامی سے، قوم اور قبیلے کی غلامی سے، رسم و رواج کے غلامی سے، غرض یہ کہ ہر چھوٹی بڑی غلامی سے نجات دلا کر ایک خدا کا بندہ اور غلام اور اس کے احکام کا پابند بنانا چاہتی ہے۔ اس تحریک کا ہدف اور گول (GOAL) ہے۔

اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل: ۳۶)

وہ اس اعلان کے ساتھ آتا ہے۔ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے) اس کا مطالبہ ہے۔ اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ) وہ کامیابی کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اللہ کے رسول کی امید ہے تم پر رحم کیا جائے گا) اس نظریہ کی بنیاد پر عرب کی سرزمین میں آج سے چودہ سو سال پہلے جو تحریک اٹھی اس نے پورے معاشرہ میں ایک ہل چل پیدا کر دی، اس نے مردوں کو زندہ کیا، سوتوں کو جگایا، کم زوروں کو توانائی عطا کی، اپاہجوں کو چلنا سکھایا اور جو لوگ اپنے نفس کے بندے تھے ان کو خدا کا بندہ بنایا، جو خواہشات کے پیچھے چل رہے تھے۔ ان کو حدود و قیود میں رہنا سکھایا۔ اس سے ایک ایسی امت وجود میں آئی جو اس انقلابی فکر کو لے کر اطرافِ عالم میں پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے ایک بڑے حصہ پر اس نے اسلام کا پرچم گاڑ دیا۔

اسلام نے انسانی زندگی کو جن حدود کا پابند بنایا ہے ان کا جب ذکر کیا جاتا ہے تو موجودہ دور کے سامنے سترہویں اور اٹھارہویں صدی کی مذہبی بندشیں آجاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے ذہن و فکر پر تالے لگانے اور سائنسی اور تمدنی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کے لیے بدترین قسم کی تشدد آمیز کارروائیاں کی گئیں۔ یہ سب کچھ مسیحیت کے نام پر اس کے غلط ترجمانوں نے کیا۔ اس قابلِ مذمت کارروائی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس نے عقل و دانش کے استعمال پر کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی بلکہ نئی تحقیقات کی راہ کھولی اور تمدن کو آگے بڑھایا۔ وہ تو انسان کے نفس اور خواہشات پر پابندی لگاتا ہے، اوہام و خرافات اور بے بنیاد تصورات سے نجات دلاتا ہے، غلط رسوم و رواج اور بے جا بندشوں سے محفوظ رکھتا ہے، اس کی پابندیاں ترقی کی ضامن ہیں نہ کہ اس کی راہ کی رکاوٹ۔

تحریک اسلامی مذہب کے جامد تصور کے خلاف اسلام کا جو حرکی تصور پیش کرتی ہے یہ اس کا ایک ہلکا سا تعارف ہے۔

اب ایئے یہ دیکھیں کہ آدمی اس تحریک کا کارکن کیسے بنتا ہے لیکن یہاں ایک بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ہر اس شخص کو کسی تحریک کا کارکن کہا جا سکتا ہے جو اس کے لیے کچھ وقت دے، تھوڑی سی دوڑ دھوپ کرے اور اس کے بعض کاموں میں تعاون کرے۔ لیکن اس وقت میرے سامنے مثالی اور معیاری کارکن کا تصور ہے۔ مثالی کارکن وہ ہے جو اپنی پوری زندگی تحریک کے حوالہ کر دے، اسی کے لیے سوچے، اسی کے لیے تگ و دو کرے، اسی کی فکر میں تڑپتا ہے اور تحریک کے مفاد کے لیے اپنے ہر مفاد کو قربان کر دے۔ اس کی جان، مال، قوت و صلاحیت سب کچھ تحریک کے لیے وقف ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ اس کے لیے کارکن کی اصطلاح کو ہلکی سمجھیں اور کوئی اور اصطلاح تجویز کریں، لیکن میرے خیال میں تحریک کی بڑی سے بڑی خدمت انجام دینے والا بھی اس کا کارکن ہی ہوتا ہے۔

تحریک کے ہر کارکن کو مثالی کارکن بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے اندر یہ تمنا، یہ جذبہ اور یہ تڑپ ہونی چاہیے کہ وہ تحریک کا ایک عام رکن نہیں بلکہ مثالی کارکن بن کر رہے گا اور تحریک کی بڑی سے بڑی خدمت انجام دے گا۔

اس تحریک کا معیاری اور مثالی کارکن بننے کے لیے آدمی کو زبردست تیاری کرنی ہوگی اور اپنے اندر خاص خوبیاں پیدا کرنی ہوں گی۔ یہاں ان ہی کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

۱۔ جو شخص تحریک اسلامی کا معیاری کارکن بننا چاہتا ہو اس کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اسلام کا گہرا علم حاصل کرے، اسے اچھی طرح سمجھے، اس کے احکام و مقاصد سے باخبر ہو اس کی روح اور مزاج کو اپنے اندر جذب کرے۔ اس کا یہ علم اور واقفیت اتنی بڑھ جائے کہ اسے اسلام کی حقانیت پر کامل شرح صدر حاصل ہو جائے، اس کے اندر سے یہ یقین ابل رہا ہو کہ صرف اسلام ہی کے دامن میں نجات مل سکتی ہے۔ وہ دن کی روشنی میں دیکھ رہا ہو کہ دنیا باطل نظریات کی آگ میں جل رہی ہے اور غلط اخلاق و اعمال نے اس کو موت کے دہانے تک پہنچا دیا ہے۔ دنیا کا کوئی نظریہ اس کے اس یقین کو متزلزل نہ کر سکے کہ اس کے پاس نور حق ہے اور ظلمت کی ماری ہوئی دنیا کو وہ راہ حق دکھا سکتا ہے۔ خدا کے پیغمبر جنھوں نے کفر و ظلمت سے دنیا کو پاک کیا انھیں اللہ کے دین پر اسی طرح شرح صدر ہوتا تھا، اسی شرح صدر کے بعد وہ اس پوزیشن میں ہوتے تھے کہ اس بھاری بوجھ کو اٹھا سکیں جو پہاڑ پر رکھ دیا جائے تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائے اور زمین پر ڈال دیا جائے تو اس کا سینہ شق ہو جائے۔ قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ تبلیغ دین کی بھاری ذمہ داری نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو شرح صدر کی دولت عطا فرمائی۔ جس کی وجہ سے اس راہ پر استقامت اور اس کے لیے دشواریوں کا برداشت کرنا آپ کے لیے آسان ہو گیا۔

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنكَ	کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا اور تم پر سے
وِزْرَكَ الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ وَرَفَعْنَا	وہ بھاری بوجھ نہیں اتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال

ساتھ اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا۔

لَكَ ذِكْرَكَ (الانشراح ۹۴:۴)

یہ اللہ کا فضل ہے کہ ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں اسلام کا نام لینے میں بعض وہ رکاوٹیں نہیں ہیں جو کسی زمانے میں تھیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی اللہ کا فضل ہے کہ اسلامی تحریکیں دنیا کے گوشے گوشے میں اسلام کی وکالت اور ترجمانی کا فرض انجام دے رہی ہیں۔ ان تحریکوں نے بہترین اسلوب میں دین کی تفہیم کی خدمت انجام دی ہے اور دے رہی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے ان تحریکوں کے نقطۂ نظر، ان کی زبان اور ان کی اصطلاحات کو تو اپنا لیا ہے لیکن ان کی معنویت اور تقاضوں کو وہ پوری طرح اپنے دل و دماغ میں نہیں اتار سکے ہیں۔ ان تحریکوں کے زیر اثر یہ کہنا آسان ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، لیکن اس اجمال کو کھولنا آسان نہیں ہے۔ ان تحریکوں نے اس حقیقت کا بے باکانہ اظہار کیا کہ انسان کی سیرت کی تعمیر، معاشرہ کی تشکیل اور سیاست کی تنظیم صحیح خطوط پر اسلام ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے اس لیے اسی کو زندگی کے ہر پہلو پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔ آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جو ان تحریکوں سے تعلق کی بنا پر اس انقلابی فکر کا چرچا تو کرتے ہیں لیکن اس کے مضمرات اور پیچیدگیوں سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ ان تحریکوں نے بتایا کہ اسلام، عقیدہ، اخلاق، معاشرت، معیشت اور سیاست کے لیے بہترین اصول فراہم کرتا ہے اور دین و دنیا کے سارے مسائل بہت ہی عمدگی سے حل کرتا ہے، اس لیے دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے تمام شعبے اس کے تابع ہوں اور اقتدار و حکومت صرف اسی کی تسلیم کی جائے۔ لیکن ایسے لوگ کم ملیں گے جو اس فکر سے اتفاق کے باوجود زندگی کے کسی ایک شعبہ میں اسلام کی برتری ثابت کر سکیں۔

اس میں شک نہیں تحریک میں عوام بھی ہوتے ہیں اور خواص بھی۔ اس لیے تحریک کے ہر فرد سے اس فکری بلندی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ خواص کا مقام قیادت اور رہنمائی کا ہے۔ عوام پیچھے چلتے ہیں۔ علم کے بغیر قیادت کا نازک منصب حاصل نہیں ہو سکتا۔ نعرے اور دعوے عوام کے لیے ہوتے ہیں۔ علم والے دنیا کو ان کی معنویت سمجھاتے ہیں۔ تحریک اسلامی کے مثالی کارکن کو علم والوں کی صف میں نظر آنا چاہیے۔ اس کے لیے اسلام کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اس مطالعہ کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسلام کا عمومی مطالعہ ہو اور آدمی اس کے بنیادی مسائل اور احکام اور اس کی غرض و غایت سے اس حد تک واقف ہو جائے کہ وہ اس کا اجمالی تعارف کرا سکے۔ تحریک اسلامی کے ہر کارکن کے لیے اس حد تک اسلام کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ اس سے غفلت کسی حال میں نہیں ہونی چاہیے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلام کا خصوصی مطالعہ کیا جائے۔ اس سے میری مراد اونچی قابلیت اور گہری بصیرت پیدا کرنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام کے تمام پہلوؤں پر اس نوعیت کا مطالعہ خاص طور پر موجودہ دور میں بہت دشوار بلکہ شاید ناممکن ہے۔ البتہ اسلام کے عمومی مطالعہ کے ساتھ اس کے کسی ایک پہلو پر ہمارے مثالی کارکنوں کو ہر علمی معیار کی تیاری کرنی چاہیے تاکہ وہ تفصیل کے ساتھ اسلام کے اس پہلو پر اظہار خیال کر سکیں اور اس کے ایک ایک نکتہ پر دنیا کو مطمئن کر سکیں۔ ظاہر ہے اس کے لیے غیر معمولی محنت کی ضرورت ہے۔ اس وقت پر خطاب ان نوجوانوں سے ہے، جو علم کے مختلف میدانوں میں کام کر رہے

ہر میدان سے بہ نسبت بے جا نہ ہوگی کہ وہ اس تیاری سے غافل نہ ہوں۔ ایک طالب علم سے علم ہی سے متعلق گفتگو ہو سکتی ہے اگر وہ علم کے میدان میں ناکام رہا تو یہ اس کا اتنا بڑا نقصان ہوگا کہ شاید کسی اور طریقہ سے وہ اس کی تلافی نہ کرسکے۔

۲۔ کسی تحریک کا کارکن اس کا ترجمان ہوتا ہے۔ تحریک اسلامی کے کارکن کو بھی اس کا ترجمان ہونا چاہیے۔ یہ ترجمانی اسے عوام اور خواص میں، مسجدوں اور مدرسوں میں، اسکولوں اور کالجوں میں، بازاروں اور پارکوں میں بڑے اور چھوٹے مجموں میں غرض ہر مقام پر اور ہر جگہ کرنی ہوگی اور اپنی بات چیت سے، تقریر و تحریر سے، صحافت سے، مذاکروں اور مباحثوں سے یعنی ہر اس ذریعہ سے کرنی ہوگی جو اس کے اختیار میں ہو اور جو اس تحریک کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہو۔ آپ ہر محاذ پر اسلام کے وکیل اور ترجمان بن کر نظر آئیں، دینِ کی ہر بحث کا رُخ اس کی طرف موڑ دیں، ہر چیلنج کا جواب آپ کے پاس موجود ہو اور ہر الجھن کو آپ اس کی روشنی میں حل کرسکتے ہوں۔ یہ ایک طویل عمل ہے جو اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ دنیا اسلام کے زیر نگیں نہ آجائے اور ہر طرف اس کا بول بالا نہ ہونے لگے یہی زبردست مہم آپ کو سر کرنی ہے، سوچئے کیا آپ اس کے لیے تیار ہیں۔؟

۳۔ تحریک اسلامی کا کارکن وہ ہے جس کی پوری زندگی اس تحریک سے ہم آہنگ ہو، وہ جو کچھ اسٹیج پر نظر آتا ہے وہی اپنی نجی زندگی میں نظر آئے۔ اس کے اخلاق، اس کے اعمال، اس کے تعلقات اور اس کے معاملات سب کچھ اس تحریک سے مطابقت رکھتے ہوں۔ جس شخص کے اندر یہ خوبی نہ ہو وہ اس کی خدمت تو کیا کرے گا اس کی بدنامی اور رسوائی کا باعث ہوگا۔ قول و عمل کا تضاد ہر تحریک کو نقصان پہنچاتا ہے، اسلامی تحریک کے لیے بھی یہ سم قاتل ہے۔ تحریک اسلامی سے وابستہ کسی نوجوان کے لیے اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ اس کا کردار اس تحریک کے عین مطابق ہو۔ آج کے دور میں جب کہ ہمارے اس ملک کے بلکہ دنیا بھر کے نوجوان ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ ان کی سیرت اور اخلاق کو گھن لگ چکا ہے، وہ بے شمار غلط کاریوں میں مبتلا ہیں، ان کی وجہ سے ہنگامے ہیں، توڑ پھوڑ ہے، بداخلاقی کے مظاہرے ہیں، زنا و بدکاری ہے، ان کے درمیان سے بڑوں کا ادب ختم ہو چکا ہے، تعلیم سے ان کی دل چسپی باقی نہیں رہی، ان کے اوقات غلط اور بے مقصد کاموں میں صرف ہو رہے ہیں، ان کی وجہ سے ان کے ماں باپ پریشان ہیں، پاس پڑوس اور محلہ کے لوگ پریشان ہیں اور ملک پریشان ہے۔ اس صورت حال میں اگر کوئی نوجوان اسلام کی صحیح تصویر پیش کرے، وہ با اخلاق اور باکردار ہو، بڑوں کا ادب کرنے والا ہو، چھوٹوں کو اس سے تکلیف نہ پہنچے، اس کے رویہ سے ماں باپ، خویش و اقارب اور ملنے جلنے والے سب خوش ہوں تو اس کی بے زبانی بھی زبان بن جائے گی اور اس کی خاموشی میں گویائی کی طاقت ہوگی۔ وہ اسٹیج پر گئے بغیر بھی ہر وقت اسٹیج پر رہے گا، اس کی باتیں کانوں کے پردوں سے ٹکرا کر نہیں لوٹ آئیں گی بلکہ دلوں اور دماغوں کی گہرائیوں میں اتر جائیں گی، اس کا وجود خود اس بات کی دلیل بن جائے گا کہ وہ حق پر ہے اور حق کی طرف دنیا کو بلا رہا ہے۔ سوچئے کیا کوئی کارکن اتنے بڑے ہتھیار سے محروم ہو سکتا ہے؟

۴۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے اور ایک نوجوان توان صلاحیتوں سے مالا مال ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ ان مول اور بیش بہا قوتوں اور صلاحیتوں کا ایک خزانہ لیے پھرتا ہے۔ ان سے وہ تخریبی کام بھی کرسکتا ہے اور تعمیری خدمات بھی انجام دے سکتا ہے۔ آپ تحریک اسلامی کے کارکن ہیں۔ آپ کے پاس قوتوں اور صلاحیتوں کا جو خزانہ ہے اسے اسی تحریک کی خدمت میں لگائیے۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ کی یہ صلاحیتیں اور توانائیاں خود بخود آپ کو نہیں مل گئی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں۔ ان کے بارے میں قیامت کے روز سوال ہوگا۔ آپ کے پاس علم ہے تو اس علم کے بارے میں سوال ہوگا۔ آپ کو جوانی ملی ہے تو اس جوانی کے بارے میں سوال ہوگا، حدیث میں آتا ہے

لن تزول قدما ابن آدم حتی یسئل عن خمس عن عمرہ فیما افناہ وعن شبابہ فیما ابلاہ وعن علمہ ماذا عمل بما علم وعن مالہ من این اکتسبہ وفیما انفقہ (رواہ الترمذی)

قیامت کے روز انسان کے قدم ہٹ نہیں سکتے جب تک کہ اس سے پانچ سوالات نہ ہو جائیں اور وہ ان کا جواب نہ دے دے۔ اس نے اپنی عمر کیسے گزاری، اپنی جوانی کس طرح ختم کی۔ جو علم حاصل کیا اس کے مطابق کس حد تک عمل کیا، اپنا مال کہاں سے حاصل کیا اور اسے کہاں خرچ کیا؟

آپ کو جو صلاحیتیں ملی ہیں اس تحریک کو ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ وہ بغور دیکھ رہی ہے کہ آپ کی یہ صلاحیتیں اس کے کام آرہی ہیں یا نہیں؟ ہو سکتا ہے کہ دنیا کے بازار میں آپ کی ان صلاحیتوں کی زیادہ قیمت ملے اور تحریک ان کی کوئی قیمت نہ ادا کر سکے۔ لیکن محض اس وجہ سے کہ بازار میں ان کی قیمت زیادہ ہے آپ ان کو نیلام نہ چڑھائیے۔ یہ دنیا اور متاع دنیا بے حقیقت ہے اور آپ کی صلاحیتیں یقین مانئے اتنی قیمتی ہیں کہ وہ یہاں کے خزف ریزوں کے عوض نہیں بیچی جاسکتیں۔ یہ یہاں کے لعل و جواہر سے بھی تولی نہیں جاسکتیں، ان کی قیمت کا تو آج آپ اندازہ بھی نہیں کرسکتے۔ اس کی صحیح قیمت اس وقت معلوم ہوگی جبکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا صلہ ملے گا۔ آپ اتنا پائیں گے کہ اس دنیا کی ہر محرومی کا احساس ختم ہو جائے گا اور ہر تمنا پوری ہو جائے گی۔

یہ تحریک کس کی ہے؟ یہ آپ ہی کی ہے، آپ اس کے دست و بازو ہیں، آپ مستقبل کے قائد ہیں جن پر اس کے چلانے کی ذمہ داری عائد ہوگی۔ آپ وہ ہیں جن کے حوالے آئندہ یہ امانت کر دی جائے گی۔ ذرا سوچئے کتنی بڑی ذمہ داری آپ پر آنے والی ہے۔ یاد رکھئے دنیا کا مستقبل اس تحریک سے وابستہ ہے۔ یہ تحریک ہر طرف چھا جانے کے لیے اٹھی ہے اور اللہ نے چاہا تو چھا کر رہے گی۔ دعا ہے کہ اس کا علم ہمارے ہاتھوں میں ہو اور ہمارے ذریعہ یہ کارنامہ انجام پائے۔

(یہ مقالہ ۲۰۰۵ء کی کل ہند کانفرنس منعقدہ بنگلور میں اس کے ارکان کی نشست میں ۲۷ر دسمبر ۲۰۰۵ء کو پڑھا گیا۔ اب کسی قدر نظر ثانی کے بعد اسے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔)

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے

محمد سعود عالم قاسمی

شوبھا، ایک غریب اور پریشان حال لڑکی ہے جس کی عمر ۲۲ سال ہے، ضلع بھساول کے ایک گاؤں سے بمبئی شہر آئی ہے، اس کو ساتھ لانے والی عورت اسے معقول آمدنی کی نوکری کا حوالہ دے کر پونے لے آتی ہے اور ایک چکلہ خانہ میں بیچ دیتی ہے، وہاں اسے اپنی عصمت نیلام کرنے کے علاوہ گالی سننا پڑتی، پٹائی سہنا پڑتی اور گاہک نہ ملنے کی صورت میں بھوک کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے، شوبھا نے کئی مرتبہ اس دردناک زندگی سے نکل بھاگنے کی کوشش کی مگر گھر والی اور غنڈہ عناصر اس کی کڑی نگرانی کرتے ہیں۔ اور دھمکی دیتے ہیں کہ اگر اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو اس کی ہڈیاں توڑ دی جائیں گی وہ مرنا چاہتی ہے مگر وہ بھی نہیں کر سکتی۔ اس وقت وہ یومیہ ۱۲ روپے کماتی ہے جس کا آدھا گھر والی (طوائف) کو دیتی ہے اور بقیہ میں سے خوراک، کرایہ اور پولیس کا حصہ ادا کرتی ہے، اور اب وہ ۷۰۷ اور ۷۰۵ جیسے مہلک امراض کا شکار ہو چکی ہے۔ وہ اگر خودکشی نہ بھی کرے تو یہ امراض اسے خود ہی فنا کر دیں گے۔

جبری بدکاری اور چکلہ خانوں کے استحصالی نظام کی یہ اور اس جیسی متعدد تصویریں انتہائی دردناک اور بھیانک ہیں ہندوستانی عورتوں کی ایک قابل لحاظ تعداد اسی ظلم و جبر کا شکار ہے، اس صورتحال نے، مرکزی حکومت، ریاست مہاراشٹر، خواتین کی نمائندہ انجمنوں اور سماجی تنظیموں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اس مسئلہ پر غور کریں اور اس تباہی سے معاشرہ کو بچانے کی کوشش کریں، مگر بڑی عجیب بات یہ ہے کہ بدکاری کا استیصال، اور بدکار اداروں کے انہدام کے فوری اقدام کے بجائے حکومت بدکاری کو قانونی حیثیت عطا کرنے پر غور کر رہی ہے ؎ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے۔

بدکاری (Prostitution) ایک ادارہ ہے جہاں بدکاری کے ٹھیکیدار، بدچلن پولس افسران، اور ووٹ حاصل کرنے والے سیاسی حضرات اپنا اپنا حصہ لگاتے ہیں۔ اور شہوت پرست بدکار اپنے جنس کی آگ بجھاتے ہیں۔ اس ادارہ کی دیکھ بھال جنسی اقدار کے قانون کے ذریعہ ہوتی ہے جو عورتوں کو گالی سننے اور برداشت کرنے کو روا رکھتا ہے اور اس کی متاع عصمت کو نیلام کرتا ہے، بدکاری خواہ جبری ہو یا اختیاری بہر صورت یہ ایک استحصالی اور لوٹ کھسوٹ کی مارکیٹ ہے جس کا سامان عورتوں کا جسم اور جنس (sex) ہیں۔

۱۹۵۶ء میں حکومت ہند نے بدکاری کے لیے لڑکیوں اور عورتوں کے غیر اخلاقی اور غیر انسانی کاروبار کو ختم کرنے کا ایکٹ
پاس کیا تھا اس ایکٹ کا حاصل یہ تھا کہ بدکاری کے لیے لڑکیوں اور عورتوں کی خرید و فروخت ختم کی جائے چکلہ خانوں کے
محافظوں، دلالوں اور بدکاری کے لیے کرایہ داروں کی حرکات کو دائرہ جرم میں لایا جائے، اور ان پر فرد جرم عائد کی جائے، مگر
اس ایکٹ کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں انفرادی اور اختیاری بدکاری یا ایسی بدکار عورتوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی
کیونکہ اس ایکٹ کے مطابق اسے جرم ہی نہیں سمجھا گیا ہے۔ اس ایکٹ میں جو تضاد ہے وہ خود موجودہ تباہی کا ذریعہ ہے اس ایکٹ
کے سیکشن ۷ء اور ۸ء کے تحت عوامی جگہوں پر بدکاری کرنے اور بدکاری کے لیے گاہک پھنسانے کے لیے بدکار عورت کو قابل سزا
قرار دیا گیا ہے گویا ایکٹ کی نظر میں وہ مجرم ہے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ایکٹ کی یہ دفعات بدکار مرد کو ہرگز مجرم نہیں قرار
دیتیں گویا مرد کو بدکاری اور استحصال کی آزادی ہے اور مجرم صرف عورت ہے۔ جیسا کچھ بھی سہی ایکٹ اپنی جگہ مگر اس کا
نفاذ شاذ و نادر ہی عمل میں آتا ہے۔ جبکہ ادھر صورت حال یہ ہے کہ چکلہ خانے بدستور پھیلتے جا رہے ہیں اور بدکاری کے لیے لڑکیوں
اور عورتوں کا کاروبار بھی بلاتخفیف جاری ہے۔ باوثوق ذرائع کی اطلاع کے مطابق صرف بمبئی شہر میں پچاس ہزار چکلہ خانے اور ایک
لاکھ طوائف موجود ہیں۔ جن میں ۲۰ فی صد کمسن لڑکیاں ہیں۔ بمبئی کے محکمہ جرائم کے خفیہ سیل کے ریکارڈ بتاتے ہیں کہ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۵ء
کی پانچ سالہ مدت میں صرف چار سو نو ۴۰۹ چکلہ خانوں پر چھاپہ مارا گیا، اس تناسب سے دیکھا جائے تو مذکورہ پچاس ہزار چکلہ خانوں
کا محاسبہ کرنے کی صورت میں چھ سو سال میں صرف ایک مرتبہ محاسبہ کیا جا سکے گا۔

اس ایکٹ کی کمزوری یہ ہے کہ یہ فاحشہ عورت پر تو پابندیاں عائد کرتا ہے مگر بدکاری کے ٹھیکیدار اور عیاش مردوں کو پوری
آزادی دیتا ہے، محکمہ جرائم کے نگہداشت سیل کے ریکارڈ اس بات کا ثبوت ہیں کہ ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۶ء کے درمیانی عرصے میں جتنے چکلہ
خانوں کے محافظوں کو گرفتار کیا گیا ان میں سے صرف دو پر فرد جرم عائد کی گئی، باقی یا تو ضمانت پر رہا کر دیے گئے یا بری کر دیے گئے
۱۹۸۱ء سے لے کر مئی ۱۹۸۶ء تک کوئی ایک بھڑوا یا چکلہ خانے کا مالک S I T ایکٹ کے تحت گرفتار نہیں کیا گیا۔ دوسری طرف چار ہزار
ایک سو انتالیس ۴۱۳۹ بیسوائیں اس ایکٹ کے سیکشن ۸ء کے تحت گاہک رجھانے کے الزام میں اور چوبیس ہزار چھ سو تریسٹھ (۲۴۶۶۳)
بیسوائیں بمبئی پولیس ایکٹ کے سیکشن ۱۱۰ کے تحت ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۵ء کے درمیان گرفتار کی گئیں اور ان سب پر فرد جرم عائد کی گئی۔ ان
ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلی مجرموں یعنی بدکاری کا کاروبار چلانے والے ٹھیکیداروں، دلالوں اور بھڑووں کے بجائے صرف
بدکار عورتیں گرفتار کی جاتی ہیں اور ان کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا جاتا ہے۔ S I T ایکٹ کی ناکامی کا ہی نتیجہ ہے کہ حکومت ہند
ہندوستانی تنظیم برائے صحت اور سماجی فلاح کی تنظیمیں بدکاری کو قانونی حیثیت دیے جانے اور اس کام کے لیے لائسنس جاری
کرنے کے معاملہ پر بحث میں مصروف ہیں۔

اس سے پہلے جنوبی کوریا، مغربی جرمنی، بیروت، اسٹرڈیم اور نیوگنڈا (امریکہ) نے بدکاری کو قانونی حیثیت دے دی ہے، وہاں
بند گھروں یا چکلہ خانوں میں بدکاری کے لیے لائسنس جاری کیے جاتے ہیں۔ بدکاری کے اس قانونی نظام کے تحت بیسواؤں

کو مقامی حکام کے رجسٹر میں اپنا نام لازمی درج کرانا پڑتا ہے، اور وقفہ وقفہ سے اپنے آپ کو طبی معائنوں کے لیے پیش کرنا پڑتا ہے، اس بنیاد پر ان کو تصدیق نامہ صحت اور پولیس اجازت نامہ کارڈ دیا جاتا ہے، جسے انسداد امراض جماعی (Venereal diseases) کے مطلب میں ہر معائنہ کے وقت پیش کیا جانا ضروری ہے۔ اور یہ اس کے بعد ہی ہو سکتا ہے جبکہ بدکار عورتوں کو اپنا پیشہ چلانے کے لیے پولیس اجازت نامہ مل چکا ہو اور اسے گورنمنٹ سے لائسنس بھی حاصل ہو۔ مذکورہ ممالک نے بدکاری کو قانونی حیثیت دینے کی وجہ جواز بیسواؤں کی فلاح اور صحت عامہ کی حفاظت کو قرار دیا ہے، مگر انھوں نے بدکاری کی لعنت اور دوسرے جرائم میں اضافہ تو کیا ہے سماجی فلاح کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں کی ہے شگ راج نویڈا کی حالت حد درجہ افسوس ناک ہے بدکار عورتوں کی آمدنی کا پچاس فی صد بدکاری کے مراکز کو جاتا ہے، نیز بدکاروں کے لیے ضروری ہے کہ وہاں تک پہنچنے کے لیے ایجنٹ یا دلال کا ذریعہ ڈھونڈھیں، دلال اس کی اجرت بدکار عورتوں سے لیتے ہیں جبکہ ہاؤس اپنا حصہ پہلے ہی لگا لیتا ہے۔

جرمنی دوسرا ملک ہے جہاں بدکاری کی قانونی حیثیت تسلیم کر لی گئی ہے، ایک جرمن محقق یا تذرف جس نے ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۸ء کے درمیان جرمنی میں بدکاری کا جائزہ لیا ہے وہ انکشاف کرتا ہے کہ بیسواؤں کے خلاف چکلوں اور قحبہ خانوں میں دلالوں کے مظالم مسلسل ہوتے رہتے ہیں۔ زناکاری کو قانونی حیثیت عطا کرنے کے نتیجہ میں سفید فام غلام کی خرید و فروخت اور کمسن لڑکیوں اور عورتوں کو بدکاری کے لیے پھنسانے میں اضافہ تو ہوا ہے کمی نہیں ہوئی ہے۔

انیسویں صدی میں برطانیہ میں زناکاری کو قانونی حیثیت دینے کے نتیجہ میں بدکار عورتوں پر پولیس کی زیادتیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ پولس نے بدکاری کے لیے ظالمانہ طریقہ پر عورتوں کی شناخت کی اور میڈیکل چیک اپ کے لیے ان کو پیش کیا گیا۔ ہندوستان میں بدکاری کو قانونی بنانے کی کوشش اس لیے کی جا رہی ہے کہ P.I.T.A ایکٹ ناکام ہو چکا ہے۔ اس کو قانونی حیثیت دینے کا مطلب یہ ہے کہ تاجران عصمت، عیاشوں اور چکلہ خانوں کے محافظوں اور مالکوں کو پوری آزادی اور موقع دیا جائے تاکہ وہ مزید لڑکیوں اور عورتوں کو بک کریں اور انھیں جنس عصمت کو نیلام کرنے پر مجبور کریں اس طرح گویا حکومت کمسن لڑکیوں اور عورتوں کو جنسی غلامی اور جنسی تشدد میں مبتلا رکھنے والے اور استحصال کے غیر انسانی ادارہ کو عملاً تعاون کرنے کی اجازت دے رہی ہے اس لیے حکومت کا یہ ارادہ انسانی اور بنیادی حقوق کو پامال کرنے کے مترادف ہے۔

حکومت اور ہندوستانی تنظیم برائے صحت (WHO) بدکاری کو لائسنس دینے کے لیے ایسے وجوہ کا اظہار کر رہی ہیں جن کی ذرہ برابر بھی معقولیت نہیں ہے۔ مہاراشٹر کے وزیر برائے عوامی صحت بھائی ساونت کہتے ہیں کہ بدکار عورتوں کو صحت نامہ کارڈ جاری کرنا متعدی ہونے والے جنسی امراض مثلاً STD اور AIDS کو چیک کرنے کا ذریعہ ہوگا جبکہ ہمیں عوام کی صحت کو ہر حال بچانا ضروری ہے۔ WHO کے سکریٹری ڈاکٹر آئی پی گیلاد کہتے ہیں کہ چونکہ زناکاری VD کے پھیلنے کا ذریعہ ہے اور بدکاری کو قانونی حیثیت دینے سے بدکار عورتوں کی صحت کی جانچ ہوگی اس لیے اس سے عوام (زناکاروں) کی صحت V.D سے محفوظ رہ سکے گی۔

گویا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ بدکار عورت VD کا سرچشمہ ہے اس لیے کہ وہ جنسی اختلاط یعنی زناکاری کا ذریعہ ہے۔ نیز یہ کہ

V.D ایک بیماری ہے جو ایک مرد قبیلی سماج (Patriarchal society) کے اعضا کو درناکی میں مبتلا کر دیتی ہے جہاں ایک عورت کا پورا وجود اس کی جنسیت سے عبارت ہے، اس کی صحت اور مسائل صحت بھی اس کے جنسی اعضا اور اعمال سے متعلق ہیں یہی وہ جنسی نظریہ ہے جو عورت کو V.D کا سرچشمہ ہونے کی حیثیت سے دیکھتا ہے، دوسرے لفظوں میں بدکار مردوں کی جنسی اخلاقیت گویا نظر انداز کر دی جاتی ہے اور اسے کبھی V.D کا سرچشمہ قرار نہیں دیا جاتا۔ اس کے علاوہ اقدامات صحت میں بھی عورتوں کا نہیں بلکہ مردوں (زناکاروں) کے مفاد کا خیال رکھا گیا ہے، کیونکہ وہی معاشرہ کی اینٹ میں جن کو خرابی سے بچانا حکومت کا فریضہ ہے اور عورتوں کی صحت یا جماعی امراض (V.D) کا مسئلہ حکومت کے موضوع بحث سے خارج ہے ـــــ حالانکہ ایک عورت جب پیشہ زناکاری کو اختیار کرتی ہے تو اس وقت وہ V.D کی مریضہ نہیں ہوتی یہ بیماری تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ عملاً بدکاری شروع ہوتی ہے اور ایک اجنبی اس کے وجود کو زہر آلود کرتا ہے، اس لیے صرف عورتوں کو اقدامات صحت کے ذرائع اختیار کرنے پر مجبور کرنا اور مردوں کو نظر انداز کر دینا انصاف نہیں بلکہ جنسی طرز عمل ہے۔

بدکاری کو قانونی حیثیت دینے کی وکالت کرنے والوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس سے خاندانی نظام کے ڈھانچہ کو مدد ملتی ہے اور زنا بالجبر کے واقعات میں کمی ہوتی ہے، اس لیے بدکاری اگرچہ ایک سماجی برائی ہے مگر ایسی برائی جو ناگزیر ہے۔ پھر یہ بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مردوں کی جنسیت فطری ہے، اس میں ہیجان اور اس کے زور کا ناقابل ضبط ہونا مردوں کے (Hormone) کے داخلی افرازے تعلق رکھتا ہے۔ جو صنف مقابل سے اختلاط کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور پھر عورت کا پورا کرداری اسی حوالے سے متعین کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حیوانی دنیا کی حقیقت اس کی قطعی تردید کرتی ہے، ایک امریکی ماہر جنسیات KINSEY امریکہ میں عنفوان شباب کا مطالعہ کے نتیجہ میں لکھتا ہے کہ مردوں کے جنسی زور HORRMONE سے پیدا شدہ جنسی عضو کا محض نفسیاتی ردعمل نہیں ہے بلکہ آزمودہ رویہ ہے جو اس مرد قبیلی تہذیب (PATRIARCHAL CULTURE) میں حاصل کیا گیا ہے جو ہر آدمی کو اس کی جنسی طاقت کی تدبیر عطا کرتا ہے، بربن بنا بدکاری ایک ناگزیر سماجی برائی ہرگز نہیں ہے۔ پھر فحش نگاری کے مواد ہیجان انگیز ماحول اور مسلّمہ جنسی اختلاط جس تہذیب میں جاری و ساری ہوں وہاں کے لوگوں کے لیے ایک معیار بنا دیتے ہیں جس میں ان کو زندگی گذارنی پڑتی ہے۔ KINSEY کے حاصل مطالعہ کی تائید دو مزید ماہر جنسیات ماسٹر اور جانسن کی تحقیقات سے ہوتی ہے۔ جو یہ ثابت کر چکی ہیں کہ عورتیں مردوں ہی کی طرح اپنے جنسی ردعمل میں اضافہ اور شدت کی اہلیت رکھتی ہیں۔ رہی یہ بات کہ بدکاری ایک آفاقی اور ناقابل اصلاح برائی ہے اس لیے اسے نظر انداز کرنا چاہئے یہ ایک دھوکہ اور دھاندلی ہے۔ کیونکہ کیوبا، اور چین نے بدکاری کے نظام میں قابل لحاظ تبدیلی کی ہے اور ویتنام نے ۱۹۷۵ء میں ایک ملین جوڑے کی بدکاری کو گھٹا کر ۱۹۸۲ء میں سیکڑوں تک محدود کر دی ہے اس لیے بدکاری ہرگز برائی نہیں ہے جس سے نجات ممکن ہی نہ ہو۔ پھر یہ بات کہ بدکاری خاندانی ڈھانچہ کو مدد پہنچاتی ہے اس لیے اسے قانونی حیثیت دی جائے، یہ مردوں کے دوغلہ پن اور جنسی بداخلاقی کا نتیجہ ہے، وہ عورت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ تم ایک شوہر پر قناعت کرو اور اپنے لیے انواع و اقسام کے مزے چکھنے کی طرف داری کرتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ زناکاری کو قانونی بنا دینے سے زنا بالجبر کے واردات میں کمی آجائے گی۔ یہ ایک خام خیالی ہے کیونکہ امریکہ میں

اورعورتوں کی خرید و فروخت پر بین الاقوامی متحدہ کمیٹی کی رپورٹ ۱۹۴۳ء نے اسے غلط ثابت کر دیا ہے اس کمیٹی کے تحت بہت سے ممالک اور براعظم مثلاً امریکہ، نیکراگوا، افریقہ اور ایشیا میں لائسنس بردار ہاؤس کا ختم کرنا زنا بالجبر میں اضافہ کی طرف رہنمائی نہیں کرتا۔ زنا بالجبر مردانہ قوت اور ایک طبقہ کے اظہار کی حیثیت سے ان ممالک میں برابر جاری ہے جنہوں نے زنا کو قانونی حیثیت دیدی ہے نیز یہ لعنت تمام طبقہ وارانہ حکومتی سماج میں موجود رہے گا۔ پھر حب الانسانیت" کے نام پر یہ دلیل کہ بدکاری کو قانونی حیثیت دینے سے بدکار عورتوں کو رفاہی مراعات کے لیے متحد کرنے میں مدد ملے گی جس کے لیے ہندوستانی فاحشہ فلاحی تنظیم (IPWA) کی بنا ڈالی گئی ہے۔ یہ تنظیم لائسنس کے نظام، بدکار عورتوں کے حرامی بچوں کے لیے مفت طبی علاج مفت تعلیم، رہائشی اور اقامتی سہولتیں اور بدکار عورتوں کے علاقوں میں بنیادی اسباب زندگی کی فراہمی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ نیز اسے قانونی بنانے سے ایسی عورتوں پر پولیس کی زیادتیاں اور دھمکیاں ختم ہو جائیں گی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بدکار عورتیں خود ہی چکلہ خانوں کے نظام کے علی الرغم خود کو منظم کر رہی ہیں۔ حالانکہ اس نام نہاد فلاحی تنظیم (IPWA) کے بیشتر مصارف چکلہ خانوں کے محافظ اور بدکاری کے ٹھیکیدار برداشت کرتے ہیں ڈاکٹر گیلاد کہتے ہیں کہ ہماری تنظیم تین سو (۳۰۰) چکلہ خانوں کے محافظوں پر مبنی ہے جس کا ہر ممبر ماہانہ ۲۵ روپے ادا کرتا ہے، ہم اس مرحلہ میں بیسواؤں اور چکلہ خانوں کے محافظوں اور منتظموں کے درمیان کوئی اختلاف پیدا کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ بیسوا تنظیم کا مطالبہ برائے لائسنس لازمی طور پر عیاشوں اور دلالوں کو بے لگام بنا دے گا، صحت کی مراعات سے چکلہ خانوں کے محافظین فائدہ اٹھائیں گے، اور بدکاریوں میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوگا اس نام نہاد تنظیم نے سب کچھ کیا مگر بدکاری کے معاوضہ کا تعین، وقت کی تحدید اور بدکار کے انتخاب کا حق کا مطالبہ نہیں کیا یہ "حب الانسانیت" کے نام پر ایک فراڈ ہے۔

مرکزی حکومت نے حال ہی میں S I T ایکٹ میں ترمیم کی تجویز دی ہے جو پارلیامنٹ کے سامنے ہے اس تجویز میں کم سن لڑکی کے ساتھ بدکاری کو جرم قرار دیا گیا ہے۔ اور جرم کی نوعیت متعین کی گئی ہے۔ کم سنی اور کبر سنی کی حد بندی کی گئی ہے وغیرہ، مگر حکومت خود اس نظام کو تسلیم کیے ہوئے ہے اور جزوی اصلاح کے ذریعہ اس انسانیت سوز اور اخلاق کش حرکت کو باقی رکھنا چاہتی ہے، حالانکہ عزت وصحت اور شرافت و انسانیت کا استحصال کرنے والے اس نظام کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کی ضرورت ہے۔

(بشکریہ انڈین اکسپریس نئی دہلی ۵ / اکتوبر ۱۹۸۶ء سنڈے ایڈیشن)

ضروری گذارش

اخبارات و رسائل سے گذارش ہے کہ براہ کرم ماہنامہ زندگی نو سے کوئی چیز حوالہ کے بغیر نقل نہ کریں۔ (ادارہ)

رسائل و مسائل

پوسٹ آفس اور بینک کی ملازمت اور بعض مسائل

سلطان احمد اصلاحی

مغلپورہ فیض آباد سے ایک دوست لکھتے ہیں۔

مکرمی مدیر صاحب! ماہ نامہ زندگی نو! السلام علیکم

مزاج گرامی!

جناب میں آپ سے ایک مسئلہ دریافت کرنا چاہتا ہوں برائے کرم میری اس سلسلہ میں رہنمائی فرمائیں (میں حنفی المسلک ہوں)

سوال۔ کیا موجودہ نظام کے تحت چلنے والے بینک Bank کی ملازمت غیر شرعی ہے۔ اگر ہاں تو کیوں۔ اور کیا پھر Post office وغیرہ کی ملازمت بھی غیر شرعی ہوگی کیونکہ وہاں پر بھی Postmaster اور دوسرے ملازمین کو بھی Saving Bank جیسے معاملات deal کرنے پڑتے ہیں۔

اگر سودی کاروبار کرنے والے بینک کی نوکری غیر شرعی ہے تو ایسے لوگ جو وہاں ملازمت کرتے ہیں ان سے تعلقات ان کے یہاں طعام وغیرہ کیسا ہے۔

میں خود ۲۳ سالہ نوجوان ہوں اور کیمسٹری میں M.Sc ہوں۔ ملازمت کے سلسلہ میں میرا یہ نظریہ ہے کہ خدا رزاق ہے مگر میں اپنے لیے ملازمت کے مواقع بڑھانے نیز مکمل اطمینان کے لیے یہ سوال کر رہا ہوں۔ ویسے بوجہ کراہیت میں نے ابھی تک کسی بھی Judiciary Bank وغیرہ کے مقابلہ برائے ملازمت کے امتحانات میں شرکت نہیں کی

براہ کرم زندگی کے قریبی رسالہ میں فتویٰ کی نوعیت کا جواب اور تفصیلی جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ اللہ آپ کو اجر خیر دے آمین۔

جواب

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ نے جو سوال کیا ہے، ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کے سلسلے میں بہترین رہنمائی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ملتی ہے جس میں کہا گیا ہے:

الحلال بین والحرام بین وبینہما امور مشتبہات لا یعلمہن کثیر من الناس فمن اتقی الشبہات استبرأ لدینہ وعرضہ ومن وقع فی الشبہات وقع فی الحرام کالراعی یرعی حول الحمی یوشک ان یرتع فیہ .... الحدیث۱؎

حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے اور ان کے درمیان کچھ مشتبہ امور ہیں جنھیں بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ تو جو کوئی ان مشتبہ چیزوں سے دور رہے وہ اپنے دین اور آبرو کو بچانے کا سامان کرتا ہے۔ اور جو مشتبہ چیزوں میں پڑتا ہے گا وہ حرام میں بھی پڑ کر رہے گا۔ جیسے کہ وہ چرواہا جو محفوظ چراگاہ کے ارد گرد چراتا ہے تو اس کا جانور کسی نہ کسی دن ضرور اس میں پڑ کر رہے گا۔

۱؎ متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، جلد ا کتاب البیوع، باب الکسب وطلب الحلال، فصل اول

اسی ذیل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری حدیث بھی آتی ہے کہ،

دع مایریبک الیٰ مالا یریبک[1]

وہ چیز جو تمہیں تردد میں مبتلا کرے اسے چھوڑ کر اس چیز کو اختیار کرو جس میں تمہیں کوئی تردد نہ ہو۔

نیز، آپ کا ارشاد ہے،

استفت نفسک، استفت قلبک البر ما اطمأنت الیہ النفس واطمان الیہ القلب والاثم ماحاک فی النفس وتردد فی الصدر وان افتاک الناس وافتوک[2]

اپنے جی سے پوچھو، اپنے دل سے فتویٰ طلب کرو۔ نیکی وہ ہے جس پر تمہارا جی مطمئن ہو، جس پر تمہارا دل مطمئن ہو اور گناہ وہ ہے جو تمہارے جی میں کھٹکے اور تمہارے سینے میں خلش پیدا کرے۔ خواہ لوگ تمہیں فتویٰ دیں اور فتویٰ دیتے رہیں۔

دوسرے موقعہ پر فرمایا کہ،

وان افتاک المفتون[3]

خواہ فتویٰ دینے والے تمہیں فتویٰ دیتے ہی کیوں نہ رہیں۔

آپکے سوال کا مرکزی نکتہ چونکہ "سود" ہے اس لیے اس سلسلے میں قرآن کے اس بیان کے علاوہ کہ "جو لوگ سود (ربوٰ) سے دست بردار نہ ہوں تو خدا اور رسولؐ کی طرف سے ان کے لیے اعلان جنگ ہے" (بقرہ، ۲۷۹) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث آپکے پیش نظر رہنی چاہیے کہ،

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء[4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے سود کھانے والے پر اور اس کے کھلانے والے پر، اور اس کے لکھنے والے پر اور اس کی گواہی دینے والے پر اور فرمایا کہ (گناہ میں) یہ سب برابر کے درجہ پر ہیں۔

اسی سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی بھی بہت قابل توجہ ہے کہ،

لیأتین علی الناس زمان لایبقی احد الا آکل الربٰو فان لم یاکلہ اصابہ من بخارہ[5]

ایک زمانہ ایسا آئے گا جبکہ کوئی نہیں بچے گا سوائے اس کے کہ وہ سود کھانے والا ہو۔ پس اگر وہ اسے نہیں کھائے گا تو اسے اس کا دھواں ضرور پہنچ کر رہے گا۔

جس کی تشریح کرتے ہوئے بجا طور پر کہا گیا ہے،

والمراد من بخارہ اثرہ وذٰلک ان یکون موکلا أو شاھدا او کاتبا او ساعیا او اٰکل من ضیافتہ او ھدیتہ[6]

اس کے دھوئیں سے مراد اس کا اثر ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ آدمی (سود کا) موکل ہو، یا اس کا گواہ ہو، یا اس کا لکھنے والا ہو یا اس کا وصول کرنے والا ہو، یا اس کی ضیافت سے کھائے یا اس کا ہدیہ قبول کرے۔

---

[1] سنن الدارمی، کتاب البیوع، باب دع مایریبک الیٰ مالا یریبک۔ نیز مسند احمد: ۴/ ۲۲۷، ۲۲۸ [2] حوالہ سابق۔ خیال رہے کہ امام دارمی نے کتاب البیوع میں ان احادیث کو "باب الربٰو الذی کان فی الجاہلیۃ" سے پہلے مذکورہ باب کے تحت نقل کیا ہے۔ نیز مسند احمد: ۴/ ۲۲۷۔ ۲۲۸ [3] مسند احمد: ۴/ ۱۹۴ [4] مسلم بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۱، کتاب البیوع، باب الربٰو، فصل اوّل [5] احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ، حوالہ سابق فصل ثانی [6] ملخص از اللمعات ومرقاۃ المفاتیح علی ہامش المشکوٰۃ/ ۲۴۵۔

ان احادیث کی روشنی میں صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی نظر میں 'سود' کا لینا اور دینا ہی نہیں، اس معاملہ کا لکھنا اور اس کا گواہ بننا بھی اتنا بڑا گناہ ہے کہ ایسا کرنے والے کو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی لعنت کا مستحق گردانتے ہیں۔ بعض کی حدیث میں سود کا درجہ ماں تک پہنچنے کی جو تشریح کی گئی ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سود کے معاملہ میں آدمی کو کس قدر محتاط اور بچ کر رہنے کی ضرورت ہے۔ آپ کے مسئلہ میں اس سے پہلی احادیث کی بھی رہنمائی بھی واضح ہے کہ ہندوستان کے 'دارالحرب' وغیرہ کی تاویلات سے اگر بینک اور ڈاک خانے وغیرہ کے سود کا تفریق جواز نکال بھی لیا جائے تو دل کا کھٹکا بہرحال قائم رہتا ہے۔ جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نیکی اور گناہ کے سلسلہ میں اصل فتویٰ انسان کے اپنے دل کا فتویٰ ہے۔ فتویٰ دینے والے لاکھ فتویٰ دیتے رہیں آدمی کو خدا کے حضور تن تنہا حاضر ہونا ہے۔ جواز اور عدم جواز کے سلسلے میں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ 'جواز' شریعت میں کسی حکم کے مطلوب ہونے کی آخری حد ہے۔ اس لیے کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر چیز جو 'جائز' ہو اسے لازماً ہی اختیار کیا جائے۔ آپ نے اپنے حنفی المسلک ہونے کا اظہار کیا ہے اور فتویٰ کی نوعیت کا جواب چاہتے ہیں اس لیے یہ وضاحت ضروری معلوم ہوئی کہ

ہندوستان کے سلسلے میں مستند علمائے امت کی رائے ہے کہ یہ 'دارالحرب' ہے البتہ چونکہ یہاں دارالحرب کے سے حالات نہیں ہیں اس لیے یہاں اس کے احکام لاگو نہیں ہوں گے۔ اس لیے فقہ حنفی کے مشہور جزئیہ

لا ربٰو بین المسلم والحربی[1] مسلمان اور حربی کے درمیان کوئی سود نہیں۔

سے فائدہ اٹھانے کی یہاں گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔ اس پس منظر میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کا یہ جواب بڑا لائق توجہ معلوم ہوتا ہے۔ سوال کرنے والے نے سوال کیا کہ حضرت 'کافر' سے سود لینا کیسا ہے۔ حکیم الامت نے برجستہ سوال کیا کہ کافر کی بیوی سے زنا کرنا کیسا ہے؟۔ مزید براں ان کا کہنا تھا کہ اگر بینکوں وغیرہ کے 'سود' کے جواز کی صورت نکل بھی آئے تو اس سے بچنا ضروری ہے۔ تاکہ مسلمانوں کے اندر 'سود' کی حرمت کی حس کمزور نہ پڑنے پائے۔

"سود کے معاملہ میں براہ راست پڑنے کے علاوہ اس معاملہ کو لکھنے اور اس کے گواہ بننے کی حرمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ حدیث سے واضح ہے۔ ڈاک خانے اور بینک کی ملازمت میں آدمی کے لیے اس سے بچنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے آپ جیسے حوصلہ مند نوجوان کا ڈاک خانے اور بینک کی ملازمت کے چکر میں پڑنا صحیح نہیں ہے۔ رزق کے دروازے اللہ نے بڑے وسیع رکھے ہیں۔ مشتبہ امور سے آدمی اپنے کو بچا لے جائے تو یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے۔

ہندوستان میں عدلیہ کی موجودہ صورت میں اس کے کسی منصب کے لیے کسی مخلص مسلمان کے امیدوار ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ڈاک خانے اور بینک وغیرہ کے ملازموں کے ساتھ قطع تعلق درست نہیں ہے۔ ان کے ساتھ کھانا پینا بھی ناجائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] کنز الدقائق / ۲۵۰۔ رشیدیہ، دہلی۔

اللہ و رسول کی پکار پر لبیک کہو جب کہ وہ تمہیں بلاتا ہے اس چیز کی طرف جس میں کہ تمہارے لئے زندگی ہے (قرآن)

ماہنامہ زندگی نو نئی دہلی ۲

جلد ۶ ★ مارچ ۱۹۸۷ء مطابق رجب / شعبان ۱۴۰۷ھ ★ شمارہ ۳

فہرست مضامین

ترسیلِ زر و انتظامی امور کے لئے:

ادارتی امور کے لئے خط و کتابت کا پتہ:
مدیر زندگی نو پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ ▦ منیجر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵، سوئیوالان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

● سالانہ زر تعاون ۵۵/- روپے ● (بیرون ہند) ۲۲۵/- روپے انڈین ● فی شمارہ = 5/ روپے ●

سرخ نشان، علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لئے فوری زر سالانہ ارسال فرمائیں یا اگلا شمارہ کسی اطلاع کے نہ ملنے پر بذریعہ وی۔ پی ارسال کیا جائے گا۔

پرنٹر، پبلشر، محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی ۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "زندگی نو" ۱۵۲۵، سوئی والان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا گیا۔ فون: ۲۷۲۲۴۸ ★ ۲۶۵۳۱۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات :

اسلامی تنظیموں میں اطاعت کے حدود

سید جلال الدین عمری

جنوری ۱۹۸۶ء کے اشارات میں اسلامی تنظیموں کے لیے شوریٰ کی اہمیت واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اب آیئے ذرا یہ دیکھیں کہ اسلامی تنظیموں میں جو اصحاب امر ہوں اور جن کے ہاتھوں میں ان کے نظم ونسق کی ذمہ داری ہو ان کی اطاعت کے حدود کیا ہیں؟ کن معاملات میں ان کی اطاعت ضروری ہوگی اور ان کے کسی حکم کو رد کرنا کب ان کے لیے صحیح ہوگا۔

کسی جماعت کا مزاج شورائی ہونے کے باوجود ہر معاملہ میں ہر شخص کی رائے نہیں حاصل کی جاسکتی یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ جن امور میں مشورہ ہو اُن کے بارے میں رائے دینے والوں کے درمیان لازماً اتفاق پایا جائے۔ ہر شخص کے سوچنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ سب کو ایک طرح سوچنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، ورنہ انسان ایک باشعور مخلوق کی جگہ کسی مشین کا پرزہ بن کر رہ جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ کسی اسلامی تنظیم میں فیصلہ کا کیا طریقہ ہوگا؟ یہ ایک پیچیدہ سوال ہے۔ اس کا جواب اسلام کے سیاسی نظام میں تلاش کرنا ہوگا۔

اسلام نے جو اجتماعی اور سیاسی نظام قائم کیا ہے۔ اور فیصلوں کے لیے جو اصول وضوابط اس نے بتائے ہیں اُن کی رو سے غیر مشروط اطاعت صرف اللہ اور اس کے رسول کی ہوگی۔ ان کا ہر فیصلہ حتمی اور آخری ہوگا، اس سے سرِمو انحراف کی اسلام کے دائرہ میں کسی کو اجازت نہ ہوگی۔ ارشاد ہے:

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ (آل عمران: ۳۲)

ان سے کہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی لیکن اگر وہ اعراض کریں تو کہہ دو کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

یہی بات دوسری جگہ زیادہ وضاحت اور پرزور طریقہ سے کہی گئی ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اُس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کردے تو پھر اُسے اپنے اُس معاملہ میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل

ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (الاحزاب: ۳۶) رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بعد مسلمانوں میں جو اُن کے اولوالامر اور حاکم ہوں اُن کی اطاعت بھی واجب ہے، لیکن اُن کی اطاعت غیر مشروط نہیں ہے۔ اُن کے جو احکام کتاب وسنت کے مطابق ہوں گے اُن میں ان کی اطاعت کی جائے گی اور جو حکم کتاب وسنت کے خلاف ہوگا اسے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ احادیث میں یہ بات بہت وضاحت کے ساتھ کہی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

السمعُ والطاعةُ على المرءِ المسلم فيما أحبَّ وكره ما لم يؤمر بمعصية فاذا أُمِر بمعصية فلا سمع ولا طاعة (بخاری ومسلم)

ایک مسلمان پر اپنے امیر کی سمع وطاعت واجب ہے اس حکم کی بھی جسے وہ پسند کرے اور اس حکم کی بھی جسے وہ ناپسند کرے، جب تک کہ اُسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے جب معصیت کا حکم دیا جائے تو نہ بات سنی جائے گی اور نہ اطاعت کی جائے گی۔

حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے فرمایا

لا طاعة في معصية إنما الطاعة في المعروف (بخاری ومسلم)

معصیت میں کوئی اطاعت نہیں کی جائے گی، اطاعت تو معروف میں ہوتی ہے۔

اِن واضح ہدایات کی بنا پر امت کا دو باتوں پر اجماع ہے۔ ایک یہ کہ معروف میں اصحاب امر کی اطاعت واجب ہے اور اس سے انحراف صحیح نہیں ہے۔ معروف میں وہ تمام احکام شامل ہیں جو حدود شرع میں آتے ہیں۔ اور جن پر عمل سے شریعت کی خلاف ورزی یا گناہ لازم نہیں آتا۔ دوسری بات یہ کہ اصحاب امر کے جو احکام معروف کے دائرہ میں نہ آتے ہوں اور جن پر عمل کی وجہ سے کسی معصیت کا ارتکاب لازم آئے اُن میں ان کی اطاعت حرام ہے (نووی، شرح مسلم ۲/۱۲۴)

اسی مفہوم کی ایک اور روایت حضرت نواس بن سمعانؓ سے آتی ہے۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق (مشکوٰۃ کتاب الامارۃ، بحوالہ شرح السنۃ)

مخلوق کی اطاعت کسی ایسے حکم میں نہیں ہوگی جس سے خالق کی نافرمانی لازم آئے۔

اس حدیث میں یہ بات بھی بتادی گئی کہ معصیت میں کسی کی اطاعت کیوں نہیں کی جائے گی۔ کوئی بھی شخص خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو بہر حال خدا کی مخلوق ہے، اُس کا بندہ اور محکوم ہے۔ اس کا ہرگز یہ مقام نہیں ہے کہ خالق و مالک کو ناخوش

کرکے اسے خوش کیا جائے۔ اس سے بڑی نادانی اور کیا ہوگی کہ ایک بندۂ ناچیز کی اطاعت کے لیے خدائے برتر کی نافرمانی کا ارتکاب کیا جائے؟

قرآن مجید نے جہاں اولو الامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے، وہیں یہ بھی بتادیا ہے کہ ان سے مسائل میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو کتاب وسنت کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور امیر اور مامور دونوں اُن کے فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (النساء: ۵۹)

اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر یقین رکھتے ہو۔ یہ بہتر ہے (تمہارے لیے) اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے

کتاب وسنت جس بات کا صاف اور صریح الفاظ میں فیصلہ کردے اُس میں نہ امیر کے لیے اختلاف جائز ہے اور نہ مامور کے لیے، دونوں اُس کے پابند ہوں گے۔ لیکن جن معاملات میں کتاب وسنت کا واضح حکم نہ ہو، جو امور اجتہادی ہوں یا جن کا تعلق حالات وظروف سے ہو اُن میں رایوں کا اختلاف ہو سکتا ہے۔ ان کا فیصلہ باہم مشورہ سے ہوگا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا،

إن عرض لي أمر لم ينزل فيه قضاء في أمره ولا سنة كيف تأمرني قال تجعلوه شورى بين أهل الفقه والعابدين من المؤمنين ولا تقض برأيك خاصة (طبرانی)

اگر میرے سامنے کوئی ایسا معاملہ آئے جس کے بارے میں نہ تو قرآن میں کوئی فیصلہ نازل ہوا ہو اور نہ کوئی سنت موجود ہو تو آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا تم لوگ اسے دین کی سمجھ رکھنے والے اور عبادت گذار مومنوں کی شوریٰ کے حوالہ کردو اور اپنی تنہا رائے سے فیصلہ نہ کرو۔

قرآن مجید کی ہدایت ہے کہ مشورہ کے بعد جو فیصلہ ہو جائے اللہ کے بھروسہ پر اس کے مطابق اقدام کیا جائے، اس میں تامل اور تردد نہ کیا جائے۔ ارشاد ہے،

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ (آل عمران: ۱۵۹)

ان سے معاملات میں مشورہ کرو پھر جب پکا ارادہ کرلو تو اللہ پر توکل کرو۔ بیشک اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

شوریٰ کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے اس سے قرآن مجید نے بحث نہیں کی ہے۔ اس کے لیے ہر زمانہ کے حالات کے

لحاظ سے کوئی بھی ایسا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے جس سے شوریٰ کے تقاضے پورے ہوں۔ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ صاحب امر شوریٰ کا پابند ہے یا نہیں؟ پابند ہے تو کن امور میں، اور کن امور میں وہ اپنی صواب دید کے مطابق فیصلہ کر سکتا ہے۔ اس کے لیے بھی قرآن و حدیث میں اصول و ضوابط متعین نہیں کیے گئے ہیں۔ یہ ضوابط حالات کے لحاظ سے مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ دور اوّل کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کے اہم اور بنیادی امور میں تو اہل الرائے کے مشوروں کی پابندی کی جاتی تھی، البتہ جزئی مسائل میں امیر اپنی صواب دید کے مطابق فیصلہ کرتا تھا۔

مشورے کے تمام شرائط اور اصول و ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے جو فیصلہ ہو ضروری نہیں کہ ہر شخص کو اس سے اتفاق ہی ہو۔ اُسے فیصلہ سے اختلاف ہو سکتا ہے اور اپنے اس اختلاف کا مناسب مواقع پر جائز حدود میں اظہار بھی کر سکتا ہے۔ لیکن عملی طور پر اسے فیصلہ کا ساتھ دینا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب کسی معاملہ میں مختلف رائیں پیش ہوتیں تو آپ اُن میں سے کسی ایک رائے کو اختیار فرماتے اور آپکے اقدام کا پوری جماعت ساتھ دیتی۔ یہی طریقہ آپ کے بعد خلفائے راشدین کا تھا۔

صاحبِ امر کی اطاعت سے انکار اور اس کے خلاف خروج اور بغاوت اس وقت تک صحیح نہیں ہے جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق رہنمائی کا فرض انجام دے رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

لو استعمل علیکم عبدٌ یقودکم بکتاب اللہ اسمعوا لہ واطیعوا	اگر تم پر کسی غلام کو بھی حاکم بنا دیا جائے جو اللہ کی کتاب کے مطابق تمہاری قیادت کر رہا ہو تو اُس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔
(مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء)	

حدیث میں یہاں تک آتا ہے کہ صاحب امر اگر فی الجملہ دین پر قائم ہے اور اس کے بنیادی احکام کا پابند ہے تو اس کے خلاف بغاوت نہیں ہونی چاہئے۔ حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یستعمل علیکم اُمراءُ فتعرفون وتنکرون فمن کرہ فقد برئ ومن انکر فقد سلم ولکن من رضی وتابع قالوا: یارسول اللہ الا نقاتلھم قالوا لا، ماصلوا۔	تم پر ایسے امیر مقرر کیے جائیں گے جن سے تم وہ اعمال بھی دیکھوگے جو معروف ہوں گے اور منکرات کا ارتکاب بھی دیکھوگے۔ جو شخص ان کے منکرات کو ناپسند کرے وہ گناہ سے بچا، جو اُن پر نکیر کرے وہ سلامت رہا، لیکن جو شخص اُن سے خوش ہوا اور ان کے پیچھے چلا تو اس نے گناہ کا ارتکاب کیا۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم اُن سے جنگ کریں؟ آپ نے فرمایا نہیں جب تک وہ نماز پڑھ رہے ہیں (اُن سے جنگ نہیں ہوگی)۔
(مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب الانکار علی الامراء الخ)	

کسی مسلمان صاحب امر سے معروفات کے ساتھ منکرات کا بھی صدور ہو تو تین رویے اختیار کیے جا سکتے ہیں اس حدیث میں

ان تینوں رویوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ آدمی اس کے منکر کو منکر سمجھے اور اسے دل سے ناپسند کرے ــــ یہ صورت اس وقت اختیار کی جائے گی جب اسے زبان سے تنقید اور انکار کی طاقت نہ ہو ــــ دوسرا رویہ یہ ہے کہ آدمی غلط کو غلط کہے اس پر تنقید اور اعتراض کرنے اور اُسے اس سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔ اس صورت میں وہ غفلت و مداہنت کے گناہ سے بچ جائے گا۔ (امید ہے اللہ تعالیٰ اسے اجر و ثواب سے بھی نوازے گا) تیسرا رویہ یہ ہے کہ آدمی منکرات کو دیکھ کر خوش ہو، خود بھی اُن کا ارتکاب کرے اور اُن کے فروغ میں تعاون کرے۔ یہ رویہ سراسر خسران اور تباہی کا ہے۔

اس حدیث سے واضح ہے کہ اگر اسلامی ریاست کا سربراہ دین سے انحراف نہیں کر رہا ہے دین کی بنیادیں اس کے ہاتھوں مجروح نہیں ہو رہی ہیں تو اس کے خلاف خروج اور بغاوت تو صحیح نہیں ہے البتہ اس کے غلط کاموں پر تنقید ضرور کی جانی چاہئے۔ یہی حقیقت ایک دوسرے پہلو سے حضرت عبادہ بن صامت کی روایت میں واضح کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں

بايعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم على السمع والطاعة في العسر واليسر والمنشط والمكره وعلى أثرة علينا وعلى أن لا ننازع الامر أهله وعلى أن نقول بالحق أينما كنا، لا نخاف في الله لومة لائم۔ (مسلم كتاب الامارة باب وجوب طاعة الامراء في غير معصية)

یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے۔

ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی کہ ہم اپنے امیر کا حکم مانیں گے اور اس کی اطاعت کریں گے مشکل میں بھی اور آسانی میں بھی خوشی میں بھی اور ناخوشی میں بھی اور اس وقت بھی جب کہ ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے اور یہ کہ ہم اپنے حاکم سے اقتدار کے چھیننے کی کوشش نہیں کریں گے اور حق بات کہیں گے جہاں بھی ہوں گے۔ اللہ کے دین کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے۔

بايعنا على السمع والطاعة في منشطنا ومكرهنا وعسرنا ويسرنا وأثرة علينا۔ ولا ننازع الامر اهله قال إلا أن تروا كفرا بواحا عندكم من الله فيه برهان
(حوالۂ سابق)

ہم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کہ ہم اپنے امیر کا حکم مانیں گے اور اس کی اطاعت کریں گے خواہ ہم اس کے حکم سے خوش ہوں یا ناخوش خواہ ہم راحت میں ہوں یا تکلیف میں خواہ ہمیں نظر انداز کیا جائے اور ہمارے مقابلے میں دوسروں کو ترجیح دی جائے۔ ہم نے اس بات کی بھی بیعت کی کہ ہم اپنے حاکم سے حکومت چھیننے کی کوشش نہیں کریں گے۔ آپ نے فرمایا ہاں اگر تم اس سے صریح کفر دیکھو جس کے کفر ہونے کی تمہارے پاس خدا کی طرف سے کوئی دلیل ہو تو تمہیں اس سے حکومت چھیننے کا بھی حق ہے۔

ان احکام کا براہ راست تعلق اسلامی ریاست کے امراء اور حکام سے ہے۔ لیکن اسلامی تنظیموں کے لیے بھی اس سے حسب ذیل ہدایات اخذ کی جا سکتی ہیں[1]

۱۔ امیر اور مامور دونوں کتاب و سنت کے پابند ہوں گے ۲۔ ان کے درمیان کسی معاملہ میں اختلاف ہو تو کتاب و سنت کے ذریعہ فیصلہ ہوگا۔ ۳۔ جن امور میں کتاب و سنت کی واضح ہدایات نہ ہوں اُن میں امیر یا سربراہ کی رائے سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اطاعت ضروری ہے۔ اس کی اطاعت سے انحراف اسی وقت صحیح ہوگا جب کہ اس سے کوئی معصیت لازم آئے۔ ۴۔ صاحب امر سے غلطی ہو یا اس کا کوئی اقدام کتاب و سنت کے خلاف ہو تو اسے ٹوکا جائے گا اور اس کی اصلاح کی کوشش کی جائے گی۔ یہ اطاعت امر کی منافی نہیں ہے بلکہ مامورین کی دینی و اخلاقی ذمہ داری ہے۔

اللهم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وأرنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه۔

---

[1] اس موضوع پر راقم کی کتاب "اسلام کی دعوت" کے آخری باب "تنظیم کیسے مستحکم ہو؟" کا مطالعہ بھی مفید ہوگا۔

مطالعۂ حدیث :

دس باتیں

سلطان احمد اصلاحی

اسلام اپنے ماننے والوں سے ان کی پوری زندگی میں خدا تعالیٰ کی بے لاگ وفاداری کا مطالبہ کرتا ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے یہ حقیقت جیسی کچھ عیاں ہے معلوم ہے۔ اسی روشنی میں اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کیا جائے تو یہی حقیقت پوری طرح ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ذیل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی طرح کی ایک حدیث پیش کی جاتی ہے جس میں آپ نے دس باتوں کی تلقین کی ہے۔ جنھوں نے ایک طرح سے ایک مسلمان کی پوری دینی زندگی کا احاطہ کر لیا ہے:

عن معاذ قال اوصانی رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم بعشر کلمات قال لاتشرک
باللہ شیئا وان قتلت وحرقت ولا تعقن
والدیک وان امراک ان تخرج من اھلک
ومالک ولا تترکن صلاۃ مکتوبۃ متعمدا
فان من ترک صلاۃ مکتوبۃ متعمدا
فقد برئت منہ ذمۃ اللہ ولا تشربن خمرا
فانہ رأس کل فاحشۃ وایاک والمعصیۃ
فان بالمعصیۃ حل سخط اللہ عزوجل و
ایاک والفرار من الزحف وان ھلک الناس
واذا اصاب الناس موتان وانت فیھم فاثبت وانفق
علی عیالک من طولک ولا ترفع عنھم عصاک
ادبا واخفھم فی اللہ[1]

حضرت معاذ رضؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دس باتوں کی تاکید فرمائی۔ فرمایا کہ تم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو ساجھی نہ کرو[1] خواہ تمہیں قتل کر دیا جائے اور جلا کے راکھ ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔ اور ہرگز اپنے ماں باپ کی نافرمانی نہ کرو[2] خواہ وہ تمہیں اسی بات کا حکم کیوں نہ دیں کہ تم اپنے بیوی بچوں اور اپنے تمام ساز و سامان سے دست بردار ہو جاؤ۔ اور تم ہرگز کسی فرض نماز کو جان بوجھ کر نہ چھوڑو[3]۔ اس لیے کہ جو کوئی کسی فرض نماز کو جان بوجھ کر چھوڑتا ہے تو اللہ اس سے اپنی ذمہ داری کو اٹھا لیتا ہے۔ اور تم ہرگز شراب نہ پیو[4] اس لیے کہ وہ تمام برائی کی جڑ ہے۔ اور اللہ کی نافرمانی سے بچو[5]۔ اس لیے کہ نافرمانی سے آدمی اللہ کی ناراضگی کو مول لے لیتا ہے۔ اور میدان جنگ سے فرار اختیار نہ کرو[6] خواہ وہاں کا ایک ایک آدمی ختم کیوں نہ ہو جائے۔ اور جب کوئی وبائی بیماری پھیل جائے جس میں کثرت

---

[1] مسند احمد: ۵/۲۳۸۔ وبہامشہ منتخب کنز العمال، مطبع غیر مندرج

سے موتیں ہورہی ہوں اور تم ان کے درمیان ہو تو وہاں سے قدم نہ ہلاؤ۔ اور اپنے اہل وعیال پر اپنی روزی میں سے استطاعت کے مطابق خرچ کرو۔ اور انھیں باادب رکھنے کے لیے ان سے اپنے ڈنڈے کو نہ اٹھاؤ۔ اور اللہ کے سلسلے میں انھیں برابر ڈراتے رہو۔

اس حدیث میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو جن دس باتوں کی تلقین کی ہے اس کی پہلی دفعہ یہ کہ:

۱۔ شرک سے اجتناب کیا جائے خواہ اس کے لیے سخت سے سخت مشکلات اور مصائب کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ معلوم ہے کہ اسلام کی نظر میں شرک کتنا بڑا گناہ ہے۔ قرآن نے اسے 'ظلم عظیم' سے تعبیر کیا ہے۔ اور دوسرے موقعہ پر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ کو معاف کر سکتا ہے لیکن وہ اسے معاف نہیں کر سکتا کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کو ساجھی قرار دیا جائے۔ اسلام کی بنیاد اللہ سے وفاداری پر ہے۔ شرک اس وفاداری کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ آقا اپنے غلام کے ہر جرم کو معاف کر سکتا ہے لیکن بے وفائی اور غداری کو ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔ اللہ کی ذات اس کی صفات اور اس کے حقوق و اختیارات، ہر چیز میں اس کے ساتھ بے آمیز وفاداری ضروری ہے۔ مسلمان کو اپنی جان کی بازی لگا کر اس متاع عزیز پر ہرگز ہرگز آنچ نہ آنے دینا چاہیے۔ جیسا کہ صدر اول کے مسلمانوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا تھا۔

۲۔ دوسری بات حدیث میں والدین کی نافرمانی سے بچنے کی کہی گئی ہے۔ اسلام میں اللہ تعالیٰ کے بعد دوسرا حق اس کے بندوں کا ہے۔ جس میں آدمی کے والدین اور اس کے ماں باپ سرفہرست ہیں۔ قرآن میں بھی جا بجا یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ اپنے ماں باپ کی نافرمانی ہرگز نہ کرو خواہ وہ تمہیں اسی بات کا حکم کیوں نہ دیں کہ تم اپنے اہل وعیال اور ساز و سامان ہر ایک سے دست بردار ہو جاؤ۔ ماں باپ کو جو تعلق اپنی اولاد سے ہوتا ہے وہ ظاہر ہے کسی دوسرے سے نہیں ہو سکتا۔ والدین سے بڑھ کر اپنی اولاد کی بہی خواہی کی توقع کسی دوسرے سے نہیں کی جا سکتی۔ ان کی طرف سے بیوی بچوں اور اپنے مال و متاع کو چھوڑنے کا حکم دینے کا مطلب ہوگا کہ ضرور اس کے اندر اولاد کی مصلحت کا کوئی پہلو ہوگا۔ بعض صورتیں استثنائی بھی ہو سکتی ہیں کہ آدمی کو اللہ کی وفاداری کے مقابلے میں والدین کی وفاداری سے دست بردار ہونا پڑے۔ لیکن عام حالات میں اس صورت سے بچتے ہوئے اس دائرے میں بھی ماں باپ کی بات ماننی ضروری ہے۔ مثال سے آگے واقعہ کی صورت میں بھی اس پر عمل کیا جانا چاہیے۔

۳۔ نماز اور خاص طور پر فرض نمازیں مومن کی زندگی میں خدا کی وفاداری کا عملی مظہر ہیں۔ اسلام فطری دین ہے۔ اس میں معذوریوں اور مجبوریوں کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور رخصت کی مستقل دفعہ موجود ہے۔ ایسے مجبور کن حالات آدمی کو پیش آ سکتے ہیں جس میں اسے کسی فرض نماز کو موخر کر کے پڑھنا پڑے۔ اور اس کی گنجائش بھی موجود ہے۔ لیکن کسی عذر کے بغیر ہوش و حواس رکھتے ہوئے کسی فرض نماز کے چھوڑنے کا مطلب ہے کہ آدمی کا دل ایمان سے خالی ہے۔ اور وہ بجا طور پر اس کا مستحق ہے کہ اس سے اللہ کی امان اٹھ جائے۔ اللہ ایمان والوں کا ساتھی ہے۔ اور اس نے ان کی دنیا و

آخرت کی بھلائیوں کا ذمہ لے رکھا ہے۔ لیکن اس کے لیے شرط ہے جیسا کہ قرآن نے کہا ہے کہ "تم مجھے یاد کرو تو میں تمہیں یاد رکھوں گا"۔ نماز اللہ کی یاد کی سب سے اعلیٰ وارفع صورت ہے۔ آدمی جب اس کے اصل سرے 'فرائض' ہی کو چھوڑ دیتے تو دوسرے اذکار و نوافل کی اس سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ جب اس نے اللہ کو یاد نہ رکھا تو اللہ کے ذمہ کو بھی اس سے اٹھ جانا فطری ہے۔

۴۔ نماز اگر اللہ کی یاد کا ذریعہ ہے تو شراب وہ چیز ہے جو انسان کو اللہ سے غافل کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ یہ وہ خصلت بد ہے جو آدمی کو اس کے عقل و شعور کے امتیازی وصف سے محروم کر کے اسے جانوروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ ظاہر ہے جب کسی کو اپنی ہی خبر نہ ہو تو اللہ، اور اس کی ٹھہرائی حدود کے پاس و لحاظ کی اس سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے۔ فرمایا کہ شراب نہ پیو کہ یہ ایک برائی نہیں بلکہ تمام تر بدی اور بے حیائی کی جڑ ہے۔ آج بھی اسے 'ام الخبائث' اور "باپ خبنی" ہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شیطان کے بہکاوے سے انسان اگرچہ آج اس کا بڑا رسیا ہے لیکن اس گئی گزری حالت میں بھی کسی کے اندر جرأت نہیں جو اخلاقی طور پر اس کی وکالت کر سکے۔ شرابی کی زندگی کو دیکھیے تو وہ بدی اور بے حیائی کا مجموعہ ہی نظر آئے گی۔

۵۔ اللہ کو پسند ہے کہ اس کے بندے اس کے فرماں بردار ہوں۔ اور اس کی نافرمانی کر کے اپنے کو شیطان کا آلۂ کار نہ بنائیں فرمایا کہ اللہ کی نافرمانی سے بچو۔ اس لیے کہ نافرمانی کر کے آدمی اللہ کی ناراضگی کو مول لیتا ہے۔ مومن کی دنیا و آخرت کی تمام تر سعادتیں اس سے وابستہ ہیں کہ اس کا اللہ اس سے راضی ہو اور اس کی نگاہ کرم ہر آن اس کی طرف ملتفت رہے۔ اسے اس حقیقت کا ادراک ہوتا ہے کہ اگر اللہ کی نگاہیں اس سے پھر گئیں تو اسے یہاں نہ وہاں کہیں جائے پناہ ملنے والی نہیں ہے۔ خدا اپنے ماننے والوں پر ہر وقت اپنا سایہ رکھتا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ہر قدم اس کی مرضی کے مطابق اٹھے۔ مومن سے امید کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی کر کے اپنے کو اس کے سائے سے محروم نہیں کرے گا۔

۶۔ عام طور پر نیکی و دینداری کو انفرادی زندگی کے دائروں تک محدود رکھا جاتا ہے۔ لیکن یہ حدیث بتاتی ہے کہ اسلام کا دینداری کا تصور بہت وسیع ہے۔ جس کا مطالبہ ہے کہ زندگی کے انفرادی نوعیت کے اعمال کے ساتھ اس کے اجتماعی تقاضوں کو بھی اسی طرح مدنظر رکھا جائے۔ اللہ کے دین کا عین بدیہی تقاضا ہے کہ روئے زمین پر اس کا غلبہ و نفاذ عمل میں آئے اور دنیا کے دوسرے تمام ادیان و مذاہب اور نظام ہائے فکر و عمل اس کے بالمقابل سرنگوں ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ اہل ایمان کو وقت پڑنے پر شمشیر و سناں سے بھی کام لینا ہوگا اور اعدائے دین کے بالمقابل داد شجاعت دینی پڑے گی۔ فرمایا کہ جب ایسا موقعہ آجائے تو معرکۂ کارزار سے فرار اختیار نہ کرو خواہ کشتوں کے پشتے لگ جائیں اور وہاں کا ایک ایک آدمی کام آجائے گھمسان کا رن پڑا ہو اور ہر طرف لاشیں ہی لاشیں نظر آئیں، لیکن مومن کے لیے جنگ سے پیٹھ پھیر لینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

۷۔ مسلمان کو اللہ کی ذات پر جو اعتماد و توکل ہونا چاہیے اس کا تقاضا ہے کہ کڑی سے کڑی آزمائش کے وقت بھی اس کے

اندر کسی قسم کا خوف وہراس پیدا نہ ہونے پائے۔ کسی مقام پر اگر کوئی وبا پھیل جائے اور کثرت سے موتیں ہونے لگیں تو اچھے اچھوں کے قدم اکھڑنے لگتے ہیں اور آدمی اس جگہ سے بھاگ نکلنے کی سوچنے لگتا ہے۔ لیکن مومن کا رویہ اس کے برعکس ہونا چاہئے۔ آدمی وبائی جگہ سے دور ہے تو احتیاط کا یہ تقاضا ضرور ہے کہ وہ وہاں نہ جائے۔ لیکن اگر وہ وہاں پہنچ چکا ہے یا پہلے سے موجود ہے تو معاملہ کو اللہ کے حوالہ کر کے قدم ہرگز وہاں سے ہٹانا نہ چاہئے۔ فرمایا کہ اگر لوگوں کے درمیان کوئی وبائی بیماری اور کثرت سے موتیں ہو رہی ہوں[1] اور تم ان کے درمیان ہو تو پھر وہیں جمے رہو۔ وہاں سے ہٹنے کی کوشش نہ کرو۔

۸ تا ۱۰۔ آخر میں بال بچوں کا خیال رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ فرمایا کہ اور اپنے اہل وعیال پر اپنی روزی میں سے استطاعت کے مطابق خرچ کرو۔ البتہ اس کے ساتھ ہی دو باتوں کی مزید تاکید ہے کہ ان کو دینی لحاظ سے باادب بنانے کی خاطر ان کے سر کے اوپر سے تمہارا (تادیب کا) ڈنڈا نہ اٹھنے پائے۔ نیز یہ کہ انھیں برابر اللہ سے ڈراتے اور اس کے معاملے میں ان کو خبردار کرتے رہو۔ خاص طور پر آج کے حالات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نصیحت ہمارے لیے بڑی توجہ طلب ہے۔ آج کی دنیا میں مادہ پرستی اور رفاہیت پسندی کا جو ہر طرف شور و غوغا ہے اس کے نتیجے میں اپنے اہل وعیال کو مادی طور پر آسودہ اور فارغ البال کرنے پر ہر شخص پوری طرح متوجہ ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ آج انسان کی پوری زندگی اپنے خاندان اور اپنے اہل وعیال کی معاشی فلاح کے محور کے گرد گھوم رہی ہے۔ اپنے بال بچوں کی دنیاوی بہتری کے لیے آدمی صبح سے شام تک ایک کیے ہوئے ہے۔ بیوی بچوں کے بیجا لاڈ پیار کے غیر اسلامی فلسفے نے اور بھی تباہی پھیلائی ہے۔ گھر کدھر جا رہا ہے اور دینی لحاظ سے خاندان کا کیا حال ہے اس کی طرف شاید و باید ہی توجہ ہوتی ہے۔ لیکن یہ حدیث بال بچوں کی فلاح کے لیے صرف ان کی مادی بھلائی ہی کو کافی تصور نہیں کرتی۔ فرمایا کہ بال بچوں کی معاشی کفالت اور ان کی ضروریات زندگی کی فراہمی صحیح معنوں میں بابرکت اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ اس کے ساتھ ہی انھیں برابر اللہ کا وفادار بنائے رکھا جائے۔ ان کا لاڈ پیار ضرور ہو لیکن ان کے سر سے ادب کی چھڑی کبھی نہ اٹھے اور اللہ کا خوف ان کے دل میں برابر بٹھایا جاتا رہے۔ مومن کے لیے اولاد آنکھوں کی ٹھنڈک اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ اس کے تئیں یہ دونوں ہی تقاضے پورے کیے جائیں۔

اللّٰھم تقبل منا ووفق لنا لما تحب وترضیٰ۔

---

[1] حدیث میں اصل لفظ "مُوتَانٌ" م کے پیش کے ساتھ بُطلان کے وزن پر ہے۔ جس کے معنی ہیں 'طاعون' یا ایسی ہی کوئی دوسری وبائی بیماری جس میں کثرت سے موتیں ہو رہی ہوں۔ (النہایہ فی غریب الحدیث ۱: ۳/ ۱۱۳۔ نیز مجمع بحار الانوار ۱: ۳/ ۳۲۱)

مقالات:

میں بھی حاضر تھا وہاں

(دارالاسلام، پٹھان کوٹ کے شب و روز)

(۳)

حکیم خواجہ اقبال احمد ندوی

قارئین کے اصرار اور ان کی افادیت کے پیش نظر زندگی نو میں جناب حکیم خواجہ اقبال احمد صاحب ندوی زید مجدہم کی یادداشتوں کا سلسلہ "میں بھی حاضر تھا وہاں" دوبارہ شروع کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ کا سب سے اہم اور تاریخی حصہ دارالاسلام پٹھان کوٹ اور لاہور سے متعلق واقعات و مشاہدات ہیں جو اب پیش کیے جا رہے ہیں۔ زندگی نو کا حکیم صاحب کی یادداشتوں پر مشتمل خصوصی شمارہ اس سے پہلے مارچ ۱۹۹۶ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ جس میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے دارالاسلام لاہور تک کے سفر کی داستان میں بات سے بات نکلتی گئی یہاں تک کہ اس کا بڑا حصہ مصنف کی بعض باتوں کے دلائل و شواہد کے ذیل میں معاصر شخصیات و تحریکات پر تبصرہ و تجزیہ میں تبدیل ہو گیا۔ موصوف کی یادداشتوں کا یہ حصہ بھی بڑا اہم اور قیمتی ہے جس میں اسلام اور دعوت اسلامی سے متعلق بڑے اچھے نکات زیر بحث لائے گئے ہیں۔ یادداشتوں کے اس نئے سلسلے میں بھی یہ حصہ موجود ہے جسے انشاء اللہ بعد میں پیش کیا جائے گا۔ حکیم صاحب محترم کی ان یادداشتوں کو دوسرے لفظوں میں بانی تحریک علیہ الرحمہ کے پرائیوٹ سکریٹری کا بیان بھی کہا جا سکتا ہے۔ جس کی تاریخی اہمیت کے سلسلے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بعض معاصر رسائل میں ان یادداشتوں پر بعض تنقیدیں شائع ہوئی ہیں۔ ہم سر دست اس سلسلہ کو مزید دراز نہ کرتے ہوئے مثبت انداز میں صرف حکیم صاحب کی یادداشتوں کو پیش کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اہل نظر اور انصاف پسند قارئین خود فیصلہ کر لیں گے کہ حقائق کہاں ہیں اور عقیدت کی غلو کی مجبوری کہاں ہے (س)

دارالاسلام ہی کی بات ہے، اس زمانہ میں جو آدمی ہم لوگوں کا کھانا پکایا کرتا تھا، وہ چلا گیا تھا اور شمس الحسن صاحب کی اہلیہ محترمہ میرا کھانا پکا دیا کرتی تھیں۔ شمس الحسن صاحب کا مکان مولانا کے مکان کے پیچھے تھا۔ ایک دن میں شمس الحسن صاحب کے پاس کسی ضرورت سے گیا تھا۔ ان کے مکان سے نکلا تو دیکھتا کیا ہوں کہ مولانا ایک بھاری سی کلہاڑی تانے کھڑے ہیں اور ان کی

کلہاڑی پوری طاقت کے ساتھ لکڑی کے موٹے سے بوٹے پر پڑنے جا رہی ہے۔ میرے اور مولانا کے درمیان ۴۰-۵۰ قدم کا فاصلہ سا ہوگا، جو میں مولانا کے کلہاڑی چلا دینے سے پہلے طے نہ کر سکتا تھا۔ اسی طرح میرے لیے یہ بات بھی ناقابل برداشت تھی کہ مولانا میری آنکھوں کے سامنے لکڑی پھاڑیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے منہ سے غیر ارادی طور پر زور سے "مولانا!" نکل گیا۔ میری آواز سنتے ہی مولانا فوراً میری طرف گھوم گئے اور میں دوڑ کر ان کے پاس پہنچ گیا میں پہنچا تو مولانا دریافت کرنے لگے کہ کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا کہ پہلے کلہاڑی مجھے عنایت فرمائیے تو بتاتا ہوں کیا ہے۔ لیکن مولانا کسی طرح کلہاڑی دینے کے لیے آمادہ ہی نہ ہو رہے تھے فرماتے ذرا ٹھیرئیے تو میں ابھی اسے پھاڑ کر پھینکے دیتا ہوں۔ بدقت تمام میں نے کسی طرح مولانا کے ہاتھ سے کلہاڑی لی۔ ویسے کلہاڑی لینے کو تو میں نے مولانا کے ہاتھ سے لے لی مگر دل میں یہی سوچتا رہا کہ اگر پہلی ہی کلہاڑی میں موٹا سا چیلا بھر سے جا کر دور نہ گرا تو مولانا ضرور کلہاڑی میرے ہاتھ سے لے لیں گے۔ دارالاسلام میں مجھے اکثر بخار آجایا کرتا تھا اور علاج کا ایک کورس پورا ہو جانے کے بعد بھی جب بخار کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا تو مولانا فرمایا کرتے اقبال صاحب! میں سوچتا ہوں کہ کیوں نہ آپ کا نام "مراض" رکھ دوں۔ بہر حال اللہ کا نام لے کر کلہاڑی جو چلائی تو پہلی ہی کلہاڑی میں موٹا سا چیلا دور جا گرا اور اسی کے ساتھ مولانا کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ اور پھر دھڑا دھڑ چیلے نکلنے لگے مگر کلہاڑی کی آواز سن کر دوسرے رفقاء پہنچ گیے اور انھوں نے مجھ سے کلہاڑی چھین لی اور ذرا ہی دیر میں چیلے ہی چیلے ہو گئے۔

دارالاسلام میں لکڑی کی دشواری مستقل رہا کرتی تھی۔ ایک دن مولانا فرمانے لگے کہ ہم لوگ ایسا کیوں نہ کریں کہ جنگل سے گیلی لکڑی کاٹ لایا کریں پندرہ بیس دن میں سوکھ ہی جائے گی میں نے عرض کیا کہ عصر بعد ہم لوگ ٹہلنے کے لیے جنگل ہی کی طرف چلیں اور واپسی میں لکڑی لے کر آجایا کریں۔ مولانا نے اس رائے سے اتفاق کیا اور میں نے دن ہی میں کلہاڑی تیز کر لی۔ عصر بعد جب ہم لوگ جنگل پہنچے تو میں نے کافی مقدار میں لکڑی کاٹ ڈالی اور سب لوگ اپنے اپنے کندھوں پر موٹی موٹی لکڑی لاد کر اٹھا لائے۔ مولانا کا حصہ بھی، حصہ بقدر جثہ کے مطابق دوسروں سے زیادہ ہی تھا، کم نہ تھا۔ پھر اقلیم علم و عرفان کا یہ شہریار جس کی تحریریں لاتعداد دل و دماغ پر حکمرانی کر رہی تھیں ——— روزانہ ململ کا صاف و شفاف کرتا زیب تن کیے اپنے ساتھیوں کے ساتھ خراماں خراماں عصر بعد جنگل جاتا اور اپنے کندھوں پر موٹی موٹی لکڑیاں لاد لاتا یہاں تک کہ کہیں سے کافی مقدار میں لکڑی آگئی تو یہ کاروبار شوق بند کر دینا پڑا۔

اسی طرح ایک دن میں اپنے کمرہ میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا، سامنے نظر اٹھائی تو دیکھتا کیا ہوں مولانا اپنے ہاتھوں میں دو بڑی بڑی بالٹی لیے کنویں کی طرف تشریف لیے جا رہے ہیں۔ جتنی دیر میں میں کنویں تک پہنچا مولانا نے بالٹی ڈبو کر کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ میں پہنچا تو مولانا نے بڑی مشکل سے اسی مجھے دی اور میرے دو ہی چار ہاتھ بالٹی کھینچنے تک اور رفقاء پہنچ گیے اور پانی بھرا جانے لگا۔ کنویں میں مینڈک دکھائی پڑ رہے تھے اور دو ایک مینڈک بالٹی میں بھی آگئے تھے جنہیں دیکھ کر مولانا فرمانے لگے ایسی کوئی ترکیب نہیں جس سے مینڈک نکال لیے جائیں۔ میں نے عرض کیا کہ ہے اور یہ کہہ کر میں مولانا کی چھوٹی بالٹی اور پتلی رسی

اٹھا لایا اور بالٹی کو رسی میں باندھ کر مینڈک نکالنے لگا۔ مولانا اسے دیکھ کر کافی لطف اندوز ہوئے اور جب پورا کنواں مینڈک سے بالکل صاف ہو گیا تو فرمانے لگے اقبال صاحب! اب آپ کو "صیاد الضفادع" کیوں نہ کہا جایا کرے۔

سرنا اسٹیشن پر پریس کا کوئی بھاری سامان آیا ہوا تھا جو تانگہ پر نہ لادا جا سکتا تھا۔ سامان کئی دن سے اسٹیشن پر پڑا ہوا تھا۔ ایک دن مولانا، شرقی صاحب سے اس کے متعلق فرمانے لگے، شرقی صاحب کیوں نہ ہم لوگ اسے اپنے کندھوں پر لاد کر اٹھا لائیں۔ شرقی صاحب نے جواب دیا مولانا! خیال تو بڑا اچھا تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ سامان بھاری ہے۔ دس بارہ آدمیوں سے کم سے نہ آپائے گا اور ہمارے پاس اتنے آدمی نہیں ہیں۔ اتفاق سے کچھ مہمان آئے ہوئے تھے، انھوں نے یہ بات سنی تو مستعد ہو گئے۔ اس طرح دس بارہ آدمیوں کا دستہ اسٹیشن پہنچ گیا۔ سامان کاندھوں پر لادا جانے لگا تو سب نے ہر چند مولانا کو منع کیا کہ آپ زحمت نہ فرمائیں۔ ہم لوگ اسے اٹھالے جائیں گے لیکن مولانا کسی طرح آمادہ نہ ہوئے اور سب کے ساتھ خود بھی اسے کاندھے پر لاد کر دارالاسلام تک آ گئے۔

مولانا کی شخصیت کے ان گہرے رنگا رنگ میں ان کے خادموں کے لیے ایک کا نٹا ضرور تھا مولانا ہم لوگوں کے ساتھ اس طرح برتاؤ کرتے جیسے ہم لوگ ان کے ہم مرتبہ ہوں اور میرا خیال ہے کہ مولانا اس کے علاوہ کسی کے ساتھ کوئی دوسرا برتاؤ کرنا چاہتے بھی تو شاید کر نہ سکتے اور یہ ان کی والدہ مرحومہ کے فیض تربیت کا اثر تھا۔ دارالاسلام میں ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ وہاں مقیم تمام حضرات مختلف ضروریات کے ماتحت باہر چلے گئے اور وہاں اقامت کرنے والوں میں، میں رہ گیا، شمس الحسن صاحب کی اہلیہ محترمہ اور مولانا کی والدہ مرحومہ شمس الحسن صاحب کی اہلیہ، مولانا کی والدہ کی تنہائی کا خیال کر کے انھیں کے پاس چلی گئی تھیں اور کہا تھا کہ میرا کھانا وہیں پکا دیا کریں گی۔ دارالاسلام میں گوشت اور ترکاری کے قسم کی کوئی چیز تو ملتی نہ تھی، جو کچھ ملتا پٹھان کوٹ ہی میں ملتا تھا اس لیے میں نے مولانا کی والدہ اور شمس الحسن صاحب کی اہلیہ سے دریافت کیا کہ جو کچھ کہیں پٹھان کوٹ سے لا دیا کروں لیکن ان دونوں نے کہا کہ کوئی چیز لانے کی ضرورت نہیں اور میں تنہا اپنے لیے ترکاری لانے جا نہیں روز کیا آتا جاتا لہٰذا دال روٹی ہی چل رہی تھی۔ بہر حال پہلے دن جب مولانا کے یہاں سے میرا کھانا آیا تو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ٹرے میں دال روٹی کے ساتھ ایک پرچ میں اتنی بالائی رکھی ہوئی ہے کہ اگر دال نہ بھی ہوتی تو میں تنہا بالائی کے ساتھ روٹی کھا کر آسودہ ہو سکتا تھا۔ میں نے سوچا ممکن ہے دودھ والا آج بھی مولانا کے بچوں کا دودھ دے گیا ہو اسی کی یہ بالائی بن گئی ہے۔ دوسرے دن ٹرے کے اندر پھر اسی مقدار میں بالائی دیکھ کر میں نے شمس الحسن صاحب کی اہلیہ سے دریافت کیا کہ یہ بالائی کہاں سے آجاتی ہے تو وہ فرمانے لگیں آپ کا جو دودھ آتا ہے، کھانا پک جانے کے بعد مولانا کی والدہ صاحبہ اسے لے کر باورچی خانہ میں بیٹھ جاتی ہیں اور پھا بھی اتار اتار کر پرچ میں رکھتی جاتی ہیں حالانکہ اس طرح بالائی تیار کرنے میں انھیں بڑی دیر لگ جاتی ہے مگر کسی طرح مانتی نہیں اور اسی دودھ میں سے صبح و شام کی چائے کے لیے دودھ بھی بچا لیتی ہیں ـــــ شمس الحسن صاحب کی اہلیہ بڑی نیک خاتون تھیں۔ مجھے اپنا چھوٹا بھائی بنائے ہوئے تھیں اور میرے ساتھ ان کا بالکل ایک حقیقی بڑی بہن

جیسا برتاؤ تھا ـــــ میں نے ان سے یہ بات سننے کے بعد انھیں کے ذریعہ مولانا کی والدہ کو کہلا بھیجا کہ آپ کی اس زحمت فرمائی کی اطلاع سے مجھے سخت دلی تکلیف پہنچ رہی ہے اور اب اس دلی تکلیف اور احساس ندامت سے بالائی میرے حلق سے نیچے نہ اتر پائے گی۔ تیسرے دن کھانے میں پھر بالائی دیکھ کر میں نے مولانا کی والدہ ہی سے التجا کی کہ وہ یہ زحمت نہ فرمایا کریں، دال میرے لیے کافی رہتی ہے اور وہ مجھے مرغوب بھی ہے لیکن وہ یہی فرماتی رہیں کہ اقبال! مجھے اس سے کوئی تکلیف نہیں پہنچتی اور تم جس طرح سوچ رہے ہو ایسا نہ سوچو۔ میری التجائیں بہت بڑھیں تو وہ فرمانے لگیں اقبال! بات اصل یہ ہے کہ میں یہ بات دیکھ ہی نہیں سکتی کہ گھر سے کسی کو کھانا جائے اور اس میں خالی دال رہے اس لیے تم یہ سب باتیں نہ سوچو۔ چنانچہ ۸۔ ۱۰ دن جب تک شمس الحسن صاحب کی اہلیہ مولانا کے گھر میں رہیں مولانا کی ضعیف و سن رسیدہ والدہ کافی دیر تک باورچی خانہ میں بیٹھ کر خود بالائی تیار کرتیں اور اسے دال کے ساتھ بھیجتی رہیں۔ یہ برتاؤ تھا مولانا کی والدہ کا ایک ایسے لڑکے کے ساتھ جس کی حیثیت ان کے گھر کے ملازم سے زیادہ ابھی نہ تھی۔ کتنا بڑا دل تھا مولانا کی والدہ کا! پھر دارالاسلام سے میرے آنے کے بعد ہر وارہ کے اجتماع میں جب مجھے مرحومہ کی تشریف آوری کی اطلاع ملی اور میں نے انھیں اپنا سلام کہلا بھیجا تو دروازہ کے قریب تشریف لائیں اور دیر تک خیریت دریافت کرتی رہیں۔ دوران گفتگو جب انھوں نے میری شادی کے متعلق دریافت کیا اور میں نے اثبات میں جواب دیا تو فرمانے لگیں اقبال! تم نے اچھا نہیں کیا جو اپنی بیوی کو یہاں نہیں لائے۔ تم اسے یہاں لائے ہوتے تو ملاقات ہو جاتی۔ اب کیا اسے دیکھوں گی۔ اب کیا اس سے ملاقات ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ ایسا نہ فرمائیے جیسے ہی موقع ملا اسے لے کر حاضر ہوں گا۔ آپ کی خدمت میں حاضری کی اسے خود بڑی تمنا ہے لیکن وہ اپنی ہی بات دہراتی رہیں۔ پھر جتنی دیر تک وہ کھڑی رہیں اسی طرح تاسف کا اظہار کرتی رہیں۔ میرے گاؤں کا راستہ اتنا خراب تھا کہ میں وہاں جا کر مولانا کے والدہ کی روانگی سے قبل واپس نہیں آسکتا تھا ورنہ دل یہی چاہ رہا تھا کہ اجتماع کو چھوڑ کر بیوی کو لے آؤں اس لیے دل مسوس کر رہ گیا۔ پھر اللہ کا حکم، مولانا کی والدہ جو فرما رہی تھیں وہی ہوا۔ تقسیم کے بعد سفر کی دشواریاں رہیں۔ پھر میں بھی سفر کے قابل نہ رہا اور میری بیوی بھی مفلوج ہو گئیں اس لیے مولانا کے والدہ کی خدمت میں حاضری کی تمنا حسرت بن کر رہ گئی۔ ان کے انتقال کی خبر سے کئی دن میرا برا حال رہا۔ اللہ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے۔ بڑی نیک بی بی تھیں مولانا کی والدہ!

مولانا کی حیات کا ایک تابناک پہلو یہ تھا کہ ان کے یہاں راز کے قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ جو کچھ اندر تھے وہی باہر جو ظاہر تھا وہی باطن۔ وہ اپنی پرائیویٹ مجلس میں وہی بات کہتے جسے علی الاعلان اسٹیج پر کہہ سکیں اور اسٹیج پر وہی بات کہتے تھے جو بے تکلف ان لوگوں کے سامنے کہہ سکیں جو ان کی ہر چھوٹی بڑی بات سے واقف تھے۔ ان کی زندگی "پبلک" اور "پرائیویٹ" کے خانوں میں منقسم نہ تھی۔ ان کی کتاب حیات ایک کھلی ہوئی کتاب تھی۔ مولانا کی عادت کوئی اہم سے اہم بات بھی ہم لوگوں سے چھپانے کی نہ تھی اور ایسا کر کے انھوں نے ہم لوگوں کو "تجسس" کے مرض سے بچا لیا تھا۔ میں جب مولانا کی خدمت میں پہنچا تو میرا سن ۱۵ سال ایسا تھا کہ اگر مولانا جماعت کے اصحاب حل و عقد کے درمیان امور مختلف فیہ سے مجھے باخبر رہنے کا موقع نہ دیتے تو یہ کوئی نامناسب

بات نہ ہوتی لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مولانا کا انداز تربیت ہی یہ تھا کہ رفقا کو اہم بار امانت سپرد کر کے ان کے جذبۂ امانت کو پروان چڑھائیں اس لیے انھوں نے اس قسم کے معاملات بھی مجھ سے مخفی نہیں رکھے۔ چنانچہ ایک موقع پر جب دارالاسلام سے ہمارے ایک رفیق بعض رفقا کے ساتھ اپنا عقد کرنے گئے ہوئے تھے اور مولانا کو ان کے نام ایک ارجنٹ لیٹر پٹھان کوٹ میں پوسٹ کرانا تھا، مولانا نے مجھے طلب فرمایا۔ میں حاضر ہوا تو مولانا کے چہرہ پر حزن وملال کے شدید اثرات تھے۔ میرے استفسار کے جواب میں مولانا نے ان رفیق کا پورا معاملہ جس کی وجہ سے انھیں سخت دلی اذیت اور خفت وندامت برداشت کرنی پڑی تھی اور جس کا ان کے قلب پر شدید اثر تھا، بیان کر دیا اور آخر میں وہ خط جو انھوں نے ان رفیق کو لکھا تھا، یہ کہتے ہوئے میری طرف بڑھا دیا "لیجئے اسے دیکھ لیجئے میں نے انھیں صاف صاف لکھ دیا ہے۔ میں اس قسم کی حرکت ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ پھر" دارالاسلام" میں جو کچھ ظہور پذیر ہوا، وہ اس خط ہی کا شدید ردعمل تھا۔

اسی طرح جس مجلس میں مولانا کو "محضر شکایات" پیش کیا گیا میں اس مجلس میں اپنی علالت کے باعث موجود نہیں تھا۔ صبح "محضر شکایات" اور اس کا مولانا نے جو جواب لکھا تھا، اسے دیکھنے کے بعد مجھے کچھ پریشانی لاحق ہوئی تو مولانا نے، جس طرح ان کو وہ تحریر دی گئی تھی، اس کی وضاحت فرما دی اور دونوں خطوط کو میرے اطمینان سے پڑھ لینے کے بعد ہی انھوں نے اپنا جواب مکتوب الیہ تک پہنچایا۔

پھر" دارالاسلام سے مولانا نعمانی صاحب وغیرہ کے چلے جانے کے بعد تو مولانا کی خدمت میں تنہا میں ہی رہ گیا تھا اس لیے پوری خط وکتابت کی نقل فائل میں رکھنے کا کام میرے ہی ذمہ تھا۔ اور مولانا نے میری نوعمری کا لحاظ نہ کرتے ہوئے جو اعتماد مجھ پر کیا تھا، مجھے خوشی ہے کہ میں نے اس اعتماد کو مجروح نہیں کیا۔ میں نے اپنے قیام لاہور و "دارالاسلام" میں مولانا کے بے شمار خطوط پڑھے ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک خط میں بھی ایسی بات نہیں دیکھی کہ "اسے اپنے ہی تک رکھئے گا" مولانا اپنے بے تکلف احباب کو بھی خطوط پورے احتساب نفس اور اوامر ونواہی کا لحاظ کرتے ہوئے لکھتے تھے اور ان خطوط میں ایک لفظ بھی ایسا نہ ہوتا تھا کہ اگر وہ خطوط کبھی پریس میں آجائیں تو انھیں پشیمانی اٹھانی پڑے۔ کسی تحریر کے سلسلہ میں افشا کا دھڑکا وہیں لگتا ہے، جہاں اوامر ونواہی کا لحاظ نہ رکھا جائے۔

مولانا کا پان سے جو تعلق تھا اس میں مولانا کی بات ہو اور پان کی بات نہ آئے تو بات کچھ ادھوری سی رہتی ہے۔ مولانا کی طرح ان کا پان بھی بڑی آن بان کا تھا۔ مولانا کے پان کا ایک رخ تو یہ تھا کہ سفر وحضر جہاں مولانا ہیں پاندان ساتھ ہے۔ حضر میں اگر پاندان ساتھ رکھنے کا موقع نہیں تو پھر ڈبیہ اور بٹوہ کا مولانا کے ساتھ رہنا لازمی تھا۔ چنانچہ ٹہلنے کے موقع پر اس "متاع عزیز" کو اپنے پاس رکھنے کی سعادت مجھے نصیب ہوتی رہی ہے۔ پھر مولانا کا پان کچھ ایسا ویسا نہیں تھا مولانا کا پان ایسا نازک تھا کہ دوسروں کی انگلیوں کے لمس کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے مولانا خود ہی اسے احتیاط سے رکھتے اور خود ہی لگاتے تھے۔ مولانا کے پان کا ایک دوسرا رخ یہ تھا کہ جیل جاتے وقت گھر سے کلی کر کے نکلتے ہیں تو پوری مدت اسیری اس طرح گذار دیتے

ہیں کہ گویا کبھی پان کو منہ لگایا ہی نہ تھا ـــــ مولانا عادتوں کے غلام نہ تھے، عادتیں خود مولانا کی غلام تھیں ـــــ مولانا کے پان کے یہ دونوں رخ سب کے سامنے ہیں۔ البتہ مولانا کے پان کا ایک رخ ایسا بھی ہے جسے دیکھنے کا صرف مجھے موقع مل سکا ہے۔

اور یہ مولانا کی اس رات کا پان تھا جب رسالہ "ترجمان القرآن" غیر معینہ مدت کے لیے بند ہو رہا تھا۔ ہوا یہ کہ مولانا نعمانی صاحب کے استعفے اور "دارالاسلام" میں سید عبدالعزیز صاحب شرقی، ملک غلام علی صاحب اور بعض دیگر حضرات کے منتقل ہو جانے کے بعد، جب مولانا نے "ترجمان القرآن" کے منیجر سید محمد شاہ صاحب کو سبکدوش کر کے، اس کام کی ذمہ داری عارضی طور پر میرے سپرد کر دی تو چند ماہ کام ٹھیک سے چلتا رہا پھر کاغذ مفقود ہو گیا اور حصول کاغذ کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تب میں نے مولانا کو اس کی اطلاع کر دی۔ میرا خط ملنے کے دوسرے دن صبح مولانا کا تانگہ دفتر کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ دفتر اس وقت عارضی طور پر پرانی انارکلی آگیا تھا۔ میں لپک کر مولانا کے پاس پہنچا پھر ان کے ارشاد کے مطابق دفتر بند کر کے تانگہ پر جا کر بیٹھ گیا اور تانگہ چل پڑا۔ راستہ میں مولانا نے ان کوششوں کا جائزہ لینے کے بعد جو کاغذ حاصل کرنے کے سلسلہ میں ہو چکی تھیں، اپنا پروگرام مرتب فرمایا اور اپنی مہم کا آغاز کر دیا۔ اور یہ مہم شام تک جاری رہی۔ بس ظہر اور عصر کی نماز ادا کرنے کے لیے تانگہ بعض مساجد کے قریب رکا۔ اس طرح پورے لاہور کا چکر لگا لینے کے بعد بھی کاغذ ملنے کی کوئی سبیل نہ نکل سکی تو مولانا نے فیصلہ کر لیا کہ اس غیر یقینی صورت حال میں رسالہ کی اشاعت کا جاری رکھنا مناسب نہیں ہے لہذا رسالہ بند کر دیا جائے۔ اور مجھے ہدایت کی کہ کل میں یہ مضمون سائیکلو اسٹائل کرا کے خریداروں کو بھیج دوں کہ حصول کاغذ کی تمام کوششیں ناکام ہو جانے کے بعد رسالہ "ترجمان القرآن" غیر معینہ مدت کے لیے بند کیا جا رہا ہے۔ لہذا جو خریدار اپنی رقم واپس لینا چاہتے ہوں، وہ دفتر کو مطلع کر دیں تاکہ ان کی بقایا رقم ان کو واپس بھیج دی جائے۔ اور جو خریدار صبر کر سکتے ہوں، وہ صبر کریں، کاغذ جیسے ہی دستیاب ہو گیا، رسالہ انھیں ملنا شروع ہو جائے گا۔

اب آخری جگہ گفتگو کرنے کے بعد جب واپسی ہوئی تو آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھا گئی تھیں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ ظفر اقبال صاحب کے یہاں، جہاں مولانا دفتر آتے ہوئے اپنا ہولڈال چھوڑ آئے تھے، پہنچتے پہنچتے ہم لوگ شرابور ہو جائیں گے مگر خیر راستہ میں تو بارش نہیں ہوئی البتہ مبارک پارک کی مسجد میں مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد جیسے ہی ہم لوگ ظفر اقبال صاحب کے یہاں پہنچے شدید طوفانی بارش شروع ہو گئی۔ ظفر اقبال صاحب، مولانا کے دوپہر کا کھانا نہ کھا سکنے اور "ترجمان القرآن" کے بند کر دیے جانے کی صورت حال پیدا ہو جانے پر اظہار افسوس کرتے رہے پھر کھانا منگوا کر ہم لوگوں کو کھلایا اور دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ عشاء کی نماز ادا کرنے اور ظفر اقبال صاحب کے اندر چلے جانے کے بعد موجودہ صورت حال سے نپٹنے کے سلسلہ میں مولانا نے مجھے ہدایات دیں پھر دفتر سے متعلق بعض دوسرے امور پر گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد جب سب کام سے فراغت حاصل ہو گئی اور میں لیٹ گیا اور مولانا نے اپنا پاندان کھولا تو کہنے لگے۔ اقبال صاحب! نیند تو شاید آج ویسے بھی نہ آتی مگر یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ پاندان میں پان نہیں ہے اگر نیند کو آنا بھی ہوتا تو اب نہیں آئے گی۔" "دارالاسلام" سے چلا تو جو پان تھے لگا کر ڈبیہ میں رکھ لیا تھا اور سوچا تھا لاہور میں پان منگا لیں گے مگر کاغذ کی تلاش میں پان لینے کا خیال ذہن سے نکل گیا۔ مجھے رسالہ بند

ہو جانے کا افسوس تو تھا ہی اب ایسی نازک گھڑی میں مولانا کے پان ختم ہو جانے کا افسوس اور بھی زیادہ ہوا لیکن پان کے مسئلہ کا حل کچھ سمجھ میں نہ آیا اس لیے خاموش رہا۔ کیونکہ سڑک پانی سے بھری ہوئی تھی، بارش اسی شدت سے جاری تھی اور باہر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ پھر معًا خیال آیا اور میں نے عرض کیا مولانا! راستہ مسدود ہو جانے کی بنا پر جو دوکاندار جہاں تھا اب وہ وہیں پھنسا پڑا ہوگا۔ اس لیے اگر راستہ کھلنے سے پہلے ان کے پاس پہنچ کر کوشش کی جائے تو ممکن ہے لگا ہوا پان بیچنے والا کوئی دوکاندار سادہ پان دے ہی دے۔ مولانا نے فرمایا ہاں، یہ بات تو آپ کی ٹھیک معلوم ہوتی ہے مگر اس پانی اور اندھیرے میں وہاں پہنچا کیسے جا سکتا ہے؟ میں نے عرض کیا اس کی فکر نہ کیجیے، وہاں تو میں انشاء اللہ پہنچ ہی جاؤں گا۔ مگر مولانا یہ اجازت دینے کے لیے کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔ پھر جب میں نے مزید بحث کرنے کی کوشش کی تو مولانا نے میری خرابیٔ صحت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے سے سختی سے روک دیا اس لیے مجبورًا خاموش ہو گیا مگر دل اضطراب کی آماجگاہ بنا رہا۔ مولانا پھر دوسری باتیں کرتے رہے لیکن میرا اضطراب جیسا تھا ویسا ہی باقی رہا۔ اور جیسے ہی بارش کی شدت میں کچھ کمی ہوئی، میں مولانا کی نظر بچا کر اور اللہ کا نام لے کر باہر نکل گیا۔ اب اس کے آگے کی یہ بات کہ میں مولانا کے لیے پان کہاں سے اور کیسے لایا تو ظاہر ہے کہ اس جگہ کے لیے یہ تفصیل بے محل ہے۔ ——————

—— بہر حال میں جب مولانا کے پاس پہنچا تو گو اس خوشی سے جو پان پا کر مجھے حاصل ہوئی تھی میرا دل بلّیوں اچھل رہا تھا مگر میرا کرتا و پائجامہ شرابور تھا، سردی سے میرے دانت بج رہے تھے اور جسم کپکپا رہا تھا اور مولانا پریشانی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے فرمایا اقبال صاحب! یہ آپ نے کیا غضب کر ڈالا!! اچھا اپنے جسم اور کپڑوں کو جلد پاک کر کے آیئے تو میں کچھ انتظام کرتا ہوں۔ کپڑے میرے پاس بھی وہی تھے جو پہنے ہوئے تھا اور مولانا کے پاس بھی وہی جو وہ پہنے ہوئے تھے۔ ان کا ارادہ رات کو رکنے کا نہیں تھا۔ اس لیے دوسرا جوڑا نہیں رکھا تھا۔ ہولڈال تو احتیاطًا لے لیا تھا۔ اسی طرح ظفر اقبال صاحب کو بھی اتنی رات میں کپڑے کے لیے جگانا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ کمرہ سے ملحق غسلخانہ سے نکل کر میں جب مولانا کے پاس پہنچا تو وہ ایک چادر لیے کھڑے تھے جو مجھے دیتے ہوئے اور میرا کرتا میرے ہاتھ سے لے کر میرے بستر کے ایک حصہ کو پلٹ کر یہ کہتے ہوئے کرتا کرسی پر پھیلانے چلے گئے کہ پائجامہ پلنگ پر اتاریئے گا ورنہ گدہ ہو جائے گا پھر کرتا پھیلا کر دوسری چادر مولانا نے مجھے اوڑھنے کو دی اور میرا پائجامہ اٹھا کر کرسی پر رکھ دیا۔ میں نے کہا بھی کہ مولانا آپ زحمت نہ فرمائیں، پائجامہ نچوڑ کر میں پھیلا دوں گا تو کہا اچھا آپ لیٹ جائیے تو بتاتا ہوں۔ میں لیٹ گیا تو انھوں نے اپنا پورا بستر مع ہولڈال کے اٹھا کر مجھے اڑھا دیا پھر پائجامہ کو نچوڑ کر پھیلانے کے بعد لوٹے تو اپنے بستر کے سروں کو چاروں طرف سے میرے جسم کے نیچے کر کے خود اوپر سے دبائے رہے تاکہ ہوا کا نفوذ میرے جسم تک نہ ہو سکے۔ اور یہ سلسلہ ایک آدھ گھنٹہ تک جاری رہا۔ پھر میری حالت معمول کے مطابق ہو جانے کے بعد بھی مولانا نے مجھے دیر تک اسی طرح اڑھائے رکھا۔ بالآخر جب میں اٹھ کر بیٹھ گیا تو پھر اچھی طرح مجھے تنبیہ کر لینے کے بعد کہ آئندہ کبھی میں اس قسم کی نا سمجھی نہیں کروں گا، مولانا پان کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے دھونے صاف کرنے اور احتیاط سے رکھنے کے بعد جب ایک پان لگا کر انھوں نے کھایا اور ڈبیہ میں

رکھنے کے لیے پان لگانے لگے ــــــ اور اتفاق سے پان وہی تھے جو مولانا کو مرغوب تھے ــــــ تو ان کے اس سوال کے جواب میں کہ دوکاندار نے یہ پان مجھے کس طرح دے دیے، جب میں نے یہ بتایا کہ پان حاصل کرنے کی ہر کوشش ناکام ہو جانے کے بعد بالآخر مجھے اپنی ٹوٹی پھوٹی پنجابی کو آلۂ کار بنانا پڑا تو اس کا خاطر خواہ اثر ہوا تو مولانا میری پنجابی سن کر بہت محظوظ ہوئے۔

رات اب ڈھل چکی تھی اور کام سب ختم تھا۔ اب سونا ہی سونا رہ گیا تھا، چنانچہ میں مولانا سے بات کرتے کرتے سو گیا۔ رات میں ایک مرتبہ میری آنکھ کھلی تو مولانا کو سوتا دیکھ کر میں وہ ساری کلفت بھول گیا جو پان کے سلسلہ میں مجھے اٹھانی پڑی تھی۔ اور اب جب کہ جسم کی ساری طاقتیں جواب دے چکی ہیں، سوچتا ہوں کہ جوانی اور طاقت اللہ کی بخشی ہوئی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ رات میں دیکھ چکا تھا کہ مولانا کی خداداد صلاحیتیں اپنے ایک ادنیٰ خادم کو آرام پہنچانے کے سلسلہ میں کس طرح بروئے کار آسکتی ہیں۔ صبح بیدار ہونے پر اپنے سرہانے اپنے کپڑوں کو تہ کیا ہوا رکھا پاکر میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ قلم پکڑنے والی انگلیوں کو برسات کی رات میں کمرہ کے اندر کپڑوں کو سکھلا کر اس طرح تہ کرنا بھی آتا ہے کہ ان میں ایک شکن بھی باقی نہ رہ جائے۔ میں نے غنودگی کی حالت میں ایک مرتبہ پھر مولانا کو اپنے کپڑوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اب مولانا نے کس طرح میرے کپڑوں کو سکھلایا یہ مجھے معلوم نہیں۔ اللہ کی بے شمار رحمتیں ہوں اس مرد حق پر جس کا اپنے ادنیٰ خادموں کے ساتھ یہ برتاؤ تھا۔

مولانا کی خدمت میں میرے دوران قیام دو حادثات ایسے پیش آئے جن میں اگر مولانا کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو شاید اس کے لیے اپنے حواس بجا رکھنا بہت مشکل ہو جاتا۔ پہلا حادثہ، حادثۂ دارالاسلام تھا اور دوسرا ایسی حالت میں ترجمان القرآن کا بند ہو جانا جب کہ "جماعت اسلامی" اور مولانا کے خلاف بدگمانیاں پھیلانے کی مہم پورے زور شور سے جاری تھی، مگر ان دونوں مواقع پر مولانا کے معمولات میں نہ تو ادنیٰ سا کوئی تغیر پیدا ہوا اور نہ ہی ان کی کسی بات سے شمہ برابر فکر و پریشانی ظاہر ہوئی۔ پہلے موقع پر مولانا نعمانی صاحب کو ان کے خط کا جواب دیے جانے سے پہلے جب میں مولانا نعمانی صاحب کے خط پر مولانا سے گفتگو کرنے کے بعد مولانا نعمانی صاحب کے خط کو نقل کرنے لگا تو مولانا دو تین منٹ تک تو میری اس بات کی طرف متوجہ رہے جو میں خط نقل کرتے ہوئے درمیان میں ان سے کر لیتا تھا، پھر انھوں نے اپنا قلم اٹھایا اور بغیر کسی ادنیٰ غور و فکر کے اپنی گذشتہ دن کی تحریر سے آگے لکھنا شروع کر دیا اور اس موقع پر بھی ان کی رفتار تحریر معمول کے مطابق رہی۔ اور دوسرے موقع پر جب مولانا کا تانگہ بازار سے ظفر اقبال صاحب کے مکان کی طرف چلا تو راستہ میں انھوں نے مجھ سے صرف یہ کہا اللہ کے بندوں تک اپنی آواز پہنچانے کا ایک ذریعہ اللہ ہی نے دیا تھا، اس کی مرضی جو اس نے اسے لے لیا۔ اس کے علاوہ نہ تو مولانا نے اس ضمن میں کوئی بات کی اور نہ ہی ان کی کسی چیز سے غم و اندوہ کا پتہ چلا۔ مولانا پہاڑ تھے حادثات انھیں ہلا نہیں سکتے تھے۔

مولانا کے مزاج و طبیعت سے متعلق تو یہ بات ضمناً آ گئی۔ بات ہو رہی تھی رسالہ ترجمان القرآن کے غیر معینہ مدت کے لیے بند کر دیے جانے کی۔ چنانچہ مولانا نے صبح بھی اور جب ان کی ٹرین چلنے لگی تب بھی تاکید کر دی تھی کہ آج خریداروں کو اطلاع

چلی جانی چاہیے مگر کام کا جائزہ لینے کے بعد جب وقت میں اتنی گنجائش محسوس ہوئی کہ سائیکل سے کاغذ کی دوکانوں کا ایک چکر لگا لینے کے بعد بھی اگر اسے شروع کیا جائے تو شام سے پہلے پورا ہو جائے گا اس لیے کاغذ کی پھر تلاش شروع ہو گئی اور ایک جگہ کاغذ مل گیا مگر وہ سفید کے بجائے گلابی تھا۔ جس پر مولانا کسی طرح رسالہ چھپوانے پر راضی نہیں ہو رہے تھے۔ بہرحال انھیں کسی طرح راضی کیا گیا، اور رسالہ اسی پر چھپ گیا

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

تحتہ ملکیت۔ فارم ۴ رول ۸

مقامِ اشاعت: دفتر ماہنامہ زندگی نو۔ ۱۵۲۵ سوئیوالان نئی دہلی ۲
نوعیتِ اشاعت: ماہنامہ
طابع و ناشر: محمد حبیب اللہ قادری
قومیت: ہندوستانی
پتہ: ۱۵۲۵ سوئیوالان۔ نئی دہلی ۲
ایڈیٹر: سید جلال الدین انصر عمری
قومیت: ہندوستانی
پتہ: شعبۂ ادارت، دفتر ماہنامہ زندگی نو۔ پان والی کوٹھی دودھ پور علیگڑھ۔
ملکیت: دعوت ٹرسٹ رجسٹرڈ
۱۵۲۵۔ سوئی والان۔ نئی دہلی۔ ۲

بورڈ آف ٹرسٹیز

مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی۔ چیرمین دعوت ٹرسٹ رجسٹرڈ
پتہ: ۱۳۵۳۔ بازار مفتی کفایت اللہ۔ دہلی ۶
مولانا شفیع مونس صاحب۔ سکریٹری دعوت ٹرسٹ
پتہ: ۱۳۵۳۔ بازار مفتی کفایت اللہ۔ دہلی ۶

ممبرس:

۱۔ مولانا صدر الدین اصلاحی۔ پھول پور اعظم گڈھ
۲۔ مولانا کے۔ سی۔ عبد اللہ۔ چاند منگور۔ کیرلا
۳۔ مولانا انعام الرحمٰن خاں
محلہ تلیا۔ نزد پولیس چوکی۔ بھوپال
۴۔ مولانا محمد یوسف۔ گھیر میر باز خاں۔ جیل روڈ۔ رام پور
۵۔ سید یوسف صاحب
۱۳۵۳۔ بازار مفتی کفایت اللہ۔ دہلی ۶
۶۔ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی۔ گلشن سہیل بدر باغ۔ علیگڈھ

مندرجہ بالا معلومات میرے علم و یقین کی حد تک صحیح و درست ہیں۔

محمد حبیب اللہ قادری
طابع و ناشر

جہیز اور اس کی شرعی حیثیت

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی*

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی کا یہ مقالہ دار العلوم ندوۃ العلماء سے کتابچہ کی صورت میں، اس کے علاوہ پندرہ روزہ تعمیر حیات، اور ماہنامہ الفرقان' لکھنؤ میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ ادارہ زندگی نو کی درخواست پر محترم مقالہ نگار نے اس پر نظر ثانی فرمائی ہے اور بعض اضافے بھی کیے ہیں۔ جس سے اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح سے متعلق اس اہم مقالے کو امید ہے کہ توجہ کے ساتھ پڑھا جائے گا اور اسے زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے گا مواد کی مناسبت سے عنوان میں تھوڑی سی ترمیم کردی گئی ہے۔ (س)

یہ حقیقت تسلیم کرنے میں شاید ہی کسی صاحب نظر کو تأمل ہوگا کہ مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات اور شرعی احکام سے انحراف، یا ان کے بارے میں تساہل و بے اعتنائی کا رویہ اختیار کرکے آخرت کے خسارہ کا خطرہ مول لینے کے ساتھ دنیاوی نقصانات بھی کچھ کم نہیں اٹھائے ہیں، اس مسلسل تجربہ کہ جس کا مشاہدہ صدیوں بلکہ زائد از یک ہزار سال سے برابر ہو رہا ہے کی بنا پر یہ توقع بے جا نہ تھی کہ ــــ آخرت کے خوف سے نہ سہی۔ دنیاوی نقصانات سے بچنے کی خاطر ہی قوم اب کم سے کم ان احکام شریعت کی خلاف ورزی سے تو باز آجائیں گے جن کے روبہ عمل نہ لانے کے نتیجہ میں پیہم ناکامیوں اور شدید سے شدید تر خساروں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، لیکن عوام کی یہ "استقامت" اور "ہمت" بھی قابل داد ہے کہ ان کی عمومی روش میں کوئی خاص تبدیلی تو کیا آتی، اس کے آثار تک نظر نہیں آرہے ہیں (الا ماشاء اللہ) بلکہ شاید ــــ بعض اہل نظر کا یہ احساس بے جا نہ ہو کہ بے راہ روی کی "یہ خو" کچھ بڑھ ہی رہی ہے' یعنی اس کے بے نئے نئے میدان تلاش کر لیے گئے ہیں یا بالفاظ صحیح موجودہ دور میں خود ہاتھ آگئے ہیں،

* استاذ تفسیر و حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

مسلمانوں کی خاص کمزوری

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ مسلمانوں کی موجودہ صورت حال "تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم"[1] کا مصداق بنی ہوئی ہے، اس لیے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ پہلے کون سا 'داغ' لیا جائے کہ اس پر 'پنبہ' رکھنے کا کام شروع کیا جائے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ مسلمانوں میں بگاڑ ہمہ جہتی ہونے کے باوجود "معاشرتی" اور معاملاتی، میدانوں میں جس درجہ پھیلا ہے، اس درجہ شاید دوسرے بعض گوشوں (مثلاً عبادات) میں نہیں ہے، بتانے کی ضرورت نہیں کہ معاشرتی اور معاملاتی قوانین کی خلاف ورزی کس درجہ فساد اور بگاڑ کا سبب بنتی ہے! اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ موجودہ ہمہ گیر فساد اور خرابی کا واحد سبب اگر اسے یعنی شرعی احکامِ معاشرت و معاملات کی خلاف ورزی کو قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا، ان معاشرتی خرابیوں میں غالباً آج کل سب سے بڑھ کر اور دور رس مہلک نتائج کی حامل، شادی بیاہ کے موقعہ پر ہونے والی رسمیں اور فضول خرچیاں ہیں، جس پر عرصہ سے مصلحین "امت" کو متوجہ کرنے چلے آرہے ہیں، اور ان کی بیخ کنی کے لیے ممکن تدابیر اختیار کی گئی ہیں، اس موقعہ پر ہونے والی ایک قدیم رسم (جس کا خیر القرون سے پتہ چلتا ہے، اور اسی وقت سے ازالہ کی تدابیر کا بھی) "مہر" کی غیر معمولی بلکہ فرضی) مقدار کا باندھنا ہے، جس کے خلاف خود نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا" ان اعظم النکاح برکۃ ایسرہ مؤنۃ"[2] (سب سے زیادہ بابرکت نکاح وہ ہوتا ہے، جس میں مالی بار کم سے کم پڑے) اور پھر غالباً اسی ارشاد سے روشنی پاکر خلیفۂ ثانی و عادل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ چاہا تھا کہ مہر کی زیادہ مقدار پر ایک حد قائم کرکے قانونی پابندی لگادی جائے[3] اس کے علاوہ ایک رسم وسیع پیمانہ پر یعنی مالی حیثیت اور وسعت سے کہیں زیادہ ضیافت ہے کہ جس کے لیے بسا اوقات سودی قرضہ لینے کی نوبت آجاتی ہے جس کا حاصل بجز وقتی واہ واہ اور نام و نمود کے کچھ نہیں ہوتا، اور بعض اوقات یہ حقیر غرض بھی حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے بجائے الٹی شکایات ہی حصہ میں آتی ہیں۔

ایک رسم

پھر ایک یہ غلط رواج پڑا کہ لڑکی کا والد، اپنے ہونے والے داماد سے، لڑکی کے نکاح یا رخصتی پر پہلے خطیر رقم حاصل کرلیتا تب ہی رخصتی یا نکاح کرتا (یہ رقم مہر کے علاوہ ہوتی) اس کے بغیر مرد کو بیوی کا ملنا گویا ممکن نہ ہوتا دنیا کے بعض حصوں، مثلاً افغانستان، اور کچھ عرب ملکوں میں اب تک یہی رواج موجود پایا جاتا ہے۔

علماء و مصلحین کا کردار :

جب یہ رواج پھیلا تو علماء و مصلحین نے، بلا کسی رو رعایت کے، صاف کہا کہ ایسی رقم کا لینا شرعاً حرام ہے کیونکہ وہ رشوت ہے اور اس کا لوٹانا ضروری ہے، مثلاً مشہور حنفی فقیہ علامہ زین الدین بن نجیم مصری نے فرمایا،

---

[1] پورا جسم زخموں سے بھرا ہوا ہے تو کہاں کہاں مرہم رکھا جائے؟ [2] بیہقی بحوالہ مشکاۃ ص ۲۶۸ ج ۲ (مطبوعہ اصح المطابع، دہلی ۱۹۳۲ء) [3] اس کی تفصیل، پھر پابندی نہ لگانے کی وجہ کے لیے دیکھئے، مرقاۃ، شرح مشکاۃ طبع قدیم ص ۴۳۲ ج ۳ ملا علی القاری

أخذ أهل المرأة شيئا عند التسليم فللزوج أن يسترده لانه رشوة.[1]

رخصتی کے وقت عورت کے گھر والوں نے کچھ لیا تھا تو اسے شوہر کو واپس لینے کا شرعاً حق ہے کیونکہ (جو کچھ دیا گیا تھا) وہ رشوت ہے۔

اور علامہ ابن عابدین شامی نے تو اس سے بڑھ کر ایسی رقم کو "سحت" قرار دیا۔

من السحت ما يأخذه الصهر من الختن بسبب بنته بطيب نفسه حتى لو كان بطلبه يرجع الختن.[2]

سحت (حرام اور ناپاک مال) وہ بھی ہے جو خسر اپنے داماد سے اپنی لڑکی (کے نکاح یا رخصتی) پر لیتا ہے، چاہے دینے والے نے (بظاہر) خوش دلی سے دیا ہو، چنانچہ اگر لیا ہے تو داماد اس کو واپس لے سکتا ہے، اگر طلب پر دیا تھا

اسی جگہ علامۂ موصوف نے "سحت" کی تشریح بھی فرمادی ہے کہ:۔

الحرام وما خبث من المكاسب فلزم عنه العار.

حرام اور خبیث طریقہ سے حاصل شدہ چیز کہ جس سے (ہر شریف آدمی کو) عار محسوس ہو

ان کے علاوہ بھی دیگر فقہا اس امر پر متفق نظر آتے ہیں، چنانچہ فتاوی عالمگیری[3] میں فقیہ ابن نجیم کا مذکورہ بالا قول اس انداز سے نقل کیا گیا ہے، جس سے اس کا مسلّم و مفتی بہ ہونا (قانونِ شریعت ہونا) معلوم ہوتا ہے فتاوی عالمگیری ہی میں اور بھی ایسے مسائل ملتے ہیں جن سے اس بات کا مسلّم ہونا ثابت ہوتا ہے، مثلاً یہ مسئلہ ملتا ہے:۔

خطب امرأة في بيت اخيها فأبى ان يدفعها حتى يدفع اليه دراهم، فدفع وتزوجها يرجع بما دفع لانه رشوة.[4]

کسی شخص نے ایسی عورت کو نکاح کا پیغام دیا جو اپنے بھائی کے گھر میں رہتی تھی، بھائی نے کچھ رقم لیے بغیر نکاح کرنے سے انکار کردیا تو اس شخص نے مطلوبہ رقم دیدی اور اس عورت سے نکاح کرلیا تو اب اسے حق ہے کہ دی ہوئی رقم واپس لیلے کیوں کہ یہ رشوت ہے۔

مذکورہ بالا کتب کے علاوہ دیگر معتبر ترین کتبِ فقہ میں اور مستند فقہا کے یہاں بہت سے ایسے مسائل و فتاوی ملتے ہیں جن سے مذکورہ بالا حکم کی تائید و توثیق ہوتی ہے، مثلاً فقہ حنفی کی معتبر ترین کتاب "فتاوی قاضی خاں" میں ہے:

رجل خطب امرأة وهي تسكن في بيت اختها وزوج اختها لا يرضى بنكاح هذا الرجل

---

[1] البحر الرائق ص۲۰۴ ج۳ (الطبعة الاولیٰ بالمطبعة العلمیة [2] رد المحتار معروف بہ شامی ص۲۰۴ ج۵ (مکتبہ نعمانیہ دیوبند)

[3] عالمگیری ص۳۲۷ ج۱ (مطبوعہ بالمطبعة الامیریہ بولاق مصر ۱۳۱۰ھ)

[4] مجموعہ فتاوی مولانا عبدالحئی فرنگی محلی۔ تفصیل آگے ہے۔

الا أن یدفع الیہ دراھم فدفع الخاطب الیہ دراھم کان لہ أن یسترد ما دفع الیہ لأنہ رشوۃ[1]

اس عبارت کا مطلب بھی تقریباً وہی ہے جو اوپر والی عبارت کا، یعنی اس میں بھی وہی مسئلہ بیان کیا گیا ہے، بس اتنا فرق ہے کہ یہاں وہ عورت اپنے بہن بہنوئی کے پاس مقیم ہے اور بہنوئی نے رقم طلب کی (اوپر کی عبارت میں بھائی کے پاس ہونا اور اسی کا رقم طلب کرنے کا مسئلہ بیان ہوا ہے) بقیہ دیگر تفصیلات بالکل وہی ہیں۔

ایک اور مشہور و معتبر کتاب " الوسیلۃ الاحمدیۃ شرح الطریقۃ المحمدیۃ" (ملوی رجب علی متوفی ۱۲۵۰ھ یا اس کے بعد) میں تو یہ مسئلہ بہت وضاحت کے ساتھ مذکور ہے، اس میں ہے:۔

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی، ومن الرشوۃ ما اخذہ ولی المرأۃ قبل النکاح اذا کان بالسؤال او کان اعطاء الزوج بناء علی عدم رضائہ علی تقدیر عدمہ[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے والے اور دینے والے پر لعنت بھیجی ہے، اور یہ بھی رشوت ہی ہے کہ عورت کا سرپرست اس کے نکاح سے قبل (عورت کے والے شوہر سے) کچھ لے، خواہ مانگ کر لے یا وہ شوہر اس بنا پر دے کہ اگر نہ دے گا تو عورت کا سرپرست اس سے نکاح کرنے پر راضی نہ ہوگا۔

ہندوستانی علماء کی خدمات

بنابریں ہندوستان کے تمام ممتاز علماء و ارباب فتویٰ نے بھی اسی کے مطابق فتویٰ دیئے ہیں، مثلاً گذشتہ صدی کے سب سے ممتاز اور وسیع النظر فقیہ و عالم مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کے "مجموعہ فتاویٰ" میں ایک فتوی یہ ملتا ہے، جو مع استفتاء کے یہاں نقل کیا جا رہا ہے:

استفتاء ۹۹۔ ماقولکم رحمکم اللہ ۔ اندریں کہ اولیائے منکوحہ حین النکاح چیزے از ماکولات و مشروبات و نقدیات کہ ماسوائے زیور و مہر مصرح و مہر مسکوت عنہ است برائے اطعام و اعطائے اہل محلہ ... بروجہ شرط کہ اگر اشیائے مذکورہ بدہند اولیائے منکوحہ بازدواج والنکاح آں راضی شوند ورنہ نہ، از ناکح وخاطب میگیرند پس ایں قسم گرفتن شرعاً درست است یا نہ[2]

اس مسئلہ میں آپ کیا فرماتے ہیں کہ منکوحہ کے سرپرست نکاح کے وقت کھانے پینے وغیرہ کا سامان اور نقد روپیہ، علاوہ زیور اور مہر مقررہ مصرح و غیر مصرح کے اس شرط پر لیتے ہیں کہ اگر یہ دیا جائے گا تو نکاح پر سرپرست راضی ہوں گے ورنہ نہیں، تو اس قسم کی چیزوں کا لینا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

- - - - - - - - - - - -

---

[1] یہ حوالہ بھی، مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی، کے ایک فتوی سے ماخوذ ہے جس کا تفصیلی تذکرہ ابھی آگے آرہا ہے، "رشوۃ" کے معنی "مجمع البحار" ص ۳۲۹ ج ۲ میں یہ لکھے ہیں: "الرشوۃ بالکسر والضم وصلۃ الی الحاجۃ بالمصانعۃ"

[2] ایضاً مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحئی ص ۳۱ ج ۲

اس سوال کا نہایت محققانہ و تفصیلی جواب یہ دیا گیا جس کا حاصل یہ ہے کہ ان چیزوں کا لینا شرعاً جائز نہیں ہے اور اس جواب کے اندر وہ فقہی عبارتیں، بطور سند ذکر کی گئی ہیں، جو اوپر مع ترجمے کے گذر چکی ہیں۔ ذیل میں اصل جواب ملاحظہ

الجواب مستعیناً باللہ العظیم ومستنصراً بالرحمٰن الرحیم گرفتن ایں قسم چیزہا شرعاً جائز نیست ودرست نیست، قال فی الوسیلۃ الاحمدیۃ، شرح الطریقۃ المحمدیۃ، ولعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی ومن الرشوۃ ما اخذہ ولی المرأۃ قبل النکاح اذا کان بالسؤال اوکان اعطاء الزوج بناءً علی عدم رضائہ علی تقدیر عدمہ ۔ وقال فی رد المحتار من السحط (من السحت) الخ۔ وقال فی المعدن لا یجوز لأب البنت ان یأخذ من الخاطب شیئاً لانہ رشوۃ وقال فی العالمگیریۃ خطب امرأۃ فی بیت اخیہا فأبی ان یدفعہا حتی یدفع الیہ دراہم فدفع وتزوجہا یرجع بما دفع لانہ رشوۃ کذا فی القنیۃ۔ وقال فی قاضی خان رجل خطب امرأۃ وہی تسکن فی بیت اخیہا واراد اخیہا لا یرضی بنکاح ہذا الرجل الا ان یدفع الیہ دراہم فدفع الخاطب الیہ دراہم کان لہ ان یسترد ما دفع الیہ لانہ رشوۃ۔ الخ"

یہ فتویٰ اگرچہ "چاٹگام" کے مولانا اشرف علی نامی ایک عالم کا لکھا ہوا ہے، لیکن اس پر حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ نے حسب ذیل تائیدی عبارت لکھ کر دستخط کیے ہیں؛[1]

صح الجواب واللہ اعلم بالصواب و یوافقہ ما فی البحر الرائق لو اخذ اہل المرأۃ شیئاً عند التسلیم فللزوج ان یستردہ لانہ رشوۃ انتہیٰ،

(جواب صحیح ہے۔ اور اللہ بہتر جانتا ہے۔ اور اس جواب کی تائید "البحر الرائق" کی اس ... عبارت سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ عبارت نقل کی ہے، جو اوپر مع ترجمہ کے مذکور ہو چکی ہے)

اس محققانہ اور فاصلانہ فتویٰ کے بعد اگرچہ مزید کسی مفتی یا عالم کے فتویٰ کی نقل پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں رہ جاتی لیکن، برصغیر کے سب سے بڑے فقہ و فتاویٰ کے مرکز دارالعلوم دیوبند کے مفتیوں کے فتوے کے بغیر شاید تشنگی محسوس کی جائے اس لیے پہلے وہاں کے ایک اقدم و اعلیٰ مفتی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمانؒ صاحب کے مطبوعہ مجموعہ فتاویٰ سے چند فتووں کے مختصر حوالے پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ سے سوال کیا گیا؛

سوال $\frac{۸۳۸}{۱۲۴}$ اولیاء مخطوبہ کو خاطب سے مہر کے سوا اور کچھ لینا اور مہر لے کر اس میں تصرفِ مالکانہ کرنا اور دعوت وغیرہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا جواب مفتی عزیز الرحمان صاحب نے حسب ذیل دیا ہے۔

الجواب؛ اولیاء مخطوبہ کو زرِ مہر سے کچھ لے کر اس میں تصرف بیجا کرنا... درست نہیں... اور غیر مہر سے کچھ لینا،

[1] مجموعۂ فتاویٰ مولانا عبدالحیٰ لکھنوی ص ۲۸۴ (مطبوعہ مطبع یوسفی واقع لکھنؤ باہتمام محمد یوسف فرنگی محلی بماہ ذی قعدہ ۱۳۳۳ھ)

زوج وغیرہ سے، اس کو فقہاء نے رشوت سے تعبیر کیا ہے[۱]۔

اس کے علاوہ حضرت مفتی صاحب کے فتاویٰ کا جو مستقل مجموعہ مولانا ظفیر الدین صاحب کی ترتیب و تحشیہ کے ساتھ خود دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کی طرف سے طبع ہو رہا ہے، اس میں بھی اسی قسم کے متعدد فتاویٰ موجود ہیں (مثال کے لیے دیکھئے فتاویٰ دارالعلوم مدلل و محشی جلد ہفتم ص۲۲۲، ص۵۰۳، ص۵۰۵) حکیم الامت حضرت تھانوی کے مطبوعہ مجموعہ فتاویٰ میں بھی ایک فتویٰ سے یہی ترشح ہوتا ہے[۲]۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سابق مفتی اعظم پاکستان و صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کے مطبوعہ مجموعہ فتاویٰ (امداد المفتین) میں بھی مفتی صاحب موصوف کے متعدد فتوے اسی مضمون کے موجود ہیں، مثلاً ایک فتویٰ یہ ہے:

"عورت کے خویش و اقرباء جو کچھ رقم اپنے لیے لے کر نکاح کرتے ہیں، یہ رشوت ہے..... رقم لینا اور دینا جائز نہیں اور اگر دے دی ہے، تو شوہر کو حق ہے کہ بعد نکاح واپس لے لے۔ کذا فی الشامی فی باب المہر[۳]" اس کے بعد مفتی صاحب نے بحرالرائق کی شامی کے حوالہ سے وہ فقہی روایت نقل کی ہے، جس کا ذکر اوپر مع حوالہ آچکا ہے) خلاصۂ کلام یہ کہ جس زمانہ میں جس قسم کی خلافِ شرع رسوم و رواج کا عموم ہوا علمائے امت نے بروقت اس کے سدِّ باب کی کوشش کی اور حکم شرعی کا برملا اظہار کر کے اتمامِ حجت کیا۔

ایک خوفناک نئی رسم

لیکن ادھر کچھ مدت سے مذکورہ رسم کے بالکل برعکس، یعنی بچارے شوہر سے رقم کے مطالبہ کرنے کے، شادی کے وقت لڑکی (یا اس کے اولیاء) سے رقم وغیرہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو بسا اوقات اتنی خطیر رقم کا ہوتا ہے کہ۔ غریبوں کا تو ذکر ہی کیا، متوسط الحال لوگوں کے لیے بھی اس کا پورا کرنا آسان نہیں ہوتا، بعض علاقوں میں تو یہ رسم۔ وبا کی طرح پھیل رہی ہے، جس کے نتیجہ میں ایسے ہولناک مسائل کھڑے ہو رہے ہیں کہ ان کی تفصیل جان کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور انسانیت کی پیشانی ندامت سے عرق آلود ہو جاتی ہے، اس کا ایک محسوس اور کھلا ہوا ضرر اور نقصان تو یہ سامنے آرہا ہے، کہ لڑکیاں بغیر شادی کے بوڑھی اور سن رسیدہ ہو جاتی ہیں، کیونکہ شوہر کو خریدنے کے لیے ان کے، یا ان کے اولیاء کے، پاس رقم نہیں ہوتی، اس سے فطری اور طبعی تقاضہ کے صحیح طریقہ پر پورے نہ ہونے کی وجہ سے جو مفاسد پھیلتے یا پھیل سکتے ہیں، ان کا اندازہ کر لینا بھی کسی باشعور کے لیے مشکل نہیں، مثلاً بدکاری عام ہوتی، قحبہ خانوں کی آبادی بڑھتی بلکہ بعض مرتبہ ارتداد تک کی نوبت آجاتی ہے (العیاذ باللہ)

---

[۱] فتاویٰ دارالعلوم دیوبند۔ ص۱۹۳ (جلد سوم و چہارم، شائع کردہ کتب خانہ امدادیہ دیوبند)

[۲] امداد الفتاویٰ ص۵۸-۲۵۷ ج۲۔ ادارہ اشرف العلوم کراچی ۱۳۷۶ھ

[۳] مجموعہ فتاویٰ دارالعلوم ص۲۰۵ ج۱، ۱۳۷۲ھ شائع کردہ کتب خانہ امدادیہ دیوبند۔ حضرت مفتی کفایت اللہ کے بھی کئی فتوے "کفایت المفتی" (مثلاً ص۱۳۷، ۱۳۹، ۱۴۰ ج۵) میں ایسے ہی ملتے ہیں۔

یہ رسم یقیناً فطرتِ انسانی کے لحاظ سے بھی الٹی ہے، اور شریعت کے عطا کردہ قانونی مزاج کے بھی۔ اسی طرح یہ بات شریعت کے مزاج کے بھی خلاف ہے، کیونکہ اللہ نے "عورت" کو اس کی صنفی خصوصیات کے لحاظ سے جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حجۃ اللہ البالغہ میں اشارہ کیا ہے[1] مطلوب بنایا ہے، اور مرد کو طالب، یہی وجہ ہے کہ مرد پر بوقتِ نکاح مہر لازم کیا ہے، عورت پر نہیں[2] کہ وہ تو مہر پانے کی مستحق قرار دی گئی ہے، اس لیے یہ قبیح رسم کم سے کم مسلمانوں میں کچھ عرصہ پہلے تک عام نہیں تھی (کچھ محدود علاقوں اور برادریوں کو چھوڑ کر) بلکہ اس کے برخلاف لڑکے سے رقم لینے کا رواج تھا، جس کا ایک اہم ثبوت مذکورہ بالا فقہی نصوص اور فتاوی ہیں۔ اور غالباً پچاس ۔۔۔ یا اس سے زیادہ عمر کے لوگ ابھی اس بات کو بھولے نہ ہوں گے کہ لڑکے کی شادی ہندوستان کے اکثر خطوں میں، ایک مسئلہ (...) ہوتی تھی، لڑکی کی نہیں، اسی لیے مذکورہ بالا فتاوی میں لڑکی، یا اس کے اولیاء سے رقم کا مطالبہ کرنے کی بابت کوئی فتوی بمشکل ہی ملتا ہے (بتانے کی ضرورت نہیں کہ علماء کے فتاوی زمانہ کے رجحان و رفتار کا سچا آئینہ ہوتے ہیں۔)

علماء و مصلحین کی ذمہ داری

لیکن اب ہندوستان کے مسلمان، بالخصوص حیدرآباد، بہار، یوپی وغیرہ کے لوگ اس رسم بلکہ وبا میں اس طرح گرفتار ہیں کہ اس سے نجات اور چھٹکارے کی کوئی راہ نظر نہیں آ رہی ہے، اور اس کی وجہ سے ہولناک مشکلات میں مبتلا اور خطرناک اندیشوں سے دوچار ہیں، اس لیے علماء و مصلحین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی سی پوری کوشش اس قبیح رسم کو اکھاڑ پھینکنے کی کریں، جو فطرتِ انسانی کے لحاظ سے بھی نامعقول ہے، اور شرعی اصول سے بھی نہایت ناپسندیدہ و مکروہ، اس کی شرعی حیثیت جاننے کے لیے تو تنہا وہی فقہی نصوص و فتاوی کافی ہیں جو اوپر ذکر میں آئے، کیونکہ اصل صورتِ مسئلہ یہاں بھی وہی ہے جو وہاں ہے، اس فرق کے ساتھ کہ وہاں "ناکح" سے رقم طلب کی جاتی تھی، جس کے کسی درجہ میں جواز کی بظاہر گنجائش نظر آتی لگتی تھی، اور شاید اسی لیے قدیم فقہا نے جس صراحت و تاکید سے یہ مسئلہ بیان کیا ہے، اتنی قوت سے اس کی معکوس صورت کا نہیں کیا کہ جس سے ہم آج کل دوچار ہیں، یعنی منکوحہ (یا اس کے والدین سے) رقم کا مطالبہ کیونکہ اس کا بھی حکم ان ہی نصوص و فتاوی سے نسبتہً بآسانی معلوم ہو سکتا ہے، یعنی جب لڑکے سے مطالبہ کرنا حرام ہے تو لڑکی سے مطالبہ کرنا بطریق اولیٰ حرام ہوگا ایسے مطالبہ کی بنیاد پر ملنے والی رقم شرعاً "رشوت" ہوگی جس کا لینا دینا اور اس کے لیے واسطہ بننا سب حرام ہے، اور از روئے حدیث ایسے سب لوگ ملعون ہوتے ہیں[3] اس لیے اس کا واپس کرنا شرعاً واجب ہے

---

[1] دیکھئے حجۃ اللہ ص ۱۴۲ مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ ۱۳۵۲ھ (باب تدبیر المنزل) [2] قرآن مجید کی متعدد آیات (مثلاً أن تبتغوا باموالکم ..... فآتوھن أجورھن (سورۃ النساء آیت ۲۴) بما أنفقوا من اموالھم (نساء آیت ۳۴) اس پر صراحۃً دلالت کرتی ہیں۔ [3] "کشف الخفاء" میں یہ حدیث ج ۲ ص ۲۴۲ پر بایں الفاظ مذکور ہے۔ "لعن اللہ الراشی والمرتشی والرائش" رواہ أحمد بن منیع عن ابن عمرو وسندہ حسن وفی الباب عن عبد الرحمن بن عوف وعائشۃ وأم سلمۃ وآخرین وروی الطبرانی عن ابن مسعود انہ قال "الرشوۃ فی الحکم کفر وھی فی الناس سحت،
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جیسا کہ "قنیہ" کے حوالے سے علامہ شامی نے نقل کیا ہے[1]

جہیز کا مطالبہ حرام، اس پر علما کا اتفاق

"وفی القنیۃ الرشوۃ یجب ردھا ولا تملک" (ص ۲۲۹/۴)، قنیہ (فقہ کی معتبر کتاب) میں ہے کہ رشوت کا واپس کرنا ضروری ہے کیونکہ لینے والا مالک نہیں بنتا "رشوۃ" کے معنی اس سے پہلے "مجمع البحار" کے حوالے سے گزر چکے ہیں کہ حیلہ بازی سے کام نکالنے کے لیے (مال کو) ذریعہ بنانا "وصلۃ الی الحاجۃ بالمصانعۃ" نقد رقم کی طرح سامان کی فرمائش بھی اسی حکم میں آتی ہے یعنی "جہیز" مانگنے کا بھی شرعاً یہی حکم ہے، خلاصہ یہ کہ لڑکے (یا اس کے اولیاء) کی جانب سے لڑکی (یا اس کے اولیاء) سے اس طرح کا جو بھی بوقتِ نکاح، یا نکاح سے پہلے، مطالبہ ہوگا، وہ شرعاً غلط اور ناجائز ہوگا، اور اس مطالبہ کے نتیجہ میں[2] جو کچھ لڑکی (یا اس کے اولیاء) کی طرف سے لڑکے کو یا اس کے عزیزوں کو دیا جائے گا، وہ مال حرام (رشوۃ) ہوگا اگر اس کا نام "ہبہ" رکھ لیا جائے تو فقہی اصطلاح میں یہ ہبہ باطل ہوگا، اس لیے اس مال کا استعمال بھی، لینے والے کے لیے حرام ہوگا، اس مسئلہ کے لیے اگرچہ مزید حوالوں اور فقہی نظائر کی ضرورت تو مذکورہ بالا تفصیلات کے بعد نہیں معلوم ہوتی لیکن توضیح مزید کے لیے چند حوالے اور ذکر کیے جاتے ہیں، (جو صراحۃً "لڑکی" سے مطالبہ کے سلسلہ میں ہیں)

قدیم علماء کے فتوے

مثلاً حنفی فقہ کی معتبر ترین کتاب "فتاویٰ قاضی خاں" میں ہے،

(کتاب النکاح۔ فصل فی النکاح علی الشرط)

امرأۃ طلقہا زوجہا فأرادت أن یتزوجہا الزوج، فقال الزوج لا اتزوجک حتی تھبنی مالک وعلیٰ من المہر فوھبت مہرھا علی أن یتزوجہا، قال ابو القاسم الصفار رحمہ اللہ تعالیٰ الھبۃ باطلۃ، وفی الشرط أولم یف لانہا جعلت المال عوضاً للزوج علیٰ نکاحھا، وفی النکاح لا یکون العوض علی المرأۃ[3]	ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک یا دو، طلاق دی، پھر دوبارہ اسی عورت نے اس طلاق دینے والے شخص سے نکاح کرنا چاہا تو اس نے یہ شرط لگائی اور عورت سے کہا کہ تم پہلے نکاح سے واجب ہونے والا مہر جب تک نہ دو گی (یا ساقط نہ کرو گی) تب تک نکاح نہ کروں گا اس مسئلہ کا حکم۔۔ یہ ہے کہ اگر وہ عورت مہر دے دے گی تب بھی اس کا دینا صحیح نہ ہوگا اور شرعاً یہ ہبہ باطل ہوگا، خواہ وہ وعدہ پورا کرے یا نہ کرے، کیونکہ اس شکل میں عورت پر نکاح کا مالی عوض دینا لازم

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ)، ورواہ احمد والطبرانی والبزار عن ثوبان بلفظ لعن اللہ الراشی والمرتشی والرائش الذی یمشی بینھما" موجودہ زمانہ کے مشہور عالم حدیث شیخ ناصر الدین الالبانی نے حاشیہ مشکوٰۃ میں (اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے (دیکھئے حاشیہ مشکوٰۃ ص ۳۲۹/۲ مطبوعہ دمشق)

[1] رد المحتار ص ۳۰۳/۴ مطبوعہ دیوبند۔ [2] مطالبہ، خواہ صاف لفظوں میں ہو یا اشاروں کنایوں میں یا رواجی طور پر ہو، سب کا حکم یکساں ہے (مزید تفصیل آگے آ رہی ہے)

[3] فتاویٰ قاضی خاں ص ۳۰۳/۱ (مطبع الیشائک لیتھوگرافک۔ طامس بلاک، کلکتہ ۱۸۳۵ء)، عورت پر مالی عوض جائز نہ ہونے اور نکاح میں (عورت کی طرف سے) مال کا ملنا مقصود نہ ہونے کی بات دیگر کتب فقہ مثلاً شامی وغیرہ میں بھی ملتی ہے (دیکھئے دستیاں کی بحث)

آتا ہے حالانکہ شریعت نے عورت پر نکاح کا کوئی مالی عوض عائد نہیں کیا ہے۔

اس مسئلہ میں خاص طور پر یہ امر قابلِ غور ہے کہ ہونے والا شوہر، عورت سے الگ سے کوئی مالی مطالبہ نہیں کر رہا ہے، بلکہ اس شوہر پر سابق نکاح کی وجہ سے جو حق اس عورت کا واجب تھا وہ اس سے صرف اس حق کے ساقط کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے یا اپنی دی ہوئی رقم یا مال واپس لینا چاہتا ہے، اسے بھی فقیہ مذکور جائز نہیں کہتے، لیکن اگر نقد یا سامان کا ہونے والے شوہر کی جانب سے مستقل مطالبہ ہو تو مسئلہ کی سنگینی اور اس کی حرمت میں شدت کتنی بڑھ جائے گی! اس کا اندازہ کسی صاحب علم کے لیے مشکل نہیں، مزید قابلِ توجہ بات اس مسئلہ کی وہ دلیل ہے جس کی بنیاد پر یہ حکم شرعی اخذ کیا گیا ہے یعنی عورت کی طرف سے نکاح کا عوض دیا جانا، جب کہ شریعت نے عورت پر نکاح کا کوئی مالی بدل نہیں مقرر کیا ہے (بلکہ مرد پر کیا گیا ہے) اس اصول و دلیل کو سامنے رکھ کر اس صورت حال کا حکم، جو یہاں زیرِ بحث ہے، اور جس سے ہندوستانی مسلمان آج کل دوچار ہیں۔ بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ یہ صورت قطعاً غیر شرعی ہے اور ایسے مطالبہ کے نتیجہ میں زوج کو (از جانب زوجہ) جو کچھ دیا جائے گا وہ شرعاً درست نہ ہوگا، اور ہبہ باطل ہوگا (جس کے نتیجہ میں حاصل شدہ مال حرام ہوگا) اسی طرح کا ایک مسئلہ فتاویٰ عالمگیری میں بطور قانونِ شرعی ذکر کیا گیا ہے (اہل علم جانتے ہی ہیں کہ فتاویٰ عالمگیری کو ممتاز ترین علماء کی ایک جماعت نے، عالمگیرؒ کی ہدایت و نگرانی میں، اسی لیے مرتب و مدوّن کیا تھا کہ وہ 'قوانینِ شریعت کا معتبر مجموعہ' یا دستورِ اسلامی برائے مملکتِ ہندوستان" قرار پائے، چنانچہ اس میں فقہاء کے مختلف اقوال میں سے قولِ مختار کے اخذ و انتخاب کا التزام کیا گیا ہے) وہ مسئلہ عالمگیری میں اس طرح ہے۔

رجل قال لمطلقته لا أتزوجك ما لم تهبي مالك علي من المهر فوهبت مهرها على ان يتزوجها ثم أبى أن يتزوجها فالمهر باق على الزوج تزوج أو لم يتزوج۔[1]

ایسی ہی عبارت اور اس کا ترجمہ ابھی اوپر گزر چکا ہے، اس میں اور اس میں صرف معمولی فرق ہے، جو اصل مسئلہ پر اثر انداز نہیں ہوتا، البتہ یہاں اصل مسئلہ (ہبہ باطل ہونے) کی وہ حکمت و علت بیان نہیں کی گئی جو اوپر فتاویٰ قاضی خان کی عبارت میں مذکور ہوئی (آگے مزید وضاحت آرہی ہے)

فتاویٰ قاضی خان کی عبارت کی تشریح کے بعد اس عبارت کی وضاحت چنداں ضروری نہیں رہ جاتی کیونکہ جیسا کہ ابھی بیان ہوا۔ اس میں بھی تقریباً وہی مسئلہ بیان کیا گیا ہے، (جزوی فرق کے ساتھ) البتہ یہاں اس حکم کی علت ذکر نہیں کی گئی ہے وہاں ذکر کر دی گئی ہے، علاوہ ازیں مشہور اندلسی مغربی وسیع النظر عالم ابنؒ حزم الظاہری (ف ۴۵۶ھ) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "المحلّٰی" میں واضح طور پر شرعی حکم یہ بتایا ہے کہ عورت کو جہیز دینے پر مجبور کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، نہ مہر کی رقم سے اور نہ کسی دوسرے مال سے، اصل عبارت یہ ہے:۔

---

[1] عالمگیری ص ۳۱۶ج ۱ (طبع ۱۳۱۰ھ)

لا یجوز أن تجبر المرأۃ علی أن تتجهز الیہ بشئ اصلاً لا من صداقها ولا من غیرہ من سائر مالها، والصداق کلہ لها، تفعل فیہ کلہ ما شاءت[1].

عورت کو کچھ جہیز دینے پر مجبور کرنا قطعاً جائز نہیں، نہ مہر کی رقم سے اور نہ اس کے کسی دوسرے مال سے، پورا مہر اسی کا ہے، اور اسے اس پر پورا حق ہے جو چاہے کرے۔

. . . .

جہیز یا نقد رقم کا مطالبہ ہندوانہ رسم:

جیساکہ اوپر عرض کیا گیا یہ صورتِ حال، کہ عورت (مخطوبہ) سے رقم یا سامان کا مطالبہ ہو، کم سے کم مسلمانوں میں، نئی غالباً برادران وطن سے جس طرح اور بہت سی قبیح خطرناک رسمیں لے لی گئیں ہیں ایسی ہی ایک رسم یہ بھی لے لی گئی ہے، اور قدرتی سزا شاید اس کی بنیادی وجہ بھی وہی ہے جو ان کے یہاں ہے، یعنی لڑکیوں کو وراثت میں حصہ نہ دینا، جو بدقسمتی سے مسلمانوں میں بھی رواج پاگیا ہے، حالانکہ دیگر شرعی ورثہ کی طرح لڑکیوں کو بھی۔ ان کے شرعی حصہ کے مطابق وراثت دینا ضروری ہے، کیونکہ قرآن مجید[2] میں اسے "فریضہ" قرار دیا گیا ہے، مگر افسوس کہ اس "فریضہ" کو عام طور پر ترک کیا جا رہا ہے جس کی ایک نقد سزا مسلمانوں کو ــ بعید نہیں کہ جہیز اور تلک کے عذاب کی شکل میں مل رہی ہو۔ یہاں یہ ذکر کرنا شاید نامناسب نہ ہوگا کہ چونکہ مسلمانوں میں یہ نیا رواج ہے اس لیے ہمارے فقہ و فتاویٰ کے اکثر مآخذ اس مسئلہ کی بابت عام طور پر خاموش ہیں، لیکن تلاشِ بسیار کے بعد۔ بہرحال کچھ نظائر مل ہی جاتے ہیں (جن میں سے تین کا حوالہ قدیم ذخیرہ سے ہی نکال کر اوپر پیش کیا جا چکا ہے)، ماضی قریب کے ایک ممتاز فقیہ اور مرکز علوم اسلامیہ دارالعلوم دیوبند کے سابق مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمان صاحب کے مجموعۂ فتاویٰ سے ایک سوال و جواب ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

قریبی زمانہ کے علماء کی آراء

(سوال ۳۷) ایک شخص نے نکاح کی تجویز کی، بعد کو معلوم ہوا کہ لڑکی چھوٹی ہے، پھر اس لڑکی کے عوض دوسری لڑکی تجویز کی، اور لڑکی کے ہمراہ دو سو روپئے دیئے، یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟ یعنی لڑکی بھی دی اور دو سو روپئے بھی، اس سوال کا جواب مفتی صاحب موصوف یہ لکھتے ہیں:

الجواب: "اگر دوسری لڑکی کے اولیاء راضی ہیں تو نکاح درست ہے اور دو سو روپئے لینا حرام ہے، (کیونکہ) یہ رشوت ہے، اس کو واپس کرنا چاہئے"[3]۔ اس جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ صورتِ مسئلہ یہی رہی ہوگی کہ دوسری (بڑی) لڑکی سے شادی کرنے پر لڑکا (یا اس کے اولیاء) اسی شرط پر راضی ہوئے ہوں گے کہ لڑکی (یا اس کے اولیاء) دو سو روپئے یا کوئی معتد بہ رقم دیں اسی لیے یہ رقم دی گئی۔ یا پھر کم سے کم یہ بات تو ضرور ہے کہ مفتی صاحب اس سوال کا مطلب یہی سمجھے تھے،

---

[1] "المحلی" ص ۱۱۹، مکتبۃ الجمہوریۃ العربیہ۔ بحار الازہر۔ مصر ۱۳۹۰ھ / ۱۹۷۰ء　[2] فریضۃ من اللہ، سورۃ النساء آیت ۱۱
[3] فتاویٰ دارالعلوم مدلل و محشیٰ جلد ہفتم صفحہ ۲۱۳

اس طرح بھی بہر حال یہ تو ثابت ہو ہی جاتا ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کے نزدیک اس صورت کا حکمِ شرعی یہی ہے ورنہ بخوشی اور بغیرِ طلب کے اپنی لڑکی۔ یا کسی کو بھی۔ کچھ دینا نہ رشوت ہے نہ حرام، اس لیے اس کا واپس کرنا بھی ضروری نہیں لیکن یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مطالبہ جس طرح "صراحۃً" ہوتا ہے، اسی طرح "دلالۃً (اشاروں کنایوں میں، یا رواج کے طور پر) بھی ہوتا یا ہو سکتا ہے ایسی صورت میں، یعنی غیر صریح مطالبہ کی صورت میں بھی، شریعت کا حکم، مطالبہ والی شکل کا سا ہوگا، (یعنی ایسا مال لینا شرعًا جائز ہوگا، رشوت ہونے کی بنیاد پر)[1] لیکن اگر صریح مطالبہ ہو تو ممانعت کا حکم تب لگے گا، جبکہ غالب گمان یہ ہو کہ جہیز یا نقد کی فلاں... مقدار اگر نہ دی جائے گی تو یہ رشتہ منظور نہیں کیا جائے گا یا رشتہ ہو جانے پر انقطاعِ تعلق یا شدید ایذا رسانی وغیرہ کی شکل پیدا ہونے کا خطرہ ہو۔

لیکن اگر کسی طرف سے کوئی مطالبہ۔ صاف الفاظ یا اشاروں کنایوں میں بھی۔ نہ ہو تو پھر کچھ لینا دینا بالکل جائز ہوگا، بشرطیکہ اس کا مقصد نام و نمود یا اسی جیسی اور کوئی فاسد غرض نہ ہو، اور بخوشی اور بآسانی مہیا کر کے دیا لیا گیا ہو۔[2]

جہیز دینا سنت نہیں ہے

مگر جہیز چاہے ان سب شرطوں کو ملحوظ رکھ دیا گیا ہو جن کا ذکر اوپر آیا، پھر بھی اس نام سے ایسا لین دین جس کا مدت سے رواج چل رہا ہے اسے سنت سمجھنا محلِ نظر ہے، کیونکہ رواجی جہیز میں۔ عمومًا یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ہونے والے داماد کو اس سامان کی ضرورت ہے بھی یا نہیں بلکہ وہ اگرچہ بے حد خوشحال ہو اور اس کا گھر سامان سے بھرا ہو تب بھی جہیز دیا جاتا ہے بعض ناواقف حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا اپنی ایک صاحبزادی حضرت زینبؓ (بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کو ان کی شادی کے وقت "ہار" دینا، جہیز کے سنت ہونے کے لیے سند خیال کرتے ہیں، لیکن یہ سند اور بنیاد بہت زیادہ کمزور ہے، کیونکہ اول تو یہ فعل ام المومنین کا تھا (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں تھا) اور وہ بھی قبل از نبوت زمانہ کا، یعنی جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونا بھی شروع نہیں ہوئی تھی اگر بعثت کے بعد کا یہ واقعہ ہوتا تو بھی محض اتنی سی بات سے جواز ثابت ہوتا (تقریری حدیث کے امکان پر) اس عمل کا سنت ہونا ثابت نہ ہوتا۔

مگر جب یہ معلوم و ثابت ہے کہ یہ واقعہ قبل از بعثت کا ہے تو اہلِ علم جانتے ہی ہیں کہ جواز پر بھی استدلال کی گنجائش نہیں رہ جاتی، چہ جائیکہ سنت ہونے پر۔ یہ الگ بات ہے کہ بغیر کسی صریحی یا غیر صریحی شرط کے اور بلا نام و نمود، بآسانی مہیا کر کے شادی کے موقع پر بھی کچھ دینے کا جواز دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے۔

---

[1] مشہور قاعدہ فقہیہ "المعروف کالمشروط" (شامی ص ۶۵۲/۲) کی بنا پر[2] اس حکم کا ایک ماخذ، وسیلۂ احمدیہ نامی معتبر کتاب کی یہ عبارت ہے "بناءً علی عدم رضاۂ علی تقدیر عدمہ" جو اوپر مجموعۂ فتاویٰ مولانا عبدالحیؒ" کے حوالہ سے تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے۔

[2] اس طرح کہ جہیز دینے کا ذکر قدیم زمانہ سے ملتا ہے، جس کا پتہ فقہی کتابوں سے بھی چلتا ہے مثلاً دیکھئے بدائع الصنائع للکاسانی ج ۲ ص ۳۰۹،۳۰۴ (مطبوعہ شرکۃ المطبوعات العلمیہ، مصر ۱۳۲۷ھ) اور جامع الفصولین ج ۱ ص ۲۹۶ لابن قاضی سماوہ (الطبعۃ الاولیٰ بالمطبعۃ الازہریۃ)

ابوالعاص سے حضرت زینبؓ کی شادی جس میں ہار دیا گیا تھا۔ کا قبل از نبوت ہونا، دوسری تیسری ہجری کے معروف و مستند مؤرخ، عبدالملک بن ہشام المتوفی ۲۱۳ھ یا ۲۱۸ھ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "سیرۃ ابن ہشام" میں زیر عنوان "سبب زواج ابی العاص من زینب" اس طرح بیان کیا ہے:

کان ابوالعاص من رجال مکۃ المعدودین مالا وامانۃ وتجارۃ... وکان خدیجۃ خالتہ فسألت خدیجۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یخالفھا وذلک قبل ان ینزل علیہ الوحی، فزوجہ، فلما اکرم اللہ رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم بنبوتہ آمنت بہ خدیجۃ وبناتہ . وثبت ابوالعاص علی شرکہ"

(سیرۃ ابن ہشام ص۶۵۱-۲ بتحقیق مصطفیٰ السقا وغیرہ)

"ابوالعاص، تجارت، امانت اور دولت میں، مکہ کے چند ممتاز لوگوں میں سے تھے ... اور حضرت خدیجہؓ ان کی خالہ تھیں چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے خود ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپؐ ابوالعاص سے (زینب کی) شادی کردیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہؓ کی رائے کے خلاف نہیں کرتے تھے، اور یہ واقعہ آپؐ پر وحی نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ جب آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت سے سرفراز فرمایا تو حضرت خدیجہؓ اور آپؐ کی تمام بیٹیاں ایمان لے آئیں... مگر ابوالعاص شرک پر قائم رہے"؛ (پھر خاصی مدت کے بعد وہ بھی ایمان لے آئے)

علاوہ ازیں مشہور حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی نے صحابہ کے احوال پر اپنی مستند ترین کتاب "الاصابہ" میں ابوالعاص کے تذکرہ میں جو انداز اختیار کیا ہے اس سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے (دیکھئے الاصابہ ص۲۴۴ ج۷)

مزید براں یہ کہ حضرت زینبؓ کی چھوٹی بہن حضرت ام کلثوم کے نکاح کے بارے میں متعدد اہل سیر نے لکھا ہے کہ وہ بھی قبل از نبوت ہوا تھا، مثلاً حافظ ابن عبدالبر اور زرقانی نے بیان کیا ہے، دیکھئے زرقانی شرح مواہب ص۱۹۵ ج۳ اور عصر حاضر کے نامور محقق سیرت نگار حضرت العلامہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور زمانہ "سیرۃ النبی" جلد دوم تقطیع کلاں ص۳۴۰ طبع اول ۱۹۲۰ء) میں حضرت زینبؓ کی دوسری چھوٹی بہن حضرت رقیہؓ کی شادی کا بھی، ابن سعد کے حوالہ سے قبل از نبوت ہونا بیان کیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب دو چھوٹی بہنوں کی شادیوں کا بھی قبل از نبوت ہونا ثابت ہے تو پھر بڑی بہن کی شادی کا قبل از نبوت ہونا اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ "جہیز" کے سنت ہونے کا شبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ان کی شادی کے وقت کچھ گھریلو سامان مہیا کیے جانے کے واقعہ کی بنا پر بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا چار بیٹیوں میں سے صرف ایک بیٹی حضرت فاطمہؓ کو گھریلو سامان دینا اس غرض سے تھا کہ حضرت علیؓ کی مستقل علاحدہ سکونت کا انتظام نہ تھا، تو ظاہر ہے کہ گھریلو سامان کی موجودگی کا بھی کوئی سوال نہیں تھا، علاوہ ازیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سرپرست بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے[۱] اگر اس موقعہ پر آپؐ سامان نہ دیتے تو بھی بظاہر اس کا

[۱] جیسا کہ تمام ارباب سیر نے لکھا ہے، مثلاً مشہور محدث و مورخ حافظ ابن عبدالبر کی شہرۂ آفاق (بقیہ اگلے صفحہ پر)

نظم آپ ہی کو کرنا پڑتا۔ ان سب سے بڑھ کر جہیز کے موجودہ طریقہ کے سنت نہ ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ وہ گھریلو سامان جو حضرت فاطمہؓ کو آپؐ نے بوقت رخصتی (یا اس کے بعد) دیا تھا، جسے عوام جہیز دینا کہتے ہیں، وہ خود حضرت علیؓ کی طرف سے فراہم کردہ رقم سے خرید کر دیا تھا، جس کی صراحت اہل سیر نے کی ہے مثلاً "زرقانی" (شرح مواہب) میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو وہ زرہ فروخت کرنے کا حکم دیا جو انھوں نے حضرت فاطمہؓ کو دی تھی، اس کے بعد کا واقعہ "زرقانی" میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا:

فبعتها من عثمان بن عفان بأربعمائة وثمانين درهما. ثم ان عثمان رد الدرع الى علي فجاء بالدرع والدراهم الى المصطفى صلى الله عليه وسلم فدعا لعثمان رضي الله عنه دعوات كثيرة. فجئته بها فوضعها في حجري فقبض منها قبضة. فقال اى بلال... ابتع بها لنا طيبا وفى رواية ابن ابى حثيثة عن علىؓ أمر رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يجعل ثلثه في الطيب ووقع عند ابن مسعود وابى يعلى بسند ضعيف عن على فقال اجعلوا ثلثين في الطيب وثلثا في الثياب وامرهم ان يجهزوها فجعل لها سرير مشروط اى مربوط بالشرائط اى حبال ووسادة من آدم حشوها ليف. الخ

تو میں نے وہ زرہ حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھ چار سو اسی درہم[1] میں فروخت کر دی۔ مگر اس ساری رقم کے ساتھ زرہ بھی حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ کو دے دی، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو بہت زیادہ دعائیں دیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں وہ سب رقم لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔۔ تو آپؐ نے حضرت بلال سے فرمایا کہ اس رقم کے ایک حصہ سے خوشبو خرید لاؤ۔۔۔۔ (ان ہی سے یا کسی اور سے فرمایا) اور ایک حصہ سے کپڑے وغیرہ، اور فرمایا کہ اس سے فاطمہؓ کے لیے سامان مہیا کر دو چنانچہ ایک (خاص قسم کا عربی) بستر اور چمڑے کا تکیہ وغیرہ تیار کروایا گیا۔ الخ

. . . .

علاوہ ازیں ہندوستان کے مشہور و مستند اور وسیع النظر صاحب درس عالم مولانا مفتی عنایت احمد کاکورویؒ اپنی مقبولِ عام سیرت کی کتاب "تواریخ حبیب الٰہ" کی چوتھی فصل میں لکھتے ہیں:۔

(باقی حاشیہ گذشتہ صفحہ کا) کتاب "الاستیعاب" میں ہے، کان ابوطالب ذا عیال کثیر۔ فاخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علیا فضمه الیه ۔۔۔ فلم یزل علی رضی اللہ عنہ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حتی ۔ زوجه من ابنته فاطمةؓ (استیعاب ص ۳۵ ج ۱ مکتبہ نہضۃ، مصر) [1] زرقانی شرح مواہب (باقی ص ۳۳ پر)

"حضرت علیؓ سب دراہم زرہ کی قیمت حضورؐ میں لائے آپؐ نے ایک مٹھی حضرت بلالؓ کو دی کہ ان درموں کی خوشبو فاطمہؓ کے لیے لے آؤ، اور باقی آپؐ نے حضرت ام سلمہؓ کو دے کر فرمایا کہ اس سے جہیز خانہ داری کا سامان بی بی فاطمہؓ کا کر دو ایک پلنگ"... [1]

عجمیوں میں ایک رواج "دستیمان"

شاید اسی سے ماخوذ وہ رواج ہے جو "اعاجم" یعنی غیر عرب باشندوں میں (دستیمان، یا دستفیان" کے نام سے غالباً بعض عرب ملکوں کے اندر) کم سے کم علامہ شامیؒ کے دور تک جاری رہا — اور کیا بعید ہے کہ اب تک رائج ہو۔ جس کا مطلب ان فقہا نے یہ بتایا ہے کہ خاطب (لڑکا) مخطوبہ (منگیتر) یا اس کے اولیا کے پاس مہر کے علاوہ ایک معقول رقم اس غرض سے بھیجتا تھا کہ اس سے مخطوبہ کے "جہیز" کا سامان خریدا جائے پھر اسے بعد نکاح خاطب (شوہر) کے گھر بھیج دیا جائے۔ ایسی صورت میں شوہر کو شرعاً یہ حق پہنچتا تھا کہ "جہیز" نہ لانے کی صورت میں وہ اس منکوحہ کے اولیا سے دستیمان کے بقدر "جہیز" کا مطالبہ کر سکے کیونکہ علامہ شامی کے الفاظ میں وہ دراصل "ہبہ بشرط العوض" ہے، یعنی "دستیمان" کے عنوان سے جو رقم مخطوبہ یا اس کے اولیا) کو بھیجی تھی، وہ اسی کام کے لیے بھیجی تھی (گویا اس رقم سے سامان خریدنے کے لیے ایک طرح کے وکیل کی سی حیثیت ان کی ہوتی تھی) — اس مسئلہ کی سب سے زیادہ تفصیل "قنیہ" اور "بحر الرائق" میں ملتی ہے، وہاں سے لے کر صاحب "درمختار" اور اس کے شارح علامہ ابن عابدین نے اپنی اپنی کتابوں میں کچھ تنقیح اور تجزیہ کے بعد جگہ دی ہے۔[2]

فقہی کتابوں میں 'جہیز'

خلاصۂ کلام یہ کہ شوہر کی بھیجی (دی ہوئی) رقم سے گھریلو سامان خرید کر لڑکی کے ساتھ بھیجنا بھی "جہاز" کہلاتا تھا، لیکن کہاں یہ اور کہاں وہ؟ جس کا رواج آج کل ہندوستان جیسے ملکوں کے مسلمانوں میں پڑ گیا ہے، عرض کرنے کا حاصل یہ ہے کہ فقہ کی کتابوں میں مذکور اس قسم کے مسائل

(باقی حاشیہ گذشتہ صفحہ کا) ص ج ۲ للامام محمد بن عبدالباقی الزرقانی شارح المواہب اللدنیہ للعلامۃ القسطلانیؒ (الطبعۃ الاولیٰ بالمطبعۃ الازہریۃ المصریہ ۱۳۲۵ھ) حضرت فاطمہؓ کے نکاح جہیز وغیرہ کی مزید تفصیل کے لیے دیکھئے راقم الحروف کی کتاب "معاشرتی مسائل" الخ

[1] تواریخ حبیب الٰہ ص ۱۴۲ (مطبع نظامی کانپور)

[2] بحر الرائق، قنیہ، درمختار، شامی وغیرہ مشہور فقہی کتابوں میں اس کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔ علامہ شامی نے اسے اعاجم کا دستور بتایا ہے، فتاویٰ عالمگیری میں یہ لفظ "دست پیماں" استعمال ہوا ہے، جو فارسی لغت ہے، دیکھئے عالمگیری ص ۳۲۸ ج ۱، رد المحتار ص ۳۶۶ ج ۲ و ص ۶۵۳-۶۵۴ ج ۲، قنیہ ص ۸۷-۹۹، بحر الرائق ص ۲۰۰ ج ۳، امام مختار بن محمود الزاہدی (ف ۶۵۸ھ) کی مشہور کتاب "القنیہ" میں ہے: بعث إلى المخطوبة. دستفيان. وزفها الأب بلا جهاز فله أن يطالب الأب بقدر المبعوث جهازاً"، القنیہ ص ۳۴ ج ۱ (مطبوعہ مطبع مہاندیہ، کلکتہ ۱۲۴۵ھ) غالباً ہندوستان میں 'جہیز' اسی 'جہاز' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ بلکہ شکل کے ساتھ یہاں اس کی حقیقت بھی بگاڑ دی گئی ہے۔

ہے، موجودہ جہیز کی جو شکل ہے اس بارے میں، استدلال کرنا کسی طرح درست نہیں (اس کی تفصیل، دلائل کے ساتھ اوپر گزر چکی ہے)

جہیز سے بھی زیادہ تباہ کن رسم

فرائشی جہیز سے بھی بڑھ کر قبیح اور شنیع بلکہ شرمناک وہ رسم ہے، جو "تلک" کے نام (یا دوسرے ناموں) سے بعض جگہ رائج ہے، جس میں واقعۃً شوہر خریدا جاتا ہے، یہ رسم تو ایسی حیا سوز بلکہ انسانیت سوز ہے کہ اس کی مذمت کے لیے الفاظ ملنے مشکل ہیں، مگر یہ رسم ہے کہ "اکاس بیل" کی طرح پھیلتی اور بڑھتی جارہی ہے، اس لیے علمائے امت اور مصلحین کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے، انھیں چاہئے کہ اس کے خاتمہ اور بیخ کنی کے لیے اپنی تمام کوششیں صرف کردیں ورنہ آیت " وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً[1] "، سے جو وعید سامنے آتی ہے اس کا تصور ہی ہر باخبر کو لرزہ براندام کرنے کے لیے کافی ہونا چاہئے۔

اس زہر کا ازالہ ہر ایک پر ضروری

اس قبیح رسم جس کی مذمت کے لیے صحیح الفاظ بھی ملنا مشکل ہیں۔ کی طرف سے غفلت برتنا یا اس بارے میں چشم پوشی سے کام لینا اب کسی طرح مصلحین وعلماء کے لیے گوارہ بلکہ جائز نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے کہ ہر جگہ ہزاروں جوان لڑکیاں خاص طور پر پڑھی لکھی لڑکیاں۔ بن بیاہی بیٹھی ہیں، جن میں سے بعض خودکشی تک کر لیتی ہیں، اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ مرتد بھی ہو جاتی ہیں اگر اس کی طرف فوری توجہ نہیں کی گئی تو اس طرح کے واقعات اور بڑھ جائیں گے، جن کی ذمہ داری سے مسلمان، خاص طور سے بااثر لوگ اور اہل علم نہیں بچ سکیں گے، اس سلسلہ میں "مسلم پرسنل لاء بورڈ" اہم رول ادا کر سکتا ہے کہ اس کے مقاصد میں "اصلاح معاشرہ" بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اس سے بڑھ کر اصلاح کی اور کون سی ضرورت ہوگی۔ نیز ہر جگہ کے باشعور عوام بھی مختلف طریقوں سے اس رسم کی بیخ کنی میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں، مثلاً ایسی شادیوں کا مکمل بائیکاٹ کریں جہاں زیادہ جہیز دیتے یا "تلک" جیسی اور کوئی رسم ہوتے دیکھیں، اور پھر جس جگہ لڑکے یا اس کے سرپرستوں کو لڑکی والوں سے مطالبات کرتے دیکھیں یا سنیں تو ان کے خلاف ایسی فضا بنائیں کہ ان کا معاشرہ میں رہنا دشوار اور کسی لڑکی کا ملنا محال ہو جائے، اس کے علاوہ اجتماعی موقعوں پر، خواہ وہ وعظ ونصیحت کے جلسے ہوں یا کسی اور مقصد سے لوگ اکٹھا ہوئے ہوں، اس مسئلہ کی شرعی وسماجی حیثیت نمایاں کی جائے، اور اس کی حرمت وقباحت ذہنوں میں بٹھائی جائے، اور بتایا جائے کہ اس طرح کے مطالبہ کے بعد جو مال بھی ملے گا وہ شرعاً رشوت ہوگا (دلائل اوپر گزر چکے ہیں) جس کا لینا دینا دونوں حرام ہے (جس طرح سود کا لینا دینا)

---

[1] آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اس عذاب سے ڈرو جو صرف ان ہی لوگوں پر نہیں آئے گا جو گناہوں میں مبتلا ہوئے، بلکہ ان پر بھی آسکتا ہے جو اگرچہ خود تو گناہوں سے بچے رہے مگر گناہ میں مبتلا لوگوں کی فکر نہیں کی، (سورۃ الانفال آیت ۲۵)

مال حرام کے بھیانک نتائج

علامہ شامی نے تو دھیبا کر اوپر گزرا) اس طرح کے مال کو "سحت" کہا ہے "اور ربا" "سحت" (حرام طریقہ سے مال کا استعمال) وہ سنگین جرم ہے، جس کی وجہ سے متعدد جگہ قرآن مجید[1] میں یہود کی شدید مذمت کی گئی ہے، اور اسے قتلِ انبیاء جیسے جرائم کے ساتھ ذکر کرکے انھیں لعنت اور سخت عذاب کا مستحق قرار دیا گیا ہے، اور حدیث شریف میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

لایدخل الجنۃ لحم نبت من السحت وکل لحم نبت من السحت کانت النار اولیٰ بہ[2] رواہ احمد والدارمی والبیہقی)

"سحت" یعنی حرام مال جس نے استعمال کیا ہو اس کے لیے جہنم کی آگ زیادہ مناسب ہے (یعنی ایسا شخص جہنم کو مطلوب ہے۔)

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے،

لایدخل الجنۃ جسد غذی بالحرام[3] (رواہ البیہقی) حرام غذا سے پلا ہوا جسم جنت میں نہیں جاسکے گا۔

مال حرام پوری عمر کی عبادتیں برباد کرنے کا سبب ہے

اور جب تک بھی استعمال کرے گا گناہگار رہے گا، تو کیا کسی مسلمان کی دینی حس اس درجہ مردہ ہو سکتی ہے کہ وہ پوری عمر گناہ اور "حرام" میں مبتلا رہے — یہ بھی بتانا شاید بے محل نہ ہوگا کہ حرام طریقہ سے حاصل شدہ چیزوں کے استعمال سے نماز اور دعا بھی - اللہ کے یہاں - مقبول نہیں ہوتی، حدیث شریف میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من اشتری ثوبا بعشرۃ دراھم وفیہ درھم حرام لم یقبل اللہ صلاۃ مادام علیہ۔

مشکاۃ ص ۲۴۲/۲

اگر کسی نے کوئی کپڑا (مثلاً) دس درہم (تین گرام کے قریب وزنی چاندی کے ایک سکّہ) میں خریدا اور اس میں ایک درہم بھی حرام مال کا ہے تو اس کی اس وقت تک نماز قبول نہ ہوگی جب تک وہ کپڑا جسم پر ہے۔

نیز صحیح مسلم میں ہے:

ان اللہ طیب لا یقبل الاّ طیبا... ثم ذکر الرجل یطیل السفر أشعث أغبر یمد یدیہ إلی السماء یارب یارب ومطعمہ حرام ومشربہ حرام وملبسہ حرام وغذی

اللہ پاک ہے اس لیے پاک (کمائی کی) چیز ہی قبول فرماتا ہے پھر آپ نے ایسے شخص کا (مثالاً) ذکر کیا جو طویل سفر میں ہونے کے باعث خستہ حال ہے اور اللہ تعالی سے ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگ رہا ہے مگر اس کی دعا قبول نہیں ہوتی کیونکہ اس کے کھانے

---

[1] سورۃ النساء آیت ۱۵۵ تا ۱۶۱ و سورۃ المائدہ آیات ۴۲، ۶۲، ۶۳

[2][3] مشکاۃ ص ۲۴۲/۲ و ص ۲۴۳/۲ (مطبوعہ اصح المطابع، دہلی)

بالحرام فاتی یستجاب لذ لکؒ پینے کا سامان اور لباس حرام (کمائی کا) ہے۔

اہم اور قابل غور بات :

کیا کوئی ایسا شخص جسے آخرت پر کامل یقین ہو وہ تمام عمر کی نمازیں برباد کرنے اور خداوند تعالیٰ کے یہاں مسلسل گناہ میں مبتلا رہنے کی حالت میں پیش ہونا گوارہ کرسکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر ایسے۔ تک اور فرمائشی جہیز جیسے۔ مال کے لینے سے اسے اس طرح بچنا چاہیئے جس طرح سانپ بچھو اور دوسرے زہریلے اور خطرناک جانوروں سے بچا جاتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اہتمام ہونا چاہئے کیونکہ زہریلے جانوروں کے اثرات زیادہ سے زیادہ اسی دنیا تک محدود رہتے ہیں، جبکہ "حرام" مال کے خطرناک اثرات اس عالم میں پڑیں گے اس کے بعد اُس عالم تک برقرار رہیں گے جسے آخرت کہتے ہیں (اعاذنا اللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا)

یہاں ایک اور حدیث کا بیان کرنا شاید بے محل نہ ہوگا جس میں فرمایا گیا ہے کہ اس طرح۔ غیر شرعی طریقہ سے حاصل شدہ مال میں برکت نہیں ہوتی یعنی جلد فنا ہو جاتا ہے بلکہ اکثر اپنے ساتھ بہت سے دنیاوی مصائب اور تکالیف بھی لاتا ہے، اور ایسا شخص اگر صدقہ کرتا ہے جو عموماً مصیبتوں کے ٹالنے کا سبب بنتا ہے لیکن اس کا، تو وہ بھی قبول نہیں ہوتا، اور مصیبتیں نہیں ٹلتیں، بلکہ برقرار رہتی ہیں، اور اس کا بھی خطرہ ہے کہ ایسے مال کے استعمال کرنے سے جو اولاد ہو وہ نافرمان اور نالائق ہو، اور اگر ایسا مال مرنے کے بعد تک باقی رہتا ہے تو وہ اپنے پیچھے نہایت خطرناک اثر چھوڑتا ہے، اصل فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح ہے:۔ لا یکسب عبد مال حرام فیتصدق منہ ولا ینفق منہ فیبارک لہ فیہ ولا یترکہ خلف ظہرہ الا کان زادہ الی النار رواہ احمدؒ

اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے کہ وہ اپنی مرضیات پر چلائے اور ہر اس برائی سے بچائے جس کا نتیجہ دنیا و آخرت میں خراب، اور خدا کی ناراضگی کی صورت میں نکلے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

معذرت

ترتیب کی چوک سے "اخبار و افکار" کے کالم کے تحت مضمون "اختیاری سول کوڈ" جنوری ۱۹۸۶ء میں دوبارہ شائع ہوگیا۔ امید کہ آفسٹ طباعت میں ایک زندہ مسئلہ کی حیثیت سے قارئین مکرر کے طور پر اسے گوارا کریں گے (ادارہ)

لہ صحیح مسلم جلد ۱، ص ۳۲۶، مکتبہ رشیدیہ دہلی لہ مشکوٰۃ، جلد ۲، ص ۷۷، (مطبوعہ دمشق)

طاغوت اور اس کی حقیقت

رفیق احمد رئیس احمد سلفی

طاغوت قرآن مجید کا ایک اصطلاحی لفظ ہے۔ یہ قرآن مجید میں آٹھ مقامات پر مختلف آیتوں میں استعمال ہوا ہے[1]
طاغوت کے معنیٰ و مفہوم کا علم انتہائی ضروری ہے کیونکہ یہ اس کتاب کا لفظ ہے جس کا پڑھنا سمجھنا اور جس کے مقتضیات پر عمل کرنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرنے اور طاغوت سے بچنے کا حکم دیں:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (نحل: ۳۶)	ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا اور اس کے ذریعے خبردار کیا کہ لوگو! اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی نے اپنی قوم کو اللہ کی عبادت کرنے اور طاغوت سے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ بات ان کی اولین اور بنیادی تعلیمات میں شامل رہی ہے۔ ظاہر ہے جس بات کی اتنی اہمیت ہو اور جو انبیاء علیہم السلام کے مقاصد میں سرفہرست رہی ہو اس کا علم اور اس کے بارے میں قلبی اطمینان حاصل کرنا کس قدر ضروری ہوگا۔ ذیل کی سطور میں قرآن کے استعمالات اور ممتاز مفسرین وعلمائے کرام کی تشریحات کی روشنی میں طاغوت کے معنیٰ اور اس کے وسیع مفہوم کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

طاغوت مبالغہ کا صیغہ ہے اس کا مادہ طغی و طغیان اور ایک قول کے مطابق طغو، طغوی اور طغوان ہے سب کا مفہوم حد اعتدال سے نکل جانا ہے۔ جو چیز اپنی مناسب حد سے آگے بڑھ جائے، اس کے لیے عربی میں طغی کہیں گے۔ قرآن نے ایک جگہ اس لفظ کو اسی معنیٰ میں استعمال بھی کیا ہے:

إِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَاءُ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ (حاقہ: ۱۱)	جب پانی کا طوفان حد سے آگے بڑھ گیا تو ہم نے تم کو کشتی میں سوار کر دیا۔

امام راغب اصفہانی طغی کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

---

[1] بقرہ: ۲۵۶، ۲۵۷۔ نساء: ۵۱، ۶۰، ۷۶۔ مائدہ: ۶۰۔ نحل: ۳۶۔ زمر: ۱۷

تجاوز الحد فی العصیان [1] نافرمانی میں حد سے تجاوز کر جانا۔

طاغوت کے مادہ طغی کا یہ مفہوم طاغوت کے اندر بھی پایا جاتا ہے چنانچہ امام راغب نے لکھا ہے:

عبارۃ عن کل متعد وکل معبود من دون اللہ [2] طاغوت ہر اس وجود سے عبارت ہے جو حدود بندگی سے نکل جائے اور جس کی اللہ کے سوا عبادت کی جائے۔

امام نووی طاغوت کے بارے میں مشہور ائمہ لغت کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

الطاغوت کل ما عبد من دون اللہ [3] طاغوت ہر وہ چیز ہے جس کی اللہ کے علاوہ عبادت کی جائے

مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی ہے:

"طاغوت طغیان سے ہے جس کے معنی سرکشی کے ہیں کسی کو طاغی (سرکش) کہنے کے بجائے اگر طاغوت (سرکشی) کہا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ انتہا درجے کا سرکش ہے۔ مثال کے طور پر کسی کو حسین کہنے کے بجائے اگر یہ کہا جائے کہ وہ حسن ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خوبصورتی میں درجہ کمال کو پہنچا ہوا ہے معبودان غیر اللہ کو طاغوت اس لیے کہا گیا ہے کہ اللہ کے سوا دوسرے کی بندگی کرنا تو صرف سرکشی ہے مگر جو دوسروں سے اپنی بندگی کرائے وہ کمال درجے کا سرکش ہے۔" [4]

طاغوت کی مندرجہ بالا تشریحات بتا رہی ہیں کہ اس کا اطلاق دو مختلف چیزوں پر ہوتا ہے۔ ایک وہ جو اللہ کے خلاف سرکشی و بغاوت اختیار کرے اور دوسرے وہ جو سرکشی و بغاوت کا باعث بنے۔ ان تشریحات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اپنے مفہوم میں بالکل عام ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ اشجار و احجار، اصنام و اوثان کاہن و ساحر وغیرہ جو بھی معبود بنائے گئے ہیں وہ سب اس عموم کے اندر شامل ہیں۔ اسی طرح خدا کے احکام و قوانین سے انسانوں کو پھیرنے اور ان سے بغاوت کرنے پر آمادہ کرنے والے بھی طاغوت کے مفہوم میں آتے ہیں چاہے یہ لوگ خود اپنے احکام و قوانین کا پابند بنانے کا فرض انجام دے رہے ہوں یا دوسرے افکار و نظریات کو ملمع سازی کے ذریعہ خدائی قانون سے بالاتر ثابت کر کے اس کی اطاعت پر لوگوں کو ورغلانے والے ہوں۔

بعض لوگوں نے اس لفظ کے معنی و مفہوم کو محدود کر دیا ہے ان کا کہنا ہے کہ اس سے مراد شیطان، ساحر، کاہن اور بت ہیں۔ لیکن اس لفظ کو ان معانی کے اندر محدود کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے یہ معانی اس کے اندر شامل ضرور ہیں لیکن انہی کے اندر یہ لفظ منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کی واضح دلیل تو قرآن کے اپنے استعمالات ہیں اس نے ہر جگہ اس لفظ کو عام رکھا ہے اور اکثر جگہ اللہ کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے جس کا

---

[1] المفردات، مادہ الطاء مع العین [2] حوالہ سابق [3] شرح مسلم للنووی جلد اول۔ کتاب الایمان باب اثبات رؤیۃ المومنین فی الآخرۃ ربہم [4] تفہیم القرآن ۱/ ۲۶۵ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۶۹ء

مطلب ہے کہ غیر اللہ پر اس کا اطلاق عام ہے۔ چاہے وہ کوئی شیطان ہو، انسان ہو، بت ہو یا ساحر اور کاہن ہو، سب اس کے اندر شامل ہیں۔

مفسرین کے سرخیل امام ابن جریر طبریؒ لکھتے ہیں:

اختلف اهل التاويل في معنى الطاغوت فقال بعضهم هو الشيطان.... وقال آخرون الطاغوت هو الساحر.. وقال آخرون بل الطاغوت هو الكاهن والصواب من القول عندي في الطاغوت انه كل ذي طغيان على الله فعبد من دونه اما بقهر منه لمن عبده واما بطاعة ممن عبده انسانا كان ذلك المعبود او شيطانا او وثنا او صنما او كائنا ما كان من شيء [1]	طاغوت کے معنی میں اہل تاویل نے اختلاف کیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس سے مراد شیطان کو لیا ہے اور کچھ لوگ اس کا معنی ساحر بتاتے ہیں، بعض لوگوں نے کاہن کو مراد لیا ہے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ ہر وہ ہستی طاغوت ہے جو اللہ کے خلاف سرکشی کا رویہ اختیار کرے اور اللہ کے علاوہ جس کی بندگی وعبادت کی جائے۔ خواہ عبادت کرنے والا اس کے قہر سے مجبور ہو کر اس کی بندگی کرے یا اپنی رضا ورغبت سے اس کی اطاعت کرے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ معبود کوئی انسان ہو یا شیطان بت ہو یا مجسمہ یا کوئی اور چیز۔

امام موصوف کی اس وضاحت سے طاغوت کے وسیع مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔ آپ کے نزدیک جہاں شیطان یا بت طاغوت ہیں وہیں انسان بھی طاغوت ہے۔ ایک دوسری حیثیت سے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پوری انسانی تاریخ میں ہمیشہ انسانوں ہی نے طاغوت کا منصب سنبھالا ہے کیونکہ کسی بت یا دوسری معنوی چیزوں کو معبود کا درجہ اس وقت ملا ہے جب کچھ انسانوں نے ان کو خدائی صفات سے متصف قرار دے کر ان کو خدا کے منصب پر فائز کر دیا ہے۔ اسی طرح ساحر اور کاہن اگرچہ لوگوں کو زبردستی اپنا تابعدار نہیں بناتے لیکن لوگوں کے وہمی مزاج سے فائدہ اٹھا کر وہ غیر شعوری طور پر ان کے معبود بن بیٹھتے ہیں۔

ابتدائے آفرینش ہی سے انسانوں سے یہ مطالبہ کیا جاتا رہا ہے کہ وہ جس ہستی کو اپنا خالق اور قاضی الحاجات سمجھتے اسی کی اطاعت وبندگی زندگی کے تمام شعبوں میں کریں۔ اپنے معاملات کو اس قانون کے مطابق طے کریں جو ان کو خدا کی جانب سے ملا ہے لیکن انسان نے اپنی خواہشات اور دوسرے اسباب وعوامل کی وجہ سے اس جامع تصور کو یا تو ذہنوں سے نکال دیا ہے یا اس نے زندگی کے محدود اور تنگ دائرے میں اس تصور کے مقتضیات پر عمل کیا ہے۔ نوع انسانی کی یہ گمراہی قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔ قرآن نے اس رویہ کا سخت نوٹس لیا ہے اور اس نے یہ حکم دیا ہے کہ ہمارے

[1] جامع البیان فی تفسیر القرآن لابن جریر الطبری ۱۳/۳، المطبعۃ المیمنیۃ مصر ۱۳۲۱ھ

ماننے والے زندگی کے تمام معاملات میں صرف اسی قانون کی اتباع کریں جو خدا کی جانب سے دیا گیا ہے۔ اور اپنی زندگی کو بغیر کسی ترجیح و تخصیص کے اسلام کے حوالہ کر دیں،

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً۔ (بقرہ: ۲۰۸)

اے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

بعض کمزور ایمان کے لوگ اس معیار پر پورے نہیں اترتے تھے اور ان سے اس کے خلاف حرکات صادر ہو رہی تھیں تو قرآن نے اس پر تنبیہ کی اور بتایا کہ جو لوگ خدا اور رسول کے قانون کو حکم بنانے کے بجائے دوسروں کو اپنا حکم تسلیم کرتے ہیں وہ طاغوت کے قانون کی اتباع کرتے ہیں۔ قرآن نے سورۂ نساء میں اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے اس سے طاغوت کی حیثیت اور اس کے مفہوم و مراد پر بھی بخوبی روشنی پڑتی ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا

(نساء، ۶۰)

اے نبیؐ، تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انھیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔

اس آیت کریمہ کا مفہوم اور عملی زندگی پر اس کا انطباق اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کا شان نزول نہ معلوم کر لیا جائے۔ مفسرین نے اس کا جو شان نزول بیان کیا ہے وہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ کے الفاظ میں درج ذیل ہے،

ایک منافق جس کا نام بشر تھا۔ اس کا کسی یہودی سے جھگڑا ہوا۔ یہودی نے کہا چلو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان سے فیصلہ کرا دیں۔ منافق نے کہا کہ کعب بن اشرف کے پاس چل، یہ یہود کا ایک سردار تھا۔ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں حق پر یہودی ہوگا۔ اس نے جانا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کی رعایت نہ فرمائیں گے وہاں حق فیصلہ ہوگا گو میں آپ سے مذہبی مخالفت رکھتا ہوں منافق چونکہ باطل پر تھا اس نے سمجھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں تو میری بات چلے گی نہیں گو میں ظاہراً مسلمان ہوں مگر کعب بن اشرف خود کوئی حق پرست نہیں وہاں میرا مقدمہ سرسبز ہو جائے گا پھر آخر وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پاس مقدمہ لے گئے آپ نے یہودی کو غالب کیا وہ منافق راضی نہ ہوا اس یہودی سے کہا کہ چلو حضرت عمرؓ کے پاس غالباً وہ یہ سمجھا ہوگا کہ حضرت عمرؓ کفار پر سخت ہیں

اس یہودی پر سختی فرمائیں گے۔ یہودی کو اطمینان تھا کہ گو سخت ہیں مگر وہ سختی حق پرستی ہی کی وجہ سے تو ہے جب میں حق پر ہوں تو مجھ کو ہی غالب رکھیں گے اس لیے اس نے انکار نہیں کیا۔ جب وہاں پہنچے تو یہودی نے سارا قصہ بیان کر دیا کہ یہ مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجلاس سے فیصل ہو چکا ہے مگر یہ شخص (منافق) اس پر راضی نہ ہوا آپ نے اس منافق سے پوچھا کیا یہی بات ہے اس نے کہا ہاں، حضرت عمرؓ نے فرمایا: اچھا ٹھہرو آتا ہوں اور گھر سے ایک تلوار لے کر آئے اور منافق کا کام تمام کیا اور کہا جو شخص رسول کے فیصلہ پر راضی نہ ہوا اس کا یہ فیصلہ ہے[1]

اس شان نزول سے معلوم ہوا کہ زیر بحث آیت میں طاغوت سے مراد کعب بن اشرف ہے دوسری روایت میں حی بن اخطب کا نام آتا ہے۔ ان کے طاغوت ہونے کی جو وجہ قرآن سے سمجھ میں آتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ یہ لوگ کتاب و سنت پر یقین رکھتے تھے اور نہ اللہ کے آخری رسول کی تصدیق کرتے تھے بلکہ اس کی مخالفت کرنے اور اسے جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی ہر وقت سازشیں کرتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے اس حالت میں ان سے کسی صحیح فیصلہ کی توقع کرنا بے سود تھا۔ اس آیت سے انسان کا طاغوت ہونا عیاں ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

زیر بحث آیت کریمہ کی جو تفسیر حافظ ابن کثیر نے کی ہے اس سے بھی اس معاملہ کی نوعیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

هذا انكار من الله عز وجل على من يدعي الايمان بما انزل الله على رسوله وعلى الانبياء الاقدمين وهو مع ذلك يريد ان يتحاكم في فصل الخصومات الى غير كتاب الله وسنة رسوله كما ذكر في سبب نزول هذه الآية .... والآية اعم من ذلك كله فانها ذامة لمن عدل عن الكتاب والسنة وتحاكموا الى ما سواهما من الباطل وهو المراد بالطاغوت هنا[2]

اس آیت میں خدا کی جانب سے اس شخص کا انکار کیا گیا ہے جو اللہ کی طرف سے اس کے آخری رسولؐ اور انبیاء سابقین پر نازل کی گئی تمام باتوں پر ایمان لانے کا دعویٰ کرنے کے باوجود مقدمات کے فیصلہ کے لیے غیر کتاب و سنت کو حکم بنانا چاہتا ہے جیسا کہ اس آیت کے شان نزول میں ذکر کیا گیا ہے۔ ... مگر یہ آیت ان تمام باتوں سے عام ہے یہ آیت ہر اس شخص کی مذمت کرتی ہے جو کتاب و سنت سے اعراض کرے اور ان کے سوا کسی باطل کو اپنا حکم بنائے یہاں طاغوت سے مراد یہی ہے۔

---

[1] بیان القرآن، ۱۲۸/۲

[2] مختصر تفسیر ابن کثیر ۴۰۹/۱، دار القرآن الکریم۔ بیروت ۱۹۸۱ء

ابن کثیرؒ کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ قرآن وسنت کو حکم بنانے کے بجائے کسی دوسرے شخص کو حکم بنانا طاغوت کو حکم بنانا ہے۔ اس لحاظ سے ایک انسان بھی طاغوت ہوسکتا ہے جو اپنا وضعی قانون لوگوں پر نافذ کرے اور وہ جماعت بھی طاغوت ہوسکتی ہے جو کتاب وسنت سے بے نیاز ہوکر عوام پر اپنا حکم چلائے۔

علامہ رشید رضا مصریؒ کی درج ذیل تشریح سے بھی طاغوت کا یہ وسیع مفہوم نکھر کر سامنے آجاتا ہے:

وهو كل ما تكون عبادته والايمان	طاغوت ہر وہ وجود ہے جس کی عبادت اور جس پر ایمان طغیان
به سبباً للطغيان والخروج عن الحق	وسرکشی اور حق سے انحراف کا باعث ہو قطع نظر اس سے
من مخلوق يعبد ورئيس يقلد	کہ وہ کوئی مخلوق ہو جس کی عبادت کی جارہی ہو یا لیڈر ہو
وهوى يتبع [1]	جس کی اندھی تقلید کی جارہی ہو یا خواہش نفس ہو
	جس کی اتباع کی جارہی ہو۔

علامہ ابن القیم الجوزیہؒ نے طاغوت کی جو تشریح کی ہے وہ بھی لائق مطالعہ ہے:

والطاغوت كل ما تجاوز به العبد حده	طاغوت ہر اس وجود کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے بندہ اپنی
من معبود او متبوع او مطاع فطاغوت	حد سے تجاوز کر جائے خواہ وہ معبود ہو یا متبوع ہو یا مطاع
كل قوم من يتحاكمون اليه غير الله	ہو ہر قوم کا طاغوت وہ ہے جس کے پاس وہ اللہ اور رسول
ورسوله او يعبدونه من دون الله	کے علاوہ فیصلہ کرانے جاتی ہے یا اللہ کے علاوہ جس کی پرستش
او يتبعونه على غير بصيرة من الله او	کرتی ہے یا بغیر خدائی بصیرت کے جس کی اتباع کرتی ہے
يطيعونه فيما لا يعلمون انه طاعة	یا جس کی ان امور میں اطاعت کرتی ہے جن کے بارے
لله. فهذه طواغيت العالم اذا تاملتها	میں اسے یہ علم نہیں ہوتا کہ وہ اللہ کی اطاعت ہیں۔ یہ ہیں
وتاملت احوال الناس معها رايت	اس دنیا کے طاغوت اگر تم اس مفہوم پر اور لوگوں کے
اكثرهم من عبادة الله الى عبادة	حالات پر غور کروگے تو دیکھوگے کہ اکثر لوگ اللہ کی عبادت
الطاغوت، وعن التحاكم الى الله والى	کرنے کے بجائے طاغوت کی عبادت کرتے اور اللہ اور
الرسول الى التحاكم الى الطاغوت وعن	رسول سے فیصلہ کرانے کے بجائے طاغوت کی اطاعت
طاعته ومتابعة رسوله الى طاعة	اور تابعداری کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس امت کے کامیاب
الطاغوت ومتابعته وهؤلاء لم يسلكوا	اور فائز المرام گروہ یعنی صحابہ وتابعین کے راستہ پر نہیں
طريق الناجين الفائزين من هذه	چلتے اور نہ اپنا مقصد وہ بناتے ہیں، جو ان کا مقصد تھا

[1] تفسیر المنار ۳/۳۷، ۴/ ۱۵۷

الامة وهم الصحابة ومن تبعهم ولا قصد واقصدهم بل خالفوهم فى الطريق والقصد معاً[1] . . . . . .

بلکہ منہج اور مقصد دونوں میں ان کی مخالفت کرتے ہیں۔

. . . .

علمائے امت اور مفسرین کرام کی مندرجہ بالا تشریحات سے صاف واضح ہے کہ قرآن نے اللہ کی بندگی کے بالمقابل طاغوت کی جس بندگی کا تذکرہ کیا ہے، اس کا دائرہ جملہ معاملات زندگی تک وسیع ہے۔ ہر وہ شخص جو خدا اور رسول پر ایمان رکھتا اور قرآن کو برحق جانتا ہے وہ بندگی رب کا حق اسی وقت ادا کر سکتا ہے جبکہ وہ اپنے تمام معاملات میں بے لاگ طریقے پر خدا اور رسول کے احکام کی پیروی کرنے والا ہو۔ اس سے ہٹ کر وہ جو راستہ بھی اپنائے گا وہ طاغوت کا راستہ ہو گا۔

---

[1] اعلام الموقعین عن رب العالمین ۱/۴۱ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر

نظام امارت کی بحالی

مسلمان خلافت و امارت کا نظام قائم کرنے کے شرعی طور پر مکلف ہیں اور اس میں کوتاہی اور سہل انگاری ان کو گنہگار کر سکتی ہے، حدیث و فقہ کی کتابوں اور اسلام کی روح اور اس کے مقاصد کے صحیح فہم کا بھی یہی تقاضا ہے، اس موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہؒ کی کتاب 'ازالۃ الخفاء' اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی کتاب 'منصب امامت' کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔ پہلے کے مسلمان اس بات کے روادار نہیں تھے اور اس کو بہت بری بات سمجھتے تھے کہ ان کا کوئی مختصر وقفہ بغیر خلافت و امارت کے گزر جائے، چنانچہ مسلمان مورخین جب کسی نئے سال کے آغاز کا ذکر کرتے ہیں تو اس طرح لکھتے ہیں کہ نیا سال شروع ہو گیا اور مسلمان اب تک بلا خلیفہ کے ہیں۔ اگر وہ اس زمانہ میں ہوتے اور اس طویل مدت کو دیکھتے جو بغیر خلافت و امارت ہی کے نہیں بغیر کسی احساس و شعور اور فکر کے گزر رہی ہے تو ہمارے متعلق کیا رائے قائم کرتے؟

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

ارکان اربعہ ص ۱۹۱

طبع چہارم ۱۹۷۶ء مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

تراجم و اقتباسات:

آؤ پھر عہد وفا تازہ کریں

کمال الدین کمال سالار پوری

کل سارے دن بخار میں مبتلا رہا سینہ میں درد بھی تھا اور بعض اوقات درد اتنی شدت اختیار کر لیتا تھا کہ سانس لینا بھی مشکل تھا. میرے سرہانے مختلف موضوعات کی کتابیں پڑی تھیں اُن میں ایک کتابچہ "دستور جماعت اسلامی..." بھی تھا. اسے دیکھتے ہی بے ساختہ اٹھالیا اور ورق گردانی کرتا ہوا عہد رکنیت تک پہنچا جس کے الفاظ یہ تھے۔

۱. میں اللہ رب العالمین کو گواہ کر کے اقرار کرتا ہوں کہ میں نے جماعت اسلامی کے عقیدے کو اس کی تشریح کے ساتھ اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور اسے سمجھنے کے بعد پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ شہادت دیتا ہوں کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

۲. میں نے جماعت اسلامی کے نصب العین کو اس تشریح کے ساتھ اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور اسے سمجھنے کے بعد اقرار کرتا ہوں کہ دنیا میں اللہ کے دین کو قائم کرنا میری زندگی کا نصب العین ہے اور اسی نصب العین کے حصول کی سعی کے لیے میں خالصتاً للہ جماعت اسلامی میں داخل ہو رہا ہوں. اور اس کام میں میرے پیشِ نظر اللہ کی رضا اور فلاح اخروی کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔

۳. میں نے دستورِ جماعت اسلامی کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور عہد کرتا ہوں کہ اس دستور کے مطابق نظام جماعت کی پوری پابندی کروں گا. آمین۔

اس عہد کو پہلے بھی پڑھا تھا اور دوسرے ارکان سے بھی پڑھا تھا اور دوسرے ارکان سے بھی پڑھوایا تھا لیکن جو کیفیت اسے پڑھ کر آج طاری ہوئی وہ صرف ۱۹۵۴ء میں طاری ہوئی تھی اس کے بعد نہیں ـــــ عہد رکنیت کے الفاظ نے ہلا کر رکھ دیا. شدت احساس نے دل و دماغ ماؤف کر دیئے. میں نے جماعت کے سامنے اللہ کو گواہ کر کے عہد کیا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں. لیکن میں نے تو اپنی خواہشات کے بت بھی اپنی آستینوں میں چھپا رکھے ہیں. میرے تو دعوائے توحید کے دامن میں آرزوؤں کے کئی الٰہ طلبگارِ سجدہ ہیں. میں نے تو ہر شرک سے برأت کا دعویٰ کیا تھا مگر میرے تو شعور

وذہن کے متعدد گوشے کمالِ آذری کے عجائب گھر بنے ہوئے ہیں۔ میں نے تو جماعت اسلامی کے نصب العین کو سمجھ لینے کا یقین دلایا تھا اور عہد کیا تھا کہ یہی نصب العین آج سے میری زندگی کا نصب العین ہوگا۔ مگر میرا نصب العین تو آج میرا روزگار، میری تجارت، میری ملازمت، میری کاشتکاری، میری مزدوری، میری عزت وعظمت، میری دولت وثروت، میری برادری، میری قوم اور میری جاہ ومنزلت بن چکا ہے۔

میں نے تو اس نصب العین کے لیے ہر قسم کی قربانی اور ایثار وفدویت کا وعدہ کیا تھا مگر میں تو اب اس نصب العین کی بات بھی نہیں کرتا۔ میں تو اس نصب العین کی فریاد بھی سننے کو تیار نہیں۔ میں تو اس نصب العین کے لیے اپنے وقت کا تھوڑا سا حصہ بھی دینے کو تیار نہیں، میں نے تو اس نصب العین کی طرف تمام انسانوں کو بلانے کا ذمہ لیا تھا مگر میں تو اب اپنے عزیزوں کو بھی اس سے متعارف کرانے کے لیے وقت نہیں دے سکتا۔ میں نے تو اس نصب العین کے لیے دیوانوں کی طرح کام کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر میں تو اس کے لیے فرزانوں کی طرح بھی کام نہیں کر رہا۔ میں نے تو اس نصب العین کو اپنی زندگی کا واحد مقصود قرار دیا تھا مگر میں نے تو اب اسے بہت سے مقاصد سے پیچھے بٹھا دیا ہے۔ میں نے تو اس نصب العین کو رضائے الٰہی کا ذریعہ تعین کیا تھا۔ مگر میں تو اب اپنے عمل سے یہ ثابت کر رہا ہوں کہ اب رضائے الٰہی سے زیادہ مجھے کچھ اور مطلوب ہے۔

میں نے تو خدا کے دین کو غالب کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر میں تو اب اپنے دھڑ کو بھی بچانا چاہتا ہوں اور سر کو بھی۔ میں نے تو اس دین کے لیے وقت اور مال اور پھر جان تک دینے کا تہیہ کیا تھا۔ مگر میں تو اب سب کچھ بچانے کے لیے کوشاں ہوں۔ میں نے تو خدا کے دین کو غالب کرنے کے لیے اپنی تمام جسمانی وذہنی اور فکری توانائیاں صرف کر دینے کا عہد کیا تھا۔ مگر میری جسمانی وذہنی توانائیاں تو اب غلبۂ دین کی جگہ اپنا دنیوی مستقبل سنوارنے کے لیے صرف ہو رہی ہیں۔ میں نے تو خدا کی رضا باطل قوتوں کے خلاف مسلسل جہاد کے ذریعہ حاصل کرنا تھی۔ مگر میں تو اب باطل سے مفاہمت کر کے بھی اس فریب میں مبتلا ہو رہا ہوں کہ روزہ نماز اور ذکر واذکار ہی رضائے الٰہی کے لیے کافی ہیں۔ میں نے تو دین کا مفہوم جماعت کے لٹریچر سے یہ سمجھا تھا کہ جب تک خدا کی زمین پر تکوینی حاکمیت کی طرح خدا کی تشریعی حاکمیت قائم نہیں ہو جاتی میرے لیے معاشرہ اور ماحول سے صلح کرنا ممکن نہیں۔ برائی کے خلاف مسلسل ہاتھ، زبان اور دلی نفرت کے ساتھ لڑائی جاری رہے گی۔ مجھے تو ہر یزید دوران کے خلاف حسینؓ بن کر کھڑا ہونا تھا۔ لیکن میں تو اب کربلا کا راستہ بھولنے لگا ہوں۔ مجھے ہر ابوجہل اور ابولہب کی شرارت وخباثت کو ختم کرنا تھا مگر میں تو اپنے وقت کے ابوجہلوں اور ابولہبوں سے ٹکرانے کا نام بھی نہیں لیتا۔ میں نے خدا کی توحید کا اعلان بلالؓ حبشی کی طرح کرنا تھا اور اقرار توحید کے جرم میں جسم کی چمڑی ادھیڑ دانے کا عہد کیا تھا مگر میں تو عبداللہ بن ابی کا سا کردار ادا کر رہا ہوں اور اپنے آپ کو فریب دے رہا ہوں کہ میں تحریک اسلامی کا کارکن ہوں میں نے تو حضرت صدیق اکبرؓ کا جذبۂ فداکاری اپنے دل میں پیدا کر کے رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے خود کو تیار کیا تھا لیکن میں تو دو سیر کھجور لانے والے مزدور کا ایثار بھی نہ اپنا سکا۔ میں نے تو حضرت عمرؓ کا ایثار وحق پرستی اپنانے کا فیصلہ کیا تھا کہ اگر

میرا بیٹا بھی خدا کی حدود کو توڑے گا تو حکم خدا کے مطابق اسے بھی حق کے لیے قربان کر دوں گا۔ میرے سامنے تو صحابہ کرامؓ کے کردار و سیرت کے جگمگاتے ہوئے راستے تھے جن پر میں نے چلنا تھا مگر میں تو اب اپنے نفس امارہ کی تاریک وادیوں میں بھٹک رہا ہوں۔ میں نے تو عزیمت کا مقام عظیم اپنے لیے منتخب کیا تھا مگر میں تو اب رخصت کے پست کوچوں میں سر چھپا رہا ہوں۔ میں تو خدا کے دین کو غالب کرنے کا نصب العین لے کر جماعت میں شامل ہوا تھا۔ میں نے تو نظم جماعت سے سمع و اطاعت کا عہد کیا تھا۔ میں نے تو دستورِ جماعت کو پوری طرح سمجھ کر بلا جبر و اکراہ رضائے الٰہی کی خاطر جماعت میں شمولیت اختیار کی تھی۔ میں نے تو یہ عزم کیا تھا کہ حالات کوئی بھی رخ اختیار کریں زمانہ کتنی بھی کروٹیں بدلے وقت کی نزاکت کتنے بھی مسائل پیدا کرے مگر جو عہد میں نے جماعت کے ساتھ کیا ہے اس میں کوتاہی نہ کروں گا۔ اطاعتِ امر میں کوتاہی کا مرتکب نہ ہوں گا۔ میں نے تو اپنے رفقائے کار سے حسنِ ظن رکھنا تھا۔ میں نے تو خدا کے لیے جماعت کے کارکنوں اور خدا کے دین سے مثالی محبت کا مظاہرہ کرنا تھا۔ میں نے تو خاندان برادری اور عزیز و اقارب سب کو ثانوی حیثیت دے کر اوّلیت اس رشتہ کو دینا تھی۔ جو لا الٰہ الا اللہ کی بنیاد پر قائم ہو۔ میں نے تو تحریک اسلامی کی دعوت کو خدا کی عظیم نعمت سمجھ کر اپنایا تھا۔ میں نے تو اس دعوت کو اپنے دوستوں پڑوسیوں محلہ داروں، بستی والوں، شہر والوں حتیٰ کہ پورے ملک ہی نہیں، پوری دنیا کے انسانوں تک پہنچانے کا عزم کیا تھا۔ میں نے ایک مسلمان تاجر، ایک مسلمان کسان، ایک مسلمان مزدور، ایک مسلمان کارخانہ دار، ایک مسلمان حاکم، ایک جج، ایک مسلمان استاد اور ایک مسلمان طالب علم بن کر خدا کی اطاعت کا حق ادا کرنا تھا۔ میں نے تو مظلوم و پسماندہ انسانوں کو ایک انسانی معاشرہ مہیا کرنے کے لیے ہر قسم کی جدوجہد کرنا تھی۔ میں نے تو رضائے حق کی خاطر ساری دنیا سے لڑ جانے کا پیمان باندھا تھا!

ہائے میری شامت اعمال! میں نے تو ہر پیمان توڑ دیا۔ ہر عہد کی خلاف ورزی کی ہے۔ ہر معاہدے سے روگردانی کی ہے۔ میرے اپنے وجود کے اندر جو حق و باطل کی جنگ چھڑی تھی۔ اور جہاں ایک جانب میری نفسانی خواہشات کی فوجیں تھیں جو باطل کے ساتھ سر بکف تھیں اور دوسری جانب میرے ایمان و ضمیر کے مجاہدین تھے جو حق کی حمایت میں فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر سرفروشی کے لیے تیار تھے۔ میں تو یہ کہہ کر ایمان و ضمیر کا ساتھی بنا تھا کہ یہ ساتھ زندگی کے آخری سانس تک رہے گا۔ لیکن مجھے تو تھوڑی مدت کے بعد ہی خواہشات و آرزوؤں نے مغلوب کر کے ایمان و ضمیر سے جدا کر دیا۔ اور اب یہ حال ہو گیا ہے کہ جب ضمیر کا حق پرست مجاہد مجھے میری غفلت و تساہل پسندی پر شرمندہ کرنے آ جاتا ہے۔ تو ہزار قسم کی تاویلوں کے ذریعے اپنے جرم کو چھپانے کی کوشش کرتا ہوں، حالانکہ میں جانتا ہوں کہ نہ تو میں ضمیر کے مجاہد کو اپنی تاویلوں سے مطمئن کر سکتا ہوں اور نہ اپنے آپ کو۔

میرے تصورات کی دنیا میں قدم قدم پر اپنے اصولوں اور بے اصولیوں کے معرکے برپا ہیں۔ لمحہ لمحہ مفاداتِ نفس اور تعلق باللہ کے درمیان ٹکراؤ ہوا۔ ابتداً میں نے اصولوں ہی کا ساتھ دینے کے لیے قدم اٹھائے۔ تعلق باللہ سے ہی رشتہ جوڑا۔ لیکن وقت کے تھپیڑوں نے بالکل غیر محسوس طریقے سے غفلت و جہل کے جال میں جکڑ دیا۔ ضمیر نے ٹوکا۔ ایمان نے

ایمان نے روکا، مگر سہل پسندی اور آرام طلبی نے عذرات اور تاویلوں کے راستے پر ڈال کر بھٹکا دیا۔ میرے تخیلات کی دنیا میں جو ایک انقلاب آیا تھا۔ اسلامی انقلاب جس نے میری زندگی بدل کر رکھ دی تھی جس نے مجھے ایک نئی دنیا سے آشنا کیا تھا جس نے مجھے وہ بھائی عطا کیے جنہوں نے ہمیشہ سچی اخوت کا مظاہرہ کیا۔ جو میرے دکھ درد میں ـــــ میرے خون کے رشتے کے بھائیوں سے زیادہ میرے غمگسار اور ہمدرد ساتھی ثابت ہوئے جن کے ایثار و قربانی نے مجھے بتادیا کہ ایک بھائی اپنے بھائی کے لیے کس درجہ ایثار کرسکتا ہے۔ خونی رشتے کے بھائی جہاں دنیا کی تھوڑی جائداد کے لیے بھائی کا گلا کاٹ دیتے ہیں۔ اسی پلپ کی دنیا میں تحریک اسلامی کے وہ کارکن بھی ہیں جو اپنے دینی اور اسلامی بھائی پر ابتلاء و آزمائش کے دور میں اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ ـــــ اس بدنصیبی کو کیا کروں کہ اپنے ان قیمتی ساتھیوں کی بھی قدر نہ کرسکا اور اپنے باہمی تعلقات میں بارہا سوء ظن کا شکار رہا اور حسن ظن کے صاف اور روشن راستے پر چلنے کے بجائے بدظنی کے خارزار میں پھنس کر رہ گیا۔ جہاں دامن ہی تار تار نہیں ہوتے ہاتھ اور پاؤں بھی زخمی ہوتے ہیں۔

میں نے تحریک اسلامی کے نصب العین کو اپنی زندگی کا نصب العین بناتے ہوئے اپنے نفس امّارہ کو کچل دینے کا عزم کیا تھا کہ یہ ہمیشہ برائی کے راستہ پر چلنے کی تلقین کرتا ہے اور خیر و بھلائی کی سیدھی اور صاف سڑک اسے کبھی پسند نہیں آئی۔ ابلیس بدی کے ذریعہ انسان کو بہکاتا ہے۔ بدی کو خوبصورت اور خوش نما لباس پہنا کر پیش کرتا ہے۔ باطل کے خارزار کو گلستان رنگ و بو کا روپ دے کر حق پرستی کی بہشت سے دور لے جاتا ہے۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے اور سمجھتے ہوئے میں اس کے سحر کا شکار ہو گیا۔ اور کئی امور میں اپنے نصب العین کو فراموش کر بیٹھا۔ جہاں مجھے ڈٹ جانا چاہیے تھا وہاں سے ہٹ گیا اور جہاں نرمی و ملائمت، شفقت و محبت کا اظہار کرنا چاہیے تھا وہاں سختی و کرختگی، نفرت، کدورت کا مظاہرہ کیا گیا۔ جن سے جڑنا چاہیے تھا ان سے کٹ گیا۔ اور جن سے کٹنے میں عافیت تھی وہاں ترک تعلق نہ کر پایا۔ یعنی الحب للّٰہ والبغض للّٰہ پر عمل نہ کرسکا۔ میں نے تحریک اسلامی کے نصب العین کو اپناتے وقت گواہی دی تھی کہ ایک اللّٰہ کے سوا کسی کو معبود، آقا، مالک، بادشاہ، حاکم رازق اور خالق نہیں مانوں گا۔ کسی کو حاجت روا، مشکل کشا اور دکھ سکھ دینے والا نہ سمجھوں گا۔ کسی کو حاکم اور فرمانروا نہیں مانوں گا۔ بزعم خویش جو حاکم یا بادشاہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کی بادشاہت اور حکومت کو تسلیم نہیں کروں گا۔ میں نے جملہ ارباباً من دون اللّٰہ کا انکار کیا تھا۔ میں نے تمام باطل فرمانرواؤں سے بغاوت کا اعلان کیا تھا۔ میں باطل قوتوں کے سامنے اللہ کے ایک باغی کی حیثیت سے سر کٹوانے کو تیار رہا تھا ـــــ سر جھکانے کو نہیں ہائے مجھے معلوم نہیں کہ اب مجھے کیا ہو گیا ہے، کہ باطل کی قوتیں موجود ہیں مگر میری بغاوت کا جذبہ ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ میں نے تحریک اسلامی میں شمولیت کے وقت اس بات کی شہادت دی تھی کہ حضور رحمۃ للعالمین خاتم المرسلین کی ذات ہی میرے لیے معیار حق اور ان کی سیرت پاک ہی میرے اعمال و کردار کے لیے کسوٹی ہے۔ میں نے اپنے اخلاق اسی سراپا رحمت ذات ﷺ کے اخلاق کے مطابق بنانے تھے۔ میں نے اپنی سیرت اسی ذات کی سیرت کے سانچے میں ڈھالنا تھی۔ میں نے دوستی، دشمنی، محبت و نفرت، روابط و تعلقات، معاملات اور

برتاؤ میں حضور پاکؐ ہی سے رہنمائی حاصل کرنا تھی۔ مجھے تو اپنے رفتار کار سے محبت کرنا تھی جیسے حضورؐ نے اپنے رفقاء کار سے کی تھی۔ میں نے دعوتِ دین کے لیے وہی طریق کار اپنانا تھا جو حضورؐ اور حضورؐ کے ساتھیوں نے اپنایا۔ میں نے تو اسی فداکاری کا ثبوت دینا تھا جس کا نمونہ حضورؐ نے پیش کیا۔ میں نے اپنے آرام و آسائش کو اس طرح تج دینا تھا جیسے اس دعوت کے راستہ میں حضورؐ نے اور حضورؐ کے ساتھیوں نے تج دیا تھا۔ میرے راستے میں تو باطل کے پرستاروں نے کانٹے بچھانے تھے۔ میری راہوں میں دشمنان دین نے گڑھے کھودنا تھے۔ مجھے تو اس دعوت کو قبول کرنے کے جرم میں شعب ابوطالب، بدر و حنین کی آزمائشوں سے گزرنا تھا۔ مجھے تو جرم توحید پر تپتی ہوئی ریت پر لٹایا جانا تھا۔ میرے جسم کو سلاخوں سے داغا جانا تھا۔ مجھے تو ابو جندلؓ کی طرح ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پیروں میں بیڑیاں ڈال کر قید میں رکھا جانا تھا۔ مجھے تو آل یاسرؓ جیسی سختیوں اور آزمائشوں کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا تھا لیکن میرے راستے میں تو ان منزلوں میں سے ایک منزل بھی نہیں آئی۔ آہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے جذبۂ تن آسانی نے راستہ بدل دیا ہو۔ عزیمت کی بجائے رخصت کے دامن میں پناہ لے لی ہو۔

میں نے تو تحریک اسلامی میں شمولیت صرف اور صرف رضائے الٰہی اور فلاح اخروی کے لیے کی تھی لیکن آج جب اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتا ہوں تو خسر الدنیا والآخرہ کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کب اور کیسے ہو گیا اور کچھ اور خواہشات اس کی جگہ سر ابھار کر کھڑی دکھائی دے رہی ہیں۔ میری انانیت نے نظم جماعت کے ساتھ سمع و طاعت کے میرے رشتہ کو کمزور کر دیا ہے۔ تحریک اسلامی کے ان مخلص، بے لوث اور جاں نثار ساتھیوں کے ساتھ میری محبت اور للّٰہیت کے خلوص کا رنگ پھیکا ہو گیا ہے۔ اور بدقسمتی کا حال یہ ہے کہ ابھی تک مجھے احساس زیاں بھی نہیں ہے۔ تحریک اسلامی کے ہفتہ وار اور ماہانہ اجتماعات جماعت کے وجود کے لیے روح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ابتداء میں میرا طرز عمل اس بات کا شاہد رہا ہے کہ میں نے ان کو یہی حیثیت دی تھی۔ لیکن آج شامت اعمال نے مجھے وہاں لا کھڑا کیا ہے جہاں معمولی معمولی بہانے عدم شرکت کے لیے شرعی عذر بن جاتے ہیں۔

عہد رکنیت کرتے ہوئے میری عملی اور فکری زندگی میں جو انقلاب آیا تھا اسے میں نے نہیں، میرے عزیزوں، دوستوں بستی والوں اور جاننے والوں سب نے واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ تعلق باللہ کے رشتہ کا یہ حال ہو گیا تھا کہ نماز با جماعت کی خاطر سارے کاروبار چھوڑ دیتا تھا بلکہ تکبیر اولیٰ شاذ و نادر ہی قضا ہوتی تھی۔ قول و فعل میں یکسانیت پیدا ہو گئی تھی میرے ہاتھ اور میری زبان سے اپنے تو درکنار غیر بھی محفوظ ہو گئے تھے۔ جماعتی لٹریچر کے ساتھ ایسا عشق تھا کہ اپنے بیگ یا تھیلے میں دو چار کتابیں ہر وقت ہوتی تھیں جنھیں سفر و حضر میں ساتھ رکھتا تھا۔ ہم سفر دوستوں کو پڑھواتا اور خود بھی پڑھتا اور بار بار پڑھتا تھا، اور اس لیے پڑھتا تھا کہ اس پر عمل کیا جائے۔ وقت کی قدر و قیمت کا احساس اتنا تھا کہ ایک لمحہ بھی مطالعۂ لٹریچر یا پھر لوگوں کو دعوتِ دین دیئے بغیر نہیں گزرتا تھا۔ لیکن نفس امارہ نے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے

کہ نہ تو اب لٹریچر کی ضرورت ہے۔ اور نہ ہر ملنے والے کو دعوت دینے کی۔ لٹریچر کو متعدد بار پڑھ رکھا ہے۔ وہ تو گویا حفظ ہے۔ ہر ملنے والے کو دعوت دینا حکمت و مصلحت نہیں ویسے بھی اب جماعت کی دعوت عام ہو چکی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جماعت کی دعوت کیا ہے؟ — یہ وہ غلط فہمی اور حماقت ہے جس نے معلوم نہیں میرے جیسے کتنے لوگوں کو برباد کیا ہے۔ کتنے لوگوں سے وہ جنون چھین لیا ہے جسے تبلیغ دین کا سرمایہ کہتے ہیں۔ جس لٹریچر سے اس کے مصنف اور جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودیؒ بے نیاز نہ ہو سکے، آج اگر میں اس سے غفلت برتوں تو میرا یہ طرز عمل حماقت کے سوا بھی کچھ اور ہو سکتا ہے؟

آہ میری بدنصیبی! میں جو اخلاص کے ساتھ تحریک اسلامی کے کارواں میں شامل ہوا تھا۔ آج اخلاص کی خنک چھاؤں کو چھوڑ کر نفاق کی دھوپ کو اپنا سہارا بنا رہا ہوں جو روح ایمان و ایقان کی معصوم کلیوں اور جذبۂ عمل کے رنگین و نازک پھولوں کو جھلسا کر زندگی سے محروم کر دیتی ہے۔ میری اپنی ذات کا بت میرا معبود بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی حماقتیں بھی میرے لیے عزیز ہو کر رہ گئی ہیں، اس کی تمناؤں کی پرستش کا جذبہ طاقتور ہوتا جا رہا ہے۔ اور میرا ضمیر بے بسی کے ساتھ سر پیٹ رہا ہے۔

نظم جماعت میں تنقید کی روایت اس لیے قائم کی گئی تھی کہ اپنے جس ساتھی کے کسی قول و فعل میں کوئی چیز اسلام یا دستور جماعت کے خلاف محسوس ہو اس کی اصلاح کی جانب توجہ دلا دی جائے لیکن آج میں تنقید کی بجائے اپنے مخلص ساتھیوں اور رہنماؤں پر تنقید نہیں کی تنقیص کرنے لگا ہوں۔ اور اس تنقیص میں لذت محسوس کرتا ہوں۔

یہ عہد رکنیت تو مجھے ایک اضطراب دے کر گیا تھا جسے اس وقت تک باقی رہنا تھا۔ جب تک خدا کی زمین پر خدا کی تشریعی حاکمیت قائم نہ ہو جاتی۔ جب تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام ارض الٰہی کے اس خطہ میں قائم نہ ہو جاتا جسے اسی غرض کے لیے اللہ رب العزت نے ہمیں عطا کیا تھا۔ یہ اضطرابِ مسلسل تو اس وقت تک باقی رہنا تھا جب تک بدی اور برائی سے یہ خطہ پاک نہ ہو جاتا۔ جب تک ظلم و عدوان کی گھٹائیں چھٹ نہیں جاتیں، جب تک سرکشی اور تمرد کے جنگل صاف نہیں کر دیئے جاتے، جب تک جبر و قہر کی پناگاہیں منہدم نہیں ہو جاتیں اور جب تک، اربابًا من دون اللہ کے تخت الٹ نہیں دیئے جاتے۔

یہ اضطرابِ مسلسل تو میری روح ایقان و جذبۂ عمل کو توانائی بخشتا تھا۔ ایسی توانائی جسے پا کر میں باطل کی بڑی سے بڑی قوت سے تنہا ٹکرا جانے سے ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا جسے پا کر میں نے شاہوں کے تاج اتارنے اور سلطانوں کے تخت الٹنے کی جسارت اپنے اندر پائی تھی اور میرے نام سے باطل کے فکری اور ذہنی ایوانوں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ یہ اضطرابِ مسلسل ہی تھا جس نے میری فاقہ کشی اور میرے ملبوس کی بوسیدگی کو وہ ہیبت عطا کی تھی کہ ارض الٰہی پر انسانی جبروت کے درباروں پر سناٹا چھا جاتا تھا۔

یہ اضطرابِ مسلسل باطل کے لیے پیغام مرگ اور حق کے لیے کامیابی کا مژدۂ جاں فزا تھا۔ یہ جب تک باقی رہا میں زندہ تھا۔

تحریک اسلامی کا کارکن زندہ تھا، دعوتِ دین کا جذبہ زندہ تھا، ایثار و فدیت تھی، تعلق باللہ کی روح پائندہ تھی، انسانیت زندہ تھی، اور محبت و اخوت زندہ تھی۔ دعوتِ اسلامی کی محفلیں زندہ تھیں اور پیغامِ حق کا چشمہ جاری و ساری تھا۔

لیکن آج کہ یہ اضطرابِ مسلسل ایک سکون اور ایک سکوت میں بدل گیا ہے۔ نیکی کا چہرہ مرجھانے لگا ہے۔ تحریک اسلامی کا کارکن میرے وجود کے اندر دم توڑ گیا ہے، دعوتِ اسلامی کا جذبہ جانکنی کے عالم سے دوچار ہے۔ ایثار و فدیت کے گلشن سے بہاریں اٹھ گئی ہیں، تعلق باللہ کا رشتہ کمزور سے کمزور تر ہو گیا ہے، محبت و اخوت کی محلیں اجڑ گئی ہیں، اور خود غرضی کے بھیانک عفریت میرے دل و دماغ پر قابض ہو کر میری حق پرستی کے جذبات کو ختم کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

میرے خالق و مالک مجھ پر رحم فرما!

اپنے فضل و کرم کی بہشت امن و راحت سے مجھے محروم نہ کر اپنی بخشی ہوئی ہدایت اور توفیقِ دعوتِ دین کی نعمت مجھ سے واپس نہ لے۔ مجھے میری ان خواہشات کے حوالے نہ کر جو بے لگام گھوڑے کی طرح ہیں۔ مجھے میرے نفس امارہ کی ان سرکشیوں کے خونخوار پنجوں سے بچا لے جن میں پھنس کر میں اپنے وجود کو ٹکڑے ہونے سے بچا نہ سکوں۔

اے دلوں میں امنڈنے والے جذبات اور دماغوں میں ابھرنے والے تصورات کے جاننے والے آقا میرے دل و دماغ کو ان جذبات و تصورات سے پاک رکھ جو خیر و سلامتی، عاجزی و انکساری اور تیری عبدیت کے جذبے سے عاری ہوں۔ اے زندگی و موت کے پروردگار! مجھے زندگی کے وہی لمحات عطا فرما جو تیرے دین کی سربلندی اور دنیا میں تیری تشریعی حکومت کے قیام کے لیے وقف ہوں۔ اور مجھے ان ایام زندگی سے بچا لے جن میں کوئی ساعت بھی تیری نافرمانی میں بسر ہو۔ اے رحمت و شفقت کے مالک مجھے اپنی عطا کے اس دامنِ کرم کی پناہ گاہ سے محروم نہ کر جو تیرے ان فداکار صاحبانِ عزیمت کے لیے مخصوص ہے۔ جن کی زندگیاں دنیا میں تیرے دین کی سرفرازی کے لیے رہی ہیں، اور میری زندگی کے شب و روز کی گردش کے پروردگار! مجھے بدعملی کی تیرگیوں میں بھٹکنے کے لیے نہ چھوڑ۔ حسن عمل کی ان نورانی وادیوں میں رکھ جہاں تیری رضا کے خوش الحان طیور نغمہ سنج ہیں۔ اے رحیم و کریم آقا! مجھے اپنے اس عہد پر قائم رہنے کی توفیق سے نوازے رکھ۔ جو میں نے تیرے دین کو نافذ کرنے کا داعیہ رکھنے والی تحریک اسلامی میں شمولیت کے وقت تیرے ان سراپا ایثار و فدویت اور تیری رضا کے لیے سب کچھ قربان کر دینے والے بندوں کے سامنے کیا تھا۔ مجھے اس جذبے سے نواز! جو تیرے لیے مرنے اور جینے کا حوصلہ بخشے۔ میری کمزوریوں کو طاقت میں بدل دے۔ میری ناتوانیوں کو توانائیوں کا روپ عطا کر دے۔ میرے دل و دماغ کو تصورات کی ان آلائشوں سے پاک کر دے جو دنیا طلبی کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں۔ اے میرے ستار و غفار مولا! میری کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف فرما اور میری زندگی کے جو سانس باقی ہیں، انھیں اپنی اطاعت کے لیے وقف کر دے۔ مجھے خیالات و نظریات کی ان پستیوں میں گرنے سے بچا لے۔ جو تیری نافرمانیوں سے عبارت ہیں۔ مجھے اس رنگین و سنگین دلدل سے بچا جس کا انجام دنیا اور آخرت کی تباہی ہو۔

مجھے آرزوؤں کے اس طلسم ہوش ربا میں بھٹکنے سے جہاں قدم قدم پر خدا فراموشیوں کے حیرت کدے آباد ہیں، میں ان امنگوں کی بہشتوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں جن کی تعمیر کسی خیالِ باطل کے شداد کے ہاتھوں ہوئی ہو۔

اے علیم و بصیر پروردگار! مجھے نہ دیکھ، میرے کرتوت نہ دیکھ، میری بداعمالیاں نہ دیکھ، میری بدکرداریاں نہ دیکھ، میری پراگندہ خیالیاں نہ دیکھ، میرے فکر و نظر کی کج ادائیوں پر نظر نہ ڈال۔ تو اپنی رحمت کی وسعتوں پر نظر رکھ اور میرے حال پر رحم فرما۔ مجھے بچالے، میری بدکرداریوں سے بچالے، مجھے حسن عمل اور حسن سیرت کی دولت سے نواز۔ مجھے اس پشیمانی سے نواز جو اپنے گناہوں کے نتیجہ میں میرے اوپر طاری ہو مجھے اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں پر ندامت کے آنسو بہانے کی توفیق ارزانی فرما۔

اے وہ پاک ذات! جو مردہ و خشک زمین کو اپنے کرم کی حیات بخش بارش سے مہکتے ہوئے گلستان اور رنگ و بو کے چمنستان میں بدلتی رہتی ہے۔ میرے دل کی زمین کو بھی نفاق و بدعملی کی ویرانیوں سے نجات دے کر نیکیوں اور حسن عمل کی حیات آفریں باران رحمت سے سیراب کر کے سبزہ و گل کی وادیوں میں تبدیل کر دے۔

اے میرے علیم و حفیظ پروردگار! تو نے جس طرح اپنے حبیبؐ کو طائف کے سرداروں کے ظلم و جور اور ان کی جانب سے دی جانے والی ذہنی اذیتوں اور اوباشوں کی سنگ باری پر ثابت قدم رکھا اور صبر عطا فرمایا۔ ان کی ذات کے صدقے مجھے بھی آزمائشوں کے میدانِ طائف میں فتنوں کے رئیسوں کے ظلم و جبر اور طنز و طعن کی سنگ باری پر ثباتِ قدم اور صبر کی دولت سے نواز۔ او رائے سننے والے اور دیکھنے والے مالک! میری بے بسی کی فریاد اور بے کسی کی دعاؤں کو قبول فرما۔

اے وہ ذات پاک جس نے حضرت ابوبکرؓ کو صدیقؓ اور ابن خطابؓ کو فاروق اعظمؓ بنایا۔ مجھے بھی ان کے نقش قدم کے مطابق صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ اور اپنے راستے میں صدیقؓ کی سی فدویت، فاروقؓ کی سی سطوت اور عدل گستری کا نظام قائم کرنے کے لیے سعی مسلسل کی ہمت دے۔ حضرت عثمانؓ کی سی حیا و بردباری۔ حضرت علی المرتضیٰؓ کی سی شجاعت و علم کے خزانوں میں سے میرا دامنِ زیست بھی بھر دے اے وہ معطی و رحمان پروردگار! مجھے فقر ابوذرؓ سے بھی آشنا کر اور صدقِ سلیمانؓ سے بھی۔

اے میرے ستار العیوب پروردگار! میں ساری دنیا سے اپنی اصلیت چھپا سکتا ہوں لیکن تجھ سے نہیں۔ تجھ پر میری نیت کا فتور بھی ظاہر ہے اور میرے کردار و عمل کا ظاہر و باطن بھی۔ پھر جس طرح تو نے میری پردہ پوشی اس دنیا میں کی اور مجھے ہر قسم کی رسوائی سے بچایا۔ آخرت میں بھی میری پردہ پوشی فرما اور میری کوتاہیوں اور لغزشوں کو اپنے دامن عفو و درگزر میں جگہ دے اور اے میرے رحیم و کریم آقا! جس طرح مجھے اس دنیا میں تحریک اسلامی کے ان مخلص اور سراپا ایثار نیک بندوں کا ساتھی بن جانے کی توفیق عطا فرمائی اور اس حال میں بھی توفیق دی کہ میں اپنے اعمال و افعال اپنے فہم و فراست کسی بھی لحاظ سے ان کا رفیق بننے کا اہل نہ تھا۔ اس طرح مجھے روز محشر بھی ان کا ساتھ نصیب فرما۔

اے میرے غفار الذنوب مولا! تیرے دین کی سربلندی کی جدوجہد میں کوتاہیاں اور لغزشیں مجھ سے سرزد ہوئی ہیں انھیں

معاف کردے اور مجھے وہی عزیمت اور للّٰہیت عطا فرما جو تو نے سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ کو عطا فرمائی تھی۔ مجھ سے دین کا وہ فہم نہ چھین لینا جو تیرے قرآن مجید اور تیرے رسولؐ کی سنّت و سیرت کے ذریعہ نصیب ہوا ہے۔ اور جس کی جانب پوری جرأت کے ساتھ مولانا مودودیؒ نے دعوت دی تھی۔

اے میرے غریب پرور پروردگار! میرے بچوں کو اپنے دین کے لیے قبول کرلے انھیں عملی طور پر تحریک اسلامی کے سپاہی اور کارکن بننے کی توفیق دے۔ تاکہ وہ میرے لیے دنیا اور آخرت میں روحانی سکون کا سرمایہ بن سکیں۔ رب العالمین اگر مجھ سے ان کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں کوتاہیاں ہوگئی ہیں تو تو مجھے معاف کردے۔ اور ان کے حق میں میری عاجزانہ دعا قبول فرمالے میری بچیوں کو بنت رسول صلعم کے اسوہ کی پیروی نصیب فرما۔ ان کی عزت و ناموس کی حفاظت کر اور انھیں ایک مسلم خاتون کی سی زندگی گزارنے کی توفیق بخش۔

رب العالمین! میری ان خطاؤں کو معاف فرما۔ جو مجھ سے دانستہ سرزد ہوئیں اور ان سے بھی جو نادانستہ ہوئیں ان لغزشوں سے بھی درگزر فرما جو مجھے یاد ہیں اور ان سے بھی جو مجھے یاد نہیں لیکن تیرے علم میں ہیں۔ میرے خالق و مالک! تیرے دین کی دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں جو کوتاہیاں میں نے کی ہیں ان کو بخش دے۔ ان کی تلافی و تدارک کی ہمت فرما۔ میرے رب! مجھے روز جزا اس وقت تنہا نہ چھوڑنا جب میرے پڑوسی، میرے عزیز، میرے رشتہ دار، میرے محلہ والے میرے شہر والے اور میرے ملک کے لوگ تیری بارگاہ میں میرے خلاف یہ استغاثہ کریں کہ میں نے انھیں تیرے دین کی دعوت پہنچانے میں تساہل برتا اور اس وجہ سے وہ تیرے دین سے غافل رہے۔ میرے مولا! مجھے ساری خلقت کے سامنے رسوا نہ کر۔ مجھے اسی زندگی میں توفیق دے کہ اس کوتاہی کا تدارک کرسکوں اور گزشتہ غلطیوں پر توبہ کرسکوں۔

میرے آقا! اپنے جن تحریکی بھائیوں کے دل میں نے دانستہ یا نادانستہ دکھائے ہیں انھیں مجھ سے راضی کردے اور مجھے اسی زندگی میں مہلت دے کہ میں ان سے معذرت کرنے میں اپنی انانیت کی وجہ سے پس و پیش نہ کرنے لگوں، میں نے نظم جماعت کی اطاعت میں جہاں سستی کا مظاہرہ کیا ہے اس پر میری توبہ قبول فرما۔ میں نے تنقید کے معاملہ میں جہاں اس کے اصول و آداب کو نظر انداز کیا ہے یا شدتِ جذبات کا شکار ہوگیا ہوں اور میرے اس جذباتی پن سے تحریک کو جو نقصان پہنچا ہے اسے معاف کردے تیری رحمت و شفقت کا واسطہ مجھے بخش دے۔ اور جس ذمہ دار جماعت کے دل کو میری کسی حرکت سے صدمہ ہوا ہے اُسے مجھ سے راضی کردے۔ میرے پروردگار! مجھے نفاق، تساہل اور کوتاہیوں سے بچا جو تیرے راستہ میں حائل ہو کر مجھے تحریک اسلامی کا اچھا کارکن بننے سے محروم رکھتی ہیں۔ "رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔"

[بشکریہ ایشیا لاہور ۱۸ر جنوری ۱۹۸۰ء۔ عنوان ہمارا تجویز کردہ ہے۔ (ادارہ)]

تنقید وتبصرہ:

ایمان وعمل کا قرآنی تصور: از الطاف احمد اعظمی (علیگ)۔

ناشر: ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی علی گڑھ آفسٹ طباعت متوسط تقطیع صفحات ۲۸۰ قیمت ۲۵ روپے لائبریری ایڈیشن ۳۰ روپے۔

"تجلیات حق" کے بعد ہمارے فاضل دوست جناب حکیم الطاف احمد صاحب اعظمی (علیگ) کی یہ دوسری پیش کش ہے جسے ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ نے آفسٹ کی دیدہ زیب اور روشن طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اسلام کی نسبت سے "ایمان وعمل" کا مسئلہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ خود اسلام۔ اس لیے اسلام کے صدر اول ہی سے اس مسئلہ پر گفتگو ہوتی چلی آئی ہے۔ ایمان وعمل کا باہمی کیا تعلق ہے؟ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ یا یہ دونوں جدا گانہ حقیقتیں ہیں۔ ایمان مستقل بالذات مجرد حقیقت ہے، جس کے وقوع پذیر ہونے کے لیے کسی دوسری چیز کی احتیاج نہیں یا معاملہ اس کے برعکس ہے؟ صدر اول میں جب کہ طبیعتوں میں سادگی تھی ان مسائل پر زیادہ قوت صرف کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص پیروؤں نے نبی برحقؐ کی زبانی خدا کا کلام یا آپ کا فرمان جو کچھ سنا اسے اپنے لیے حرز جاں بنایا۔ اور ایمان کے بدیہی تقاضے کے طور پر اعمال صالحہ سے زیادہ سے زیادہ اپنے دامن کو مالا مال کرنے کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ لیکن قرآن وحدیث کے ذخیرے میں وہ بنیادیں پوری طرح موجود تھیں جو "ایمان وعمل" کی نسبت سے مذکورہ مباحث کے لیے مواد فراہم کرتی تھیں۔ چنانچہ بعد کے ادوار میں جب مسلمان امت کی عجمی علوم وافکار سے آشنائی ہوئی تو خاص حالات کے پس منظر میں یہ مسائل پوری قوت اور شدت کے ساتھ ابھرے۔ یہاں تک کہ اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے امت میں "علم الکلام" کے نئے فن کی بنیاد پڑی۔ جس کی باریکیاں اور موشگافیاں معلوم ہیں۔ اصطلاحات کے دبیز پردوں میں یہ فن دبا ہوا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں حکیم الطاف احمد صاحب نے "ایمان وعمل" کے مسئلہ میں فنی اور تکنیکی مصطلحات سے تعرض نہ کرتے ہوئے اس سلسلے میں خاص طور پر قرآن حکیم کے رخ زیبا کی رونمائی کی کوشش کی ہے۔ اپنے مطالعہ قرآن کے نتیجے میں ان کے سامنے "ایمان وعمل" کی جو نسبت اور ان کا جو باہمی تعلق سامنے آیا ہے، پورے دعوتی جوش کے ساتھ اسے انھوں نے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ کتاب کا مقصد علمی اور تحقیقی سے زیادہ دعوتی اور تحریکی ہے۔ امید ہے کہ اس کا مطالعہ اسی پس منظر میں کیا جائے گا۔ "ایمان وعمل" کے سلسلے میں واقعہ یہ ہے کہ بہتر بات وہی ہے جو حضرت وہب بن منبہ نے کہی ہے کہ "لا الٰہ" جنت کی کنجی ضرور ہے لیکن کنجی کارآمد وہی ہوتی ہے۔ جس میں دندانے بھی ہوں۔ جنت کا دروازہ بھی اسی وقت کھلے گا جبکہ اس کنجی میں دندانے ہوں۔ اگر یہ دندانوں سے خالی ہوگی تو یہ دروازہ بھی نہ کھل سکے گا" مصنف موصوف نے اس کتاب میں اس حقیقت کو بڑے پر زور اور موثر انداز میں سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ کتاب چونکہ معروف معنوں میں علمی اور تحقیقی نہیں ہے اس لیے اس میں حوالوں وغیرہ کا اہتمام بھی اپ ٹو ڈیٹ انداز سے نہیں کیا گیا ہے۔ علمی

عام طور پر جوش عمل کا سرا ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ ایمان کے ساتھ عمل کے لیے مہمیز اس کتاب کا بنیادی مطمح نظر ہے۔ امید ہے کہ اس سے اسی نسبت سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ ایمان وعمل کا مسئلہ ہر مسلمان کی زندگی کا اعلیٰ مسئلہ ہے۔ اس لیے توقع ہے کہ اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور اسے زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مصنف نے یہ کتاب بھی اپنی مطب کی مصروفیات کے ساتھ لکھی ہے جس پر وہ ہر طرح سے مبارکباد اور تحسین کے مستحق ہیں۔ طباعت کے ساتھ تصحیح کا پورا انتظام کیا گیا ہے۔ گرانی کے لحاظ سے قیمت بھی مناسب ہے۔ (س)

تصوف، ایک تجزیاتی مطالعہ: از ڈاکٹر عبیداللہ فراہی

ناشر ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ۔ آفسٹ طباعت۔ متوسط تقطیع۔ صفحات ۲۰۰ قیمت پچیس روپیے لائبریری ایڈیشن پینتیس ۳۵ روپے

ادارۂ تحقیق کی یہ دوسری تازہ پیش کش ہے جسے اس نے آفسٹ طباعت میں بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر عبیداللہ فراہی کی یہ کتاب تحقیق و تصنیف کے اپ ٹو ڈیٹ معیاروں کی مکمل تصویر پیش کرتی ہے۔ کتاب جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے، تصوف کا ایک تجزیاتی مطالعہ ہے۔ جس میں مصنف نے اپنے متین اور متوازن پیش لفظ کے علاوہ پہلے تصوف کا ایک اجمالی تعارف پیش کیا ہے۔ آگے فقر و زہد، توکل و مجاہدہ وغیرہ تصوف کی آٹھ اہم اصطلاحات پر علمی اور تحقیقی انداز میں گفتگو ہے۔ کتاب ایک ریسرچ تھیسس ہے جس میں مکمل حوالوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ کتاب محنت اور تدقیق سے لکھی گئی ہے۔ اس کا کسی قدر اندازہ اس کے مراجع کی فہرست پر ایک نظر ڈال کر ہی کیا جاسکتا ہے جو عربی ستر ۷۰ فارسی پندرہ ۱۵، اردو سولہ ۱۶ اور انگریزی آٹھ کتابوں اور چار درسائل پر مشتمل ہے۔ آخر میں مکمل اشاریہ بھی ہے جس سے کتاب کے مندرجات کے تلاش کرنے میں مزید سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ متانت اور سنجیدگی اس کتاب کا طرۂ امتیاز ہے۔ مصنف تصوف کے مستند مآخذ کی روشنی میں، اس کی مذکورہ معروف اصطلاحات کا جنھوں نے ایک طرح سے تصوف کے پورے فن کا احاطہ کر لیا ہے، ان کی حقیقت، ان کے دلائل و شواہد اور ان کے مضمرات کا تفصیل سے جائزہ پیش کرتے ہیں۔ کتاب میں چونکہ تنقید کا پہلو ابھرا ہوا ہے۔ اس لیے دوران بحث اپنے نقطۂ نظر سے انھیں جو چیزیں قرآن و سنت سے ہٹی ہوئی یا کھٹکتی نظر آتی ہیں ان کا پورے علمی وقار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ شروع سے آخر تک وہ اس وقار کو برقرار رکھنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ تلاش حقیقت کے سلسلے میں ان کے تبصرے سے تصوف پر ان کے نقد و نظر کے انداز کا کسی قدر اندازہ کیا جاسکتا ہے:

"لیکن تلاش حقیقت کے لیے ایک صوفی کی روحانی تگ و تاز جس سے خواہی نخواہی اسے لوٹ آنا ہوتا ہے، اگر سلامت لوٹ سکے تو اس کی یہ مراجعت بالکل خالی ہاتھ نہیں ہوتی بلکہ ضبط نفس اور جدت کردار کے ساتھ ہوتی ہے تصوف کے حق میں یہ ایک بات جاتی ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔" ص ۸۰،

تصوف کے سلسلے میں شدت اور عقیدت کے غلو میں امت نے بڑا وقت گزارا ہے۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ میں قرآن و حدیث سے بڑھ کر صوفیانہ لٹریچر کے شہ پارے اس کا مرجع و معمول رہے۔ حالات کی تبدیلی سے اسلامیات میں ریسرچ و تحقیق کا جو نیا تعمیری رخ سامنے آیا ہے اس کا خاطر خواہ حصہ تصوف کے حصے میں آیا ہے۔ تصوف کے جائزے اور تحلیل کا یہ سلسلہ قیمتی ہے لیکن ایک چیز ہے جسے شاید نگاہوں سے اوجھل نہ ہونا چاہئے کہ اسلامیات کے دوسرے فنون کی طرح تصوف کی بھی اپنی مخصوص اصطلاحات اور بات کہنے کا خاص انداز ہے۔ عام طور پر اگر ان اصطلاحات سے انسیت نہ ہو تو بہت سی وہ چیزیں وحشت کا باعث معلوم ہوتی ہیں جنھیں ارباب تصوف قرآن و سنت کا عین مقتضا باور کرتے ہیں۔ اصطلاحات پر جھگڑا نہ کرنے کا اصول مسلم ہے۔ مزید براں توجیہ و تاویل کا حق امت کے دوسرے تمام طبقات کی طرح اہل تصوف کو بھی اسی طرح ملنا چاہئے۔ تصوف اسلامی تاریخ کا بڑا قوی اور موثر عامل ہے اور اس کے پیچھے امت کے بڑے بڑے پہاڑ کھڑے ہیں۔ اس لیے بڑا خیال رکھنے کی ضرورت ہے کہ اس کے مباحث کا تجزیہ و تحلیل اس کے مطلوب و مقصود مثبت پہلو سے استفادہ کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے پائے۔ زمانی حالات و اثرات کی مجبوریوں کا بھی پوری طرح لحاظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ کاوش اپنے نقطۂ نظر سے معروضی انداز سے تصوف کے مسائل کے تجزیہ و تحلیل کا اچھا نمونہ پیش کرتی ہے۔ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ تصوف کے مستند مآخذ کی روشنی میں اس کے مطلوب مثبت پہلو کی بھی سادگی اور ستھرائی کے ساتھ ترجمانی کی جائے۔ توقع ہے کہ اہل علم اس گراں بہا علمی تحفہ کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ اور اس کی قرار واقعی پذیرائی کی جائے گی۔ کتاب کی تصحیح کا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ ظاہر و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے کتاب کی قیمت زیادہ نہیں ہے۔ (س)

ندائے فضلاء　دو ماہی۔ نادیۃ الفضلاء مبارک پور کا دینی و علمی ترجمان

مدیر: جمیل احمد نذیری۔ معاون: احمد الرشید مبارکپوری۔ قیمت فی شمارہ ۵۰-۴۔ سالانہ زر تعاون پچیس روپے (ہندوستان سے) بیرون ملک پندرہ ڈالر۔

ضلع اعظم گڑھ کے معروف علمی قصبہ مبارک پور میں مدارس عربیہ کے فضلاء نے اپنی ایک انجمن قائم کی ہے۔ دو ماہی 'ندائے فضلاء' اسی انجمن کا دینی و علمی ترجمان ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اس کے تین شمارے ہیں۔ پہلا شمارہ چھپن صفحات کا تھا۔ دوسرے شمارے میں تشنگی کو دور کرنے کے لیے صفحات کی تعداد بڑھا کر چونسٹھ کر دی گئی ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ اور گٹ اپ جاذب نظر ہے۔ مضامین بھی بہتر اور علمی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ تصنیفی حسن کی البتہ کمی محسوس ہوتی ہے۔ مواد کے ساتھ اگر مضامین میں حسن ترتیب کا بھی لحاظ رکھا جا سکے تو رسالہ کی معنوی خوبی دوبالا ہو جائے گی۔ رسالہ کے مدیر مولانا جمیل احمد نذیری کا انداز نگارش سادہ اور پرکشش ہے، امید ہے کہ ان کی توجہ سے رسالہ کے تمام مضامین میں مضمون نگاری کے آداب کا زیادہ سے زیادہ لحاظ رکھا جا سکے گا۔ اردو زبان میں دینی لٹریچر اپنے بوجھل انداز بیان کے لیے شکایتوں کا کافی ہدف رہا ہے، خوشی کی بات ہے کہ ندائے فضلاء

کے میدان میں نوجوان علماء و فضلاء کی تربیت کا جو مقصد بیان کیا گیا ہے، وہ بڑا لائق ستائش اور وقت کا اہم تقاضا ہے۔ البتہ ایک بات کی ضرورت ہے کہ مضامین طے شدہ پروگرام کے تحت منصوبہ بند انداز سے لکھائے جائیں۔ اور ہندوستان کے خاص حالات اور ملت اسلامیہ کی ترجیحات کو پیش نظر رکھا جائے۔

مدارس عربیہ کے فضلاء کی مناسبت سے دوسرا مفید سلسلہ مدارس میں داخل نصابی کتابوں کے مصنفین کا تعارف اور ان کتابوں پر ریویو اور تبصرے کا ہو سکتا ہے۔ مدارس کے نظام میں عام طور پر یہ بڑی کمی معلوم ہوتی ہے کہ وہی لوگ جو بڑی بڑی کتابوں کے ماہر اور اس کے ایک ایک لفظ پر مدلل تقریر کر سکتے ہیں وہ اسی کتاب کے مصنف اور کتاب کے انداز بیان اور اس مضمون کی دوسری کتابوں کے بالمقابل اس کے امتیازی پہلو وغیرہ جیسے موضوعات پر مختصر تبصرے سے بھی قاصر رہتے ہیں۔ مدارس کے موضوعات اور ان کے پیش نظر علوم پر ریویو اور تبصرہ کا نمبر اس کے بعد آتا ہے۔ دو ماہی ندائے فضلاء اگر اس کمی کو دور کر سکے تو اس سے وقت کی ایک بڑی ضرورت ہوگی۔" ندائے فضلاء" نام بظاہر ثقیل معلوم ہوتا ہے لیکن رجسٹریشن وغیرہ کی دشواریاں بھی کم نہیں ہوتیں۔ اور اصل چیز تو کام ہے، کچھ دن بعد نام زبانوں پر رواں ہو ہی جائے گا رسالہ جاری کرنے کے بعد اصل مسئلہ اس کو باقی رکھنے کا رہتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ندائے فضلاء اپنی دشواریوں پر قابو پانے میں کامیاب ہو۔ اور اس کا معیاری صوری و معنوی ہر اعتبار سے خوب سے خوب تر ہو۔ ضلع اعظم گڑھ کے مشاہیر کا تذکرہ اور یہاں کے تاریخی مقامات اور تاریخی چیزوں کی تحقیق و تفتیش کو بھی اگر ندائے فضلاء اپنے پروگرام میں شامل کر سکے، جیسا کہ اس کے بعض مندرجات سے جھلکتا بھی ہے، تو غالباً وہ اپنے حدود سے تجاوز نہیں کرے گا۔ اعظم گڑھ ہی کے بعض دوسرے خطوں کے برعکس جہاں مدارس عربیہ کے فضلاء کا دل آسان طلب اور عوامی دلچسپی کے کاموں میں زیادہ لگتا ہے، مبارکپور کے فضلائے ٹھوس اور دقت طلب علمی کاموں کو اپنا مطمح نظر بنایا ہے جو ہر طرح سے لائق ستائش اور قابل مبارکباد ہے۔

مینیجر دو ماہی ندائے فضلاء، مبارک پور، اعظم گڑھ یوپی انڈیا ۲۷۶۴۰۴ اس پتہ سے شائقین اس دینی و علمی مجلہ کو حاصل کر سکتے ہیں۔ (ا۔ س)

ضروری اعلان

تبادلے کے اخبارات، رسائل اور مجلات جو مدیر "زندگی نو" کے نام رام پور کے پتہ پر بھیجے جاتے تھے اب اس پتہ پر ارسال کیے جائیں۔ تبصرے کے لیے کتابیں بھی اسی پتہ پر بھیجی جائیں۔

مدیر زندگی نو، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

★ جلد ۶ اپریل ۱۹۸۷ء مطابق شعبان رمضان ۱۴۰۷ھ ★ شمارہ ۴ ★

فہرست مضامین

اشارات

مقالات

ادارتی امور کے لئے خط و کتابت کا پتہ: مدیر زندگی نو، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
ترسیل زر و انتظامی امور کے لئے: منیجر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵، سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

● سالانہ زر تعاون -/۵۵ روپے ● بیرون ہند -/۲۲۵ روپے انڈین ● فی شمارہ =/5 روپے ●

سرخ نشان علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لئے فوری زر سالانہ ارسال فرمائیں یا اگلا شمارہ کسی اطلاع کے نہ ملنے پر بذریعہ وی۔ پی ارسال کیا جائے گا۔

پرنٹر پبلشر ... کی جانب سے ... میں چھپوا کر ... دفتر ماہنامہ زندگی نو ۱۹۸۷-۰۳-۲۰ ... نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ فون: ۲۶۲۲۹۸ ★ ۳۲۵۳۲۳

حکمتِ دعوت

سید جلال الدین عمری

اللہ تعالیٰ کے دین کو انسانوں تک پہنچانا بڑا وسیع ہی نہیں بڑا نازک کام بھی ہے۔ قرآن مجید نے ہدایت کی ہے کہ یہ کام حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں 'جدال' یعنی بحث و مباحثہ اور گفتگو کی بھی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ اس صورت میں 'جدالِ حسن' کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بحث اور گفتگو بہتر سے بہتر اور انتہائی شائستہ طریقہ سے ہو۔ جہاں یہ محسوس ہو کہ بات کے سمجھنے اور سمجھانے کا جذبہ نہیں ہے یا تکرار، کٹ حجتی اور بات کی پچ پائی جاتی ہے، بحث سے اجتناب کیا جائے۔ یہ پوری تفصیل سورۂ نحل کی اس آیت میں موجود ہے۔

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ
(النحل: ۱۲۵)

اپنے رب کے راستہ کی طرف دعوت دو حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ۔ اور ان سے مباحثہ کرو اس طریقہ سے جو بہتر ہو۔ بے شک تمہارا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو جو اس کے راستہ سے بھٹک گیا اور وہ ہدایت پانے والوں کو بھی جانتا ہے۔

اس آیت میں دعوت کے لیے سب سے پہلے حکمت پر زور دیا گیا ہے۔ حکمت علمی اور فکری بھی ہوتی ہے اور عملی بھی۔[1] دعوت کے لیے یہی حکمت مطلوب ہے۔ حکمتِ دعوت کے بہت سے پہلو ہیں۔ بعض پہلوؤں کی یہاں تھوڑی سی تشریح کی جا رہی ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کا دین ساری دنیا کے لیے ہے اور سب انسانوں کے لیے ہے۔ لیکن اسے پیش کرنے کے لیے مخاطب کا تعین بہت ضروری ہے۔ پہلے آپ کو طے کرنا ہوگا کہ آپ کا خطاب اس کے ماننے والوں سے ہے یا انکار کرنے والوں سے، عوام سے ہے یا خواص سے، جدید تعلیم یافتہ اصحاب سے ہے یا قدیم تعلیم یافتہ

---

[1] اللہ کے رسول دونوں طرح کی حکمت سے نوازے جاتے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ [illegible] تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ۔ جولائی، اکتوبر [illegible]

ضرورت [illegible] ہی دیکھنا ہے کہ وہ اللہ سے ہے یا بن دیکھے خدا [illegible] سے، اس کے بعد ہی آپ یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ اسلام کی دعوت کیا ہو اور کس طرح پیش کی جائے۔ بالعموم ہماری تحریروں اور تقریروں میں مخاطب کا تعین نہیں ہوتا۔ جہاں خدا کے اثبات کے بجائے اس کی اطاعت کی ضرورت ہوتی ہے وہاں ہم اس کے احکام سنانے لگتے ہیں اور جہاں اس کے احکام سنانا ہوتا ہے وہاں اللہ تعالیٰ کے وجود کے اثبات پر زور صرف کرنے لگتے ہیں۔ کبھی محسوس ہوتا ہے کہ ہم اونچے تعلیم یافتہ طبقے سے خطاب کر رہے ہیں، لیکن اچانک ہماری گفتگو، عوامی سطح سے شروع ہو جاتی ہے، کبھی خطاب کا رخ بظاہر غیر مسلموں سے ہوتا ہے لیکن جلد ہی وہ مسلمانوں سے خطاب میں تبدیل ہو جاتا ہے، کبھی نئی نسل سے اس انداز میں گفتگو ہوتی ہے جیسے پرانی نسل کے افراد سامنے بیٹھے ہوں۔ اس طرح ہمارے مخاطب بدلتے رہتے ہیں اور ساتھ ہی ہماری تقریر اور تحریر بھی بھٹکتی رہتی ہے اور ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اس وقت مخاطب کون ہے اور اس کے لیے کون سا طریقۂ دعوت مناسب ہے؟ بے محل گفتگو سے وہ فائدہ نہیں ہو سکتا جو ہونا چاہیے بلکہ بعض اوقات نقصان پہنچتا ہے۔ حکمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ گفتگو مخاطب کے ذہن و فکر کو سامنے رکھ کر کی جائے اور موقع و محل کی مناسبت سے کی جائے۔

۲۔ گفتگو چاہے اسلام کے ماننے والوں سے ہو یا نہ ماننے والوں سے موقع و محل اور مخاطب کی ذہنی استعداد کا لحاظ رکھنا بہر حال ضروری ہے۔ احادیث میں اس کے صاف اشارے موجود ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ نے ایک لمبی حدیث بیان کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کے درمیان سے اٹھ کر کسی ضرورت سے تشریف لے گئے۔ واپسی میں تاخیر ہوئی تو ہم سب کو تشویش لاحق ہو گئی۔ میں تلاش میں نکلا تو دیکھا کہ آپ ایک انصاری کے باغ میں موجود ہیں۔ میں نے عرض کیا: آپ کی تاخیر کی وجہ سے سب لوگ پریشان ہیں۔ میں بھی اسی پریشانی میں تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچا ہوں۔ آپ نے اپنے جوتے عنایت فرمائے اور کہا انھیں اپنے ساتھ لے جاؤ۔ یہ حکم اس لیے دیا تاکہ آپ کی یہ نشانی دیکھ کر صحابہ کرام کو پورا اطمینان ہو کہ حضرت ابوہریرہؓ آپ ہی کے پاس سے آ رہے ہیں اور ان کی فکرمندی دور ہو۔ اس کے بعد صحابہ کی اس محبت اور تعلق خاطر کے جواب میں فرمایا:

فمن لقيت من وراء هذا الحائط	اس دیوار کے پیچھے جس سے بھی تمہاری ملاقات ہو اور
يشهد ان لا اله الا الله مستيقنا	لا الٰہ الا اللہ کی یقینِ قلب کے ساتھ گواہی دے تو اسے
بها قلبه فبشره بالجنة	جنت کی خوش خبری سنا دو۔

جب میں آپ کے پاس سے لوٹا تو سب سے پہلے میری ملاقات حضرت عمرؓ سے ہوئی۔ میں نے ان کو آپ کا یہ ارشاد سنایا تو انھوں نے [illegible] سینے پر [illegible] مارا کہ میں گر پڑا۔ [illegible] میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی

شکایت کی کہ آپ نے حضرت عمرؓ سے ان کی اس سختی کی وجہ پوچھی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ کیا آپ نے حضرت ابوہریرہ کو یہ بشارت سنانے کے لیے بھیجا تھا؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا

لا تفعل فانی اخشی ان یتکل الناس	ایسا نہ کریں، کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ کلمہ ہی پر
علیھا فخلھم یعملون	بھروسہ کر بیٹھیں۔ آپ ان کو چھوڑ دیں تاکہ وہ عمل کریں

حضرت عمرؓ کا مطلب یہ تھا کہ یہ بشارت بلاشبہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے، لیکن اس کا مطلق انداز میں ہر شخص کے سامنے پیش کیا جانا مناسب نہیں ہے۔ اس کا غلط مفہوم بھی نکالا جا سکتا ہے اور اس سے قوت عمل بھی متاثر ہو سکتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہاں انھیں عمل کرنے دو۔[1]

اسی مفہوم کی ایک اور روایت آئی ہے۔ حضرت معاذؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما من احد یشھد ان لا الٰہ الا اللہ	جو کوئی اس بات کی صدق دل سے گواہی دے کہ اللہ
وان محمدا رسول اللہ صدقا من قلبہ	کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ
الا حرمہ اللہ علی النار	کے رسول ہیں تو اللہ ضرور اس پر جہنم کو حرام کر دے گا۔

حضرت معاذؓ نے خوش ہو کر فرمایا کہ کیوں نہ میں دوسروں کو بھی ان کے ایمان پر جنت کی یہ خوش خبری سنا دوں؟ آپ نے انھیں منع کرتے ہوئے فرمایا۔ اذا یتکلوا۔ تب تو وہ اسی پر بھروسہ کرنے لگیں گے۔[2]

یہ بخاری کی روایت ہے۔ مسلم میں یہ روایت کسی قدر تفصیل سے آئی ہے۔ اس کے الفاظ ہیں لا تبشرھم فیتکلوا۔[3] مطلب یہ کہ ان کو اس کی بشارت نہ دو ورنہ وہ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ملتے ہیں۔

لا دعھم فلیتنافسوا فی الاعمال	یہ خوش خبری انھیں نہ سناؤ انھیں اعمال خیر میں ایک
فانی اخاف ان یتکلوا[4]	دوسرے کا مقابلہ کرنے دو۔ اس خوش خبری کے سنانے
	سے مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ اسی پر تکیہ نہ کرنے لگ جائیں۔

آپ کے ارشاد کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کی شہادت دینا نجات کے لیے کافی ہے اور اس کے تقاضے پورا کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس کے اجمال سے یہ شبہ ہو سکتا تھا اس لیے جب

---

[1] مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من مات علی التوحید دخل الجنۃ [2] بخاری، کتاب العلم، باب من خص بالعلم قوما دون قوم الخ [3] مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من مات علی التوحید دخل الجنۃ

[4] فتح الباری: ۱۶۳/۱

کہ ان کی تفصیل سامنے نہ رکھی جائے اسے بیان کرنے سے منع فرمایا۔

صحابۂ کرام کے ہاں بھی اس قسم کی نصیحت ہمیں ملتی ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔

حدثوا الناس بما یعرفون أتحبون ان یکذب الله ورسوله [۱]

لوگوں کو وہ بات بتاؤ جسے وہ سمجھ سکیں، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب ہو۔

مطلب یہ کہ دین کی جو باتیں کسی شخص کے لیے بالکل نامانوس اور اجنبی ہوں وہ انھیں قبول تو نہیں کر سکتا البتہ اس کا اندیشہ ضرور ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کا انکار ہی کر بیٹھے۔ اس لیے وہ باتیں اس کے سامنے رکھنی چاہئیں جو اس کی عقل کی گرفت میں آسکتی ہوں اور جو باتیں اس کی سمجھ سے باہر ہوں ان سے احتراز کرنا چاہئے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے۔

ما انت بمحدث قوماً حدیثاً لاتبلغه عقولهم الا کان لبعضهم فتنة [۲]

جب تم کسی قوم کو ایسی حدیث سناؤ گے جس کی باریکیوں تک اس کی عقل نہ پہونچ سکے تو ان میں سے بعض افراد کے لیے یہ فتنہ بن جائے گی۔

ان احادیث اور آثار کا تعلق اصلاً مسلمانوں سے ہے لیکن ان سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ دعوت و تبلیغ ایک حکیمانہ عمل ہے۔ اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ آدمی جس مجلس میں جو مسئلہ چاہے چھیڑ دے اور موقع و محل کی رعایت کے بغیر بحث شروع کر دے۔ اس میں مخاطب کی نفسیات، اس کے ذہنی پس منظر اور ماحول کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

۳- اب آئیے یہ دیکھیں کہ جو لوگ دین کو نہ مانتے ہوں یا اس کے منکر اور مخالف ہوں ان کے سامنے دعوت کس طرح پیش کی جانی چاہئے۔ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان کے سامنے پہلے دین کی اصولی اور بنیادی باتیں رکھی جائیں تفصیلات سے جہاں تک ہو سکے تعرض نہ کیا جائے، اس لیے کہ دین کی تفصیلات کا رشتہ اس کی بنیادی تعلیمات سے جڑا ہوا ہے۔ اگر آدمی دین کی بنیادوں پر مطمئن ہو جائے تو تفصیلات سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر ان بنیادوں ہی پر اسے یقین نہ ہو تو تفصیلات پر اسے مطمئن کرنا مشکل ہوگا۔ ایک بات پر مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے گی تو دس باتوں پر اس کا عدم اطمینان باقی رہے گا۔

اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کا یہی اسوہ رہا ہے۔ وہ بنیادی طور پر سب سے پہلے توحید خالص کی دعوت دیتے رہے، ہر طرح کے شرک کی تردید کرتے رہے، رسالت کی حقیقت اور رسول کی حیثیت واضح کرتے رہے، آخرت کا صاف صاف اور مدلل تصور پیش کرتے رہے اور اخلاقی تعلیمات پر جن کی قدر و قیمت ہر انسان محسوس کر سکتا ہے زور دیتے رہے ...

[۱] بخاری، کتاب العلم، باب من خص بالعلم قوماً [۲] مسلم، مقدمہ، باب النہی عن الحدیث بکل ما سمع

کے ساتھ جو لوگ ان باتوں پر ایمان لے آئیں، انھیں دنیا اور آخرت کی کامیابی کی خوش خبری سناتے ہیں اور ان کا انکار کرنے والوں کو دنیا اور آخرت میں بھیانک نتائج سے آگاہ کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دعوت کا یہی طریقہ اختیار فرمایا۔ مکہ میں جو لوگ دین سے بے خبر تھے اور جنھیں اس کی صداقت پر یقین نہیں تھا بلکہ جو اس کے مخالف اور دشمن تھے انھیں آپ نے اصول دین ہی کی دعوت دی، ان کے حق میں مضبوط دلائل فراہم کیے اور ان کی توضیح و تشریح میں پورا زور صرف کیا لیکن شریعت کی تفصیلات نہیں بیان کیں اس لیے کہ شریعت کی ضرورت اصلاً اس کے ماننے والوں کے لیے ہوتی ہے۔ مدینہ میں بلکہ مکہ میں بھی جب کبھی بہ ضرورت پیش آئی تفصیلات فراہم کی گئیں۔

حدیث سے بھی یہی حکمت تبلیغ سامنے آتی ہے۔ صلح حدیبیہ کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ حضرت ابوسفیانؓ شام گئے ہوئے تھے، ہرقل نے وہاں ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے میں بعض سوالات کیے ان میں سے ایک سوال آپ کی تعلیمات سے متعلق تھا۔ اس نے پوچھا کہ آپ لوگوں کو کن باتوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ حضرت ابوسفیانؓ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن آپ کی تعلیمات سے بخوبی آگاہ تھے۔ انھوں نے آپ کی تعلیم کا خلاصہ اس طرح بیان فرمایا:

یقول اعبدوا اللہ وحدہ ولا تشرکوا بہ شیئا واترکوا ما یقول آباءکم ویأمرنا بالصلوٰۃ والصدق والعفاف والصلۃ [1]	وہ کہتے ہیں کہ اللہ واحد کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور تمہارے باپ دادا جو کچھ اس معاملہ میں کہتے تھے اسے چھوڑ دو۔ آپ ہمیں حکم دیتے ہیں نماز کا (اور زکوٰۃ کا)، صداقت اور راستی کا، عفت اور پاک دامنی کا اور صلہ رحمی کا۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کن بنیادی نکات پر مرکوز تھی اور کن باتوں پر آپ زور دیا کرتے تھے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گورنر کی حیثیت سے یمن بھیجا تو ہدایت فرمائی۔

انک ستاتی قوما اھل کتاب فاذا جئتھم فادعھم الی ان یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ فان ھم اطاعوا لک بذالک فاخبرھم ان اللہ قد فرض	تم عن قریب ایسی قوم کے پاس جاؤگے جو اہل کتاب ہے۔ جب ان کے پاس پہونچو تو انھیں دعوت دو کہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، کی گواہی دیں اگر وہ تمہاری یہ بات مان لیں تو انھیں بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ

[1] بخاری، کیف کان بدء الوحی

علیہم خمس صلوات فی کل یوم ولیلۃ فان هم اطاعوالک بذالک فاخبرهم ان اللّٰہ قد فرض علیہم صدقۃ تؤخذ من اغنیاءهم فترد علی فقرائهم [1]	نے ان پر پانچ نمازیں ہر دن اور رات میں فرض کی ہیں۔ اگر وہ یہ بات بھی مان لیں تو انھیں بتاؤ کہ اللہ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مال داروں سے لی جائے گی اور ان کے محتاجوں کو لوٹا دی جائے گی

یمن میں اس وقت اہل کتاب ہی نہیں مشرک بھی تھے۔ آپ نے اہل کتاب کا خاص طور پر غالباً اس لیے ذکر فرمایا کہ وہ آسمانی کتابوں کے ماننے والے اور پڑھے لکھے تھے۔ اس لیے فطری طور پر ان سے خطاب کا طریقہ بھی مشرک قوموں سے خطاب کے طریقہ سے مختلف ہونا چاہئے تھا یہ ایک طرح سے مخاطب کو پہلے سے ذہن میں رکھنے اور مناسب انداز اختیار کرنے کی ہدایت تھی۔

اس حدیث سے یہ رہنمائی بھی ملتی ہے کہ داعی کے ذہن میں تو دین پورا کا پورا ہوگا لیکن اسے وہ ایک ترتیب سے پیش کرے گا۔ اسی حدیث میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں۔

فلیکن اول ما تدعوهم الیہ عبادۃ اللّٰہ عزوجل فاذا عرفوا اللّٰہ عزوجل فاخبرهم.... [2]	پہلی چیز جس کی تم ان کو دعوت دوگے وہ اللہ عزوجل کی عبادت ہوگی۔ جب وہ اللہ عزوجل کو پہچان لیں تو انھیں بتاؤ....

اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی دعوت دو۔ اللہ کا وہ تصور جو اسلام پیش کرتا ہے جب ان کی سمجھ میں اچھی طرح آجائے اور وہ یہ تسلیم کرلیں کہ اسی کی عبادت ہونی چاہئے تو پھر شریعت کی تفصیلات ان کے سامنے رکھو۔ لیکن وہ بھی سب کی سب اور ایک ساتھ نہیں بلکہ اس میں بھی ایک ترتیب ہونی چاہئے۔ یہ ترتیب احکام شریعت کی اہمیت کے لحاظ سے ہوگی۔ جو حکم جتنا اہم ہوگا اتنا ہی اسے مقدم رکھا جائے گا۔ جس حکم کی جتنی اہمیت کم ہوگی اس کا مقام بھی دعوت میں اسی لحاظ سے متعین ہوگا۔

یہاں ابھرنے والے ایک سوال کا جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اب دین مکمل ہو چکا ہے۔ اس کے اصول و فروع سب کے سامنے ہیں۔ غیر مسلموں سے گفتگو میں بھی اصول دین ہی نہیں فروع دین بھی زیر بحث آسکتی ہیں۔ کیا ان کا جواب نہ دیا جائے اور ان سے احتراز کیا جائے؟

اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ جہاں اس طرح کا کوئی سوال پیدا ہو اس کا جواب فراہم کرنا عین تقاضائے دعوت ہے۔ پیغمبروں کی دعوت میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ انھوں نے وقت ضرورت دین کی تفصیلات

[1] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب اخذ الصدقۃ من الاغنیاء۔

[2] مسلم، کتاب الایمان، باب الدعاء الی الشھادتین الخ۔

سے بحث کی ہے اور جو سوالات اٹھے ان کا جواب دیا ہے۔ لیکن یہ بات بہر حال ذہن میں رہنی چاہیے کہ احکام شریعت کا سرا اصول دین سے جڑا ہوا ہے۔ اس لیے توجہ اصلاً اصول دین ہی پر مرکوز رہنی چاہیے اور مخاطب کو ان ہی پر مطمئن کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

۴۔ بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب تک بات سختی کے ساتھ نہ کی جائے اور مخاطب کو چوٹ نہ لگے، دعوت کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ ایسے مواقع بھی آتے ہیں جہاں سختی کی بھی ضرورت پیش آتی ہے اور باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور ڈنکے کی چوٹ پر حق کا اظہار کرنا پڑتا ہے لیکن یہ بات ہمیشہ داعی کے پیش نظر رہنی چاہیے کہ محض اس کے غلط اندازِ تخاطب کی وجہ سے مخاطب کے اندر دعوت ہی کے خلاف نفرت اور بے زاری کے جذبات نہ بھڑک اٹھیں۔ خطاب کی درشتی سے بالعموم مخاطب کی انا مجروح ہوتی اور اس کے پندار کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ وہ داعی کو اپنا حریف اور دعوت کی مخالفت کو اپنا فرض تصور کرنے لگتا ہے۔ اس لیے حکمت کا تقاضا ہے کہ دعوت کا ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ مخاطب دعوت میں دلچسپی اور کشش محسوس کرنے کی جگہ اس سے دور ہو جائے۔ داعی کے خطاب میں نرمی اور ملاطفت ہونی چاہیے۔ یہ نرمی کسی ڈر اور خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ مخاطب کو قریب کرنے کے لیے ہوگی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو فرعون کے سامنے اللہ کا پیغام پہنچانے کا حکم دیا گیا تو ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی گئی کہ انداز خطاب میں نرمی ہو۔ ارشاد ہے:

اِذْهَبَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ۔ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ ۔ قَالَا رَبَّنَا إِنَّنَا نَخَافُ أَن يَفْرُطَ عَلَيْنَا أَوْ أَن يَطْغَىٰ ۔ قَالَ لَا تَخَافَا إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرَىٰ ۔

(طٰہٰ: ۴۳-۴۶)

تم دونوں جاؤ فرعون کے پاس۔ بے شک اس نے سرکشی کی ہے، اس سے نرمی سے بات کرو۔ شاید وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈرے۔ دونوں نے عرض کیا، اے ہمارے رب ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہمارے ساتھ زیادتی کرے گا اور پل پڑے گا۔ اللہ نے فرمایا تم مت ڈرو۔ بے شک میں تمہارے ساتھ ہوں سب کچھ سن رہا ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حق کا اظہار و اعلان بہر حال ہوگا، فرعون جیسی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے ہوگا اور بے خوف و خطر ہوگا لیکن اس بات کا ضرور خیال رکھا جائے گا کہ ہمارے لب و لہجہ کی تلخی اور انداز کی خرابی مخاطب کو حق سے دور نہ کر دے اور اس کے دل کے دروازے کھلنے کی جگہ بند نہ ہو جائیں۔ بعض اوقات پہاڑ جیسی صداقت بھی محض انداز کی خرابی کی وجہ سے رد کر دی جاتی ہے اور کبھی تلخ سے تلخ حقیقت کو بھی شیریں کلامی قابل قبول بنا دیتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو 'قول لین' کی جو نصیحت کی گئی تھی اس

کے ذیل میں حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں "کہ اس میں بڑی عبرت اور نصیحت ہے۔ وہ یہ کہ فرعون سرکشی اور نافرمانی کی آخری حد کو پہنچا ہوا تھا اور موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مخلص اور منتخب بندہ تھے، لیکن اس فرق کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنے اس مخلص بندہ کو حکم دیا کہ وہ فرعون سے نرمی اور ملاطفت کے ساتھ بات کریں۔ گفتگو کا کیا انداز اختیار کرنے کا حکم دیا گیا تھا اس بارے میں سلف کے بعض اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ بات میں نرمی اور محبت ہو تاکہ نفس پر اس کا گہرا اثر پڑے۔

(تفسیر ابن کثیر: ۱۵۳/۳)

حضرت موسیٰؑ کو فرعون سے جس طرح خطاب کا حکم دیا گیا تھا اس کا ذکر دوسرے مقام پر اس طرح آیا ہے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى

(نازعات: ۱۸، ۱۹)

جاؤ فرعون کے پاس اس نے سرکشی کی ہے۔ اس سے کہو کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ سنور جائے اور میں تیرے رب کی طرف تیری راہنمائی کروں تاکہ تو اس سے ڈرے۔

اس میں فرعون کی سرکشی پر تنقید بھی ہے اور اصلاح حال کی دعوت بھی ہے۔ لیکن دونوں باتوں میں نصیحت اور خیر خواہی کا پہلو غالب ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے حضرت موسیٰؑ اس کی فلاح و کامیابی کے لیے بے چین ہیں۔ یہی انداز دعوت میں مطلوب ہے۔

حکمت کے بعض اور پہلوؤں پر ان شاء اللہ آئندہ روشنی ڈالی جائے گی۔

مقالات:

میں بھی حاضر تھا وہاں

(۴)

حکیم خواجہ اقبال احمد ندوی

لاہور میں میرا مولانا سے قرآن مجید کا درس چل رہا تھا اور میں اسے ختم کیے بغیر گھر آنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ مگر وہ جنگ کا زمانہ تھا اور بین الاقوامی حالات بالکل غیر یقینی سے تھے۔ چنانچہ ان حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا ایک دن فرمانے لگے کہ ہو سکتا ہے کہ جنگ کے شعلے ہندوستان تک پہنچ جائیں۔ اُس وقت کہا نہیں جا سکتا کہ آپ کب گھر جا سکیں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ آپ گھر جا کر جلد واپس آ جائیے۔ اس طرح میں بادل ناخواستہ گھر چلا آیا۔ گھر آنے سے پہلے مجھے اور نگ زیبی پھوڑے نکل رہے تھے مگر تکلیف نہ تھی جس کی وجہ سے علاج کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ گھر پہنچ کے بعد جب تکلیف میں اضافہ ہو گیا اور علاج سے فائدہ کی شکل نظر نہ آئی تو میں نے مولانا کو یہ تکلیف دہ صورت حال لکھ دی۔ ان کا جواب آیا کہ اورنگ زیبی پھوڑے مجھے بھی نکل آئے ہیں۔ اور ایک انجکشن سے آرام ہے۔ لہٰذا آپ فوراً یہاں آ جائیں تاکہ وہی انجکشن آپ کو لگوا دوں۔ مگر لاہور سے روانہ ہوتے وقت ایک صاحب نے مجھے ایک نسخہ لکھا دیا تھا جس کے استعمال سے چند دن میں پھوڑے ٹھیک ہو گئے۔ اور میں نے مولانا کو اس کی اطلاع کر دی۔ مولانا کا خط آیا کہ ہم سب لوگ " دارالاسلام " منتقل ہو رہے ہیں اس لیے آپ گھر سے وہیں آ جائیے گا۔ میری موجودگی میں چودھری نیاز علی خاں صاحب مرحوم سے یہ گفتگو چل رہی تھی۔ مولانا کے ایک مکتوب سے " دارالاسلام " میں ان کے قیام سے متعلق یہ تفصیلات معلوم ہوتی ہیں:۔

> دارالاسلام کے لیے چودھری نیاز علی صاحب (ریٹائرڈ ایس ڈی او محکمہ نہر) نے ۶۰، ایکڑ زمین وقف کی تھی میں نے چودھری صاحب کے بنائے ہوئے مکانات میں قیام کیا تھا۔ اس زمین کی آمدنی کا مجھ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میری ذات یا ترجمان القرآن، یا جماعت اسلامی کے کسی کام میں اس کی آمدنی کا ایک پیسہ بھی کبھی خرچ نہیں ہوا۔
>
> میں ۱۸ / مارچ ۳۸ ۱۹ء کو وہاں پہنچا تھا اور دسمبر ۳۸ء تک وہاں رہنے کے بعد لاہور منتقل ہو گیا تھا۔ بعد میں جون ۴۲ء میں پھر منتقل ہوا اور اگست ۴۷ء کے اختتام تک وہاں رہا۔[1]

---

[1] مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی حصہ اوّل ص ۲۰۷

مولانا حیدر آباد سے منتقل ہوئے تو پہلے دارالاسلام ہی تشریف لائے تھے۔ مگر چند ماہ قیام کے بعد جب انھوں نے محسوس کیا کہ یہاں انھیں اپنی مرضی کے مطابق کام کے مواقع حاصل نہیں ہیں تو وہ لاہور منتقل ہو گئے تھے۔ چند سال بعد چودھری صاحب مرحوم کا اصرار پھر بڑھا کہ مولانا دارالاسلام آ جائیں تو مولانا ایسی شرائط پر راضی ہوئے تھے جن سے ان کے کام میں کسی کی مداخلت کا امکان باقی نہ رہے۔ ۱۹۳۸ء میں جب مولانا اور چودھری صاحب کے درمیان اختلاف رونما ہوا تو مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی، مولانا کے ساتھ تھے۔ اس لیے مولانا اصلاحی صاحب سے ہی یہ تفصیلات سنئے کہ اختلاف کی نوعیت کیا تھی اور مولانا دارالاسلام سے لاہور کیوں اور کیسے منتقل ہوئے۔ ملاحظہ ہو!

" یہ بات تو سبھی لوگ جانتے ہوں گے کہ مولانا مودودیؒ نے اپنی تحریک کا آغاز دارالاسلام (پٹھان کوٹ) سے کیا تھا اور اس بات سے بھی لوگ بالعموم واقف ہی ہوں گے کہ مولاناؒ حیدر آباد سے دارالاسلام، ڈاکٹر اقبالؒ کے مشورے اور چودھری نیاز علی خاں صاحب کی دعوت پر آئے تھے، لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مولاناؒ اپنی تحریک کی عملی بنیاد ڈالتے ہی چند دنوں کے اندر اندر دارالاسلام کو چھوڑ کر لاہور کیوں منتقل ہو گئے تھے۔ پچھلے تین چار مہینوں کے دوران کچھ لوگوں کے ایسے مضامین دیکھنے میں آئے جن میں اس انتقالِ مکانی کی عجیب اور بے سروپا قسم کی وجہیں بتائی گئی ہیں اور ان میں سے ایک بزرگ نے تو اس سلسلے میں حسب معمول قیاسِ زور سے کام لینے میں قباحت محسوس نہیں کی ہے۔ چونکہ اس وقت کم از کم ہندوستان کی حد تک، میں تنہا وہ شخص ہوں جو اس معاملہ سے براہ راست متعلق رہا ہے، اس لیے یہ میری ذمہ داری قرار پاتی ہے کہ اس حقیقت واقعی کو روشنی میں لاؤں جو اس نقل مکانی کی پہلی اور آخری وجہ تھی۔ اس سے نہ صرف یہ کہ اس بارے میں مذکورہ بالا غلط بیانیوں کی تصیح ہو جائے گی اور لوگ اصل صورت واقعہ سے واقف ہو جائیں گے۔ بلکہ ساتھ ہی مولانائے مرحوم و مغفور کی سیرت کا ایک خاص اور اہم پہلو بھی سامنے آ جائے گا۔

پہلے اس واقعہ کا پس منظر جان لیجئے۔

مولانا ۱۳ مارچ ۱۹۳۸ء کو حیدر آباد سے دارالاسلام، جمال پور (نزد پٹھان کوٹ) منتقل ہوئے تھے، یہ منتقلی ڈاکٹر اقبال مرحوم کے مشورے اور چودھری نیاز علی خاں صاحب مرحوم (ساکن جمال پور نزد پٹھان کوٹ) کی دعوت پر ہوئی تھی اور اس لیے ہوئی تھی کہ یہاں مرکز بنا کر احیائے اسلام کی دعوت کا کام منظم طور سے شروع کیا جائے۔ یہاں آ کر مولانا نے ان فکر انگیز مضامین کا سلسلہ پایۂ تکمیل کو پہنچایا جو ان کی مشہور تصنیف "موجودہ سیاسی کشمکش اور مسلمان" میں موجود ہیں۔ اس سلسلہ مضامین میں مولاناؒ نے اس دعوت و تحریک کا ایک عملی خاکہ بھی پیش کیا جس کے مطابق ان کے نزدیک برصغیر میں احیائے اسلام کا کام منظم طور پر کیا جانا چاہئے تھا اسے پڑھ کر اطراف ملک کے بہت سے اصحاب نے مولاناؒ کو تائیدی خطوط لکھے اور تجویز پیش کی کہ اللہ کا نام لے کر ان خطوط پر کام شروع کر دیا جانا چاہیے، اس تجویز یا اس مطالبے کے

بعد مولانا نے ۱۹۳۸ء کے اواخر میں ایک دستور کا خاکہ مرتب کیا جس میں پیش نظر تحریک کے مقصد، طریق کار اور اصول وضوابط کی تفصیل درج تھی۔ اس مسودۂ دستور کی انہوں نے اس طرح کتابت کرائی کہ ایک طرف کے صفحات سادے رکھے گئے تھے اور مقابل کے صفحات پر مسودہ کی عبارت درج تھی۔ طباعت کے بعد انھوں نے اس مسودۂ دستور کی کاپیاں ان تمام حضرات کو بھجوا دیں جو اس کام سے دلچسپی ظاہر کر چکے تھے اور ان کے علاوہ بھی بہت سے ارباب علم وفکر کے پاس روانہ کرائیں اور ان سب لوگوں سے گذارش کی کہ اس مسودۂ دستور کو بغور مطالعہ فرمائیں۔ اور اس کے اندر جہاں جہاں بھی وہ کوئی حذف یا اضافہ یا ترمیم تجویز کریں اس کو خالی صفحات پر درج کرتے جائیں تاکہ جب اس مسودہ کو آخری شکل دینے کے لیے مشاورتی اجتماع ہو تو یہ ترمیمات اور حذف واضافے بھی غور وبحث کے وقت سامنے رہیں پھر ایک مناسب مدت کے بعد موصوف نے ان تمام حضرات کو دارالاسلام میں ایک متعینہ تاریخ پر اکٹھے ہونے کی دعوت دی۔ کچھ لوگوں کا تو کوئی جواب موصول نہ ہوسکا، کچھ لوگوں نے کسی بنا پر شریک اجتماع ہونے سے معذوری ظاہر کی اور لکھا کہ ہم اپنی ترمیمات اور مشورے مسودۂ دستور میں درج کر کے بھیج رہے ہیں، باقی لوگ تشریف لائے۔ ۱۹۳۹ء کے اوائل میں یہ مجوزہ اجتماع دارالاسلام میں مولانا کی رہائش گاہ میں منعقد ہوا۔ حاضرین میں سے اکثریت مغربی ہند کے لوگوں کی تھی۔ یوپی سے شریک ہونے والوں میں مولانا منظور نعمانی صاحب بھی تھے۔ باہمی غور وبحث کے بعد دستور اپنی آخری شکل میں منظور ہوگیا اور اسی وقت سے چودھری نیاز علی صاحب کا اختلاف بھی شروع ہوگیا۔ اس اختلاف کا مبنیٰ منظور شدہ دستور کی وہ دفعہ تھی جس میں تحریک کا نصب العین اسلامی حکومت کا قیام بتایا گیا تھا۔ بہر حال اجتماع ہوگیا تو اسی دن (یا اگلے دن) بعد عصر شرقی صاحب کی رہائش گاہ کی بیٹھک میں وہ لوگ اکٹھا ہوئے جنہوں نے اس دستور کے مطابق تحریک کے قیام اور اس میں شریک ہونے کے لیے آمادگی ظاہر کی تھی۔ یہ کل پانچ آدمی تھے۔ سب سے پہلے مولانا نے تجدید شہادت کی اس کے بعد باقی چار آدمیوں نے دوسرے لفظوں میں یہ کہ تحریک کی باقاعدہ بنیاد ڈالی۔ جس کے بعد چودھری صاحب کے اختلاف نے اپنا عملی اثر دکھانا شروع کر دیا۔ وہ اپنے مزاج کے مطابق نہایت نرم اور شائستہ انداز میں مگر اصرار کے ساتھ مولانا سے کہتے رہے کہ دستور میں اسلامی حکومت کا لفظ نہیں رہنا چاہئے۔ ان کا کہنا تھا کہ الفاظ اور اصطلاحات میں کیا رکھا ہے اصل چیز تو کام ہے، آپ اپنا کام کرتے رہیں، مگر دستور میں اسلامی حکومت کی اصطلاح کے رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے چودھری صاحب کی اس رائے یا خواہش کے پیچھے کیا مصلحت کام کر رہی تھی میں اس کرید میں نہیں پڑنا چاہتا خصوصًا اس لیے کہ اب وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ مولانا نے ان کے جواب میں نہایت صفائی اور پوری سنجیدگی سے فرمایا کہ اگر ہمیں یہاں اپنے طور پر کام کرنے کا موقع نہیں ملتا تو ہم اب کہیں اور جا کر یہ کام کریں گے۔ چنانچہ انھوں نے لاہور منتقل ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مولانا کے اس فیصلے سے چودھری صاحب سخت پریشان ہوگئے۔ انھوں نے مولانا کو منانے کی بڑی کوشش کی۔ جب اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب نہ ہوسکے تو قصبہ دینا نگر کے شیخ نصیب صاحب کو

بلایا جو دارالاسلام ٹرسٹ کے ٹرسٹیوں میں سے تھے۔ شیخ صاحب تشریف لائے اور انھوں نے بھی اپنی سی پوری کوشش کی کہ مولانا دارالاسلام سے نہ جائیں۔ مگر بات جہاں تھی وہیں رہی۔ مولانا نے اپنے فیصلہ پر اٹل رہے اور شیخ صاحب مایوس و دل گرفتہ واپس چلے گئے۔ ان ہی دنوں مولانا کا فرمایا ہوا یہ جملہ مجھے اب تک یاد ہے کہ "عجیب مشکل ہے، جن لوگوں کے پاس روپیہ ہے وہ سمجھتے ہیں کہ عقل بھی ان ہی کے پاس ہے"۔ غرض منتقلی کا فیصلہ برقرار رہا کتابیں رات گئے تک پیک کی گئیں، صبح کو ٹرک پر سامان لادا گیا اور ہم لوگ اس حال میں لاہور روانہ ہو گئے کہ بالکل نہیں معلوم تھا کہ اب پاؤں ٹکانے کی جگہ کب اور کہاں ملے گی؛ مزید لطف کی بات یہ کہ ادارے کے مالی حالات بھی مسلسل صبر آزما چل رہے تھے۔ سہ پہر کے وقت لاہور پہنچ کر ترجمان القرآن کے مینیجر سید محمد شاہ صاحب کے ذاتی مکان (واقع محلہ مصری شاہ) میں سامان اتار کر رکھ دیا گیا اور شام کو قیام گاہ اور دفتر کے لیے مکان کی تلاش شروع ہوئی جو کئی دنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد کامیاب ہو سکی یہ تھی دارالاسلام (پٹھان کوٹ) سے لاہور منتقل ہو جانے کی اصل وجہ، اور یہ تھا اس نقل مکانی کا اصل واقعہ۔

اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب ڈھائی تین سال بعد مولانا پھر دارالاسلام لوٹے تھے تو کس شرط پر لوٹے ہوں گے میں اُن دنوں لاہور میں موجود نہیں تھا اس لیے براہ راست علم کی بنا پر کوئی روایت نہیں کر سکتا مگر دارالاسلام واپس لوٹنے سے چند ماہ قبل مولانا نے مجھے اس بارے میں جو اطلاع دی تھی اس سے حقیقت واقعہ پوری طرح سمجھ لی جا سکتی ہے۔

یکم فروری ۱۹۴۱ء کے اپنے ایک گرامی نامہ میں موصوف نے تحریر فرمایا تھا کہ:

"کچھ مدت سے چودھری نیاز علی خاں صاحب اور شیخ نصیب صاحب نے پھر اصرار شروع کیا ہے کہ تم پھر پٹھان کوٹ والی جگہ کو اپنے ہاتھ میں لے لو۔ اس سلسلہ میں بہت کچھ خط و کتابت ہوئی اور بات چیت کی نوبت بھی آئی۔ آخر میں یہ تصفیہ ہوا ہے کہ وہ عمارات مع چار چھ ایکڑ زمین کے ۹۰ سال کے پٹے پر میں ان سے لے لوں گا اور شرح کرایہ سو روپیہ سالانہ یا اس کے قریب قریب ہوگی۔ اس صورت میں ہمارے ادارے کا ان کے ٹرسٹ سے کوئی تعلق نہ رہے گا اور نہ کسی قسم کی مداخلت کا ان کو حق ہوگا۔ ہم محض ایک کرایہ دار کی حیثیت سے وہاں رہیں گے جس طرح یہاں (لاہور میں) کرایہ دے کر رہتے ہیں"[1]

میں جب "دارالاسلام" پہنچا تو مولانا کے ساتھ قمرالدین خاں صاحب وہاں موجود تھے۔ البتہ مستری صاحب مرحوم کے متعلق یاد نہیں کہ تشریف لے آئے تھے یا میرے بعد تشریف لائے۔ بہر حال سب لوگ بڑی محبت سے ملے۔ مولانا کے پھوڑے اس وقت تک ٹھیک نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے میرے زخموں کے نشانات کو دیکھا اور علاج کی تفصیل اور گھر کے حالات معلوم کرتے رہے۔

مستری صاحب کا نام محمد صدیق صاحب تھا مگر وہ مستری صاحب کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ وہ سلطان پور لودی کے

[1] ہفت روزہ دعوت نئی دہلی۔

رہنے والے تھے اور شادی ان کی بنارس میں ہوئی تھی۔ مستری صاحب سے میری پہلی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی تھی جب میں ندوہ کا طالب علم تھا۔ اس ملاقات کے بعد وہ جب جب لکھنؤ آئے، وقت نکال کر انھوں نے مجھ سے مزید ملاقات کی یہی حال لاہور کا رہا۔ وہاں بھی جب وہ تشریف لائے تو موقع نکال کر بڑی تفصیلی گفتگو فرمائی۔ "دارالاسلام" میں تو ہر وقت کا رہنا سہنا تھا اس لیے سراپا محبت بنے ہوئے تھے۔ میں بھی ان کا بڑا ادب و احترام کرتا تھا اور میرے لائق جو بھی خدمت رہتی، اس کے لیے ہر وقت مستعد رہتا تھا۔

مستری صاحب کے چہرہ پر ہر وقت خشوع وخضوع کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اور حالت نماز میں اس کیفیت کے اندر مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ مستری صاحب کی اہلیہ مالیخولیا میں مبتلا تھیں اور انھیں ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کوئی مستری صاحب کو مار نہ ڈالے۔ کبھی کبھی ان کے دماغی توازن میں بھی اختلال پیدا ہو جاتا تھا۔ ساتھ میں ایک چھوٹا بچہ تھا۔ اہلیہ کی تکالیف شدت اختیار کر لیتیں تو خشوع وخضوع کی طرح مستری صاحب کا صبر وشکر بھی انتہائی قابل تحسین ہوتا۔

مستری صاحب کا مولانا آزاد کے یہاں اس زمانہ میں قیام رہ چکا تھا جب انھوں نے "حزب اللہ" قائم کی تھی۔ اس کے علاوہ سرائے میر میں اپنی کسی ملازمت کے دوران، انھیں مولانا فراہی صاحب کے درس قرآن کو بھی سننے کا موقع مل گیا تھا۔ یہ مواقع جو انھیں میسر آگئے تھے ان کے باعث وہ قرآن مجید کی بعض آیات اور بعض چھوٹی سورتوں کے مطالب بڑے موثر اور بڑے پر اعتماد انداز میں بیان کر لیا کرتے تھے۔

ان صفات کے ساتھ مستری صاحب مرحوم پر ایک غیر اعتدالی کیفیت کا غلبہ ہو گیا تھا۔ جس کا ایک رخ یہ تھا کہ خانقاہوں اور دینی درس گاہوں کے متعلق ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہاں احساس گناہ کی حس کو بالکل ختم کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان دونوں اداروں کے متعلق وہ فرمایا کرتے تھے کہ بھیا! بدھی کر دیتے ہیں وہاں بدھی! وہاں جانے کے بعد آدمی کے اندر سے گناہ کا احساس ہی ختم ہو جاتا ہے۔ کتنا ہی بڑا گناہ آدمی سے سرزد ہو جائے لیکن ندامت تو بڑی بات ہے۔ یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کے "دارالاسلام" میں تشریف لانے کے بعد، مستری صاحب کے اس جذبہ کا جب بھی اظہار ہوتا تو اس طبقہ میں جس کے متعلق ان کے دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ احساسِ گناہ کی حس بالکل ختم ہو گئی ہے وہ خاص طور سے مولانا نعمانی صاحب کو ضرور شامل کر لیا کرتے تھے۔

دوسرا رخ مستری صاحب کی غیر اعتدالی کیفیت کا یہ تھا کہ وہ پکڑ پکڑ کر "اصلاح قلب" کی مشق کرانے کے خوگر ہو گئے تھے۔ چنانچہ میں ان سے بہت قریب تھا اس لیے مجھے اکثر ان کا تختۂ مشق بننا پڑتا۔ کلمہ طیبہ کے مختلف الفاظ کے متعلق فرماتے کہ انھیں یہاں سے اٹھاؤ اور یہاں مارو۔ انھیں یہاں سے اٹھاؤ اور یہاں مارو" پھر اصرار رہتا کہ اس کی مشق کرنے کے بعد انھیں سناؤں۔ گویا یہی کام خانقاہوں میں انجام پائے تو برا بن جائے اور اسی کو مستری صاحب خود انجام دیں تو

"اصلاح قلب ہو جائے۔ مستری صاحب مرحوم کی میرے اوپر خصوصی لطف و کرم کی وجہ شاید یہی تھی کہ انھوں نے غلطی سے پہلی ملاقات کے بعد ہی میرے متعلق یہ رائے قائم کر لی تھی کہ میں ان کی توجہات کو قبول کرنے کی اپنے اندر صلاحیت رکھتا ہوں۔ اسی لیے انھوں نے پہلی ملاقات ہی سے میرے اوپر توجہ شروع کر دی۔ پھر لکھنؤ اور لاہور میں جب جب ملاقات ہوئی اس سے غافل نہیں رہے بہرحال" دارالاسلام' میں ان کی اس روش سے میں عاجز ہو گیا تو مجھے مولانا کی مدد لینی پڑی تب نجات ملی۔ مگر مولانا کی فہمائش سے انھیں اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا بلکہ اسے انھوں نے اپنی صلاحیتوں کے بروئے کار لانے کی راہ میں مزاحمت سمجھا اور بد دل ہو گئے۔

مستری صاحب مرحوم صرف معمولی اُردو جانتے تھے مگر اس تلخ حقیقت کو محسوس کرنے کے بجائے وہ اپنے علم و آگہی اور دانش و بینش کے متعلق فریب خوردگی کا شکار ہو گئے تھے اور چاہتے تھے کہ جو خیالات ان کے ذہن میں جس طرح جاگزیں ہو گئے ہیں مولانا بلا حیل و حجت ان پر عمل پیرا ہو جائیں۔ اب مولانا کے لیے ایسا کرنے میں دشواری یہ تھی کہ اللہ نے انھیں کتاب و سنت کے علم اور دینی بصیرت سے نواز رکھا تھا اس لیے وہ ایسی باتوں پر عمل پیرا ہونے سے معذور تھے جن کی حیثیت محض مزعومات کی ہو یا جن کی پشت پر کتاب و سنت کے دلائل کے بجائے صرف "انا" اپنا کام کر رہا ہو۔ چنانچہ ایسے مواقع پر جب مستری صاحب کی طرف سے کسی غلط موقف کو اختیار کر لینے کی خواہش کا دبے الفاظ میں اظہار ہوتا اور مولانا دلائل سے اس کے نقائص ان پر واضح کر دیتے تو مستری صاحب دلائل سے قائل کر دینے یا قائل ہو جانے کا رویہ اختیار کرنے کے بجائے مولانا کے سامنے تو خاموش ہو جاتے لیکن بعد میں اپنی بد دلی اور مایوسی کا اظہار شروع کر دیتے۔ مستری صاحب مرحوم کی یہ غلط روش کسی بدنیتی پر مبنی نہ ہوتی تھی۔ ان کی سمجھ کے مطابق بد دلی اور بے اطمینانی پھیلانا بھی خلوص میں شامل تھا۔ مگر جماعتی زندگی میں پورے خلوص کے ساتھ بھی اس قسم کی غلطیاں اپنے اثرات دکھا کر رہتی ہیں۔ چنانچہ" دارالاسلام" میں مستری صاحب کی غلطیوں نے بھی اپنے اثرات دکھائے اور" دارالاسلام" کے انتشار میں ان کی بے اعتدالی ایک بہت زبردست عامل بنی رہی۔ الغرض انفرادی زندگی کے لیے مستری صاحب مرحوم کا خشوع و خضوع جتنا قابل ستائش تھا جماعتی زندگی کے لیے ان کی بے اعتدالی اتنی ہی زیادہ مہلک تھی۔

بلاشبہ مستری صاحب مرحوم کی یہ خوبی کی" جماعت اسلامی" سے نکلنے کے بعد وہ" اقامت دین" کے دشمن نہیں بن گئے اور اس بات کا احساس ہو جانے کے بعد کہ" جماعت اسلامی" سے نکل کر انھوں نے غلطی کی ہے ان کا خود مولانا مودودی کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ درخواست پیش کرنا کہ انھیں" جماعت اسلامی" میں داخل کر لیا جائے، ان کی شخصیت کو" جماعت اسلامی" سے نکلنے والے تمام حضرات کی شخصیتوں سے ممیز کر دیتا ہے۔ چنانچہ مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی اپنے انٹرویو میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ وضاحت فرماتے ہیں،

... نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر یہ بھی بتا دوں کہ جو حضرات ان دنوں جماعت سے نکلے تھے ان

میں سے ایک نہایت نیک منش بزرگ (مستری صدیق صاحب مرحوم) نے ۴۵ء کے اجتماع دارالاسلام کے بعد خواہش ظاہر کی تھی کہ انھیں جماعت میں پھر داخل کر لیا جائے۔ مولانا نے ان کو جواب دیا کہ رکنیت تو ایک ضابطہ کی چیز ہے اصل چیز وہ کام ہے جو ہم کر رہے ہیں، آپ ہمارے ساتھ آکر دعوت کا کام کریں رکنیت کا مسئلہ بعد میں طے ہوتا رہے گا۔[1]

اسی طرح مستری صاحب مرحوم کے قدیم رفیق مولانا ابو محمد صاحب رام نگری اپنے مضمون "جب تحریک اقامت دین کی نیو رکھی جا رہی تھی" میں ۴۵ء کے "اجتماع دارالاسلام" کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

. . . . مستری محمد صدیق صاحب جماعت سے الگ ہو چکے تھے، مگر تحریک و دعوت کے مخالف نہیں ہو گئے تھے، وہ بھی اجتماع میں آئے تھے۔[2]

مولانا رام نگری کے مذکورہ بالا مضمون سے مستری صاحب کے متعلق مندرجہ ذیل تفصیلات معلوم ہوتی ہیں:

اب آگے کی بات سمجھانے کے لیے ہمیں پیچھے ہٹنا ہوگا، ہم نے اوپر مستری محمد صدیق صاحب کا ذکر کیا ہے۔ یہ بھی بڑی خوبی اور خصوصیت کے شخص تھے، رہنے والے سلطان پور ریاست کپورتھلہ کے تھے، نہ معلوم کیسے بنارس آکر یہاں رہ پڑے تھے، ایک پنجابی مستری خاندان میں عقد ثانی کر لیا تھا، آٹے کی مشین کی مرمت کے بڑے ماہر تھے، دور دور کے لوگ ان کو مشین کی مرمت کے لیے لے جاتے تھے، میں نے ان کی دینی تعلیم کے بارے میں ان سے کبھی کچھ نہیں پوچھا، انگریزی کے صنعتی رسائل دیکھا کرتے تھے تو کانگرسی خیال کے، مگر معلوم نہیں ان کے اندر اسلام کے وہ تصورات کیسے پیدا ہو گئے تھے جن پر جماعت اسلامی قائم ہوئی انھوں نے ترجمان القرآن بھی نہیں دیکھا تھا، مولانا آزاد کے مرید تھے، ممکن ہے "الہلال" اور "البلاغ" دیکھا ہو، مگر کبھی ان کا ذکر نہیں کرتے تھے۔

مستری صاحب صلوٰۃ میں لحن کے ساتھ قرأت پسند نہیں کرتے تھے، وہ عرض و نیاز کے انداز میں نماز پڑھتے تھے۔ مستری صاحب کی اسلامی تعلیم بھی معمولی تھی، مطالعہ بھی وسیع نہ تھا، قرآن مجید کے سوا ان کے پاس شاید دینی کتابیں بھی نہ تھیں، اس لیے ان پر اسلامی نظام زندگی واضح نہ تھا، نہ وہ اس کی وضاحت کر سکتے تھے، مگر اصولاً لوگوں کو وہی دعوت دیتے تھے جو دعوت جماعت اسلامی دیتی تھی۔ جب جماعت کا وجود نہ تھا وہ بار بار مجھے تقاضا کرتے کہ ہم لوگوں کو اسلامی نظام قائم کرنے کی تحریک لے کر اٹھنا چاہیے اور میں بار بار کہتا کہ یہ کام ہم لوگوں کے کرنے کا نہیں ہے، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا حسین احمد صاحب

---

[1] سہ روزہ دعوت دہلی، مفکر اسلام سید مودودی نمبر، ص ۹

[2] ایشیا لاہور ۲۴ فروری ۱۹۸۵ء ص ۳۱

میں مولانا سید سلیمان ندوی جیسے لوگ بھی ہیں، یہ کسی بڑے آدمی کو اس تحریک کے لئے اٹھانا چاہتے تھے، جب ہم لوگ کسی طرح اس کام کے لیے تیار نہ ہوئے تو مستری صاحب دل برداشتہ ہو کر بنارس کی سکونت ترک کر کے اپنے وطن سلطان پور چلے گئے۔

یہاں مولانا اصلاحی کا ایک اور قول قابل ذکر ہے مستری محمد صدیق صاحب مولانا مودودیؒ سے اختلاف رائے کی وجہ سے ابتدا ہی میں جماعت سے علٰحدہ ہو گئے تھے، مولانا مودودیؒ نماز فجر کے بعد تفریح کرنے کے عادی تھے، بنارس میں بھی نماز کے بعد تفریح کو چلے، مولانا امین احسن بھی ساتھ تھے، باتوں باتوں میں مستری صاحب کا ذکر نکل آیا، اصلاحی صاحب نے فرمایا کہ وہ اس مزاج کے آدمی ہیں کہ نماز میں امام تو کوئی اور ہو لیکن وہ ارکان ان کی تکبیر پر ادا کیا کرے۔[1]

مستری صاحب مرحوم کی زندگی خلوص و محبت اور سادگی کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ اللہ ان کی کوتاہیوں سے درگذر فرمائے اور انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (جاری ہے)

---

[1] ایضاً ص ۲۹ تا ۳۱

آخری نبی کی وسیع دعوت

سلطان احمد اصلاحی

آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت زندگی میں کن دور رس تبدیلیوں کی علم بردار تھی اور اس کا دائرہ فکر و عمل کی کن وسیع جہتوں کو محیط تھا اس کا صحیح اندازہ اسی وقت کیا جا سکتا ہے جبکہ اس دعوت کے مخاطبین، ان کے ذہنی و فکری رجحانات اور ان کی عملی زندگی کے تمام خدوخال پورے طور پر نگاہ کے سامنے ہوں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین تین لوگ تھے مشرکین عرب اور اہل کتاب یہود و نصاریٰ۔ آئیے ان میں سے ہر ایک کے ذہنی اور عملی نقشۂ زندگی پر ایک نظر ڈالیں۔

مشرکین عرب : دنیا کے ہر نظام فکر و عمل کی طرح شرک و بت پرستی بھی اپنا ایک مستقل نظام رکھتی ہے۔ اور پوری انسانی زندگی کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتی ہے۔ بت پرستی کا نظریہ کوئی مجرد اور محدود چیز نہیں جس کا معاملہ کچھ خود ساختہ خداؤں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور ان کی نیاز مندیاں بجالانے پر ختم ہو جاتا ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ چیز ایک پوری توہماتی شریعت کو جنم دیتی ہے۔ جو اپنے ماننے والوں کی زندگیوں پر اپنے دور رس اثرات مرتب کرتی ہے۔ سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین عرب کی اس پسندیدہ شریعت کی تفصیل بیان کی ہے۔ زندگی کی دوسری بہت سی نعمتوں کی طرح کھیتی باڑی اور مویشی وغیرہ اہل عرب کی وہ خاص نعمت تھی جس پر اللہ تعالیٰ کی صحیح شکر گزاری اور اس کے بندوں کے حقوق کی ٹھیک ادائگی کے ذریعہ ہی یہ لوگ اپنے کو دنیا و آخرت کی سعادتوں سے ہمکنار کر سکتے تھے۔ لیکن زندگی کے دوسرے بے شمار معاملات کی طرح اس سلسلے میں یہ بت پرست قوم عجیب و غریب توہمات کا شکار تھی۔ اور اس خود ساختہ شریعت کے مختلف مظاہر تھے جن کی اس کے ہاں کارفرمائی تھی۔

مشرکانہ شریعت کے مظاہر :

۱۔ کھیتوں اور مویشیوں میں بتوں کی شرکت :

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ
نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا
لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا

اور انھوں نے ٹھہرایا اللہ کے لیے اس میں سے جو اس نے
پیدا کیا کھیتی اور مویشی کا ایک حصہ اور کہا کہ یہ اللہ کے
لیے ہے ان کے گمان کے مطابق اور یہ ہمارے [illegible]

يَصِلُ إِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَىٰ شُرَكَائِهِمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۝

(انعام، ۱۳۶)

داروں (بتوں، دیوی دیوتاؤں) کے لیے ہے جو ہمارے ساجھی داروں کا ہے وہ تو اللہ تک نہ پہنچے گا البتہ جو اللہ کا ہے وہ ہمارے ساجھیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ کتنا برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔

مویشیوں کے سلسلے میں ان کے اندر اور بھی طرح طرح کے توہمات پائے جاتے تھے۔

وَقَالُوا هَٰذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرْثٌ حِجْرٌ لَا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَنْ نَشَاءُ بِزَعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ لَا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَاءً عَلَيْهِ ۚ سَيَجْزِيهِمْ بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝ وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَٰذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا ۖ وَإِنْ يَكُنْ مَيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ ۚ سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝

(انعام: ۱۳۸-۱۳۹)

اور انھوں نے کہا یہ مویشی اور کھیتاں ہیں جن کی مناہی ہے۔ انھیں بس وہی کھا سکتے ہیں (بتوں کے پروہت وغیرہ) جنھیں ہم چاہیں ان کے خیال کے مطابق۔ جبکہ دوسرے مویشی ہیں جن کی سواری منع ہے۔ اسی طرح کچھ مویشی ہیں جن پر یہ (ذبح کے وقت) اللہ کا نام نہیں لیتے۔ (بلکہ بتوں کا لیتے ہیں اور اسے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں) اس پر جھوٹ باندھتے ہوئے جلد ہی وہ انھیں بدلہ دے گا اس کا جو وہ جھوٹ باندھتے تھے اور انھوں نے کہا کہ ان مویشیوں کے پیٹ میں جو کچھ ہے وہ خاص ہمارے مردوں کے لیے (حلال) ہے اور ہماری عورتوں کے لیے حرام ہے۔ البتہ اگر وہ مرا ہوا ہو تو اس میں سب ساجھی ہیں۔ جلدی وہ انھیں بدلہ دے گا ان کے اس بیان کا ضرور وہ حکمت والا علم رکھنے والا ہے۔

سماجی زندگی میں قوم عرب کی بیہودہ اعتدالیاں براہ راست ان کے مشرکانہ تصورات و عقائد کا نتیجہ تھیں۔ تحلیل و تحریم کے سلسلے میں ان کی مذکورہ بالا بے بنیاد روش کو قرآن ان کے انہی عقائد کا ثمرہ قرار دیتا ہے،

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ

ضرور جلد کہیں گے وہ جنھوں نے (اللہ کے ساتھ دوسروں کو) ساجھی ٹھہرایا کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک کے راستہ پر نہ پڑتے نہ ہمارے آباء و اجداد اور نہ ہم کسی چیز کو حرام قرار دیتے۔ اسی طرح جھٹلانے کی راہ پکڑی انھوں نے جو ان سے پہلے تھے یہاں تک کہ انھوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھا۔ کہو کیا تمہارے پاس کوئی یقینی چیز ہے جو تم اسے ہمارے لیے نکالو تم تو بس وہم و گمان

(انعام: ۱۴۸) کی پیروی کرتے ہو۔ اور محض اٹکل پچو سے کام لیتے ہو۔

۲۔ قتلِ اولاد: فقر و فاقے کے ڈر سے اپنے ہی جگر گوشوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا، اس سے بڑھ کر سماجی بُرائی اور کیا ہو سکتی ہے۔ جو بدنصیب طبقۂ انسانیت اپنی اولاد کے سلسلے میں رحم و ترحم کے جذبات سے یکسر عاری ہو کر اپنے ہاتھوں سے انھیں لقمۂ اجل بنانے سے نہ چوکے، عام ابنائے انسانیت کے سلسلے میں غمخواری و ہمدردی اور ان کے جسم و جان کی حفاظت و بقا کی اس سے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔ عرب کے یہ مشرکین اس بدی کی لعنت میں بھی بُری طرح گرفتار تھے جسے قرآن ان کے معبودانِ باطل کی براہِ راست اکساہٹ کا نتیجہ قرار دیتا ہے:

وَكَذَٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ ۖ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ۝

(انعام: ۱۳۷)

اور اسی طرح خوش نما بنا دیا ہے بہت سے مشرکین کے لیے اپنی اولاد کو مار دینے کو ان کے ساجھی داروں (بتوں اور دیوی دیوتاؤں) نے تاکہ وہ انھیں تباہ کریں اور ان کے اوپر ان کے طریقۂ زندگی (دین) کو گڈمڈ کر دیں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے سو تم ان کو اور وہ جو الزام تراشی کرتے ہیں اس کو صرفِ نظر کرو۔

آگے بھی قرآن نے یہی بات کہی کہ ان کا یہ شرمناک جرم شرک و بت پرستی کی صورت میں خدا تعالیٰ پر بے جا الزام تراشی کا نتیجہ ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ افْتِرَاءً عَلَى اللَّهِ ۚ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝

(آیت: ۱۴۰)

یقیناً گھاٹا کیا جنھوں نے اپنی اولاد کو مارا حماقت سے بغیر سمجھے بوجھے۔ اسی طرح اللہ نے جو انھیں روزی دی (اس کی بہت سی چیزوں کو اپنے لیے) حرام ٹھہرا لیا اللہ پر جھوٹ باندھتے ہوئے۔ یقیناً انھوں نے گمراہی کا راستہ پکڑا اور وہ راہ یاب نہیں ہوئے۔

اس پس منظر میں ان کی خرافاتی شریعت کو مسترد کرتے ہوئے قرآن نے ان کے سامنے صحیح دین داری کے جو خد و خال پیش کیے اس کے وسیع تر دائرے کی جھلک ہمیں آیاتِ ذیل میں نظر آتی ہے:

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ ۖ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا ۖ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۖ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُم مِّنْ إِمْلَاقٍ ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۖ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۖ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ

کہو کہ آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں تمہارے رب نے تمہارے اوپر کن چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے۔ یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو ساجھی مت بناؤ۔ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور اپنی اولاد کو فاقہ کے ڈر سے جان سے نہ مارو ہم تم کو روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی۔ اور بے حیائی کے کاموں

(ملاحظہ [illegible] کلام ۲۵۱ [illegible])

إِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝
وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ
حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ
بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَاِذَا
قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَبِعَهْدِ
اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ

(انعام: ۱۵۱-۱۵۲)

- - - - - - - -
- - - - - - -
- - - - - - -

کے پاس نہ جاؤ، جو ان میں کھلی ہوں یا چھپی۔ اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے سوائے حق کے۔ اس کی اللہ نے تم کو تاکید کی ہے تاکہ تم سمجھو۔ اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ سوائے اس طریقے کے جو بہتر سے بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنی بھر کی عمر کو پہنچ جائے۔ اور ناپ اور تول کو پورا کرو انصاف سے ہم کسی جان پر اس کی طاقت سے اوپر کا بوجھ نہیں ڈالتے۔ اور جب تم بات کہو تو انصاف سے کہو خواہ وہ (صاحب معاملہ) اپنا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ اور اللہ کے پیمان کو پورا کرو۔ اس کی اس نے تم کو تاکید کی ہے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔

اس تاکید کے ساتھ کہ:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ
وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ
ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

(آیت: ۱۵۳)

اور یہ میرا راستہ ہے سیدھا سو تم اس کی (پوری طرح) پیروی کرو۔ اور دوسری پگڈنڈیوں کو نہ پکڑو کہ وہ تمہیں اس کے (اللہ کے) راستہ سے ہٹا کر ادھر ادھر کر دیں۔ اس کی اس نے تم کو تاکید کی ہے تاکہ تم بچ کر رہو۔

ان آیات کریمہ میں وسیع دائرہ پر مشتمل مختلف سماجی برائیوں سے منع کیا گیا ہے اور بعض انتہائی اہم مثبت تعلیمات دی گئی ہیں، اس سلسلۂ بیان میں برائیوں کے ذیل میں ایک جامع بات ولا تقربوا الفواحش ما ظھر منھا وما بطن کہی گئی ہے، جس کی تفصیل مختلف تفسیری روایات کی روشنی میں زنا کی مختلف صورتوں، محرمات سے نکاح اور شراب نوشی وغیرہ سے کی گئی ہے[1]۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ الفاظ عام ہیں جو کھلی اور چھپی بدی اور برائی کی جملہ صورتوں کو محیط ہیں۔ مفسرین میں امام رازیؒ نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔

والاولیٰ ان لا یخص ھذا النھی بنوع
معین بل یجری علیٰ عمومہ فی جمیع
الفواحش ظاھرھا وباطنھا لان اللفظ
عام والمعنی الموجب لھذا النھی وھو
کونہ فاحشۃ عام ایضا ومع عموم اللفظ

زیادہ بہتر ہے کہ اس ممانعت کو کسی خاص قسم کے ساتھ مخصوص نہ کیا جائے۔ بلکہ بے حیائی کے تمام کاموں کی نسبت سے خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے یہ اپنے عموم پر باقی رہے اس لیے کہ یہ لفظ عام آیا ہے۔ اور اس ممانعت کو لازم کرنے والا معنی جو اس کا بے حیائی کا کام ہونا ہے وہ بھی اسی طرح عام

[1] [illegible]

والمعنی یکون التخصیص علی خلاف الدلیل[1]

یہ (ظاہر) اور معنی کے اس عموم کے ... (کے مدلول) کو کسی ایک مفہوم کے ساتھ خاص کرنا دلیل کے خلاف بات ہوگی۔

یہی بات اسی پس منظر میں اس سے پہلے اسی سورہ میں بدیں الفاظ کہی گئی ہے:

وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ (انعام: ۱۲۰)

اور گناہ کھلا ہو یا چھپا (سب) چھوڑ دو۔ ضرور جو لوگ گناہ کی کمائی کرتے ہیں انھیں بدلہ ملے گا اس جرم کا جو یہ کرتے تھے۔

اس کی تفسیر میں بھی امام موصوف نے ایک قول اسی وسعت کا حامل نقل کیا ہے اور اسی کو راجح قرار دیا ہے۔

ان هذا النهی عام فی جمیع المحرمات وهو الاصح لان تخصیص اللفظ العام بصورة معینة من غیر دلیل غیر جائز[2]

یہ ممانعت عام ہے تمام حرام کی ہوئی چیزوں کے سلسلے میں اور یہی بات زیادہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ کسی عام لفظ کی تخصیص کسی مخصوص صورت سے کسی دلیل کے بغیر جائز نہیں ہے۔

رأس المفسرین علامہ ابن جریر طبری نے یہی بات مزید تفصیل سے کہی ہے۔ آیت بالا کی تفسیر میں ذکر کردہ روایات سے ملتی جلتی روایتیں نقل کرنے کے بعد اس مقام پر اپنی ترجیحی رائے وہ ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں۔

والصواب من القول فی ذلك عندنا ان یقال ان الله تعالیٰ ذکره تقدم الی خلقه بترك ظاهر الاثم وباطنه وذلك سره وعلانیته والاثم کلما عصی الله به من محارمه وقد یدخل فی ذلك سر الزنا وعلانیته، ومعاهدة اهل الرایات واولات الاخدان منهن ونکاح حلائل الآباء والامهات والبنات والطواف بالبیت عریانا وکل معصیة لله ظهرت او بطنت واذ کان ذلك کذلك وکان جمیع ذلك اثما وکان الله عم بقوله وذروا ظاهر الاثم

ہمارے نزدیک اس سلسلے میں ٹھیک بات یہ ہے کہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے روبرو کھلے اور چھپے ہر طرح کے گناہ کو چھوڑنے کی بات رکھی ہے۔ یعنی وہ جو پوشیدگی میں کیا جائے یا علانیہ۔ اور گناہ (اثم) کا مطلب ہے ہر وہ چیز جس کے ذریعہ اس کی حرام کردہ چیزوں سے اللہ کی نافرمانی کی جائے۔ اس کے اندر لازمی طور پر چھپا اور کھلا ہوا زنا، جھنڈے والی (پیشہ ور)، اسی طرح ان میں آشنائیاں کرتی پھرتی عورتوں کے معاہدے، باپ کی بیویوں اور ماؤں اور بیٹیوں سے نکاح، خانہ کعبہ کا ننگے طواف اسی طرح اللہ کی ہر نافرمانی خواہ وہ کھلی ہو یا چھپی شامل ہے۔ جب معاملہ یہ ہے اور یہ تمام چیز اثم (گناہ) ہیں اور اللہ نے اس بات کو

[1] مفاتیح الغیب: ۱۳/ ۱۷۵ [2] حوالہ سابق: ۱۳/ ۱۶۱

وبباطنه جميع ما ظهر من الاثم و جميع ما بطن لم يكن لاحد ان يخص من ذلك شيئا دون شئ الا بحجة للعذر قاطعة [1]

عام رکھا ہے کہ "اور کھلے اور چھپے گناہ کو چھوڑ دو" یعنی تمام وہ گناہ جو کھلے ہوں یا جو چھپے ہوں۔ تو کسی کے لیے جائز نہیں کہ اس میں سے کسی چیز کو خاص کرے اور دوسری کو چھوڑ دے۔ سوائے اس کے کہ اس کے پاس کوئی ایسی دلیل ہو جس کے بعد کچھ کہنے کا موقعہ نہ رہے (جو ظاہر نہیں ہے)

سورۂ اعراف میں یہی بات بعض اہم نکات کے اضافہ کے ساتھ کہی گئی ہے۔ اور آخر میں شرک کی صورت میں خدا تعالیٰ پر جو بے بنیاد تہمت طرازی ہوتی ہے اس کی تردید ہوئی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے قبل "گناہ" کے ساتھ "بغاوت و سرکشی" کے جس اجتماعی جرم سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے وہ براہ راست اسی شرک و بت پرستی کا نتیجہ ہے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطَانًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ٥ (آیت: ۳۳)

کہو میرے رب نے جو چیز حرام ٹھہرائی ہے وہ بے حیائی کے کام ہیں خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے۔ اور گناہ اور ناحق سرکشی کو۔ اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ اس چیز کو ساجھی ٹھہراؤ جس کے لیے اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ اور یہ کہ تم اللہ پر وہ بات کہو جو تم نہیں جانتے ہو۔

۳۔ طریقۂ آبار کی اندھی پیروی: شرک و بت پرستی کے بطن سے ابھرنے والا ایک دوسرا مرض جس میں اس کی نام لیوا عرب کی یہ امت بری طرح گرفتار تھی، اپنے آبار و اجداد کے طور طریقے اور ان کی روش زندگی کی اندھی پیروی تھی۔ آخری پیغمبر نے جب ان کے سامنے اسلام کی دعوت حق پیش کی اس کے جواب میں انھوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ ہم اپنے اسلاف اور بزرگوں کو ایک طریقے کا پابند دیکھتے آئے ہیں اور ہم اس سے سرمو تجاوز نہیں کر سکتے۔ اپنی توہم پرستی کے اندھے پن میں یہ لوگ فرشتوں کو نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ اور ان کے نام پر مورتیاں بنا کر ان کے سامنے سر نیاز خم کرتے تھے۔ اس کے حق میں دلیل اس کے سوا دوسری نہ تھی کہ:

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (زخرف: ۲۲)

بلکہ انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آبار و اجداد کو ایک طریقہ پر پایا ہے۔ اور ہم انھیں کے نقوش کو پکڑے سیدھے راستے پر ہیں۔

اور یہ بات کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی خاص نہ تھی۔ آپ سے پہلے دنیا میں جتنے انبیاء علیہم السلام آئے سب کو اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں سے یہی ایک جواب سننے کو ملا:

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ

اور اسی طرح تم سے پہلے ہم نے کسی بستی میں ڈرانے والا بھی

---

[1] جامع البیان ۸/۶۷

مِّنۡ نَّذِيۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡهَاۤ ۙ اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ (ایضاً: ۲۳)

بھیجا تو اس کے خوش حال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو ایک طریقہ پر پایا ہے۔ اور ہم انھیں کے نقوش پا پر چلتے رہیں گے۔

عرب کی مشرک قوم کی اس گمراہی کا دائرہ کافی وسیع تھا اس کا اثر صرف شرک وبت پرستی کی نت نئی صورتوں ہی میں نہیں ظاہر ہوتا تھا کہ طریق آبا کی پیروی کے حوالہ سے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیں۔ بلکہ ان کے اس عقیدۂ باطل نے انھیں پوری زندگی میں برائیوں اور بے حیائیوں کے ارتکاب کا کھلا لائسنس دیدیا تھا۔ خدا کے گھر کا ننگے ہو کر طواف کرنا اس سے بڑھ کر بدی اور بے حیائی اور کیا ہو سکتی ہے۔ مشرکین عرب عام طور پر اس بے حیائی میں گرفتار تھے جس میں مردوں کے ساتھ ان کی عورتیں بھی برابر شریک تھیں۔[1] اپنی اس بے حیائی کے بے وجہ جواز ان کے لیے طریقہ آبار کی یہی اندھی پیروی تھا

وَاِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَةً قَالُوۡا وَجَدۡنَا عَلَيۡهَاۤ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلۡ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاۡمُرُ بِالۡفَحۡشَآءِ ؕ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ (اعراف: ۲۸)

اور جب یہ کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آبار واجداد کو اسی پر پایا ہے اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے۔ کہو کہ اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ پر وہ بات کہتے ہو جانتے نہیں ہو۔

اس کے جواب میں قرآن نے انھیں حق تعالیٰ کی بے لاگ اطاعت کا حکم دیا اور فرمایا کہ یہ محض شیطان کے بہکاوے میں آکر ان حرکتوں کا ارتکاب کر رہے ہیں:

قُلۡ اَمَرَ رَبِّىۡ بِالۡقِسۡطِ ۚ وَاَقِيۡمُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ وَّادۡعُوۡهُ مُخۡلِصِيۡنَ لَـهُ الدِّيۡنَ ؕ كَمَا بَدَاَكُمۡ تَعُوۡدُوۡنَ ؕ‏ فَرِيۡقًا هَدٰى وَفَرِيۡقًا حَقَّ عَلَيۡهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَيَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ۔ (ایضاً: ۲۹-۳۰)

کہو کہ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے۔ اور اس کا کہ تم اپنے رخ کو سیدھا کرو ہر نماز کے وقت۔ اور اس کو (اللہ کو) پکارو اطاعت کو اس کے لیے بے آمیز کرتے ہوئے۔ جیسا کہ اس نے تم کو پیدا کیا ہے ویسا ہی تم پلٹو گے۔ ایک گروہ کو اس نے راہ پر لگایا اور دوسرا گروہ اس کا مقدر گمراہی ٹھہری۔ انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا دوست بنایا۔ اور سمجھتے ہیں کہ وہ راستہ پر ہیں۔

اس پس منظر میں خدا تعالیٰ کے لیے کامل یکسوئی اور اس کی بے لاگ بندگی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی شرک و بت پرستی کی آلودگی سے دامن کش رہنے کے ساتھ اپنی پوری زندگی میں اس کے عطا کردہ مجموعۂ قانون کی پیروی کرنے والا ہو۔ جسے اصطلاح میں شریعت کے نام سے جانا جاتا ہے:

[1] تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۲۰۸

وامروا مخلصين له الدين) اى امركم بالاستقامة فى عبادته فى محالها وهى متابعة المرسلين المؤيدين بالمعجزات فيما اخبروا به من الله وما جاءوا به من الشرائع وبالاخلاص له فى عبادته فانه تعالى لا يتقبل العمل حتى يجمع هذا الركنين ان يكون صوابا موافقا للشريعة وان يكون خالصا من الشرك. [1]

اور اسے (اللہ کو) پکارو اطاعت کو اس کے لیے بے آمیز کرتے ہوئے. یعنی اس نے تمہیں اپنی عبادت کے معاملہ میں اس کے تمام مواقع میں جمنے کا حکم دیا ہے. اور اس کا طریقہ رسولوں کی بے چون و چرا پیروی کا ہے، جن کی معجزات کے ذریعہ تائید کی گئی، ان تمام معاملات میں جن کی انھوں نے خبر دی اللہ کے سلسلے میں اور وہ جو (مختلف) شریعتیں لے کر آئے اور وہ جو اس کی عبادت کے معاملہ میں انھوں نے اخلاص کی بات کہی. اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی عمل کو اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک کہ اس کے اندر دو باتیں نہ پائی جائیں. پہلے یہ کہ وہ صحیح ہو اور شریعت کے مطابق ہو اور شرک کی آمیزش سے پوری طرح پاک ہو۔

اسی طرح سورۂ بقرہ میں مشرکین کا اپنے معبودان باطل سے غیر معمولی تعلق کو واضح کرنے کے بعد جبکہ انہی کے اثر سے تحریم و تحلیل کے دائرے میں انھوں نے طرح طرح کی بے اعتدالیاں اختیار کر رکھی تھیں اور محض اپنے جی سے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ نعمتوں میں سے بہت سی چیزوں کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا تھا،[2] اسے شیطان کی وسوسہ اندازی قرار دیتے ہوئے خدائی فرمان یہ نازل ہوا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

اے لوگو! کھاؤ ان تمام چیزوں میں سے جو زمین میں ہیں حلال اور پاکیزہ اور شیطان کے راستوں کی پیروی نہ کرو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے. تمہیں تو وہ بس برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ تم اللہ پر وہ بات کہو جو تم جانتے نہیں ہو۔

(البقرۃ: ۱۶۸-۱۶۹)

آگے فرمایا کہ زندگی کے اس دائرے میں ان کی یہ بے اعتدالی محض آبا و اجداد کی اندھی پیروی کا نتیجہ ہے. یہی چیز ہے جس نے اس اہم ترین مسئلے میں انھیں راہ صواب سے منحرف کر رکھا ہے. اور ان کی پوری جمعیت اندھوں بہروں کا ایک گلہ بن کر رہ گئی ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس چیز کی جو اللہ نے اتارا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو پیروی کریں گے اس

[1] ابن کثیر، حوالہ سابق [2] تفسیر ابن کثیر، ۱/۲۰۳۔

آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝
وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا
لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ
لَا يَعْقِلُونَ ۝ (آیات ۱۷۰ - ۱۷۱)

کیا اس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا ہے کیا اس کے باوجود بھی کہ ان کے آباء و اجداد کچھ سمجھتے نہ ہوں نہ انھیں راستہ کی کچھ خبر ہو

اس کے بعد اہل ایمان کو مخاطب کر کے اس سلسلے میں جادۂ اعتدال کی طرف رہنمائی اس طرح فرمائی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَا
كُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۝
إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ
الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ
غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ
رَحِيمٌ ۝
(ایضاً ۱۷۲ - ۱۷۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں سے جو ہم نے تمہیں روزی دی ہیں۔ اور اللہ کا احسان مانو اگر تم بس اس کی بندگی کرتے ہو۔ اس نے تمہارے اوپر خاص طور پر حرام قرار دیا ہے مردار، خون، سور کا گوشت اور وہ چیز جسے غیر اللہ کے نام پر قربان کیا جائے۔ سو جو کوئی (اس کے لیے) مجبور ہو جائے اس طور پر کہ اسے دلی رغبت ہو نہ (ناگزیر حد سے آگے) بڑھنے والا ہو سو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ فی الواقع اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے،

مویشیوں کے سلسلے میں مشرکین عرب جن بے اعتدالیوں کا شکار تھے اس کی تفصیل سورۂ مائدہ میں ہے۔ مختلف قسم کے جانوروں کے سلسلے میں انھوں نے اپنے اوپر طرح طرح کی پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ قرآن نے ان کے ان باطل خیالات کی تردید کرتے ہوئے فرمایا:

مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَ
صِيلَةٍ وَلَا حَامٍ ۙ وَلَٰكِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يَفْتَرُونَ
عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۖ وَأَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۝
(آیت : ۱۰۳)

اللہ نے کوئی بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حامی نہیں بنایا۔ البتہ وہ جنھوں نے انکار کیا اللہ پر (اس کا) جھوٹ باندھتے ہیں۔ اور ان میں اکثر سمجھتے نہیں ہیں۔

وہ اونٹنی جو پانچ بچے جن چکتی جس میں آخری نر ہوتا، عرب جاہلیت اس کے کان پھاڑ دیتے، اس پر سواری کرنا اپنے لیے حرام کر لیتے، اسے نہ کسی گھاٹ سے ہنکایا جاتا، نہ کسی چراگاہ سے روکا جاتا اور کوئی عاجز و درماندہ مسافر بھی اس پر سواری کی جرأت نہ کرتا۔ اس کا نام بحیرہ تھا۔ آدمی سفر سے بسلامت واپسی اور بیماری سے شفایاب ہو کر اٹھنے پر نذر مانتا کہ اگر ایسا ہوا تو میری یہ اونٹنی کھلی چھوٹی رہے گی۔ یہ سائبہ تھی اور بحیرہ کی طرح اس سے بھی کسی قسم کا کام لینا حرام تھا۔ اسی طرح ان کا ایک خیال تھا کہ اگر بکری مادہ جنے تو وہ (مادہ) ان کی۔ اور اگر نر جنے تو وہ ان کے معبودوں کا حصہ ہو گا۔ اور اگر وہ نر اور مادہ ساتھ

جنتی تو کہتے کہ وہ مادہ کے ساتھ اس کا بھائی بھی مل گیا ہے۔ یہ 'وصیلہ' ہوتی۔ اور اس سے ہونے والے اس نر کو وہ اپنے معبودوں کے نام ذبح کرنا جائز تصور نہ کرتے۔ اسی طرح اگر کوئی اونٹنی کسی نر سے بار آور ہو کر دس بچے جن دیتی تو کہتے کہ اس نر نے اپنی پیٹھ محفوظ کر لی۔ اب نہ اس پر کوئی سواری کی جا سکتی ہے، نہ اس پر کوئی سامان لادا جا سکتا ہے۔ نہ اسے کسی گھاٹ سے روکا جا سکتا، نہ کسی چراگاہ سے منع کیا جا سکتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا نام 'حامی' تھا کہ اس نے اپنی پیٹھ کو محفوظ کر لیا، قد حمی ظہرہ۔[1]

قرآن نے کہا کہ اپنے معاملات میں ان کی یہ من مانی حرکتیں ان کی اسی تقلید آباء کا براہ راست نتیجہ ہیں چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (مائدہ ۵: ۱۰۴)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جسے اللہ نے اتارا ہے اور رسول کی طرف تو وہ کہتے ہیں ہمارے لیے کافی ہے وہ جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا ہے۔ کیا اس کے باوجود کہ ان کے آباء و اجداد کچھ جانتے ہوں، نہ انہیں راستے کی کچھ خبر ہو۔

۴۔ ہوا پرستی: اس کے علاوہ قرآن شرک و بت پرستی کا ایک بڑا مظہر انسان کی 'ہوا پرستی' کو قرار دیتا ہے۔ دنیا کے اس کارخانے میں ایک خدا کے علاوہ بہت سے خداؤں کی حکمرانی ہے اور وہ اس کے مستحق کہ ان کی شبیہیں بنا کر ان کے حضور سر تسلیم خم کیا جائے اور ان کی نیاز مندیاں بجا لائی جائیں، ظاہر ہے انسان کی یہ وہ روش ہے جس کا عقل و خرد سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسان دنیا میں بے قید زندگی بسر کرنے کے لیے اسے بطور بہانہ کے استعمال کرتا ہے۔ اپنے جذبۂ بندگی کی تسکین کی خاطر وہ 'شرک و بت پرستی' کا ایسا نظام تجویز کرتا ہے جس میں خدا کی حیثیت عضو معطل سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ اور اسے پوری آزادی مل جاتی ہے کہ زندگی میں جو روش چاہے اپنائے اور اپنی خواہش نفس کی پیروی میں جدھر چاہے منہ مارتا پھرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جگہ جگہ اہل شرک کی بت پرستی کو 'خواہش نفس کی پوجا' کے مرادف قرار دیا ہے، جس کے بعد وہ اپنے معاملات زندگی میں بالکل جانوروں کی طرح بے لگام ہو جاتے ہیں:

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (فرقان: ۴۳-۴۴)

کیا تم نے دیکھا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود ٹھہرایا سو کیا تم اس پر نگران ہوا چاہتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ تو بس جانوروں کے مانند ہیں۔ بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔

اس لیے کہ یہی خواہشات ہوتی ہیں جو زندگی میں ان کا اصل مرکز توجہ بن جاتی ہیں:

من كان في طاعة الهوى في دينه يتبعه في كل ما يأتي ويذر لا يتبصر دليلا ولا يصغي

جو کوئی اپنے دین کے معاملہ میں خواہش نفس کی پیروی میں ہوگا وہ جو کام بھی کرے گا یا جسے چھوڑے گا اس میں اسی کی پیروی

[1] [illegible]

إلى برهان نحو عليه هواه وجاهد الله[1] ... کرے گا، وہ نہ کسی دلیل پر غور کرے گا، نہ کسی حجت و برہان پر کان دھرے گا، سو وہ اپنی خواہش نفس کا بندہ ہوگا اور اسے ہی اپنا معبود قرار دے گا۔

دوسرے مقام پر قرآن نے ایسے شخص کو گمراہی کے آخری درجے پر قرار دیا ہے، جو خالصتاً مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کو پروان چڑھاتا اور حرص کے بطن سے بے مہارا باحیت پسندی جنم لیتی ہے:

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَن يَهْدِيهِ مِن بَعْدِ اللَّهِ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝ وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ[2]

(جاثیہ: ۲۳-۲۴)

سو کیا تم نے دیکھا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود ٹھہرا لیا اور اللہ نے اسے جانتے بوجھتے گمراہ کیا۔ اور اس کے کان اور دل پر مہر کر دی اور اس کی نگاہ پر پردہ ڈال دیا۔ سو اللہ کے بعد اسے راہ پر کون لگا سکتا ہے۔ کیا پس تم یاد دہانی نہیں حاصل کرتے ہو۔ اور انھوں نے کہا کہ یہ ہماری بس دنیا کی زندگی ہے ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں بس زمانہ ختم کرتا ہے۔ انھیں اس کی کچھ جانکاری نہیں۔ وہ بس اٹکل کے تیر چلاتے ہیں۔

سورۂ محمد میں اہل ایمان کو آخرت کے اجر بے پایاں کی بشارت دیتے ہوئے، لذت دنیا میں گم اہل کفر و شرک کو دوزخ کے دردناک عذاب سے ڈرایا گیا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۝ (آیت: ۱۲)

ضرور اللہ داخل کرے گا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ایسے باغات میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ رہے وہ جنھوں نے انکار کیا تو وہ دنیا کی اس زندگی میں کچھ فائدہ اٹھالیں اور کھالیں جیسے کہ جانور کھاتے ہیں۔ (بعد کی زندگی میں) ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

---

[1] الکشاف للزمخشری، ۲/۷۷۰۔ [2] مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ ان دو آیتوں میں مخاطب کی تبدیلی کے قائل ہیں ... یہود ہیں جو دعوت کے اس مرحلے میں مشرکین عرب کی حمایت میں سرگرم تھے اور دوسری آیت کے مصداق کفار عرب۔ تدبر قرآن ۶/۳۴۱ لیکن دیگر ائمہ تفسیر کی تشریحات کی روشنی میں ان دونوں آیتوں میں خطاب مشرکین عرب ہی سے ہے۔ ... آیت مذکورہ کے سیاق میں ہی جو دانشمند پر عرب کے مشرکین سے متعلق ہے۔ ملاحظہ ہو: ابن جریر ۲۵/۹۱ ... [illegible]

بعد میں ان کے اس انجام سے دوچار ہونے کی واحد وجہ یہ بتائی کہ یہ لوگ دنیا کے اندر خواہشات کی پیروی کے دام میں گرفتار رہے:

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ كَمَن زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُم	سو کیا وہ جو اپنے رب کی طرف سے واضح نشانی پر ہو اس کی طرح ہو سکتا ہے جس کے لیے اس کے برے عمل خوشنما کر دیے گئے
(آیت: ۱۴)	اور یہ لوگ اپنی خواہشات نفس کی پیروی میں لگے ہوں۔

آخری پیغمبر کی دعوت کو یہ لوگ جو قبول کرنے سے انکار کرتے رہے تو اس راہ کی دوسری رکاوٹیں اپنی جگہ، ان کا اصل مرض یہ تھا کہ یہ لوگ خواہشات نفس کے دام میں اسیر تھے۔ اور آخرت کے ادھار سودے کی خاطر دنیا کی نقد آسودگیوں اور آسائشوں بالفاظ دیگر اپنی ہوس پرستیوں سے دست بردار ہونے کے لیے کسی طرح آمادہ نہ تھے:

فَإِن لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ ۚ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ	سو اگر یہ تمہاری بات نہ مانیں تو سمجھ لو کہ یہ اپنی خواہشات نفس کی پیروی میں لگے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر راہ سے ہٹا اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر اپنی خواہش نفس کی پیروی میں لگ جائے۔ ضرور اللہ
(قصص: ۵۰)	(ایسے) نافرمان لوگوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔

۵۔ انسانوں کی حکمرانی:

دنیا کے ہر نظام فکر و عمل کی طرح شرک و بت پرستی کا یہ خاصہ بھی اپنی جگہ ہے کہ اس کے فلسفے اور بنیادوں میں جزوی طور پر جو اختلافات بھی پائے جاتے ہوں عملی زندگی میں اس کا یہ نتیجہ متفقہ طور پر سامنے آتا ہے کہ سوسائٹی کا مٹھی بھر نمایاں طبقہ اس کا موید اور سرپرست بن کر ابھرتا ہے۔ اور وہ آبادی کی عظیم اکثریت کو اپنے پسندیدہ راستے پر لگانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے۔ آج کی مروجہ اصطلاح میں اسے ہم 'مفادات حاصلہ' (vested interests) کا نام دے سکتے ہیں جنھیں قرآن قوم کے سربرآوردہ لوگ 'ملأ قوم'، اپنی بڑائی کے نشہ میں سرشار 'الذین استکبروا'، اور لیڈران قوم 'الذین اتبعوا'، کے نام سے یاد کرتا ہے۔ چونکہ ان کے تمام تر مفادات اسی مروج نظام زندگی سے وابستہ ہوتے ہیں اس لیے وہ اس کے پورے ڈھانچے اور اس کے تمام کل پرزوں کے ساتھ اس کے تحفظ اور بقا کے لیے اپنا پورا ایڑی چوٹی کا زور صرف کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ظاہر ہے ان کا یہ مقصد صرف شرک کے فلسفے اور اس کی بنیادوں کے باقی رہنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ مقصد تو اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جبکہ اس سے وابستہ پورے نظام زندگی کے پھلنے پھولنے کے مواقع حاصل ہوں اور شرک کے ساتھ اس سے متعلق پوری کا شریعت بھی پوری طرح زندہ و برقرار ہو۔

[illegible] ۔ مولانا اصلاحی نے آیت میں مذکورہ اوصاف کی بنا پر اس کا مطلب [illegible] ۔ واللہ اعلم۔

نظام شرک کا یہی آپسی گٹھ جوڑ ہے جسے قرآن نے سیدنا ابراہیمؑ کی دعوت کی تفصیل کے ذیل میں، "مودۃ بینکم فی الحیوۃ الدنیا"، کے بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے جبکہ قیامت کے روز اس شیرازے کو بکھر جانے کے سبب ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوگا،

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا وَّمَاْوٰكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (عنکبوت: ۲۵)

اور اس نے (ابراہیم نے) کہا کہ تم نے اللہ کو چھوڑ کر بہت سے بتوں کا جو سہارا پکڑا ہے تو محض دنیا کی زندگی میں باہمی محبت و تعلق کے سبب۔ بعد میں قیامت کے دن تم میں سے ایک دوسرے کا انکار اور ہر ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرے گا اور تمہارا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ اور تمہارے لیے کچھ مددگار نہ ہوں گے۔

آخری نبیؐ کی دعوت کے بیان میں قرآن نے اس حقیقت کو بار بار ابھارا ہے کہ کس طرح قوم کا سربرآوردہ یہ طبقہ رائج الوقت نظام شرک و کفر کو برقرار رکھنے کے لیے سب سے پہلے آگے بڑھ کر قرآن اور اس کے عطا کردہ نظام فکر و عمل کا انکار کرتا تھا اور اپنے اثر و اقتدار کی دھونس جما کر عوام الناس کو اپنے پسند کردہ راستہ پر چلنے کے لیے مجبور کرتا تھا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ښ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِۨ الْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ؀

(سبا: ۳۱)

اور کہا جن لوگوں نے انکار کیا کہ ہم ہرگز اس قرآن پر ایمان نہ لائیں گے، نہ اس چیز پر جو اس سے پہلے رہی (تورات و انجیل وغیرہ) اور اگر تم دیکھتے (تو یہ عجیب منظر ہوتا) جبکہ یہ بے انصاف اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے در یں حالیکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کی بات کو پلٹ رہا ہوگا۔ کہیں گے وہ لوگ جو دبائے ہوئے تھے ان لوگوں سے جو بڑے بنے ہوئے تھے۔ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور ایمان والے ہوتے۔

اس کے بعد قرآن خدا کے حضور ان کے اس آپسی تکرار کی تفصیل ان لفظوں میں پیش کرتا ہے،

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَاۗءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ؀ وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ

کہا ان لوگوں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے ان لوگوں سے جو دبے ہوئے تھے کیا ہم نے تم کو روکا تھا راستی سے جبکہ وہ تمہارے پاس آئی۔ بلکہ تم خود مجرم تھے۔ اور کہا ان لوگوں نے جو دبے ہوئے تھے ان لوگوں سے جو بڑے بنے ہوئے تھے بلکہ تمہاری رات دن کی تدبیر (اس کا سبب تھی)

إِذْ تَأْمُرُونَنَا أَن نَّكْفُرَ بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُ أَندَادًا ۚ وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ وَجَعَلْنَا الْأَغْلَالَ فِي أَعْنَاقِ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (آیت: ۳۲-۳۳)

جبکہ تم ہم کو حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کا انکار کریں اور اس کے لیے (دوسروں) کو ساجھی قرار دیں اور وہ شرمساری کو چھپائیں گے جبکہ عذاب کو دیکھیں گے۔ اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان کی گردنوں میں ہم زنجیریں ڈالیں گے۔ ان کو بدلہ وہی تو ملے گا جو یہ کرتے رہے تھے۔

قرآن کہتا ہے یہ کچھ اسی پیغمبرؐ کے ساتھ خاص نہیں۔ نظام شرک و کفر کے علم بردار، ہر دور میں، اپنی دنیوی حیثیت سے دھوکا کھا کر حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ آنے والی شریعتوں کا ان کی جملہ تفصیلات کے ساتھ انکار کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ آگے فرمایا:

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ۝ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ۝ (سبا: ۳۴-۳۵)

اور ہم نے کسی بستی میں جو ڈرانے والا بھی بھیجا تو اس کے خوش حال لوگوں نے کہا کہ (رسولو!) تم جس چیز کو دے کر بھیجے گئے ہو ہم اس کا انکار کرنے والے ہیں۔ اور انھوں نے کہا کہ ہم مال اور اولاد میں تم سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اور ہم پر عذاب نہیں ہونے کا۔

نظام کفر و شرک کے ان وسیع دائروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آخری نبیؐ نے اسے منہدم کرتے ہوئے جب اس کی جگہ توحید کا آوازہ بلند کیا تو اس کے پیش نظر نظام زندگی میں کتنی دور رس تبدیلیاں رہی ہوں گی۔ اور قرآن کی یہ پکار فکر و عمل کے مکمل انقلاب سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوسکتی تھی کہ:

اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ۗ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝ (اعراف: ۳)

پیروی کرو اس پورے (مجموعۂ دین) کی جو تمہارے رب کی طرف سے تم تک اتارا گیا ہے۔ اور اس کو چھوڑ کر دوسرے کارسازوں کے کہنے میں نہ رہو۔ تم بہت کم یاد دہانی حاصل کرتے ہو۔

ضروری اعلان

بعض حضرات ماہنامہ زندگی نو کے سلسلے میں انتظامی امور کی بابت بھی خطوط پان والی کوٹھی، علی گڑھ کے پتہ پر بھیج دیتے ہیں ضروری عرض ہے کہ ترسیل زر و جملہ انتظامی امور کے لیے مراسلت منیجر ماہنامہ زندگی نو ۱۵۲۵، سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ کے پتہ پر کی جائے۔ صرف مضامین اور ادارتی امور سے متعلق مدیر ماہنامہ زندگی نو، پان والی کوٹھی، دودھ پور علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲ سے رابطہ رکھا جائے۔ (ادارہ)

اسلام اور امن*

مولانا انعام الرحمٰن خانصاحب۔ بھوپال

الحمد للّٰہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم

محترم حضرات! مجھے اس مسئلہ پر اپنے خیالات پیش کرنا ہے کہ امن کا اسلام سے اور اسلام کا امن سے کیا رشتہ ہے اور دنیا میں امن کیونکر قائم ہو سکتا ہے؟

امن ہر دل کی خواہش اور ہر زبان کی پکار ہے۔ بوڑھا، جوان، عورت، مرد، شہری، دیہاتی، کالا، گورا غرض یہ کہ ہر سلیم الطبع آدمی امن چاہتا ہے۔ اس خواہش عام کی تکمیل کے لیے کوششیں بھی برابر ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ خواہش پوری نہیں ہوتی۔ یہ خواہش اتنی عام ہے کہ آدم کی اولاد اس کے نام پر دھوکا بھی کھاتی رہی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کائنات کے ہر گوشہ میں امن ہے نہیں ہے تو اسی مخلوق میں جہاں یہ آرزو ہر دل میں ہے — سوچنے کی بات ہے کہ ایسا کیوں ہے؟

واقعات کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی فطرت اصلاً تو امن پسند ہے لیکن فتنہ و فساد کی حالت کسی وجہ سے اس پر عارض ہو جاتی ہے۔ جیسے قدرتی حالت تو صحت ہے اور بیماری اس پر عارض ہوتی ہے یا مثلاً سچ انسانی فطرت ہے اور جھوٹ اس پر عارض ہوتا ہے۔ یعنی انسان جب بلا ارادہ کچھ بولے گا تو وہ سچ ہوگا لیکن جب کسی غرض سے بولے گا تو ارادہ کر کے اس غرض کے مطابق بولے گا جو جھوٹ ہوگا۔

مگر ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جذبات و خواہشات و اغراض بھی بشری خصوصیات کے طور پر انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں جو اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں اور جائز حدود سے آگے بڑھ کر امن کو غارت کرتی رہتی ہیں اس طرح آدم کا یہ بیٹا عقل اور جذبات کا اخلاقی احساس اور خواہشات کا ملکوتیت اور حیوانیت کا معجون مرکب بن گیا ہے۔ اور اس انسان نما جن کو قابو میں رکھنے کے لیے ایک بوتل کی اور کسی عامل کے عمل کی ضرورت ہے۔ اور چونکہ انسان کے جذبہ اور خواہش کا کوئی ایک رنگ اور ایک دائرہ نہیں ہے اس لیے فساد کی وسعتیں اور امن کے دائرے

---

* یہ مقالہ ۲۰ دسمبر [illegible] کو ایس، آئی، او، آف انڈیا کی پہلی کل ہند کانفرنس منعقدہ بنگلور میں پڑھا گیا۔

چھوٹے بڑے اور ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ افراد اور خاندانوں سے لے کر قوموں اور حکومتوں تک جس سطح پر دیکھیے آپ کو سکون کے بجائے اضطراب اور تعاون کے بجائے تصادم نظر آئے گا۔

یہ بات سب مانتے ہیں کہ فتنہ وفساد انسانوں کو اور انسانیت کو کھا جانے والا ایک مرض ہے لیکن اس مرض کے سبب کی تشخیص میں رائیں مختلف ہیں اسی لیے علاج کے نسخے اور انھیں استعمال کرنے کے طریقے بھی مختلف ہو گئے ہیں۔ بلکہ امن کا تصور اور اس کی شکلیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں متضاد بن گئی ہیں۔ ایک حالت اگر ایک کی نگاہ میں امن کی معیاری شکل ہے تو دوسرے کی نگاہ میں وہی سب سے بڑا فساد ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک کی نگاہ میں سوسائٹی کا معیاری نقشہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے تصورات و احساسات کو ایک ضابطہ کے اندر بروئے کار لانے کا موقع ملے۔ اور ہر شخص مناسب حدود کا پابند رہ کر اپنی صوابدید کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو استعمال کر سکے تو دوسری جانب امن کا ایک مفہوم اور اس کا ایک نقشہ یہ بھی بن گیا ہے کہ پہلے تو انسان کے سفلی جذبات ابھار کر کچھ حقیقی اور کچھ مصنوعی حقوق کی طلب پیدا کرو۔ اس طرح ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ سے لڑا کر ڈنڈا ہاتھ میں لو۔ پھر اس ڈنڈے کی مار جتنی دور پہنچ سکے اتنی دور تک سب کو مار مار کر خاموش کر دو۔ پھر ان کے تمام تصورات اور جذبات واحساسات کو کچل کر موت کا سناٹا طاری کر دو۔ اور چلتے پھرتے انسانوں کے اس قبرستان کا رقبہ بڑھاتے ہوئے بلکہ اسی ضرورت سے امن کی فاختہ اڑانا شروع کر دو۔ اور امن کی پکار اتنی بلند آواز سے لگاتے رہو کہ دوسری آوازیں دب جائیں۔

بہرحال یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ انسان کی امن پسند فطرت پر فتنہ و فساد کا غبار کیوں چھایا ہوا ہے۔ ہابیل کی بے گناہی پر قابیل نے ڈاکہ مار کر جو فساد کا بیج بویا تھا وہ اب تک کیوں انسان کی خیر آشنا فطرت پر اپنے کانٹے اور زہریلے پھل برسا رہا ہے، انسان دوسرے میدانوں میں جتنی ترقی کر رہا ہے اتنا ہی وہ امن کے لیے ترس رہا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ اس کی ترقی ہی امن کی بہت بڑی دشمن بن گئی ہے یوں تو ہر قوم کسی نہ کسی کے سر پر گناہوں کا گھڑا پھوڑ کر اپنا دل بہلا سکتی ہے۔ ہمارے لیے بھی اپنے ملک کی حد تک یہ کہہ دینے سے دل کو تسکین مل جاتی ہے کہ یہاں کے امن کو غارت کرنے کا ذمہ دار انگریز ہے۔ اس کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی نے یہاں کے ان لوگوں کے درمیان بھی نفرت وعداوت کے بیج بو دیئے جو سینکڑوں سال سے شیر وشکر بن کر رہتے آئے تھے۔ مگر یہاں کے فسادات کی اس توجیہ سے دل کو تسکین تو مل جاتی ہے مگر بات بنتی نہیں۔ ساری دنیا میں تو انگریز نے یہ کھیل نہیں کھیلا۔ پھر کیوں پوری دنیا درندوں کا جنگل بنی ہوئی ہے۔ خود ہمارے ملک میں بھی صرف وہی فتنہ تو اپنا منحوس سایہ ڈالے ہوئے نہیں ہے جسے عرف عام میں فرقہ وارانہ فساد کہتے ہیں بلکہ فساد کی نت نئی شکلیں پیدا ہو چکی ہیں اور آئے دن پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ ان سب کو تو انگریز کی سیاست کا ثمر نہیں کہا جا سکتا۔ نہ کسی بیرونی ہاتھ کی بات کہہ دینے سے بات بنتی۔

جس طرح اخلاق اور صحت ... اصول کا تقاضا ہے کہ خرابی کی جڑیں وہاں نہیں ہوتیں جہاں خرابی نظر آتی ہے

بلکہ اس کی جڑیں کہیں دور ہوتی ہیں۔ جسم پر کسی جگہ پھوڑا ہو اس کی جڑیں فساد خون میں اور فساد خون کی جڑیں معدہ کے سوء ہضم میں ہوں گی۔ مرہم پٹی سے بھی اس کا علاج ہونا چاہئے۔ لیکن یہ کافی نہیں۔ اصل علاج فساد خون کا اور معدہ کا ہونا چاہئے۔ اب اگر ہم کو فیشن کے طور پر یا کسی سیاسی تقاضے سے امن امن کی تسبیح پڑھ کر سرخرو ہوجانا نہیں ہے اور اگر ہم دل سے امن کے آرزومند ہیں تو ہمیں اس اصول کو اپناتے ہوئے ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھنا ہوگا کہ اس شجر خبیث کی جڑیں کہاں ہیں جس نے ساری دنیا کے امن کو ایک خواب پریشاں بنا کر رکھ دیا ہے ساتھ ہی ہمت کرکے اسے اکھاڑنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ پھر ان کی زمین میں اس پاکیزہ درخت کا بیج بونا اور اس کی آبیاری کرنا ہوگی جس سے امن و سکون کا گھرا سایہ میسر آتا ہے اور امن و آتشی کے میٹھے پھل ٹپکتے ہیں۔

تلاش حقیقت کے اس سفر میں پہلے قدم پر ہمیں ماننا چاہئے کہ جس طرح کسی فوج کی فتح یا شکست کا ذمہ دار اس کا سپہ سالار ہوتا ہے اسی طرح کسی دور کی اچھائیاں بھی اور برائیاں بھی اس تہذیب کے کھاتہ میں جاتی ہیں جو اس دور پر سایہ فگن ہوتی ہے اور جس کے ہاتھ میں اس دور کی فکری امامت ہوتی ہے۔ پھر ہمیں کھلے دل سے اس حیثیت کا اعتراف بھی کرنا چاہئے کہ ادھر کوئی چار سو سال سے دنیا کی فکری امامت یورپ کے ہاتھ میں ہے۔ اور ساری دنیا میں مسلمان ہوں یا غیر مسلم سب کے دل و دماغ پر مغربی تہذیب کے — عیسائی مذہب کے نہیں مغربی تہذیب کے — افکار و نظریات چھائے ہوئے ہیں اور انہیں نظریات سے پیدا ہونے والی قدریں لوگوں کے دلوں میں اتر گئی ہیں۔ مغربی تہذیب اور اس کی نکتہ آفرینیوں کا رعب دلوں پر ایسا بیٹھ گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو دنیوی علوم و فنون کے استادوں کی طرف سے آئے اسے بے چوں و چرا مان لیا جاتا ہے محض اس دلیل کی بنیاد پر کہ یہ بات فلاں مفکر نے کہی ہے۔ چاہے اس کی حیثیت محض ایک ذہنی اپج سے زیادہ نہ ہو۔

لیکن اس صورت حال کی شکایت کرنے کے بجائے یہ بات ماننا چاہئے کہ یہ جو کچھ ہوا وہ عین قانون قدرت کے مطابق ہوا۔ قاعدے کی بات ہے کہ طاقت کے مقام سے جو چیزیں پیش کی جاتی ہیں وہ آسانی کے ساتھ دلوں میں اتر جاتی ہیں۔ بہت پرانا مقولہ ہے "الناس علی دین ملوکہم" یہ ہوتا ہی آیا ہے کہ مسلح تہذیب کی چمک دمک سے مفتوح قوموں کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ یہ علحدہ بات ہے کہ یہ چمک اگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری سے پیدا ہوئی ہو تو تھوڑے ہی دنوں میں وہ ماند پڑ جاتی ہے اور خود اس تہذیب کے علم بردار پلٹ کر حسرت کے ساتھ پیچھے دیکھنے لگتے ہیں۔ یہی کچھ مغربی تہذیب کے ساتھ ہوا کہ ان کے ہتھیار بند ہاتھوں کے ذریعہ جو چیز آئی وہ مرعوبانہ ذہنیت کے ساتھ قبول کرلی گئی۔ لیکن یہ مسلح اور غالب قومیں چونکہ مکھی پر مکھی مارتے رہنے اور لکیر کی فقیر بنے رہنے کی کمزوری سے بڑی حد تک پاک ہیں اس لیے اب خود انہی کے سلیم الطبع افراد پر اس کا ردعمل شروع ہوگیا ہے۔ اور یہ احساس بڑھتا جارہا ہے کہ ہم نے کسی بھی الٰہی ہدایت سے بے نیاز ہوکر اپنی اجتماعی زندگی کا جو سفر مادہ پرستانہ نظریات سے بنی ہوئی ٹرین پر سوار ہو کر شروع کیا تھا وہ ہمیں بیابان مرگ

پرلے آئی ہے۔ اسی طرح وہ مغلوب قومیں جو پس خوردہ کھانے اور کامیاب نقالی کو ہی کمال سمجھتی تھیں ان کے دل و دماغ پر بھی حکمراں کی ساحری کا اثر کم ہو رہا ہے اور "وہ سوتے میں کچھ کلبلانے لگے ہیں"۔

یہ صحیح ہے کہ معلوم تاریخ کے ہر دور میں انسانی برادری کے اندر فتنہ و فساد اور کشت و خون کا بازار گرم رہا ہے لیکن ہر دور میں انسان کی حیوانیت میں سے نکلنے والے یہ شعلے اور ان کو بھڑکانے والی آندھیاں کچھ مختلف رہی ہیں جنھیں بیان کرنے کے لیے ایک کتاب کی وسعت درکار ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے غور و فکر کو اسی دور تک محدود رکھنا چاہیے جس کا مزہ ہم چکھ رہے ہیں۔

اگر موجودہ مغربی تہذیب کا بے لاگ تجزیہ کیا جائے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ اس کی ابتدا ایک منفی جذبہ سے ہوتی ہے۔ مسیحی مذہب کے قائم کردہ کلیسائی نظام نے خدائی ہدایت کے نام پر لوگوں کی روحوں اور جسموں کو اتنے سخت شکنجہ میں کس دیا تھا کہ عام نفسیاتی قانون کے مطابق اس کا ردعمل ہونا ہی تھا۔ اور یہ ردعمل اتنا ہی شدید ہونا تھا جتنا شدید یہ جبر تھا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اور ایک عرصہ تک قدیم کلیسائی نظام کے نمائندوں اور جدید علمی تحریک کے علم برداروں کے درمیان شدید کشمکش ہوتی رہی۔ مسیحی متکلمین نے اپنے مذہبی عقاید کی اور اپنی بائبل کے تصورات کائنات و انسان کی پوری عمارت یونانی فلسفہ کے نظریات پر رکھی تھی اور ان کا خیال یہ تھا کہ ان بنیادوں میں سے کسی کو اگر ذرا سی ٹھیس لگی تو یہ پوری عمارت ڈھیر ہو جائے گی اور اس کے ساتھ مذہب بھی ختم ہو جائے گا دوسری طرف جدید علمی تحریک کے علمبردار، جو کامیابیوں سے سرشار ہو کر تحقیق و دریافت کا کام کر رہے تھے انھیں قدم قدم پر اس فلسفہ و سائنس کی کمزوریاں معلوم ہو رہی تھیں جس کے سہارے عقاید و کلام کا یہ پورا نظام کھڑا ہوا تھا۔ مگر وہ جوں جوں آگے بڑھتے تھے کلیسا والے اپنے مذہبی و سیاسی اقتدار کے بل بوتے پر روز افزوں لرزہ خیز مظالم کے ذریعہ ان کی راہ روکنے کی کوشش کرتے تھے۔

اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ جدید علمی بیداری میں شروع سے ہی مذہب اور اہل مذہب کے خلاف ایک ضد سی پیدا ہو گئی۔ اور اہل کلیسا کی تنگ نظری کے نتیجہ میں یہ ضد اتنی بڑھی کہ صرف مسیحیت اور کلیسا تک محدود نہیں رہی بلکہ نفس مذہب اس کا نشانہ بن گیا۔ پھر علم و فکر کے میدان سے آگے بڑھ کر سیاست و معیشت وغیرہ مختلف میدانوں میں یہ کشمکش پھیلی اور اہل کلیسا کی شکست کے بعد جب تہذیب جدید کے معماروں کے ہاتھوں ایک نئے نظام زندگی کی عمارت اٹھی تو زندگی کے ہر شعبہ سے مذہب کو عملاً بے دخل کر دیا گیا۔ مگر چونکہ انسانی فطرت سے مذہبی احساسات کو بالکل کھرچ ڈالنا ممکن نہیں ہے اس لیے اصول یہ قرار پایا کہ مذہب افراد کا ایک شخصی معاملہ ہے۔ کوئی شخص اپنی انفرادی زندگی میں خدا کو ماننا چاہتا ہے تو مانے اور جس طرح چاہے اس کی پوجا کرے۔ مگر مذہب کو اجتماعی زندگی کے کسی شعبہ میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔

اس صورت حال نے جدید تہذیب میں ایک خصوصیت یہ پیدا کردی ہے۔ اور شاید اس خصوصیت میں یہ منفرد ہے کہ تہذیب کا ایک ڈھانچہ تو پہلے وجود میں آگیا اور بعد میں اس کے لیے بنیادیں فراہم کی گئیں۔ حالانکہ تقریباً ہر تہذیب اس بنیاد پر قائم ہوتی ہے جو انسان و کائنات کے کسی ایک مطالعہ کے نتیجہ میں بنتی ہے۔ لیکن جدید مغربی تہذیب چونکہ ایک منفی جذبہ کے تحت وجود میں آئی ہے اس لیے زندگی کے بنیادی مسائل میں کوئی ایک رائے بنائے بغیر کچھ روز یہ چلتی رہی۔ لیکن چونکہ زندگی کا کوئی نظام نامہ بن نہیں سکتا اور اگر کسی جذبہ سے بنا لیا جائے تو زیادہ دن قائم نہیں رہ سکتا جب تک کہ انسان و کائنات کے بارے میں کسی مثبت یا منفی نظریہ کی بنیاد نہ فراہم کی جائے۔ اس لیے اس تہذیب کے معمار مجبور ہوئے کہ انسان و کائنات کے آغاز و انجام کے بارے میں کوئی ایک رائے قائم کریں۔ اور یہ بات ایک اعجوبہ سے کم نہیں کہ علمی بیداری کے اس روشن دور میں علم و عقل کے ان پرستاروں نے جہالت کے تاریک دور کی طرح اپنے اس مطالعہ کی بنیاد اندازوں اور قیاسات پر رکھی۔ جس طرح پہلے زمانہ میں جہالت کے اندھیرے میں بھٹکنے والوں کا ہاتھ جس چیز پر پڑ گیا وہ خدا بنالی گئی۔ اس طرح علم و عقل سے آراستہ ان مفکرین میں سے جس نے اس اندھیرے میں اپنے قیاسات کو ذرا مرتب شکل میں پیش کر دیا اسے حقیقت مان لیا گیا۔ عقل پر حد سے زیادہ اعتماد نے مفکرین کا نقطۂ نظر یہ بنا دیا کہ ہم صرف ان چیزوں کو مانیں گے جو ہمارے حواس کی گرفت میں آجائیں۔ اور چونکہ خدا انسان کے حواس سے بلند ہے۔ اسے دیکھا اور چھوا نہیں جا سکتا۔ نہ اس کے وجود کا ایسا ثبوت موجود ہے جسے مانے بغیر چارہ نہ ہو اس لیے ان مفکرین میں سے جو خود شناس تھے وہ تو یہاں رک گئے کہ خدا چونکہ ہمارے حواس کی پکڑ میں نہیں آتا اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہو اور ہو سکتا ہے کہ نہ ہو۔ لیکن جو لوگ دنیائے علم کے نو دولتے تھے انھوں نے خدا کے وجود کا دو اور دو چار کی طرح کا ثبوت نہ ہونے کو اس کے نہ ہونے کا ثبوت سمجھ لیا۔ اور ایسی باتیں کرنے لگے کہ گویا انھیں خدا کے نہ ہونے کا کوئی قطعی ثبوت مل گیا ہو۔ درآں حالکہ وہ خود جانتے اور مانتے تھے کہ نفی کا کوئی ثبوت ممکن نہیں۔ انہی میں سے بعض عقل کے تیلون نے تو یہ بھی کہا کہ خدا نے انسان کو نہیں، انسان نے خدا کو پیدا کیا ہے۔ یعنی خدا اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان کے ذہن یا وہم کی پیداوار ہے۔ یہ علٰحدہ بات ہے کہ جب انہی لوگوں پر کوئی کڑی مار پڑی تو دعا کے لیے گرجوں کے دروازے کھل گئے۔ بہر صورت سطح ذہن کے اس فرق کے باوجود یہ دونوں طرح کے عقلیت پرست اس بات پر متفق رہے اور اپنے طور پر خدا کو ماننے والوں نے بھی اس رائے میں عملی طور پر ان کا ساتھ دیا کہ ہم اپنی زندگی کا منہاج اور طریقہ طے کرنے کے لیے خدا اور کسی ماورائی ہدایت کے محتاج نہیں ہیں۔ انسان کی عقل اور اس کے تجربات یہ کام کر سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ایک طرف تو کلیسا کے مظالم کا ردعمل یہ ہوا کہ جدید علمی تحریک سے پیدا ہونے والے مفکرین کی ذہنیت میں لامذہبیت پیوست ہو گئی اور ان کے زیر اثر علوم و فنون اور ادب کا جوار تقا ہوا وہ اسی ذہنیت کے ساتھ ہوا۔

دوسری طرف انھوں نے بجا طور پر محسوس کیا کہ انسان و کائنات کی اصل کا معمہ حل کیے بغیر چارہ نہیں، اور چونکہ یہ معما بھی حواس کے حدود سے آگے کی چیز ہے اس لیے یہاں بھی انھوں نے اپنی محدود عقل ہی کو رہنا بنایا۔ عقل کو میں اس وجہ سے محدود کہہ رہا ہوں کہ عقل بیچاری حواس کی محتاج ہے۔ حواس کے رپورٹر جیسی اطلاع اسے دیں گے ویسا ہی فیصلہ یہ عقل کرے گی۔ اور جہاں رپورٹر کوئی اطلاع نہیں دیں گے وہاں یہ عقل اگر خود شناس ہے تو کوئی فیصلہ نہیں کرے گی اور اگر بر خود غلط ہے تو اندھیرے میں تیر چلاتی رہے گی۔ عقل کی ایسی ہی دوڑ بھاگ کے نتیجہ میں متعدد نظریات وجود میں آئے۔ یہ نظریات بھی ایسے ہی اندازوں اور خود ساختہ اصولوں پر قائم تھے جیسے قدیم فلسفہ یونان کے نظریات تھے اور جنھیں دنیا اپنی علمی ترقی کے ساتھ رد کر چکی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس علمی بیداری نے قدیم جہالت کے ڈالے ہوئے بہت سے پردے چاک کیے۔ بہت سے وہ بند کھولے جو دلوں اور دماغوں کو جکڑے ہوئے تھے۔ فکر کا دریا جو ایک تالاب میں بند ہو کر گندہ ہو رہا تھا اسے روانی بخشی اور حریت فکر و ضمیر کی دولت سے انسان کو مالا مال کیا۔ یہ انسان پر جدید علمی بیداری کا احسان ہے۔ لیکن اسی آزادی فکر و ضمیر کی جولانیاں دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ ان قابل احترام مفکرین نے اپنے نظریات کو سجانے اور انھیں دل نشین بنانے میں اگرچہ بے مثال محنت اور قابل قدر ذہنی صلاحیت صرف کی۔ لیکن کسی ماورائی ہدایت سے آزاد ہو جانے کی وجہ سے یہ آزادی فکر و ضمیر آوارگی فکر و ضمیر بن جانے سے نہیں بچ سکی۔ ساتھ ہی غور کرنے سے عقل کی بے راہ روی کا ایک پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے جس کی جانب ڈاکٹر اقبال نے اشارہ کیا ہے کہ "عقل تا بال کشود است گرفتار تر است" یعنی جب سے عقل نے بازو کھولے ہیں وہ اور زیادہ گرفتار ہو گئی ہے۔

اس طرز فکر نے بہت سے فلسفے اور فلسفیانہ نظام پیدا کیے جو کتابوں میں لکھے گئے اور تعلیم گاہوں میں پڑھے اور پڑھائے جاتے رہے۔ ان سب کا ذکر کرنے کی یہاں نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔ مگر ان میں سے تین فلسفیانہ نظریے ایسے ہیں جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اٹھے اور تفصیلات سے قطع نظر اپنی روح کے اعتبار سے پوری تہذیب پر چھا گئے۔ اور جنھوں نے انسانی زندگی پر جتنا ہمہ گیر اثر ڈالا ویسا اثر شاید کسی اور چیز نے نہیں ڈالا۔

ان میں سے ایک نظریہ وہ ہے جو ہیگل نے تاریخ انسانی کی تعبیر کے سلسلہ میں پیش کیا ہے۔ دوسرا اسی کا ہم جنس ایک اور فلسفہ تھا جو مارکس کی تعبیر تاریخ کے بطن سے نکلا۔ یہاں ان فلسفوں کی تفصیلات بیان کر کے ان پر بحث و تنقید کا موقع نہیں۔ ان فلسفوں پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ ان کی بنیاد مشاہدہ پر نہیں، نہ کسی ایسی چیز پر ہے جو حواس کی گرفت میں آتی ہو۔ جبکہ یہ فلسفی اسی وجہ سے خدا کو ماننے پر تیار نہیں ہوئے کہ وہ حواس سے ماوراء ہے۔ البتہ اپنے موضوع کے اندر رہتے ہوئے ڈارون کے نظریۂ ارتقا اور اسی خاندان کے دوسرے افراد یعنی تنازع للبقاء (STRUGGLE FOR EXISTENCE) انتخاب طبیعی (NATURAL SELECTION) اور قانون بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) پر بھی ایک سرسری نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ کیونکہ انہی نظریات کے اثرات

وسیع تر اجتماعی فکر میں جذب ہوئے ہیں اور جنھوں نے انسانی معاشروں کو تعاون کے بجائے تصادم کی راہ پر ڈال دیا ہے۔

عام انسانی ذہن نے ان نظریات سے متاثر ہو کر کائنات کا جو تصور قایم کیا وہ یہ تھا کہ یہ کائنات ایک میدان جنگ ہے جہاں زندگی اور بقا کے لیے مسلسل جنگ ہو رہی ہے جو ختم ہونے والی نہیں۔ نظام فطرت ہے ہی کچھ ایسا کہ جسے زندہ اور باقی رہنا ہو اسے نزاع اور کشمکش کرنا پڑتی ہے۔ اور اس زور آزمائی میں وہی باقی رہنے کا حق دار ہے جو زندہ رہنے کی قوت کا ثبوت دیدے۔ اور جس نے اپنی یہ طاقت ثابت کر دی وہی اصلح ہے۔ اور چونکہ وہ اصلح ہے اس لیے زمین اور اس کے وسائل زندگی پر اسی طاقتور اصلح کا حق ہے جس نے زندہ رہنے کی طاقت کا ثبوت دیدیا اور کمزور چونکہ اصلح نہیں ہے اس لیے اسے طاقتور کے لیے جگہ چھوڑ دینا چاہئے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو طاقتور بالکل حق پر ہے۔ اگر وہ کمزور کو ہٹا کر اس کی جگہ لے لیتا ہے۔

یہ نظریات اگر نباتات وحیوانات کی طبعی زندگی تک رہتے تو مضائقہ نہیں تھا۔ ان پر علمی بحثیں ہوتی رہتیں مگر غضب تو یہ ہوا کہ ان نظریات کو نباتات وحیوانات کی طبعی خصوصیات کے دائرہ سے آگے بڑھا کر انسان کی ارادی اور معاشرتی زندگی میں داخل کر دیا گیا۔ اور قدرتی بات ہے کہ کائنات کا یہ جنگ و جدال والا تصور اور بقا و فنا کا یہ قانون انسان کی شعوری زندگی اور اس کی زیر دستی و بالا دستی کے تعلق سے جب دل و دماغ میں بیٹھ جائے تو اس سے پیدا ہونے والے فلسفۂ زندگی میں محبت، رحم اور ایثار جیسے شریفانہ جذبات کی نہ ضرورت رہے گی نہ گنجائش۔ عدل و انصاف اور امانت و صداقت جیسی چیزوں کو طاقت کی طلب کا دیو نگل جائے گا۔ بقاء زندگی کے لیے زور آزمائی کے میدان میں تو معاشروں کے اندر بھی اور مختلف معاشروں کے درمیان بھی طاقت حاصل کرنے کی دوڑ ہی ہو سکتی ہے جس میں ان تمام اعلیٰ اقدار اور اخلاقی اوصاف کا پامال ہونا ضروری ہے جو ہمیشہ سے قابل قدر رہے ہیں۔ طاقت کی اس دوڑ میں اگر اعلیٰ شریفانہ اوصاف کا نام لیا جائے گا اور کسی اخلاقی صفت کا مظاہرہ بھی کیا جائے گا تو اس لیے کہ یہ بھی حصول طاقت کا ایک ذریعہ ہے کسی اخلاقی صفت کے نام پر انسانی برادری کو دھوکہ دے کر ان کے سروں پر سواری گانٹھی جا سکتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ بات کہ پہلے بھی انسان لڑتا جھگڑتا رہا ہے۔ مگر پہلے اسے فساد سمجھا جاتا تھا اور اب وہ عین تقاضائے فطرت ہو گیا۔ دنیا میں ظلم ہوتا ہی رہا ہے مگر پہلے اسے ظلم ہی سمجھا جاتا تھا اور اس کا امکان رہتا تھا کہ ظلم کرنے والے کا ضمیر جاگے اور وہ اس سے باز آ جائے۔ مگر اب ظلم کو اس نظریہ کی بنیاد پر ایسی منطق مل گئی جس سے وہ طاقتور کا حق بن گیا۔ اس کے بعد ظلم کو ایک برائی سمجھنے اور ضمیر کے جاگنے کا سوال ہی باقی نہیں رہا۔ خاص طور پر جبکہ اجتماعی لادینیت اور خالص دنیاویت نے جس کا نام سیکولرزم رکھا گیا ہے انسان کو شیلزم کی شراب پلا کر شتر بے مہار بنا دیا ہے۔ ساتھ ہی اس کے دماغ میں یہ ہوا بھر دی ہے کہ تو خود صاحب حاکمیت ہے تجھے تیری ماں نے آزاد جنا ہے۔ تجھ پر کسی اور کی مرضی اور کسی دوسرے کا حکم چلنے کا کوئی سوال نہیں۔ تجھ پر خود تیری مرضی کو منظم ہو کر چلنا چاہئے تو کسی اور کی ساورنٹی کا تابع کیوں ہو تو خود خالق آپ ہی ہے تو لائسنس عطا

یہ فعل ہے۔ تیری مرضی چلانے کے امیدواروں میں سے تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔

آدم کا بیٹا جو طاقت اور کمزوری کا، عقل اور جذبات کا، علم اور جہالت کا مرکب ہے۔ جو ایسی طاقت حاصل کر چکا ہے جسے اس دور سے پہلے کسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سر میں بے قیدی و سرمستی کی یہ ہوا بھر کے اسے مادر پدر آزاد کر دیا جائے۔ ساتھ ہی عقلی فلسفوں کے ذریعہ اس کے ضمیر کو سلا دیا جائے۔ اس کے سفلی جذبات کو ابھار کر نسلی برتری یا کسی اور طرح کے نیشنلزم کا نشہ چڑھا کر مقابلہ کی طاقت حاصل کرنے کے میدان میں اتارا جائے گا تو ایسا انسان دوسرے انسانوں کے لیے بھیڑیا نہیں بنے گا تو اور کیا بنے گا۔ ایسے انسان کو امن کی تلقین کرنا ایسا ہی ہو گا جیسے بھوکے درندوں کو گھاس چرنے کی تعلیم دینا۔ اس پر مزید یہ کہ تاریخ کو روٹی کی خراد پر چڑھا کر جب یہ فلسفہ ذہنوں میں اتار دیا جائے کہ محروم انسان ہمیشہ روٹی کے لیے لڑتا ہے اور اس کا روٹی کے لیے ہی لڑتے رہنا عین تقاضائے فطرت اور عصری تقاضا ہے تو یہ شراب دو آتشہ ہو جائے گی۔ اس طرح بھوک کو بھڑکانے اور انتقامی جذبات جگا دینے کے بعد تو قدرتی طور پر محبت و آشتی کی نہریں نہیں خون کی ندیاں بہتی دکھائی دیں گی۔ ادھر محبت سے سرشار آدمی خون کے آنسو بہاتے ہوئے کہے گا ؎

درندو جنگلوں سے آ کر اپنی آنکھ سے دیکھو ۔۔۔ کہ انساں سے نہیں پائی ہے انساں نے اماں اب تک

البتہ اس مقام پر طاقت کے بھی پرستار اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور قریبی تاریخ ہی کے اتار چڑھاؤ پر حقیقت بیں نگاہ ڈالیں تو انھیں نظر آ جائے کہ ان غیر فطری طریقوں سے حاصل کی ہوئی طاقت پائدار نہیں ہوتی بہت جلد زائل ہو جاتی ہے۔ نشہ آور چیزوں سے چڑھا ہوا نشہ ذرا سی ترشی سے اتر جاتا ہے۔

اس کے بعد امن اور فساد کے تعلق سے ایک اور بات پر نظر ڈالیے۔ دنیا کے سامنے قرآن نے جو عقائد پیش کیے ہیں ان کی حقانیت کے دلائل بیان کرنے کا تو وقت نہیں ہے۔ اس وقت تو بس اتنا کہہ دینے کی گنجائش ہے کہ وہ انسانی فطرت ہی کی آواز ہیں۔ جس نظام فکر و عمل کا نام اسلام ہے اس کی بنیاد یعنی توحید اور آخرت اور رسالت کے عقیدہ سے جو تعلیم ملتی ہے اور انسانی فکر کا جو رخ متعین ہوتا ہے اس کو اگر قانون بقائے اصلح کی طرز کا نام دیا جائے تو وہ ہو گا قانون بقائے انفع یعنی اصل چیز نفع رسانی ہو گی۔ جو شخص یا جو قوم نفع پہنچانے کی صفت میں جتنا آگے بڑھے گی اتنی ہی اس کی طاقت زیادہ اور اس کی زندگی طویل ہو گی۔ اس نظریہ کو اگر حکومت کی طاقت مل جائے اور اس کے ہاتھ میں ذہن و فکر بنانے کے وسائل آ جائیں تو چونکہ یہ نظریہ انسان کی خیر پسند فطرت کو اپیل کرنے والا ہے اس لیے ذہن و فکر کی دنیا میں انقلاب آ جائے اور دیکھتے دیکھتے ہوا کا رخ اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ آج جو دوڑ طاقت حاصل کرنے کے میدان میں مچی ہوئی ہے اور انسانوں اور انسانیت کو روند رہی ہے ویسی ہی دوڑ نفع رسانی کے میدان میں شروع ہو جائے اور سہارے کے محتاج لوگوں کو سہارا دینے والا بنا دے۔ یہ مسابقت شروع ہو جانے کے بعد سرچشے

کے نام ہے اور بنیادی قدریں اس طرح بدل جائیں کہ امن و آشتی کے لیے علیحدہ سے کسی وعظ اور کسی اپیل کی ضرورت ہی نہ رہے۔ انسان کے امن پسند مزاج کے ساتھ اس نظریہ کی خاصیت مل جائے تو محبت و آشتی کی نہریں جاری ہو جائیں۔ ساری خلق کو خالق کا کنبہ سمجھنے کی تعلیم کتابوں سے نکل کر انسان کے فکر و عمل میں رچ بس جائے اور اس طرح دنیا طاقت آزمائی کے جنگل اور مادہ پرستی کی بھٹی سے نکل کر امن و سلامتی کے ٹھنڈے سایہ میں آجائے۔

محترم بھائیو! یہ قانون بقائے انفع کی بات جو میں نے نہایت ہی مختصر طور پر کہی یہ اسلامی تعلیمات کا صرف ایک نکتہ ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جس نظام فکر و عمل کے صرف ایک نکتہ سے دنیا میں امن کی بہار آسکتی ہے تو پورے نظام کی برکتیں کیا کچھ ہوں گی!

تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے اسی لیے میں نے مغربی تہذیب کے بنیادی اصولوں پر ہی گفتگو کی ہے اس کے ثمرات و نتائج کی جانب محض اشارات کیے ہیں۔ اس طرح اسلام کے عقیدہ سے نکلنے والی بنیادی تعلیم ہی کا بیان کافی ہونا چاہیے۔ کیونکہ توجہ کے لائق بنیادی چیز اس منبع کو ہونا چاہیے جہاں سے تباہ کن سیلاب نکلتا ہے یا رود حافظ! نہریں۔ پھر یہ کہ دیکھنے اور جانچنے کی چیز اصول ہوتے ہیں نہ کہ ان اصولوں کے نام لیوا تاہم بات کو سمجھنے کے لیے نمونہ کے طور پر اس معطر حیات بخش دیگ کا ایک چاول پیش کر رہا ہوں۔

ان دنوں معاشیات کا بہت زور ہے۔ اسی بنیاد پر تحریکیں بھی چل رہی ہیں اور فتنے بھی اٹھ رہے ہیں اس لیے معاشیات ہی کے نقطۂ نگاہ سے ایک نظر اسلام پر بھی ڈال لیجیے۔ لیکن اس مطالعہ میں دو باتیں پیش نظر رہنا ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ کسی عمارت کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے اس کے صرف ایک دو ستونوں کا دیکھ لینا کافی نہیں۔ پوری عمارت پر مع اس کی بنیاد اور اغراض تعمیر کے نگاہ ڈالنا ضروری ہے، دوسری بات یہ کہ آسمانی کتابوں اور انبیاء کی تعلیمات کا عملی روپ جس کا نام اسلام ہے اس کا بنیادی مقصد انسان کے معاشی مسئلہ کو حل کرنا نہیں اس کے انجام کا مسئلہ حل کرنا ہے۔ اگرچہ وہ انسان کی روٹی کے مسئلہ کو اور اس کی زندگی کے تمام مسائل کو نظر انداز نہیں کرتا اور دوسرے نظام اگر کوئی ایک مسئلہ حل کرتے بھی ہیں تو سو مسائل پیدا بھی کرتے ہیں اور انھیں الجھا بھی دیتے ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود ان مسائل کی اہمیت اسلام کی نگاہ میں اس سے زیادہ نہیں جتنی اہمیت کسان کی نگاہ میں بھوسہ کی ہوتی ہے۔ کاشتکار کھیتی کرتا ہے گیہوں پیدا کرنے کے لیے لیکن بھوسہ خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اگرچہ بھوسہ ایک قیمت رکھتا ہے لیکن وہ کاشت کار کا مقصود نہیں ہوتا۔

اسلام سب سے پہلے خدا کے وجود کا عقیدہ مع توحید اور دوسری صفات کے دلوں میں بٹھاتا ہے پھر اس کی صفات سے منطقی نتیجہ کے طور پر پیدا ہونے والے رسالت و آخرت کے عقیدہ کا یقین پیدا کرتا ہے۔ عقیدہ پر یقین ایک قلبی کیفیت ہے۔ اور ہر کیفیت کی طرح یہ کیفیت بھی گوناگوں حالات سے گزرتی ہے اسلامی عبادات اس یقین

مختلف اسباب سے پڑنے والی گرد کو صاف کرتی رہتی ہیں اور خوف خدا کے اس چوکیدار کو بیدار رکھتی ہیں جو بندہ مومن کے دل پر بیٹھا رہتا ہے۔ پھر آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے والا یہ عقیدہ قدروں کو بدل دیتا ہے۔ عزت کا معیار دولت کو نہیں تقوی کو قرار دیتا ہے۔ انفاق، ایثار، صداقت و امانت، صبر و شکر، قناعت و توکل اور خدمت خلق جیسے اعلیٰ اوصاف کے حق میں رائے عامہ تیار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم ہرگز مسلمان نہیں ہو اگر تمہارا پڑوسی بھوکا ہو اور تم پیٹ بھر کر سو جاؤ۔ اور اسی طرح بخل و حرص اور خود غرضی جیسی ناپسندیدہ چیزوں کے خلاف نفرت و بیزاری کو عام کرتا ہے جب اس کو قوت نافذہ کے ذریعہ بھلائیوں کی آبیاری اور برائیوں کے استیصال کا اختیار حاصل ہو تو وہ ہر مستحق کی کفالت کا ذمہ دار ہوگا۔ اس کا بیت المال ویسا تالاب نہیں ہوگا جس میں سے پانی لینے کے لیے شرط یہ ہو کہ پہلے آپ اس میں پانی ڈالیں تب اس پر آپ کا حق ہوگا۔ بلکہ اس میں سے ہر پیاسا سیراب ہو سکے گا چاہے اس نے تالاب میں کبھی ایک چلو پانی بھی نہ ڈالا ہو۔ وہ ذہنوں کو ڈھالنے والے ایسے سانچے بنائے گا اور ترغیب و ترہیب کے مختلف طریقوں سے کام لے کر آدمی کی خودی و عزت نفس کو اتنا بیدار کر دے گا کہ ایک سوار کا چابک اگر گر پڑے تو وہ کسی راہگیر سے چابک اٹھانے کی فرمائش نہیں کرے گا کہ مبادا یہ فرمائش سوال کی تعریف میں آ جائے۔ گھوڑے سے اتر کر خود چابک اٹھائے گا۔ اسی نقشہ کو دیکھ کر بعد میں آنے والے کہیں گے ؎

فقیری میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے — کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

یہ اور ایسے ہی دوسرے داخلی و خارجی انتظامات کے بعد بھی اگر کوئی خبیث النفس چوری جیسا گھٹیا جرم کرے تو اسے ایسی سخت سزا دی جائے کہ وہ اپنا کٹا ہوا ہاتھ لے کر پوری سوسائٹی کا نفسیاتی آپریشن کرتا پھرے۔ اسی ضرورت سے وہ طاقت و اختیار چاہتا ہے۔ اور یہی خدمت انجام دے کر انسانیت پر بہار لانے کی غرض سے وہ انسانی باغ کا چارج اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے۔ کیوں کہ انسانیت کی ایسی ہمہ جہتی خدمت بغیر اختیار کے نہیں کی جا سکتی۔

یقیناً اس زمانے میں یہ بہار دنیا کی نظروں سے اوجھل ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ضرور ہے کہ اگر کچھ لوگ مل کر دنیا پر یہ بہار لانے کی دھن میں لگ جائیں۔ اور اللہ کی مدد سے ان کی کوششوں کے نتیجہ میں انسانوں کی تنظیم کا تانا بانا اس طرح بُن دیا جائے کہ نفسانیت پر حقانیت غالب آ جائے۔ طاقت کی دوڑ کے بجائے نفع رسانی اور اوصاف عالیہ کی دوڑ شروع ہو جائے۔ زن، زر، زمین جیسے فساد و پیکار کے عوامل اگر معدوم نہ ہوں تو کمزور ہو کر اتنے دب جائیں کہ انسانوں کے دل و دماغ پر ان کا غلبہ نہ رہے کہ ایسی چیزوں سے انسان کو شرم آنے لگے تو کیا پھر بھی انسانی خون اتنا ہی ارزاں رہے گا جتنا آج ہے؟ —— یہیں سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ انسانیت کی اس سے بڑی خدمت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اور جن خوش نصیبوں کو اس خدمت کی توفیق ہے ان سے زیادہ بلند مقام خدا و خلق کی نگاہ میں اور کسی کا نہیں ہوگا۔

ان باتوں کے تعلق سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں چونکہ مسلمان ہوں اس لیے بس اپنے مذہب کی حمایت کر رہا ہوں۔ مگر میرے عزیزو! میں کہوں گا کہ اگر آپ کے دل میں واقعی امن وآشتی کی تمنا مچل رہی ہے تو بدگمانیوں کی سطح سے اوپر اٹھ کر اور اپنے خیر خواہ بن کر حقیقت بیں نگاہ سے مسئلہ کو دیکھئے۔ کیا یہ غلط ہے کہ ہم خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم ہمارے دل ودماغ پر مغربی افکار ونظریات کا جادو چلا ہوا ہے۔ انہی کی قدروں کو اور انہی کے معیارات کو ہم نے قبول کر لیا ہے ہم اشیا کو انہی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور معاملات پر انہی کے زاویہ سے سوچنے لگے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی باخبر ان باتوں سے انکار نہیں کریگا۔ جب بات یہ ہے تو پھر ذرا آزاد وغیر جانبدار ذہن سے سوچئے۔ مسلم وغیر مسلم کا فرق کئے بغیر تمام انسانوں کے لئے امن وسلامتی اور خیر وبرکت کا انحصار طاقت ور بننے کے لیے کش مکش کرنے میں ہے یا دوسروں کو نفع پہنچانے کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش میں؟ لوگوں کی خدمت کرکے مزہ لینے میں ہے یا دوسروں کو نیچا دکھا کر خوش ہونے میں؟ دوسرے الفاظ میں یہ کہ قانون بقائے اصلح کی زور آزمائی کے ابلتے ہوئے سیلاب میں ہے یا قانون بقائے انفع کے ٹھنڈے آبشار میں؟ گروہ بندی کے جذبات سے بلند ہو کر دیکھا جائے تو صاف دکھائی دیگا کہ مغربی فلسفوں کا بنایا ہوا نظریہ امن پسند انسان کو خون آشام درندہ بنا دیتا ہے اور آپ کے اپنے خدا کا سکھایا ہوا نظریہ لڑنے بھڑنے والے انسان کو انسانیت کا سچا خادم بناتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ طاقتور ظالم کے لیے نرم چارہ اور میٹھا نوالہ بن جانا بھی نہ تو انسان کی صحیح فطرت سے میل کھاتا ہے نہ اس کے اخلاق سے۔ پھر یہ کہ خیر وبرکت کے خزانہ کی حفاظت کے لیے بھی طاقت کی ضرورت ہے اس وجہ سے ایک الجھن یہ پیدا ہوتی ہے کہ خیر وصلاح کی حفاظت کرنے والی طاقت میں اور شر وفساد پھیلانے والی طاقت میں فرق کیسے کیا جائے۔ مگر یہ کوئی مشکل کام نہیں حقوق کی حفاظت یا مظلوم کی حمایت میں نکلی ہوئی تلوار اور ڈاکو کے ہاتھ میں اٹھی ہوئی تلوار دونوں دیکھنے میں تو یکساں ہیں لیکن دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ پھر اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ قیام امن کے لیے بہرحال ایک قوت قاہرہ کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ قوت قاہرہ خیر کی خادم ہے یا شر وتسلط کی پشت پناہ۔ مگر اس فرق کو سمجھ لینا اور زیادہ آسان ہے۔ اول تو ہر ایسی طاقت خود اپنے بنیادی اصولوں کا اظہار واعلان کرتی ہے۔ اور اگر نہ بھی کرے تو اس کے طور وطریق سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ طاقت کس سرچشمہ سے غذا حاصل کر رہی ہے۔ خداپرستی کے عقیدہ سے یا تنازع للبقا جیسے کسی نظریہ سے۔

اس مقام پر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ جب طاقت کا حقیقی سرچشمہ عقیدہ توحید اور اس پر یقین ہے اور اس عقیدہ سے پھوٹنے والی تعلیم یعنی اسلام لوگوں کے لیے امن وآشتی کا گہوارہ ہے تو پھر کیا بات ہے کہ اس عقیدہ کے امین وعلم بردار مسلمان اس کی برکتوں سے فیض یاب نہیں ہیں۔ دوسروں کے لیے خدا کی رحمت کا سایہ بننے کے بجائے خود اپنے اندر ہی فی سبیل اللہ فساد میں معروف ہیں۔ اس سوال پر میں عرض کروں گا کہ میری اس گفتگو کا عنوان "اسلام

اور امن، نہیں " اسلام اور امن " ہے۔ اس لیے مجھے اپنے موضوع سے باہر نہیں جانا چاہئے۔ تاہم مختصر بات یہ کہ اگر کوئی انصاف پسند غیر مسلم بھی تلاش حق کی نیت سے مطالعہ کرے تو اسے نظر آئے گا کہ جب تک مسلمان اپنے عقیدہ اور اس کے تقاضوں سے اجتماعی نظم کے ساتھ جڑے رہے تو فکری امامت اور عملی قیادت کی ذمہ داری انہی پر رہی لیکن جب وہ مختلف اندرونی و بیرونی حملوں کی زد میں آکر اور اس منصب سے سیر ہو کر سہولت پسندی کا شکار ہو گئے۔ احتساب کائنات کی جدوجہد کرتے کرتے تھک گئے اور " چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات " میدان عمل سے ہٹ کر سو گئے تو لیلائے زندگی میں ان کے سب مہرے مات کھا گئے۔ ایسے میں حالات میں دوسری قومیں آگے بڑھیں اور انھوں نے احتساب کائنات کا فریضہ انجام دے کر ایسی طاقت حاصل کرلی کہ فکری امامت کا اور نتیجہ میں عملی قیادت کا پرچم ان کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس کے بعد جو دنیا میں آگ و خون کا کھیل کھیلا جاتا رہا حتی کہ اسی صدی کے صرف تیس چالیس سال کے مختصر عرصہ میں دوبار پوری دنیا کو خون کا غسل دیا گیا۔ اور اب بھی جگہ جگہ خوف و دہشت کی نئی نئی شکلیں سامنے آرہی ہیں یہ سب انہی کی فکری امامت اور عملی قیادت کی دین ہے۔ مسلمانوں کو سوچنا چاہئے کہ ان کی غفلت اور خود فراموشی نے جو دنیا کو یہ دن دکھائے۔ اور اس کانٹوں بھرے جنگل کا سب سے زیادہ پر خار حصہ خود انہی کے حصہ میں آیا اس کا ذمہ دار کون ہے۔ بے لاگ انصاف کا فتویٰ ہو گا کہ اس کی ذمہ داری میں یہ بھی شریک ہیں۔ اب انھیں آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہئے کہ ایک طرف تو مغربی تہذیب کی بلی اب تھیلے سے باہر آچکی ہے۔ مغربی دنیا ٹھوکریں کھاتے کھاتے اپنی ہی پیدا کی ہوئی تہذیب سے بیزار ہو کر اس طرح چیخنے لگی ہے کہ اس کی آواز مشرق میں بھی سنائی دے رہی ہے۔ دوسری طرف انہی کی علمی و تحقیقی کاوشوں نے ایسے راز دنیا پر منکشف کر دیے ہیں کہ اب خدا کو نظر انداز کرنا یا اس سے انکار مشکل سے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اور نور ہدایت سے محروم علم و فکر کے اندھیرے میں روح عصری پکار رہی ہے۔

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے عشق بلا خیز کا قافلہ سخت جاں

ربنا تقبل منا انک انت السمیع علیم و تب علینا انک انت التواب الرحیم

ضروری اعلان

تبادلہ کے اخبارات، رسائل اور مجلات جو مدیر " زندگی نو " کے نام رام پور کے پتہ پر بھیجے جاتے تھے اب اس پتہ پر ارسال کئے جائیں۔ تبصرہ کے لیے کتابیں بھی اسی پتہ پر بھیجی جائیں۔

مدیر زندگی نو، پان والی کوٹھی، دودھ پور۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

جنسی تعلیم کا مسئلہ اور اسلام

سلطان احمد اصلاحی

موجودہ دور میں خدا سے بے زار اور ہدایت الٰہی سے بے نیاز ہو کر انسان نے فکر و نظر کی باگ جو اپنے ہاتھ میں سنبھالی ہے اور اس کے نتیجے میں جو پے در پے قلابازیاں وہ کھا رہا ہے اس کا تازہ ترین نمونہ 'جنسی تعلیم کا مسئلہ' ہے، جس میں سن بلوغ کو پہنچنے اور جنسی ضروریات کو محسوس کرنے سے پہلے ہی لڑکوں اور لڑکیوں کو اس کے تمام سربستہ رازوں سے آگاہ کر دیا جانا ضروری خیال کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اطلاع ہے کہ برطانیہ میں وہاں کے دارالعوام نے برطانیہ میں موجود تمام تعلیم گاہوں کے لیے ایک قانون منظور کیا ہے جس کی رو سے تمام تعلیم گاہوں پر لازم ہے کہ وہ بچوں کو جنسی تعلیم دیں اور ہر بچے کے لیے لازم ہے کہ وہ جنسی تعلیم کی کلاس میں حصہ لے۔ اس سے قبل بچوں کے والدین کو اختیار تھا کہ وہ بچوں کو جنسی تعلیم کی کلاس میں شریک ہونے کی اجازت دیں یا نہ دیں، لیکن اب والدین سے یہ اختیار چھین کر اسکول کے ماسٹروں کو دیدیا گیا ہے۔ یہ جنسی تعلیم بچوں اور بچیوں دونوں پر بلا تخصیص لازم ہے۔[1]

جنسی تعلیم برطانوی تعلیم گاہوں میں:

برطانوی تعلیم گاہوں میں اس جنسی تعلیم کا کیا رنگ ڈھنگ ہے اور تعلیم کے نام پر کیا کچھ گل کھلائے جا رہے ہیں اس کا کسی قدر اندازہ بچوں کے لیے جنس پر پڑھائی یا پڑھنے کے لیے تجویز کی جانے والی کتابوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ جس کے کچھ نمونے یہ ہیں:

- "سیکس ایجوکیشن (جنسی تعلیم)۔ یہ کتاب تعلیم دیتی ہے کہ لڑکیوں کو آزادی ہونی چاہیے کہ وہ جس کو چاہیں اپنا ساتھی، دوست یا ہمجولی بنائیں۔
- MAKE IT HAPPY ۔ یہ کتاب کہتی ہے کہ جنس سے لذت انفرادی طور پر نہیں، مل کر حاصل کرنی چاہیے۔ (جیسے قوم لوط کیا کرتی تھی۔)
- ہم حاملہ نہیں ہیں۔ اس کتاب میں حمل اور جنس کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

بچوں کے حقوق (رائٹس آف چلڈرن) اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ کس عمر میں جنسی عمل زبردستی ہے۔

[1] ہمراز ایشیا، لاہور، ۲۱ دسمبر ۱۹۸۶ء ص ۲۱۔

اور کس عمر میں یہ ایک باہمی اختلاط ہے۔

• THOUGHT NOT CAUGHT۔ یہ کتاب بچوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ وہ جہاں دوسری چیزوں کی تصویریں کھینچتے اور بناتے ہیں وہاں جنسی اعضاء کی تصویریں بھی کھینچیں اور بنائیں اور اس میں انھیں کوئی شرم نہیں کرنی چاہئے۔

• بچوں کے لیے جنس کی تفریحی کتاب (ڈپلے بک)۔ اس کتاب میں بچوں کی عریاں تصویریں مختلف انداز سے دی گئی ہیں۔

• BIOLOGY FOR LIFE۔ اس کتاب میں لڑکیوں کو خاص طور پر بتایا گیا ہے کہ حاملہ ہوئے بغیر جنسی عمل سے حظ کیسے اٹھایا جا سکتا ہے۔

• GROWING UP۔ اس کتاب میں رحم مادر میں جنین کی مختلف حالتیں دکھائی گئی ہیں اور یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ حمل سے کیسے بچا جا سکتا ہے۔

• سیکس اینڈ یو (جنس اور آپ) یہ کتاب لڑکیوں اور عورتوں دونوں کے لیے ہے۔ اس میں جنسی عمل کے مختلف طریقے تصویروں کے ذریعہ بتائے گئے ہیں۔

• "جینی ایک مارٹن کے ساتھ رہتا ہے" یہ ایک ناول ہے جس میں منظر کشی کی گئی ہے کہ ایک لوطی باپ ایک ہی بستر میں اپنی پانچ سالہ بیٹی اور دوست لڑکے کے ساتھ رات کیسے گزارتا ہے۔

• "ایک لڑکا دس میں!" اس کتاب میں قارئین کو ہم جنس پرستی کے فوائد بتائے اور تلقین کیے گئے ہیں۔

• "ایک گوالا اپنی راہ پر"۔ یہ بھی ایک ناول ہے۔ جس کی کہانی کا مرکزی کردار ایک ٹیچر ہے جو اپنے نوجوان شاگرد کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتا ہے[1]

ہندوستان میں جنسی تعلیم: ہمارا ملک ہندوستان جو سیاسی طور پر برطانوی استعمار سے آزاد ہو جانے کے باوجود فکر و نظر کے سانچوں میں آج بھی برطانیہ و یورپ ہی کا اسیر ہے، ظاہر ہے جنسی تعلیم کی اس نئی جنس کو اپنے ہاں درآمد کرنے میں زیادہ تاخیر نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ خبر ہے کہ ملک کی راجدھانی دہلی میں 'جنسی تعلیم' (SEX EDUCATION) کا استقبال کیا جا چکا ہے۔ اگرچہ بہت سے لوگوں کو اس کا پتہ نہیں ہے۔ لیکن دہلی کے منتخب اسکولوں اور کالجوں میں ایک خاموش جنسی انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ جنسی تعلیم جسے متعدد دہائیوں سے ملک میں 'شجر ممنوعہ' باور کیا جاتا تھا، بالآخر وہ کلاس روموں میں داخل ہو چکی ہے۔ اور سینکڑوں لڑکے اور لڑکیاں جنس کی بنیادی باتوں کو سیکھ رہے ہیں یہ نیا

[1] حوالہ سابق ص ۲۲۔

تجربہ ایک رضاکارانہ تنظیم پریوار سیوا سنستھا کی کوششوں کا رہین منت ہے جناب چیتنا کوہلی جن کی عمر چھتیس سال ہے اور جو مذکورہ تنظیم میں پروگرام منیجر کے فرائض انجام دے رہی ہیں ان کا کہنا ہے کہ اس تجربہ کی پذیرائی تعجب خیز حد تک ہے۔ وہ ادارے جہاں جنسی تعلیم کی کلاسوں کا انعقاد عمل میں آیا، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: بھارتیہ ودیا بھون، چندرا آریہ ودیالے آرمی پبلک اسکول، بلائنڈ اسکول جو ماڈل ٹاؤن میں ہے۔ لیڈی سری رام کالج اور گورنمنٹ کے سینیر سرکاری اسکولس جو خیالہ اور راج پوری گارڈن کے علاقوں میں واقع ہیں[1]

آگے اس تنظیم کے پروگرام اگزیکیوٹیو کے۔ آر۔ کو اس جی، کا کہنا ہے کہ شروع شروع میں تو بچے عام طور پر شرمیلا پن محسوس کرتے ہیں لیکن جیسے جیسے کلاس آگے بڑھتی ہے وہ کھلنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ سوالات کی بوچھاڑ شروع کرتے ہیں تو یہ چیز کہیں رکنے کا نام نہیں لیتی ہے۔ لڑکے اور لڑکیوں کے سادہ ابتدائی تعلق سے لے کر، ان کے استفارات اور شکوک وشبہات کا دائرہ جنسی عمل (EXUAL INTERCOURSE) اور بچہ پیدا کرنے (REPRODUCTION) جیسی چیزوں تک وسیع ہوتا ہے[2]۔

مزید براں ان کے سوالات کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں۔ ایام ماہواری کیا ہوتے ہیں؟ کیا استمنار بالید کا عمل غلط ہے؟ یہ کیا وجہ ہے جو لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کی طرف غیر معمولی کشش محسوس کرتے ہیں؟۔ مانع حمل ادویہ اور اس کے دوسرے طریقے کون کون سے ہیں؟ اس مسئلہ پر مشورہ کی ضرورت ہو تو ہمیں کہاں جانا چاہئیے؟ غرضیکہ اس طرح کے بے شمار سوالات ہیں جو کہیں رکنے کا نام نہیں لیتے مس کوہلی فرماتی ہیں کہ یہی وہ موقعہ ہوتا ہے جبکہ ہم اندر داخل ہوتے ہیں۔ پہلے تو ہم اپنے لکچر کے لیے سلائیڈس کا استعمال کرتے ہیں۔ پھر ہم ٹیچر سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ کلاس روم چھوڑ دیں۔ جب یہ ہو جاتا ہے تو پھر طالب علم صحیح معنوں میں کھلتے ہیں'[3]

یہ ہے صورت حال جس سے کہ جدید دنیا سے آگے خود ہمارا ملک دوچار ہے۔ اس موقعہ پر اسلام کے ایک طالب علم کی حیثیت سے فطری طور پر ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اسلام اس مسئلہ کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جنسی تعلیم کے سلسلے میں اس کا کیا رویہ ہے۔ اور اس باب میں کس طریقۂ کار اور کس لائحۂ عمل کو وہ اپنے اور اپنے ماننے والوں کے لیے پسند کرتا ہے۔

اسلام کا نقطۂ نظر: اسلام کے بارے میں علی وجہ البصیرت ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ وہ انسانیت کے دکھوں کا ایک ہی درماں اور قیامت تک کے لیے اس کے اندر پیدا ہونے والے جملہ معاملات ومسائل کا ایک ہی معتبر، مستند اور قابل اعتماد حل ہے۔ سن بلوغ سے پہلے یا اس کے بعد قبل از وقت جنسی تعلیم کے مسئلہ میں بھی اس کی واضح اور صاف رہنمائی ہمارے سامنے ہے۔ اسلام شادی سے پہلے معقول وجوہ کے بغیر جنسی راز کی

---

[1] ریڈینس ہفت روزہ، دہلی، ۲۳، ۲۹ مارچ ۱۹[illegible]ء ص ۹ [2] حوالہ سابق [3] حوالہ سابق

کی پردہ کشائی کو پسند نہیں کرتا۔ اسے ناگوار ہے کہ ضرورت سے پہلے، مصنوعی ذرائع سے کمسنوں اور نوجوانوں کی جنسی بھوک کو بھڑکایا جائے۔

فطری رہنمائی کا قانون: اس سلسلے میں سب سے پہلے جو چیز ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اسلام کا ماخذ اول قرآن کا فطری رہنمائی کا قانون ہے۔ قرآن حکیم میں یہ بات ایک سے زیادہ مقامات پر کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو ایک خاص انداز سے پر پیدا کیا ہے۔ اور اس کی شکل و صورت، اس کی ہئیت اور اس کی جسمانی ساخت کو ایسا قرار دیا ہے جو اس کی ضروریات و مطالبات کے عین ہم آہنگ ہے۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کو اسباب زیست کی سمجھ اور اپنے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی فطری قوت اور صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے جو ایک جانور کا بچہ بھی پیدا ہوتے ہی اپنی ماں کی چھاتی سے دودھ پینے کا طریقہ اپنے سے سیکھ لیتا ہے۔ مرغی کا بچہ زمین سے دانا اپنے آپ چگنے لگتا ہے۔ اور چڑیا اپنا گھونسلا اپنے آپ تیار کرنے لگتی ہے۔ اسی طرح حیوانات اپنی جنسی ضروریات کا ادراک بھی اپنے آپ کر لیتے ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں اسے اس کی خلقت اور بناوٹ کے لحاظ سے 'احسن تقویم' پر پیدا کیا ہے، بدیہی طور پر اس کے اندر فطری رہنمائی کی صلاحیت بھی دوسری تمام مخلوقات کے مقابلے میں بڑھی ہوئی اور اعلیٰ پیمانے پر رکھی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے جو کسی رسمی تعلیم کے بغیر عمر کے اضافہ کے ساتھ وہ اپنے روزمرہ کے مسائل و ضروریات سے بڑی آسانی کے ساتھ عہدہ برآ ہو لیتا ہے۔ زیر ناف کے بالوں کی صفائی کے لیے آج تک کبھی بھی اسکول اور کالج کی رسمی تعلیم کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ جنسی ضرورت کے مسائل کو بھی اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اَلَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی	جس نے کہ (ہر مخلوق کے لیے بناوٹ میں اس کے مناسب
(اعلیٰ: ۳)	حال) اندازہ ٹھہرایا اور (اس کو جینے کی) راہ بتائی۔

اور

اَلَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ	جس نے کہ ہر چیز کو (اس کے مناسب حال) بناوٹ عطا
ثُمَّ هَدٰی (طٰہٰ: ۵۰)	کی اور (اسے زندگی کی ضروریات کا) طریقہ سکھایا۔

کے اندر جس فطری رہنمائی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور جس کا وافر ترین حصہ اشرف المخلوقات کے حصہ میں آیا ہے اس کے نتیجے میں سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد مناسب وقت پر ازدواجی زندگی میں داخل ہوتے ہی مرد اور عورت دونوں اپنی جنسی ضرورت کے مسائل کا بخوبی ادراک کر لیتے اور کسی کوچنگ اور کلاس میں جائے بغیر اس سے بہتر سے بہتر طریقہ پر عہدہ برآ ہو لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں افراط و تفریط سے بچنے کے لیے اس ضمن میں قرآن و سنت کی تعلیمات بالکل کافی ہیں جو اپنے اندر آدمی کے لیے مکمل اور بھرپور رہنمائی کا سامان رکھتی ہیں۔ اس مرحلے سے پہلے اس

سلسلے کی کسی مشق و تمرین کی اسے کوئی ضرورت نہیں۔

احکام حجاب کی دو دفعات : سن بلوغ سے قبل یا بلوغت کی عمر کو پہنچ جانے کے باوجود رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے اور عملاً اس کے لیے ضرورت مند ہونے سے پہلے، جنسی معاملات کی آگاہی اور اس سلسلے کی مشق و تمرین کی نامطلوبیت پر، اسلام کے قانون حجاب کی ایک دفعہ سے بھی صاف روشنی پڑتی ہے۔ معلوم ہے کہ اسلام نے اپنے معاشرہ کو پاکباز اور عفت مآب رکھنے کی خاطر، دوسرے تحفظات کے علاوہ، خاص طور پر عورتوں کے پردہ کا اہتمام کیا ہے۔ اس سلسلے میں دوسری تعلیمات کے ساتھ ایک طرف تو مردوں اور عورتوں دونوں کو اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ وہ غض بصر، نگاہیں نیچی رکھنے کو اپنا وطیرہ قرار دیں۔ کہ اپنے کو جنسی بے اعتدالیوں سے محفوظ رکھنے اور اس ضمن میں شیطان کی چالوں کو ناکامیاب بنانے کا یہ بڑا موثر اور کارگر ذریعہ ہے۔ لیکن اس تدبیر کو اپنانے کے باوجود گھر کے اندر شوہر کے علاوہ دوسرے بہت سے قریبی رشتہ کے لوگ ہوتے ہیں جن کی فطری طور پر گھر کے اندر کثرت سے آمد و رفت ہوتی رہتی ہے کتاب اللہ نے یہ رعایت رکھی ہے کہ عورت اپنی زیب و زینت کی جگہوں، چہرہ اور ہتھیلی، اسی طرح جسم کے بعض دوسرے حصے جنہیں عورت گھر کے اندر ہر حال میں چھپائے نہیں رکھ سکتی اور جو اٹھتے بیٹھتے لازماً کھل ہی جاتے ہیں، یہی معاملہ کپڑے اور زیور وغیرہ کی زینت کا بھی ہے کہ عورت کوشش کے باوجود اس کی دل کشی و رعنائی کو پوری طرح دبا دینے میں کامیاب نہیں ہوسکتی، چنانچہ کتاب فطرت نے اس دائرے میں گنجائش رکھی ہے کہ عورت شوہر کے علاوہ اپنے قریبی رشتہ داروں اپنے باپ، بھائی، بھتیجے، خسر، اپنے سوتیلے لڑکے وغیرہ جیسے لوگوں کے سامنے اپنی اس زیب و زینت اور اسباب آرائش کو ظاہر کرسکتی ہے۔ اسی ضمن میں قرآن نے ایک دوسرے طبقے کا بھی ذکر کیا ہے جو جنسی تعلیم کے مسئلہ میں اسلام کے مطلوبہ رویہ کے مطالعہ کے سلسلے میں بڑا معنی خیز ہے۔ اور وہ یہ کہ عورت گھر کے اندر ان چھوٹے کمسن بچوں کے سامنے بھی اپنی زیب و زینت کا اظہار کرسکتی ہے جن کو نسوانی رازوں سے آگاہی اور ان کی بابت ان کے اندر ابھی تجسس (CURIOSITY) نہ پیدا ہوئی ہو۔

أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ (نور: ۳۱)

اور وہ بچے جنہیں عورتوں کے بھیدوں کی آگاہی نہ ہوئی ہو۔

جس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ بچہ جب تک بچہ ہے اس کے لیے اسلام کی مطلوبہ فطری راہ یہ ہے کہ وہ اپنی معصومیت پر قائم اور جنسی معاملات میں نابلد اور بے بہرہ رہے۔ اسلام نے بچپنے کی عمر چودہ سال قرار دی ہے جو معلوم ہے[1]۔ دوم یہ کہ بچہ جب اس عمر سے تجاوز کر جائے۔ اور اس کے اندر جنسی حس کسی قدر بیدار، اس کے معاملات سے آگاہی کی خواہش اور اس کی بابت کسی درجہ میں کشش اور لپک پیدا

[1] اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہمارا کتابچہ، بچوں کی مزدوری اور اسلام، ص ۱۸، ۱۹۔ مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔

ہو جائے تو اسے ان مواقع اور ان جگہوں سے دور رکھنے کا پورا اہتمام ہونا چاہئے جہاں پہنچ کر اس کے اندر سے اس کی فطری سادگی کے متاثر ہونے کا خدشہ ہو ــــــ اس ٹکڑے کی تفسیر کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر نے کیا خوب کہا ہے :

أو الطفل الذين لم يظهروا على عورات النساء) يعني لصغرهم لا يفهمون احوال النسآء وعوَاتهن من كلا مهن الرخيم[1] وتعطفهن في المشية وحركاتهن وسكناتهن فاذا كان الطفل صغيرا لا يفهم ذلك فلا باس به خوله على النسآء فاما ان كان مراهقا أو قريبا منه بحيث يعرف ذلك ويدريه ويفرق بين الشوهاء والحسناء فلا يمكن من الدخول على النسآء[2]

(اور وہ بچے جنھیں عورتوں کے بھیدوں پر آگاہی نہ ہوئی ہو) یعنی اپنی کمسنی کی وجہ سے عورتوں کے احوال اور ان کی پوشیدہ باتوں کو وہ نہیں سمجھتے۔ ان کی لوچ دار باتیں، ان کا اٹھلا کر چلنا اسی طرح ان کی دوسری حرکات و سکنات۔ تو جب تک بچہ چھوٹا ہو اور ان باتوں کو سمجھتا نہ ہو تو اس کے لیے عورتوں کے پاس آنے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر وہ بالغ ہو چکا ہو یا بالغ ہونے کے قریب ہو اس طور پر کہ وہ ان باتوں کو جانتا ہو اور ان کو سمجھتا ہو اور بدصورت اور خوبصورت عورتوں کے درمیان فرق کر سکتا ہو تو اسے عورتوں کے پاس آنے جانے کا اختیار نہیں رہے گا۔

ظاہر ہے کہ بالغ یا بلوغت سے قریب پہنچ جانے والے لڑکوں کے سلسلے میں قرآن کی یہ پیش بندی اسی لیے ہے کہ گھروں کے اندر عورتوں کے ناز نخرے، ان کی مخصوص اداؤں اور حرکتوں کو دیکھ کر ان کے اندر قبل از وقت جنسی جذبات کو بڑھاوا نہ ملے۔ اور بلا ضرورت جنسی میلانات کی مہمیز سے ان کی ذہنی یکسوئی اور قوت کار متاثر ہونے سے محفوظ رہے۔

آگے احکام حجاب کی دوسری دفعہ سے بھی "جنسی تعلیم" کے مسئلہ پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ قرآن نے تین مواقع پر نابالغ اور ناسمجھ بچوں کو بھی اجازت کے بغیر گھر کے اندر آنے سے منع کیا ہے،

---

[1] اس مقام پر اصل میں "الرحیم" ح سے نقطہ کے بغیر ہے۔ جو یقیناً طباعت کی غلطی ہے۔ "الرحیم" ح سے کا یہاں کوئی موقعہ نہیں ہے۔ محمد علی صابونی اپنے اختصار میں اس کی تصیح کر دی ہے۔ ملاحظہ، مختصر تفسیر ابن کثیر، ۲/۱۰۰، دار القرآن الکریم، بیروت، ۱۴۰۱ھ / ۱۹۸۱ء

[2] تفسیر ابن کثیر، ۳/۲۸۵ مکتبہ تجاریہ کبریٰ، مصر ۱۹۳۶ء۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنكُمُ ٱلَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَٱلَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا ٱلْحُلُمَ مِنكُمْ ثَلَٰثَ مَرَّٰتٍ مِّن قَبْلِ صَلَوٰةِ ٱلْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُم مِّنَ ٱلظَّهِيرَةِ وَمِنۢ بَعْدِ صَلَوٰةِ ٱلْعِشَآءِ ... (نور: ۵۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو چاہئے کہ تم سے اجازت لے کر اندر داخل ہوں وہ لوگ جو تمہاری ہاتھ کی ملکیت ہیں یعنی باندی اور غلام اور وہ بچے) جو ابھی بلوغت کی عمر کو نہیں پہنچے ہیں تین اوقات میں فجر کی نماز سے پہلے اور دوپہر میں (قیلولہ کے وقت) جبکہ تم اپنے کپڑے اتارتے ہو، اور عشاء کی نماز کے

فجر سے پہلے اور عشاء کے بعد کے اوقات میں گھر کے اندر ملازم اور چھوٹے بچوں کے داخلہ کی حرمت کی حکمت تو معلوم ہی ہے، دوپہر میں قیلولہ کے وقت بھی آدمی اپنے اہل خانہ کے ساتھ کسی ایسی ہیئت میں ہو سکتا ہے جس پر کسی کمسن اور نابالغ بچے کی نگاہ کا پڑنا صحیح نہ ہو۔ آیت کریمہ سے یہ ضمنی نکتہ تو ہاتھ آتا ہی ہے کہ اسلامی معاشرے کے اندر مردوں اور عورتوں کی طرح کمسن بچوں کو بھی فجر سے پہلے اٹھ جانے کا عادی ہونا چاہیے، ورنہ اگر اس کا امکان ہی نہ ہوتا تو اس کی ممانعت کی ضرورت ہی کیا ہوتی، جو آج کے فرنگیت زدہ مسلمان سوسائٹی کے لیے یقیناً ایک اجنبی چیز ہے جہاں عیسائیوں کی نقل میں رات گئے تک جگنے اور سورج نکلنے کے بعد اٹھنے کا عام رواج ہے، جنسی تعلیم کے مسئلہ میں بھی آیت پاک کی رہنمائی بالکل واضح ہے کہ کمسن اور نابالغ بچوں کو ان جگہوں اور ان مواقع سے زیادہ سے زیادہ دور رکھنے کی ضرورت ہے جہاں پہنچ کر یا جنھیں دیکھ کر ان کے اندر قبل از وقت جنسی جذبات کو بڑھاوا ملے اور بھوک لگنے سے پہلے ہی انھیں بھوک کا احساس ستانے لگے۔

آگے کی آیت کریمہ اس نکتے کو مزید کھول دیتی ہے کہ جب بچوں کے اندر سمجھ آجائے اور وہ بلوغت کی عمر کو پہنچ جائیں تو تمام دوسرے مردوں اور عورتوں کی طرح انھیں کسی بھی وقت گھر کے اندر پیشگی اجازت کے بغیر نہ آنا چاہیے:

وَإِذَا بَلَغَ ٱلْأَطْفَٰلُ مِنكُمُ ٱلْحُلُمَ فَلْيَسْتَأْذِنُوا كَمَا ٱسْتَأْذَنَ ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمْ آيَٰتِهِۦ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ (نور: ۵۹)

اور جب بچے بلوغت کی عمر کو پہنچ جائیں تو چاہیے کہ وہ بھی اندر اجازت لے کر داخل ہوں جیسا کہ دوسرے لوگ جن کا حکم پہلے گزر چکا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیتوں کو کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ علم والا حکمت والا ہے۔

عام طور پر اسکولوں اور کالجوں کے اندر تعلیم کے دوران بچوں کی وہی عمر ہوتی ہے جس کے سلسلے میں آیت کریمہ میں کہا گیا ہے کہ بالغ اور سمجھدار بچوں کو پیشگی اجازت کے بغیر گھر کے اندر نہ آنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ

جو ذہن اس اصول کا قائل ہو اس کے لیے تعلیم کے نام پر اس خرافات کا تصور کرنا بھی محال ہے کہ جنسی رازوں کی آگاہی کے لیے باقاعدہ کلاسیں چلائی جائیں۔ اور فطری تعلیم سے آگے ان کی عملی مشقوں کا بھی اہتمام کیا جائے؟

بچوں کا الگ بستر: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بھی اس مسئلہ میں ہماری رہنمائی کا سامان فراہم کرتی ہے۔ مشہور روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ بچہ جب سات سال کا ہو جائے تو اسے نماز کا باقاعدہ حکم دینا چاہئے اور جب دس سال کا ہو جائے تو اسے مار کر نماز پڑھوانی چاہئے ساتھ ہی اس عمر کے بعد ان کے بستروں کو الگ الگ کر دینا چاہئے۔

مروا اولادکم بالصلاۃ وھم ابناء سبع سنین واضربوھم علیھا وھم ابناء عشر وفرقوا بینھم فی المضاجع [1]

اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جبکہ وہ سات سال کے ہوں۔ اور انھیں مار کر نماز پڑھاؤ جبکہ وہ دس سال کے ہو جائیں۔ اور ساتھ ہی ان کے بستروں کو بھی الگ الگ کر دو۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تاکید پر مسلمان معاشرے میں بھی شاید کم ہی عمل ہوتا ہے۔ دس سال کی عمر میں بچوں کا بستر الگ الگ کر دینا چاہئے اس میں حکمت کا بڑا پہلو یہی ہے کہ اس عمر کو پہنچنے کے بعد بچے کے اندر جنسی احساسات رینگنا شروع ہو جاتے ہیں۔ بستر الگ کر دینے سے ان کی رفتار سست اور بچہ زیادہ مدت تک اپنی فطری سادگی کو قائم رکھنے میں کامیاب رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اس عمر کے بعد بھی ایک ہی بستر پر دو یا اس سے زیادہ بچے سوتے رہیں تو جسمانی رگڑ سے جنسی جذبات کے بھی نسبتہً تیز ترقی کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ وقت سے پہلے بلوغت کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اسلام کمسن بچے کا بستر الگ کر کے جنسی معاملات میں مناسب وقت تک اسے زیادہ سے زیادہ معصوم دیکھنا چاہتا ہے تو کلاس روم میں جنسی رازوں کا افشاں کر کے وہ بچوں کے جنسی جذبات کو بھڑکانا کسی صورت پسند نہیں کر سکتا۔

زن و شوئی رازوں کے افشار کی حرمت: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دوسری حدیث کی روشنی میں بھی 'جنسی تعلیم' کے مسئلہ میں اسلام کے مطلوبہ رویئے کا اندازہ آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ آپؐ نے سختی سے ممانعت فرمائی ہے کہ زن و شو کے مخصوص تعلقات اور اس کی تفصیلی کیفیات کو بر سر عام بیان کیا جائے۔ اور ایک راز جسے خدا

---

[1] ابوداؤد جلد ۱۔ کتاب الصلوٰۃ، باب متی یومر الغلام بالصلوٰۃ، ورواہ ایضاً فی شرح السنۃ والمصابیح مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۱، کتاب الصلوٰۃ فصل ثانی

اور رسول کی رازہی رکھنا پسند کرتے ہیں، خواہ مرد اور کسی عورت کے لیے ایسے طشت از بام کیا جائے۔ حضرت ابوسعید خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان من اشر الناس عند اللہ منزلۃ یوم القیامۃ الرجل یفضی الی امرأتہ وتفضی الیہ ثم ینشر سرھا[1]	اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیامت کے دن درجے کے لحاظ سے لوگوں میں بدترین ہوگا وہ شخص جو اپنی عورت تک پہنچے اور وہ اس تک پہنچے، پھر وہ اس کے بھید کو پھیلاتا پھرے۔

جس سے استدلال کرتے ہوئے بجا طور پر کہا گیا ہے:

وفی ھذا الحدیث تحریم افشار الرجل مایجری بینہ وبین امرأتہ من امور الاستمتاع ووصف تفاصیل ذٰلک ومایجری من المرأۃ فیہ من قول او فعل اونحوہ[2]	اس حدیث سے حرمت ثابت ہوتی ہے کہ مرد اس کے اور اس کی عورت کے مابین خاص زن و شوئی تعلقات کے جو معاملات چلتے ہیں، ان کا افشار کرے اور اس کی تفصیلات کو (مزے لے کر) بیان کرے۔ اسی طرح عورت کی طرف سے اس سلسلے میں جو چیزیں سامنے آتی ہیں، بات، عمل یا اور دوسری باتیں، ان کی روداد پیش کرے۔
- - - - - - - - -	
- - - - - - - - -	

کھلی ہوئی بات ہے کہ جب اسلام اسے نہیں پسند کرتا کہ بیوی اور شوہر کے مخصوص تعلقات جو واقعی اور حقیقی ہوتے ہیں ان کا برسرعام افشا ہو اور ان کی تفصیلات و جزئیات کو مزے لے لے کر بیان کیا جائے جس کے نتیجے میں معاشرہ کے اندر شرم و حیا کا مطلوبہ جذبہ کمزور ہو اور بے شرمی و بے حیائی کو رواج پانے کا موقع ملے۔ اس مضرت کے ہوتے ہوئے جب وہ اس واقعی اور حقیقی جنسی تعلق کو طشت از بام کیا جانا گوارا نہیں کرتا، تو حقیقی نقصان کی یقینی موجودگی کے ہوتے ہوئے موہوم فوائد کی آرزو میں اسکولوں اور کالجوں میں متعین پروگرام کے تحت جنسی رازوں کے طشت از بام کیے جانے بلکہ ان کی عملی مشق و تمرین کو کیوں کر گوارا کر سکتا ہے؟ اور یہ چیز اس کے یہاں قابل تصور بھی کیوں کر ہو سکتی ہے؟

شادی سے پہلے جنسی تعلیم کی یہ مضرت و قباحت تو اس صورت کے لیے ہے جبکہ معاملہ عورت اور مرد کے فطری جنسی تعلق کے دائرے میں ہو۔ لیکن معلوم ہے کہ جدید تہذیب بے قید و بے مہار جنسی زندگی کی قائل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو اس کی جنسی تعلیم بھی عورت مرد کے فطری جنسی تعلق سے آگے غیر فطری جنسی تعلقات کی غلاظت کا بڑا پشتارہ اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے۔ جنسی اباحت پسندی (SEXUAL PERMISSIVENESS) جدید دنیا کا ایک دوسرا مسئلہ ہے جس پر الگ سے غور و فکر اور بحث و تحقیق کی ضرورت ہے۔

---

[1] مسلم جلد ۱۔ کتاب النکاح باب تحریم افشار سر المرأۃ [2] شرح نووی المسلم بر مسلم، حوالہ سابق ۱/۴۶۴

تنقید و تبصرہ

نبی خاتمؐ و دین کامل۔ ادیان و ملل کی تاریخ میں اس کی اہمیت و خصوصیت۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ طبع اول ۱۹۸۸ء۔ صفحات ۴۸۔ قیمت اردو ایڈیشن چار روپے، عربی وانگریزی پانچ روپے۔ ناشر۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

ہمارے مخدوم ومحترم جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اپنے علم وفضل اور عمر وتجربے کے جس مرحلے میں ہیں، اس میں بجا طور پر ان کی مجلسی گفتگوئیں اور تقریریں بھی اس قابل ہوتی ہیں کہ اگر انھیں شائع کردیا جائے تو اس سے علم اور دین کا فائدہ ہی ہوگا۔ خوشی کی بات ہے کہ ندوۃ العلماء نے اس کا خاطر خواہ اہتمام بھی کیا ہے۔ شاید ہی ان کی کوئی مجلس اور تقریر ہو جو افادہ عام کے لیے اردو ہی نہیں، اکثر وبیشتر عربی انگریزی میں بھی اشاعت پذیر نہ ہوتی ہو۔ زیر نظر کتابچہ بھی موصوف کی اسی طرح کی ایک تقریر ہے جو دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام اور اس کی دعوت پر "قادیانیت" کے موضوع پر منعقدہ ایک مجلس مذاکرہ ۲۹۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۶ء میں کی گئی۔ ٹیپ کی مدد سے تیار کی گئی اس تحریر پر مصنف نے نظر ثانی فرمائی، حوالوں کو اصل الفاظ میں پیش کرنے کا اہتمام کیا، ساتھ ہی اس میں کچھ نئے ضروری مواد ومعلومات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ (پیش لفظ/۴)۔ اس لیے فی البدیہہ تقریر سے آگے اب یہ ایک باقاعدہ تحریر ہے۔ اور اسی حیثیت سے اس پر نظر ڈالنا پیش نظر ہے۔

کتابچہ کا موضوع جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ختم نبوت اور دین کی کاملیت ہے۔ اور پیش نگاہ خاص طور پر مدارس عربیہ کے طلبہ اور اس کے فضلا ہیں۔ مصنف کا خاص میدان تاریخ ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان کی تاریخی اور عام معلومات متنوع ــــ اور وسیع ہیں۔ زیر نظر کتابچہ میں بھی اس کی جھلک صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ قادیانیت کے رد کے پس منظر میں تقابل ادیان کی بحث ص ۱۰ تا ۲۷ معلومات افزا اور قیمتی ہے۔ اسرائیل سے متعلق لٹریچر میں 'پروٹوکولات' کو بہت بار پڑھا تھا، اس تقریر سے پہلی بار اس کے معنی "تعلیم حکمائے صہیون معلوم ہوئے ص ۱۸، ۲۰ اور اس کے کچھ نمونے بھی پڑھنے کو ملے۔" قادیانیت' کے موضوع پر مصنف الگ سے لکھ چکے ہیں، آگے اس کے سلسلے میں بھی اچھی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ البتہ ص ۳۹ پر یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ قادیانیت کے رد میں کام کرنے والوں اور اس کے خلاف سینہ سپر ہونے والوں میں بانی تحریک اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم ومغفور کا ذکر سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور پروفیسر الیاس برنی کے بھی بعد سب سے آخر میں کیا گیا ہے۔

دوسرا توجہ طلب پہلو اس کتابچہ میں حدیث کے حوالوں کا ہے۔ سورہ مائدہ کی آیت کریمہ الیوم اکملت لکم دینکم الخ کے سلسلے میں مصنف ص ۲۷ پر فرماتے ہیں کہ "بخاری کی حدیث ہے"۔ لیکن ص ۲۸ پر روایت کے ختم پر حاشیہ میں

اس تفصیل کے بعد کہ "روایت صحیح بخاری، کتب صحاح و سنن، مسند امام احمد بن حنبل" آخر میں قوسین میں فرماتے ہیں کہ (الفاظ مسند احمد بن حنبل کے ہیں)"۔ حوالہ کا یہ انداز ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر روایت بخاری کی ہے تو آخر میں مکمل حوالہ بھی بخاری کا ہی دینا چاہئے۔ لیکن اگر مسند احمد کے الفاظ موقع کے لیے زیادہ مناسب تھے تو شروع میں بخاری کا ذکر کیے بغیر پورا حوالہ مسند احمد کا دینا تھا۔ بعد میں مزید شواہد کے لیے بخاری اور دوسرے مراجع کا حوالہ دیدیا جاتا۔ لیکن ان دونوں ہی معروف طریقوں کو چھوڑ کر حوالے کا ایک بالکل نیا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ شروع میں بخاری شریف کا اور آخر میں نامکمل حوالہ مسند احمد کا ہے۔ بات غالباً یہ ہے کہ مصنف کے پیش نظر نہ تو صحیح بخاری ہے، نہ مسند احمد بلکہ ان کے پیش نظر حافظ ابن کثیرؒ کی تفسیر ابن کثیر ہے۔ اور وہ بھی غالباً محمد علی صابونی کا اختصار۔ اس لیے کہ مصنف کے نقل کیے ہوئے الفاظ سے اصل ابن کثیر میں دو جگہ اختلاف "لو علینا یا معشر الیهود" اور آخر میں "فی یوم جمعۃ" کا ہے (تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۱۲۔ مکتبہ تجاریہ کبریٰ، مصر ۱۹۳۷ء) جبکہ مختصر تفسیر ابن کثیر میں یہ اختلاف صرف ایک جگہ آخر میں "فی یوم جمعۃ" کا رہ جاتا ہے (مختصر تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۴۸۳ دار القرآن الکریم، بیروت ۱۹۸۱ء) حافظ ابن کثیر امام احمد کے حوالہ سے پہلے تو وہ روایت نقل کرتے ہیں جسے مصنف نے نقل کیا ہے۔ آگے وہ بخاری کی روایت کو نقل کرتے ہیں جو نسبتہً مختصر ہے۔ ساتھ ہی دوسری کتب حدیث کا حوالہ بھی دیدیتے ہیں، جس کی مدد سے ہی غالباً حوالہ کا پورا حاشیہ ترتیب دیا گیا ہے۔ تفسیر ابن کثیر تفسیری احادیث کی انسائیکلو پیڈیا ہے جس کا حوالہ بے تکلف دیا جا سکتا ہے۔ اس کا براہ راست حوالہ دینے کے بجائے بالواسطہ حوالہ کی جو صورت اختیار کی گئی ہے جو علمی دیانت اور علمی شکرگزاری کے بھی خلاف ہے اور مغالطہ انگیز بھی۔ امید ہے کہ آئندہ ایسے حوالوں سے اجتناب کیا جائے گا۔

آگے ص ۳۲، ۳۳ پر حدیث "یحمل هذا العلم من کل خلف عدوله ... الخ" پر حوالہ صرف "مشکوٰۃ، فصل ثانی ص ۳۶" لکھا ہے۔ یہ حدیث مشکوٰۃ جلد ۱۔ کتاب العلم، فصل ثانی کی ہے جسے کتاب کے مصنف نے بیہقی سے ان کی کتاب 'المدخل' کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور اس کے 'مرسل' ہونے کی صراحت کی ہے۔ مرسل روایت کے سلسلے میں جمہور محدثین کا مسلک معلوم ہے کہ اس کی نسبت سے توقف کیا جانا بہتر ہے۔ (نزہۃ النظر، شرح نخبۃ الفکر/ ۵۱۔ کتب خانہ عزازیہ دیوبند)۔ بہتر تھا کہ مصنف محترم تقریر کے مرکزی نکتہ کی حیثیت سے کسی ایسی حدیث کا انتخاب فرماتے جس پر سند کی جہت سے کلام نہ ہوتا۔ ورنہ کم سے کم حوالہ میں اس کی اس حیثیت کی صراحت ضروری تھی۔

ص ۴۳ پر مشہور روایت "لا تجتمع امتی علی ضلالۃ" کے سلسلے میں مصنف نے "رواہ ابن ابی عاصم" کا نامکمل حوالہ دیا ہے۔ یہ حدیث ابوداؤد و ترمذی دونوں میں موجود ہے۔ پھر صحاح کی کتابوں کو چھوڑ کر ایک نامعروف

وہ بھی نامکمل حوالہ دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اصول فقہ کی کسی کتاب سے بھی آسانی کے ساتھ مراجعت کی جا سکتی تھی۔ اصول فقہ کے بنیادی مسائل میں 'اجماع' سے متعلق یہ معروف و مشہور روایت ترمذی اور ابو داؤد کی ہے۔ لفظ ترمذی کا ہے۔ البتہ اس کی سند ضعیف ہے۔ اگرچہ امام حاکم نے اس کے دوسرے شواہد کی تخریج کی ہے۔ (مجموع متون اصول ۴۷/۴ مطبوعہ مکتبۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ ۱۴۰۲ھ)۔ امام نووی نے بھی اس کے ضعیف ہونے کی صراحت کی ہے۔ اور حجیت اجماع کے سلسلے میں اس کے مقابلے میں 'لاتزال طائفۃ من امتی ظاہرین علی الحق الخ' والی حدیث کو زیادہ راجح قرار دیا ہے۔ (شرح نووی للمسلم بر مسلم، ۱۴۳/۲ اصح المطابع، دہلی)۔ ص ۳۶ پر ایک اہم مسئلہ سے متعلق 'سوانح احمدی' کا نامکمل حوالہ ہے۔ اسے بھی مکمل کرنے کی ضرورت ہے۔ تاریخ اور عام معلومات کے حوالے اس کتابچہ میں بہتر ہیں۔ جس میں جلد کے ساتھ صفحات کا بھی عام طور پر اہتمام کیا گیا ہے۔ احادیث کے حوالہ میں سہل پسندی سے کیوں کام لیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ جبکہ خدا کے فضل سے مصنف کے یہاں علمی معاونین کی کوئی کمی نہیں ہے۔ (مقدمہ ارکان اربعہ طبع چہارم ۱۹۷۶ء) اس کتابچہ میں مصنف نے تحدیث نعمت کے طور پر اپنے حدیث کا درس لینے اور درس دینے کا بھی حوالہ دیا ہے ص ۲۷، اس کے باوجود معروف احادیث کے حوالوں کی وہ صورت ہے جو قابل توجہ ہے۔

پریشان کن معاملہ اس پمفلٹ کے آخری صفحات کا ہے۔ مصنف اپنے مخصوص خطیبانہ رنگ میں مجمع کو آگاہی دیتے ہیں کہ "میں آپ کو آگاہی دیتا ہوں۔۔۔ کہ نئی نسل اور ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کا اعتماد اسلام کی مردم خیزی، شجر اسلام کی بارآوری، قرآن مجید کی تاثیر و ہدایت کے تسلسل اور اس امت کی طاقت تولید و انتاج ۔۔۔ کی قابلیت پر اعتماد نئی نسل کے ذہنوں میں آپ کو بحال کرنا پڑے گا، قادیانیت سے کم درجہ کے فتنے جن کے نام لینے کی ضرورت نہیں، وہ بھی اسی راستہ سے آرہے ہیں کہ ہمارے اچھے خاصے پڑھے لکھے نہیں جانتے کہ شجر اسلام ہر زمانہ میں سرسبز و شاداب رہا اور دین کا درخت نئے شگوفے کھلاتا رہا اور ہر زمانے میں نئے برگ و بار لاتا رہا" الخ۔ ص ۴۴۔ شگوفے کھلانے کا محاورہ تو غالباً اس موقعہ کے لیے درست نہیں، لیکن اس اقتباس کے خط کشیدہ حصے سے سخت پریشانی ہوتی ہے۔ واقعہ ہے کہ مصنف نے اس موقعہ پر ابہام پیدا کرکے بڑی بے انصافی سے کام لیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ۱۹۸۶ء کے ہندوستان میں قادیانیت سے کم درجہ کے وہ کون سے فتنے ہیں جن کی طرف علماء اور دانشوروں کے اس اہم مجمع میں مصنف نے توجہ مبذول کرانی ضروری خیال کی۔ آگے مصنف اس کی جو مزید تشریح کرتے ہیں اس سے بات کسی قدر کھل جاتی ہے۔ "محافظین اسلام مجددین دین، قائدین ملت اور مجاہدین اسلام سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہا، اور قرآنی و دینی حقائق کبھی یکسر و کلیتہً پردہ خفا میں نہیں رہے اور دین عمومی تحریف اور امت اجتماعی انحراف کا کبھی شکار نہیں ہوئی، اور یہ دعویٰ کروں تو بجا ہے کہ

پوری تاریخ اسلام میں ایک سال کی مدت اور کم از کم چھ مہینے کی مدت اور کہوں کہ وسیع عالم اسلام کے کسی محدود سے محدود رقبہ میں بھی کوئی ایسا زمانہ نہیں گزرا کہ حق بات کہنے والا ناپید ہو گیا ہو، اور دین کے بنیادی حقائق بالکل مجہول ہو گئے ہوں؛ ص ۴۳۔ آخر میں ص ۴۵ پر بھی فرماتے ہیں "یہ خیال سخت خطرناک ہے کہ امت معاذ اللہ عقیم ہو گئی ہے، ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور یہ اندھیرا صدیوں سے چلا آرہا ہے"۔ اس عبارت کے خط کشیدہ جملوں کو دیکھا جائے تو یہ الفاظ میں بھی تقریباً وہی بات ہے جسے مصنف اپنی کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" میں دہرا چکے ہیں۔ جس کے ماله وماعلیہ پر بہت کچھ مواد سامنے آچکا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسا عظیم فتنہ جو اپنی خطرناکی میں "قادیانیت" سے ملتا جلتا ہو جو مصنف کے بقول اپنے دور رس اثرات ونتائج کے لحاظ سے پوری اسلامی تاریخ کا سب سے مہلک اور عظیم فتنہ ہے۔ ص ۴۴ اس کے سلسلے میں مصنف کے اس مبہم انداز تخاطب سے دین وملت کی کون سی خدمت انجام پاتی ہے اگر اس سے مقصود "خاص سرزمین" اور "خاص ماحول" کی مناسبت سے "کچھ لوگوں" کی نسبت سے ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنا ہے تو اس پر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ اگلے ایڈیشن میں حک وفک اور مناسب ترمیمات واضافے کر دیے جائیں تو رسالہ کی افادیت میں اضافہ ہوگا۔ (س)

اقامت دین کا کام کہاں اور کیسے ہو؟ — از شبیر احمد منظر قدوسی

بار اول ۱۹۸۶ء۔ صفحات ۶۴۔ قیمت ۳ روپئے۔ ناشر: ادارہ صدائے صحرا، ۴۵ قاضی اسٹریٹ بسونگڈھی بنگلور ۵۶۰۰۰۴

جناب شبیر احمد منظر قدوسی نے یہ مختصر رسالہ خاص طور پر تحریک اسلامی کے حلقوں کو پیش نظر رکھ کر مرتب فرمایا ہے۔ تحریک اسلامی کی یہ آواز ایک مسلم حقیقت ہے کہ اسلام ہماری پوری زندگی کا دین ہے۔ اور پوری زندگی پر تنہا اسی کی حکمرانی ہونی چاہیے۔ لیکن اس کے باوجود اس موضوع پر بحث وگفتگو کی پوری گنجائش رہتی ہے کہ اس مقصد کے حصول کا صحیح طریقہ کار کیا ہو اور غلبۂ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کا کام ہمیں کہاں اور کیونکر انجام دینا چاہیے؟ اس کتابچہ میں مصنف نے اسی سوال کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ موصوف کا خاص زور اس پر ہے کہ تحریک اسلامی کے کارکنوں اور اس سے متعلق افراد اور حلقوں کو بالخصوص اپنے اہل وعیال اپنے خاندان اور قریبی ماحول کے لوگوں کی اصلاح وتربیت اور ان کی ہمہ جہتی نگرانی کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ہو جائے تو بعد کے تمام مراحل آسانی کے ساتھ طے ہو جائیں گے۔ اپنے گھربار اور اپنے قریبی ماحول کی اصلاح وتربیت کی اہمیت وضرورت قرآن وحدیث کی تعلیمات سے ظاہر ہے۔ تحریک اسلامی نے بھی اپنے دستور اور پالیسی پروگرام میں اسے اسی اہمیت کا مستحق قرار دیا ہے۔ مصنف نے مختلف بنیادی اور ذیلی عنوانات کے تحت اس مسئلہ کو سلجھے ہوئے مؤثر اور پر سخا انداز میں واضح کیا ہے۔ اور اصولی باتوں کے علاوہ اس سلسلے میں عملی تدابیر کی بھی نشاندہی کی ہے۔ امید ہے کہ تحریک اسلامی کے حلقے رسالے سے پوری طرح فائدہ اٹھائیں گے۔ دوسرے حلقے بھی اس سے اسی طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ طباعت صاف ستھری روشن اور ٹائیٹل جاذب نظر ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔

(س)

جلد ۶ ✱ مئی ۱۹۸۷ء مطابق رمضان، شوال ۱۴۰۷ھ ✱ شمارہ ۵

فہرست مضامین

ادارتی امور کے لئے خط و کتابت کا پتہ :
مدیر "زندگی نو" پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ترسیل زر و انتظامی امور کے لئے :
منیجر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵، سوئیوالان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

● سالانہ زر تعاون -/۵۵ روپے ● (بیرون ہند) -/۲۲۵ روپے انڈین ● فی شمارہ = 5/ روپے ●

سرخ نشان، علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لئے فوری زر سالانہ ارسال فرمائیں یا اگلا شمارہ کسی اطلاع کے نہ ملنے پر بذریعہ وی۔پی ارسال کیا جائے گا۔

پرنٹر و پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ "زندگی نو" ۱۵۲۵، سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ فون : ۲۷۳۲۲۸ ★ ۲۶۵۳۱۳

اشارات :

حکمت دعوت (۲)

سید جلال الدین عمری

دعوت کا انداز انذار اور تبشیر کا ہونا چاہئے۔ اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے دین کے انکار کرنے یا اسے قبول کرنے کے جو نتائج سامنے آنے والے ہیں ان سے آگاہ کرنا۔ اس میں انسان کی فطرت کی خاص رعایت ہے۔ انسان جس نظریہ اور عقیدہ کو اختیار کر لیتا ہے اس سے ایک طرح کی ذہنی اور جذباتی وابستگی اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ وابستگی بھی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ لیسا اوقات انسان کے نزدیک اس کی صداقت ہر شک وشبہ سے بالاتر ہوتی ہے۔ وہ اسی وقت اس سے دست بردار ہو سکتا ہے جب کہ ایک طرف علمی تنقید کے ذریعہ اس کی فکری کمزوریوں کی نشاندہی کی جائے اور دوسری طرف اس کے متبادل جو نظریہ پیش کیا جائے اس کی برتری اور افادیت بھی واضح کی جائے۔ یہی انذار و تبشیر ہے[1] یہی طریقہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اختیار کرتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی پوری دعوت انذار و تبشیر پر مبنی ہوتی ہے۔

انذار و تبشیر کے دو پہلو ہیں۔ ایک کا تعلق آخرت سے ہے اور دوسرے کا ہماری اس دنیا سے۔ پیغمبروں کی دعوت میں یہ دونوں پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ وہ ایک طرف یہ واضح کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دین کو قبول کرنے یا رد کرنے کا آخرت میں کیا انجام سامنے آئے گا، اور دوسری طرف یہ بھی بتاتے ہیں کہ دنیا میں اس کے کیا نتائج نکلنے والے ہیں۔ قرآن مجید نے بھی یہی انداز اختیار کیا ہے۔ ذیل میں اسی کے الفاظ میں آخرت کے انجام کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

هٰذَا ذِكْرٌ ؕ وَ إِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ	یہ ایک ذکر ہے اور بے شک متقیوں کے لیے بہترین
مَاٰبٍ ۙ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ	ٹھکانا ہے۔ ہمیشہ رہنے والے باغات جن کے دروازے

[1] انذار و تبشیر کا فریضہ صرف وعظ و نصیحت ہی کے ذریعہ نہیں بلکہ خالص علمی اور عقلی انداز میں بھی انجام دیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ "احیاء اسلام کے لیے علمی تیاری کی اہمیت" سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ جنوری۔ مارچ ۱۹۸۶ء۔

الْاَبْوَابُ ۝ مُتَّكِـِٕیْنَ فِیْهَا یَدْعُوْنَ فِیْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِیْرَةٍ وَّ شَرَابٍ ۝ وَ عِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ۝ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِیَوْمِ الْحِسَابِ ۝ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ۝ هٰذَا ؕ وَ اِنَّ لِلطّٰغِیْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ۝ جَهَنَّمَ یَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ هٰذَا فَلْیَذُوْقُوْهُ حَمِیْمٌ وَّ غَسَّاقٌ ۝ وَّ اٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ۝ هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ؕ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ۝

(ص، ۵۰ تا ۵۹)

ان کے لیے کھلے ہوں گے۔ ان میں وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوئے بہت سے میوے اور مشروبات طلب کر رہے ہوں گے اور ان کے پاس نگاہیں نیچی رکھنے والی اور ہم سن بیویاں ہوں گی۔ یہ ہیں وہ چیزیں حساب کے دن جن کے دئے جانے کا تم سے وعدہ کیا جا رہا تھا بے شک یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا یہ تو متقیوں کا انجام تھا اور سرکشوں کے لیے بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ یعنی جہنم جس میں وہ ڈالے جائیں گے اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے ان کے لیے کھولتا ہوا پانی اور پیپ ہے یہ اسے چکھیں، اور کچھ اسی طرح کی اور چیزیں بھی ہوں گی لو یہ ایک اور لشکر ہے جو تمہارے ساتھ گھسا چلا آرہا ہے۔ ان کے لیے کوئی خوش آمدید نہیں ہے۔ یہ بھی جہنم میں داخل ہونے والے ہیں

آخرت کے انجام کی یہ تصویریں قرآن مجید کے صفحات میں جا بہ جا ملتی ہے[1] جنت کی تصویر اتنی پرکشش ہے کہ اس کے مقابلہ میں دنیا اپنی ساری رعنائیاں کھو بیٹھتی ہے اور آدمی اس کی طرف بے اختیار پیش قدمی کرنا چاہتا ہے۔ اور جہنم کا وہ اتنا بھیانک نقشہ کھینچتا ہے کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل اندر سے پناہ مانگنے لگتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے پیغمبر جہاں یہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دین کو قبول کرنے سے آخرت میں انسان جنت کا سزاوار ٹھہرے گا اور اس کے انکار کا نتیجہ جہنم کی شکل میں ظاہر ہوگا، وہیں وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ اس دین کے انکار کی وجہ سے دنیا میں بھی خدا کا عذاب آئے گا اور انکار کرنے والے تباہ کر دیئے جائیں گے۔ قرآن مجید نے بھی تاریخ کے حوالہ سے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے،

قَدْ مَكَرَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْیَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ

اس سے پہلے کے لوگوں نے بھی اللہ کے دین کے خلاف سازش کی اللہ نے ان کی سازش کی عمارت جڑ سے

[1] مزید مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو۔ سورہ رحمٰن، سورہ واقعہ، سورہ نبا اور سورہ غاشیہ وغیرہ

فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ (النحل ۲۶-۲۷)

اکھاڑ پھینکی اور اس کی چھت ان پر گر پڑی اور ان پر عذاب اس طرف سے آیا جس کی ان کو خبر بھی نہ تھی۔ پھر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کو رسوا کرے گا اور کہے گا کہاں ہیں میرے شریک جن کے بارے میں تم جھگڑا کرتے تھے۔ اس وقت علم والے کہیں گے بے شک آج کافروں پر عذاب اور رسوائی ہے۔

سورہ عنکبوت میں بعض نافرمان قوموں پر دنیا میں جو عذاب آیا اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (العنکبوت)

پھر ہم نے ان میں سے ہر ایک کو اس کے گناہ میں پکڑا ان میں سے کسی پر ہم نے پتھر برسانے والی آندھی بھیجی اور کسی کو خوفناک آواز نے آدبوچا اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کسی کو ہم نے غرق کر دیا۔ اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا وہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔

یہ تو اللہ تعالیٰ کے دین کے انکار کا دنیاوی انجام ہے اور اس کے قبول کرنے کا اس دنیا میں جو ثمرہ ملے گا اسے بھی اللہ کے پیغمبر نمایاں کرتے ہیں۔ یہاں ایک بات ذہن میں رہنی چاہئے وہ یہ کہ یہ دنیا، اس کا مال و اسباب اور اس کا عیش اور راحت آخرت کے مقابلہ میں ہیچ ہے، اس کا کوئی وزن نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود انسان ایک ایسی دنیا چاہتا ہے جو ظلم و زیادتی اور فتنہ و فساد سے پاک ہو۔ جہاں وہ امن و سکون سے زندگی گذار سکے اور اس کی ضروریات معقول طریقے سے پوری ہو رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ایک طرف دنیا کی بے ثباتی واضح کرتے ہیں تاکہ آخرت کی طرف سے توجہ نہ ہٹنے پائے اور دوسری طرف یہ بھی بتاتے ہیں کہ اللہ کے دین کو جب کوئی قوم قبول کرتی ہے تو اس کی مہلت حیات بڑھا دی جاتی ہے، اس کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے، اسے پاکیزہ زندگی ملتی ہے اور اس پر چاروں طرف سے رحمت کی بارش برستی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا ذکر قرآن نے ایک جگہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ

نوحؑ نے کہا اے میری قوم کے لوگو میں تمہارے لیے صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔ (اور یہ بتاتا ہوں) کہ تم اللہ کی عبادت کرو اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔ وہ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور

لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝
(نوح ۴:۲)

ایک وقت مقرر تک تمہیں مہلت دے گا۔ بے شک اللہ کا طے کیا ہوا وقت جب آجائے تو اسے ٹالا نہیں جاسکتا۔ کاش تم اس بات کو جانتے۔

پھر مزید فرماتے ہیں،

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝
(نوح ۱۰-۱۳)

تو میں نے ان سے کہا کہ اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو بے شک وہ بڑا بخشنے والا ہے وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا۔ اور تمہارے مال و اولاد میں ترقی دے گا اور تمہیں باغات عطا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کردے گا۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے تم اللہ سے وقار اور عظمت کی توقع نہیں رکھتے۔

حضرت ہود علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ۝ (ہود، ۵۲)

اے میری قوم کے لوگو اپنے رب سے گناہوں کی معافی مانگو پھر اس کی طرف رجوع کرو وہ آسمان سے تم پر خوب بارشیں برسائے گا اور تمہاری قوت میں مزید قوت کا اضافہ کرے گا اور مجرم بن کر نہ روگردانی کرو۔

اسی کا اعلان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بھی ہوا۔

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۝ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ۭ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ
(ہود: ۳)

عبادت نہ کرو تم مگر صرف اللہ کی بے شک میں تمہارے لئے اس کی طرف سے ڈرانے والا اور خوش خبری سنانے والا بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اور یہ کہ تم اپنے رب سے گناہوں کی معافی مانگو پھر اس کی طرف رجوع کرو وہ تم کو ایک وقت مقرر تک اچھا سامان زندگی دے گا۔ اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا۔ اور اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں ڈراتا ہوں تمہارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب سے

اس آیت میں انذار و تبشیر کے دونوں پہلو ایک ساتھ نمایاں ہو گئے ہیں۔ یہی انداز اہل کتاب سے خطاب

کرتے ہوئے اختیار کیا گیا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ‎۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ‎۝ (المائدہ: ۶۵۔ ۶۶)

اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان کی غلطیوں کو ضرور معاف کر دیتے اور ان کو نعمت بھری جنتوں میں ضرور داخل کرتے اور اگر وہ توریت اور انجیل کو اور اس کتاب کو جو ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے قائم کرتے تو اپنے اوپر سے بھی کھاتے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے بھی۔ (ہر طرف سے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں برستیں) ان میں سے کچھ لوگ سیدھی راہ پر چلنے والے ہیں لیکن ان کی اکثریت وہ ہے جو برا عمل کر رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی وعدہ ہے کہ جو قوم اس کے دین کو سچے دل سے قبول کرے گی اور اس پر پوری طرح کاربند ہوگی وہ اسے اس دنیا میں سیاسی اقتدار اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں برتری بھی عطا فرمائے گا۔ ارشاد ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ‎۝ (النور: ۵۵)

تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں اللہ نے ان سے وعدہ فرمایا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا کرے گا۔ جیسا کہ اس نے ان سے پہلے کے لوگوں کو حکومت دی تھی۔ اور ان کے اس دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے ان کے لیے جما دے گا اور ان کے خوف کو ضرور امن سے بدل دے گا۔ وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اس کے بعد جو ناشکری کرے گا وہی نافرمان ہوگا۔

سورۂ صف میں ایمان کے تقاضے پورے کرنے کا صلہ جو دنیا اور آخرت میں ملنے والا ہے اس کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے۔

يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ

وہ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی

مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ٥ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ٥

(الصف : ۱۲-۱۳)

ہوں گی اور عمدہ مکانوں میں رکھے گا جو ہمیشہ رہنے والے باغوں میں ہوں گے۔ یہ بڑی کامیابی ہے اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو وہ بھی تمہیں عطا کرے گا۔ یعنی اللہ کی نصرت اور قریب میں حاصل ہونے والی فتح۔ تم مومنوں کو خوش خبری سنا دو۔

ان آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دین کا تعلق دنیا کی فلاح سے بھی ہے اور آخرت کی فلاح سے بھی دعوتِ دین میں اگر صرف آخرت کی فلاح اور کامیابی کا تصور چھایا رہے اور یہ بالکل معلوم نہ ہو کہ خدا کے دین میں ہماری اس دنیا کے دکھ درد کا بھی علاج ہے، وہ یہاں کے مسائل بھی حل کرتا ہے اور اس سے پاکیزہ زندگی ملتی ہے، تو اس سے فطری طور پر یہ تاثر پیدا ہوگا کہ دین کا تعلق ہماری اس دنیا کے امور و مسائل سے نہیں ہے۔ اسی طرح دعوت میں اگر دنیا کی کامیابی کا پہلو اس قدر حاوی ہو کہ فلاحِ آخرت کا تصور دب جائے تو لازماً یہ تصور ابھرے گا کہ اللہ تعالیٰ کا دین دنیا کے مسائل حل کرنے کے لیے آیا ہے اور اس کے ذریعہ آخرت کی کامیابی ایک ضمنی چیز ہے۔ ان دونوں تصورات میں ایک طرح کا عدم توازن ہے۔ اس عدم توازن سے دین کا تصور ہی بگڑ سکتا ہے۔ اس سے احتیاط کی ضرورت ہے۔

حکمت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ مخاطب کے عقائد و افکار اور دعوت کے درمیان قدرِ مشترک تلاش کی جائے اور اس کی صحیح باتوں کو دعوت کی بنیاد بنایا جائے۔ موجودہ دور میں قدرِ مشترک کی تلاش کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ آدمی اپنے اور مخاطب کے درمیان صرف مشترک باتیں ڈھونڈتا پھرے اور اختلافی نکات کو نہ چھیڑے تاکہ دونوں کے درمیان اتحاد اور یگانگت باقی رہے اور اختلافات نہ ابھریں۔ پھر اس سے ایک اور رجحان بھی فروغ پاتا ہے وہ یہ کہ اگر دو چار مشترک باتیں مل جائیں تو مخاطب کے سارے مزعومات اور معتقدات کو برداشت کیا جائے اور خاموشی کے ساتھ اسے سند جواز فراہم کر دی جائے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ ایک غیر علمی رویہ ہے، اتحاد کی کوئی حقیقی بنیاد بھی نہیں ہے۔ یہ ایک الگ بحث ہے۔ قدرِ مشترک کی تلاش سے ہمارا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ مخاطب دعوت کی کسی بنیاد کو تسلیم کرتا ہے یا نہیں اگر تسلیم کرتا ہو تو اسی بنیاد پر بات آگے بڑھائی جائے اور اس کے تقاضے اس کے سامنے رکھے جائیں۔ اس سے اجنبیت اور دوری کے فاصلے کم ہوں گے اور وہ یہ محسوس کرے گا کہ یہ تقاضے خود اس کے عقیدہ اور فکر کے فطری تقاضے ہیں۔ اس سے کسی نئی چیز کا مطالبہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ یہ مخاطب کو قریب کرنے کی ایک تدبیر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے دعوت کا یہ انداز بھی اختیار کیا ہے:

عرب کے مشرکین اللہ تعالیٰ ہی کو کائنات کا خالق ومالک مانتے تھے لیکن اس کے باوجود بہت سے دوسرے خداؤں کی خدائی کے بھی قائل تھے۔ قرآن مجید نے کئی ایک مقامات پر ان ہی کے مسلمات سے اس تضاد کو نمایاں کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کائنات میں ہر طرف خدا کی حکمرانی کو تسلیم کرنا اور اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانا ایک ایسا رویہ ہے جس کی کوئی معقول توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ
لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ فَأَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝
اللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ
مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ إِنَّ اللّٰهَ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ وَلَئِنْ سَأَلْـ
ـتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ
مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ
بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ قُلِ
الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ
(العنکبوت: ۶۱-۶۳)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان وزمین کو پیدا کیا ہے اور کس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا تو وہ ضرور یہی جواب دیں گے کہ اللہ نے (ان سے کہو کہ) پھر کہاں وہ بہکائے جاتے ہیں؟ اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے رزق میں کشادگی عطا کرتا ہے اور جس کو چاہے تنگی میں مبتلا کرتا ہے بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ (وہ بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں) اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان سے کون بارش اتارتا اور اس کے ذریعہ مردہ پڑی ہوئی زمین کو زندہ کرتا ہے تو وہ ضرور یہی جواب دیں گے کہ اللہ ہی کرتا ہے کہو الحمد للہ (اس طرح خود ہی تم نے شرک کی تردید کردی) لیکن ان میں سے اکثر سمجھتے نہیں ہیں۔

غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ کائنات تین بنیادوں پر قائم ہے۔ تخلیق، حرکت وعمل اور حیات۔ ان ہی سے اس کائنات کو وجود ملا ہے اور وہ ایک خاص نظام کے تحت اپنا عمل انجام دے رہی ہے۔ جس ہستی کے قبضہ میں یہ تینوں قوتیں ہوں وہی اس کی مستحق ہے کہ اسے خدائی کا مقام حاصل ہو۔ ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ مشرکین خود اقرار کرتے تھے کہ یہ تینوں طاقتیں اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہیں۔ اس میں اس کا کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ قرآن مجید نے کہا کہ پھر بتاؤ کہ تمہارے عقیدہ میں شرک کہاں سے گھس آیا اور اللہ کے شریک کہاں سے پیدا ہوگئے۔

مشرکین کے اس اعتراف سے کہ کائنات کا سارا اقتدار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے جس طرح قرآن مجید نے حجت قائم کی ہے اس کی ایک مثال ذیل میں دی جارہی ہے۔

قُلْ لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيْهَا إِنْ

(ان سے) کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ زمین اور

كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۝ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝

(المومنون: ۸۴-۹۰)

اس کی ساری مخلوق کس کی ہے؟ تو وہ ضرور جواب دیں گے کہ اللہ کی ہے۔ کہو تو پھر کیوں نہیں نصیحت حاصل کرتے۔ ان سے پوچھو کہ ساتوں آسمان اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ تو ضرور یہی جواب دیں گے کہ اللہ۔ ان سے کہو تو پھر کیوں نہیں اس سے ڈرتے۔ ان سے پوچھو اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے؟ وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ وہ ضرور یہی کہیں گے کہ یہ سب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ان سے کہو کہ پھر کہاں سے تم پر جادو چل جاتا ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم نے تو ان کے سامنے حق پیش کر دیا ہے اور اسے وہ جھٹلا رہے ہیں۔

یہ انداز قرآن مجید نے اہل کتاب کے ساتھ بھی اختیار کیا ہے۔ اس نے ان کی فکری و عملی گمراہیاں واضح کی ہیں لیکن اس کے ساتھ ان سے کہا کہ ہم ایک خدا کو مانتے ہیں اور تم بھی ایک خدا کو مانتے ہو آؤ ہم سب مل کر خدا کی شریعت کے پابند ہو جائیں اور سارے خداؤں کی غلامی سے آزاد ہو جائیں۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝

(آل عمران: ۶۴)

اے نبی کہو اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔ پھر اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں صرف ایک خدا کی اطاعت کرنے والے

اہل کتاب اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ عبادت صرف ایک ہی خدا کی ہونی چاہئے لیکن اس کے باوجود ان کے اندر شرک داخل ہو گیا تھا اور انہوں نے خدا کے بندوں کو خدا بنا لیا تھا۔ یہود (کا ایک فرقہ) حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا مانتا تھا اور نصاریٰ کے ہاں تو حضرت عیسیٰؑ ابن اللہ ہی تھے

وہ اصولی طور پر اس بات کو بھی مانتے تھے کہ قانون دینے کا حق اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے اور انسان کو اسی کے قانون کا پابند ہونا چاہئے کسی دوسرے فرد کو نہ تو قانون دینے کا حق حاصل ہے اور نہ اس کی اتباع ہونی چاہئے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے احبار و رہبان کو خدائی کا مقام دے رکھا تھا۔ ان کے احکام و فرامین خدائی احکام و فرامین کی حیثیت اختیار کر چکے تھے اور وہ خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر اپنے مفادات کے تحت احکام جاری کرتے تھے۔ قرآن نے اس تضاد کو نمایاں کیا اور اس پر تنقید کی۔ ارشاد ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ٥ (توبہ: ۳۱)

انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو اپنا رب بنا لیا ہے۔ اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ صرف ایک خدا کی اطاعت کریں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔

قرآن مجید نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا دم بھرنے کے بعد انسان کو صرف اس کے احکام کا تابع ہونا چاہئے یہ صریح تضاد ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کو معبود برحق بھی مانے اور احبار و رہبان کو خدا کی طرح فرماں روا اور قانون ساز بھی تسلیم کرے۔

آج دنیا پر لامذہبیت کا راج ہے، اخلاقی قدریں پامال ہو رہی ہیں اور ہر طرف فتنہ و فساد کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ بہت سے لوگ سنجیدگی سے سوچتے ہیں کہ اس کا علاج مذہب اور اخلاق کے اندر ہے۔ لیکن اس کا کوئی واضح تصور ان کے ذہنوں میں نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے اس مجمل سے احساس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں اسلام کی دعوت دی جائے۔ انھیں بتایا جائے کہ اسلام انسان کی ایک حقیقی ضرورت ہے۔ اسی سے ہمارے مسائل حل ہو سکتے ہیں، دنیا فتنہ و فساد سے پاک ہو سکتی ہے اور امن و امان قائم ہو سکتا ہے۔ اس سے ہٹ کر ہر طرف گھپ اندھیرا ہے اور نجات کی ساری راہیں بند ہیں۔

پلٹ کے پھر نہ آسکا، خبر نہ اس کی مل سکی
ہمارا جو بھی آدمی دیارِ غیر کو گیا
(نعیم صدیقی)

آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وسیع دعوت

(۲)

سلطان احمد اصلاحی

اہل کتاب یہود ونصاریٰ: حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے دوسرے مخاطب اہل کتاب یہود و نصاریٰ تھے۔ جو صاحب شریعت تھے اور جن کے پاس اپنی ضروریات و حالات کے لحاظ سے خود کفیل نظام قانون موجود تھا، جو ان کی جملہ معاملات زندگی میں ہدایت و رہنمائی کے لیے بالکل کافی تھا۔ چنانچہ یہود کے متعلق قرآن صراحت کرتا ہے کہ توراۃ کی صورت میں انھیں وہ کتاب عطا کی گئی تھی جو زندگی کی پرپیچ راہوں میں انھیں راہ صواب دکھانے والی اور مسائل کی گھٹاٹوپ تاریکیوں میں انھیں مشعل راہ کا کام دینے والی تھی۔ اور اس قوم کے زوال پذیر ہونے سے قبل عرصہ دراز تک اس کے انبیار اور علمار و فقہار کسی کی اد کھوٹ کے بغیر پوری دیانت داری اور امانت کے ساتھ اس کے مطابق ان کے معاملات زندگی کے فیصلے کرتے تھے۔ زندگی کے جملہ امور و مسائل میں یہی کتاب ان کی راہنما تھی۔ اور کسی ملامت کی پروا کیے بغیر وہ اس کا حق ادا کرتے تھے۔

إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝ (مائدہ ۵:۴۴)

نہ ور ہم نے توراۃ اتاری۔ اس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ جس کے ذریعہ (عرصہ دراز تک) انبیار جو مطیع فرمان تھے ——— فیصلے کرتے رہے ان لوگوں کے لیے جو یہودی تھے (اسی طرح ان کے) علمار و فقہار اس لیے کہ انھیں اللہ کی کتاب کا نگراں بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے۔ سو تم لوگوں سے نہ ڈرو۔ (صرف) مجھ سے ڈرو۔ اور میری آیتوں کو تھوڑے داموں سودا

[1] مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ نے دیگر نظائر قرآن کی روشنی میں آیت کے اس آخری ٹکڑے کو خطاب کی تبدیلی کے ساتھ وقت کے یہود کے بجائے مذکورہ علمار و فقہار ہی سے متعلق مانا ہے۔ اور اسی کو راجح قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو تدبر قرآن: ۲/۳۰۱،۳۰

نہ کرو۔ اور جو کوئی فیصلہ نہ کرے اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا ہے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

تورانی شریعت کا وسیع دائرہ: اس کتاب کا نظام شریعت کس وسعت کا حامل تھا اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے اندر علاوہ زندگی کے دیگر امور و مسائل کے فوجداری قانون اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ موجود تھا۔ چنانچہ آگے فرمایا:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ○ (آیت ۴۵)

اور ہم نے ان کے اوپر اس میں فرض کر دیا تھا کہ جان کے بدلہ جان، آنکھ کے بدلہ آنکھ، ناک کے بدلہ ناک، کان کے بدلہ کان، دانت کے بدلہ دانت اسی طرح (دوسرے تمام) زخم قابل قصاص ہیں۔ جو کوئی اپنی طرف سے چھوڑ دے تو یہ اس کے لیے (اپنے گناہوں کا) کفارہ ہے۔ اور جو کوئی فیصلہ نہ کرے اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا ہے تو یہی لوگ ظالم ہیں۔

اس سے قبل حضرت آدم کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کے واقعہ کو نقل کرنے کے بعد بنی اسرائیل کے سلسلے میں اسی ذیل کی ایک اور اہم ہدایت بیان کی گئی، اس وضاحت کے ساتھ کہ اس کے علاوہ اس قوم کے رسولوں کو ہم نے جملہ معاملات زندگی کے سلسلے میں واضح احکامات "بینات" عطا کیے تھے:

مِنْ أَجْلِ ذَٰلِكَ كَتَبْنَا عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ إِنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ بَعْدَ ذَٰلِكَ فِي الْأَرْضِ لَمُسْرِفُونَ ○ (مائدہ ۵: ۳۲)

اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر فرض کیا کہ جو کوئی کسی جان کو قتل کرے کسی جان یا زمین میں فساد کے بغیر تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ اور جس نے ایک جان کو زندہ رکھا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندہ رکھا۔ اور ہاں ان کے پاس ہمارے رسول آئے واضح نشانیاں لے کر۔ پھر بھی ان میں بہترے اس کے باوجود بھی زمین میں حد سے بڑھنے والے ہیں۔

قومِ یہود کے جرائم :۔ اس کے علاوہ قرآن نے مختلف مقامات پر یہود کے جرائم اور ان کے اخلاقی امراض کی تفصیل بیان کی ہے۔ جن میں یہ قوم اپنی شرارتوں اور کتاب اللہ میں من مانی تحریفات کے نتیجے میں گرفتار ہوئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نیکی اور بھلائی کی وسیع تعلیمات ہوں گی جن کا حق تعالیٰ کی جانب سے انھیں حکم کیا گیا اور جن پر بحکم و کاست عمل پیرا ہونے پر ہی ان کی دنیا و آخرت کی فلاح وابستہ ہوگی۔ آخری نبیؐ کی دعوت کو زک دینے کے لیے اس قوم کا سب سے بڑا ہتھیار جھوٹ تھا جس کی یہ بری طرح رسیا اور دلدادہ تھی۔ جھوٹی باتیں سننا اور جھوٹی باتوں کا یقین کرنا اور عدالت سے جھوٹے فیصلے حاصل کرنے کی کوشش کرنا اس قوم کا محبوب مشغلہ ہے۔ اس کے لیے یہ لوگ توراۃ کو چھوڑ کر آخری نبیؐ سے اپنے حسب دل خواہ فیصلے کے لیے ناکام توقع وابستہ کرتے ہیں۔

وَمِنَ الَّذِينَ هَادُوا سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ سَمَّاعُونَ لِقَوْمٍ آخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَٰذَا فَخُذُوهُ وَإِنْ لَمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوا وَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ فِتْنَتَهُ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (مائدہ ۴۱)

اور جو لوگ یہودی ہوئے ان کے بہترے جھوٹ سننے والے، کچھ دوسرے لوگوں کے لیے سننے والے ہیں جو تم تک نہیں آئے۔ یہ بات کو ہٹاتے ہیں اس کی (اصل) جگہوں سے۔ کہتے ہیں اگر تم کو یہ ملے تو لے لو اور اگر تم کو یہ نہ ملے تو بچ رہو۔ اور اللہ، جس کی آزمائش کرنا چاہے تو اس کے روبرو تم کو اس کا کچھ اختیار نہیں۔ یہی لوگ ہیں کہ اللہ نے نہ چاہا کہ ان کے دلوں کو پاک کرے۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے۔ اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

فرمایا کہ اس نحوست کا اثر یہ ہے کہ یہ پوری قوم جھوٹی گواہی اور رشوت ستانی[1] کے مرض میں گرفتار ہے:

سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ أَكَّالُونَ لِلسُّحْتِ فَإِنْ جَاءُوكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ وَإِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَضُرُّوكَ شَيْئًا وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (مائدہ: ۴۲)

جھوٹ کے سننے والے اور حرام (رشوتوں) کے کھانے والے۔ سو اگر یہ تمہارے پاس آئیں تو تم ان کے درمیان فیصلہ کر دو یا ان سے منہ پھیر لو۔ اور اگر تم ان سے منہ پھیر لو تو یہ تمہارا ہرگز کچھ نہ بگاڑ سکیں گے اور اگر تم ان کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ ضرور اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

[1] الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/ ۳۶۰

یہ قوم یہود کے اندر زنا کا ایک واقعہ تھا جس کے سلسلے میں وہ توراۃ کے حکم رجم سے بچنے کے لیے کسی ہلکی سزا کی توقع میں آخری نبیؐ کی بارگاہ میں آئے تھے[1]۔ فرمایا کہ جس نبیؐ کے قدم اکھاڑنے کی خاطر یہ صبح سے شام تک سازشوں کے جال بننے میں مصروف رہتے ہیں یہ کیا بات ہے جو اس نیازمندی سے اس خاص مسئلے میں وہ اس کا رخ کر رہے ہیں:

وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَاةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ۝ (مائدہ ۵ : ۴۳)	یہ کیسے تم کو ثالث بناتے ہیں۔ جبکہ ان کے پاس تورات ہے۔ جس میں (صاف) اللہ کا حکم موجود ہے۔ پھر یہ اس کے بعد پیٹھ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ اور یہ ماننے والے لوگ نہیں ہیں۔

دوسرے مقام پر بھی قرآن نے ان کا یہی مرض بیان کیا ہے کہ ان کی ساری تگ و دو برائی، ظلم و سرکشی اور حرام خوری کے لیے ہے جبکہ اس کے برعکس انھیں خیر و فلاح کے ہمہ جہتی کاموں کے لیے سرگرم کار رہنا تھا:

وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۝ (مائدہ ۵ : ۶۲-۶۳)	تم ان میں سے بہتوں کو دیکھو گے کہ یہ گناہ، سرکشی اور حرام کھانے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ بہت برا ہے جو یہ کرتے رہے ہیں۔ کیوں نہیں منع کرتے (ان کے) علماء و فقہاء انھیں گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے بہت برا ہے جو یہ بناتے رہے ہیں۔

آگے فرمایا کہ اس قوم سے کسی بہتری کی کیا توقع کی جا سکتی ہے جبکہ یہ بجائے نیکیوں اور بھلائیوں کے ہر طرح کی برائیوں اور نافرمانیوں کے سلسلے میں بے مہار ہے۔

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ	پھٹکارے گئے جنھوں نے کفر کیا بنی اسرائیل میں سے، داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبانی۔ یہ اس لیے ہوا جو یہ نافرمانی کرتے اور حد سے بڑھتے تھے۔ یہ ایک دوسرے کو برائی سے منع نہیں کرتے تھے اس سے

[1] تفسیر ابن کثیر: ۲/۵۹-۶۰

لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ (آیات، ۷۸-۷۹)

جو یہ کرتے تھے۔ بہت برا تھا جو یہ کرتے رہے تھے۔

دوسرے مقام پر قرآن نے ان کے اسی طرح کے ایک اور جرم سود خوری اور بے ایمانی کی نشاندہی کی ہے جبکہ ان کے برعکس نیکی اور بھلائی کی باتوں کا انھیں حکم دیا گیا تھا۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۝ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۝ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (النساء، ۱۶۰-۱۶۱)

ستم فرمانی کی وجہ سے ان کی جو یہودی ہوئے ہم نے ان کے اوپر حرام کردیں بہت سی وہ پاکیزہ چیزیں جو (پہلے) ان کے لیے حلال تھیں۔ اور اس لیے کہ یہ اللہ کے راستہ سے بہت زیادہ روکتے اور سود لیتے جبکہ انھیں اس سے منع کیا گیا تھا۔ اور لوگوں کا مال ناحق طریقے سے کھاتے۔ اور ہم نے ان میں سے (ایسے) کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

حق پرست اہل کتاب: چنانچہ کچھ لوگ جو اللہ کی توفیق سے حق پر قائم ہیں اور اسی کی برکت سے جنھیں آخری نبیؐ کی دعوت کو قبول کرنے کی توفیق حاصل ہوئی ہے ان کا حال یہ ہے کہ انھوں نے نماز اور زکوٰۃ کا دامن مضبوط پکڑ کر اپنے لیے دنیا و آخرت کی بھلائی کا سامان کر لیا ہے۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (نساء: ۱۶۲)

البتہ وہ جو ان میں علم میں گہرے اور ایمان والے ہیں وہ یقین رکھتے ہیں اس کا جو تم تک اتارا گیا اور جو تم سے پہلے اتارا گیا۔ اور (یہ) نماز قائم کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے ہیں۔ اور ایمان رکھنے والے ہیں اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔ یہ ہیں جنھیں ہم جلد ضرور بڑا بدلہ دیں گے۔

نصاریٰ۔ صاحب شریعت گروہ: قوم یہود کی اصلاح کے لیے مبعوث ہونے والے آخری پیغمبر حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروکار 'نصاریٰ' حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے تیسرے بنیادی مخاطب تھے۔ یہ بھی ایک صاحب شریعت گروہ تھا اس لیے کہ حضرت مسیح کوئی نیا دین اور نئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے۔ بلکہ موسوی شریعت 'توراۃ' کو صحیح معنوں میں زندہ کرنے اور انجیل

کی حکمت و موعظت اور روح شریعت کی پیروی پر مشتمل ابھری ہوئی تعلیمات کے ذریعہ اس پہلو سے توراۃ کے اندر پیدا ہو جانے والے نقص کو دور کرنے کے لیے آں جناب کی بعثت ہوئی تھی۔ جس کی صراحت آج بھی عہد نامۂ جدید میں بدیں الفاظ موجود ہے کہ:

"یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں"۔ (متی: باب: ۵: ۱۷)

نیز یہ کہ:

"آسمان اور زمین کا ٹل جانا شریعت (یعنی توراۃ) کے ایک نقطہ کے مٹ جانے سے آسان ہے"۔

(لوقا، باب: ۱۶: ۱۷)

جس کی تصدیق قرآن حکیم کی درج ذیل آیت کریمہ سے ہوتی ہے کہ آں جناب کے مشن میں انجیل کے ساتھ توراۃ کی تعلیم بھی اسی اہتمام سے شامل تھی۔ چنانچہ بارگاہ ایزدی سے ان دونوں کا علم انھیں ساتھ ساتھ عطا کیا گیا تھا:

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ

(آل عمران: ۴۸، ۴۹)

اور وہ (اللہ) اسے (عیسیٰ کو) سکھاتا ہے کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل اور اسے رسول بنا کر بھیجا بنی اسرائیل کے پاس۔

آگے یہی بات ان لفظوں میں کہی گئی:

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِىْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝

(آل عمران: ۵۰)

اور میں تصدیق کرنے والا ہوں جو مجھ سے پہلے توراۃ ہے۔ اور میں اس لیے (آیا ہوں) تاکہ تمہارے لیے حلال قرار دوں ان بہت سی چیزوں کو جو تم پر حرام ٹھہریں۔ اور میں تمہارے پاس آیا ہوں تمہارے رب کی طرف سے ایک کھلی نشانی لے کر سو تم اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے توراۃ کے 'مصدق' ہونے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ توراۃ میں آں جناب کی آمد کی بشارت موجود تھی۔ ساتھ ہی اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آپ فی الجملہ توراتی شریعت پر عامل تھے اور علمائے یہود کی اس میں پیدا کردہ تحریفات کو ختم کر کے اسے اس کی اصل موسوی صورت پر لانے والے[1]

[1] مفاتیح الغیب: ۲/۴۷۶

حضرت مسیحؑ کی طرح یہی وصف قرآن نے آں جناب کو ملنے والی کتاب "انجیل" کا بھی بیان کیا ہے کہ وہ انہی معنوں میں توراۃ کی تصدیق کرنے والی اور اس طرح حکمت وشریعت دونوں کی جامع ہے:

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ ۖ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۝ (مائدہ: ۴۶)

اور ان (رسولوں) کے پیچھے ہم نے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا جو تصدیق کرنے والے تھے اپنے سے پہلے تورات کی۔ اور ہم نے انھیں انجیل دی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ اور وہ تصدیق کرنے والی تھی اپنے سے پہلے تورات کی۔ اور ہدایت اور نصیحت تھی ڈرنے والوں کے لیے۔

توراۃ سے مل کر حکمت وشریعت کی جامع انجیل کی اسی دوگونہ حیثیت میں اس کے پیروں کو حکم ہوا کہ انھیں اپنے معاملات زندگی کا فیصلہ اس کے مطابق کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا:

وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنجِيلِ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فِيهِ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ (مائدہ: ۴۷)

اور چاہیے کہ انجیل والے اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں اتارا ہے۔ اور جو کوئی فیصلہ نہ کرے اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا ہے تو یہی لوگ گنہگار رہیں۔

قرآن کا نسخۂ شفاء: کون نہیں جانتا کہ یہود کی طرح نصاریٰ عہد الٰہی کے ساتھ وفا نہ کر سکے۔ اور اول الذکر کی طرح ان لوگوں نے بھی اپنی مقدس کتاب میں تبدیلیاں کر ڈالیں اور یہود ہی کی طرح بے جا عصبیتوں کا شکار ہو گئے۔ اہل کتاب کے ان دونوں ہی گروہوں یہود و نصاریٰ کے اس درد کا درماں مشیت ایزدی نے آخری نبیؐ کو دی جانے والی اجمع و اکمل کتاب اور انسانی زندگی کے مکمل دستور قرآن کے ذریعہ کیا جس کا امتیاز یہ ہے کہ وہ توراہ و انجیل کی طرح جملہ صحف سماوی کی تعلیمات وہدایات کا عطر اور خلاصہ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے انسانوں کی طرف سے ان میں کی جانے والی لفظی و معنوی تحریفات کی نشاندہی کرتی اور اس طرح یہ جملہ سابق آسمانی کتابوں کی نگراں ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ انسان کے لیے مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اور قیامت تک کے لیے انسانی زندگی میں جو امور و مسائل پیش آئیں گے ان سب کے سلسلے میں یہ اپنے اندر جامع اور آخری ہدایات رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے جو آخری نبیؐ کو خطاب کر کے ارشاد ہوا کہ قرآن کی صورت میں تمہیں اب یہ دائمی اور آخری شریعت دی جاری ہے اس لیے دنیا کے دوسرے تمام انسانوں کی طرح اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے معاملات کا فیصلہ بھی اسی کے مطابق کرنا ہوگا۔ اور ان کی دنیا و آخرت کی

فلاح اس سے وابستہ ہے کہ وہ بھلائی کے اس آخری ایڈیشن کی طرف لپکیں۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ الْکِتٰبِ وَمُھَیْمِنًا عَلَیْہِ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَ ھُمْ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الْحَقِّ لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّمِنْھَاجًا وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلٰکِنْ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ فِیْہِ تَخْتَلِفُوْنَ ۞

. . . .

مائدہ : ۴۸

اور ہم نے تم تک کتاب اتاری ہے حق کے ساتھ جو تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلی کتابوں کی اور ان پر نگراں ہے سو تم ان (اہل کتاب یہود و نصاریٰ) کے درمیان فیصلہ کرو اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا ہے اور تمہارے پاس جو حق آگیا ہے اسے چھوڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک طریقہ اور راہ عمل قرار دیا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک مسلک کر دیتا۔ لیکن (اس نے ایسا نہیں کیا) تاکہ تم کو آزمائے اس میں جو اس نے تم کو دیا ہے۔ سو تم بھلائیوں کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے۔ سو وہ تم کو بتا دے گا جس میں تم آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے۔

تکمیلی شریعت کے نمائندہ اس آخری ایڈیشن کے آجانے کے بعد جو کوئی شریعت الٰہی کے نامکمل ایڈیشنوں سے چمٹنے پر اصرار کرے تو اس کا مطلب اس کے سوا دوسرا نہیں کہ وہ گروہی عصبیتوں میں گرفتار اور اپنی خواہشات نفس کا پرستار ہے اور اس کی یہ روش خالص جاہلیت کی روش ہے۔ جو خدائی فیصلے کی صریح ناقدری ہے۔ چنانچہ آگے فرمایا۔

وَاَنِ احْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَ ھُمْ وَاحْذَرْ ھُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْکَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّصِیْبَھُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِھِمْ وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ۞ اَفَحُکْمَ الْجَاھِلِیَّۃِ یَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ حُکْمًا لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ۞ (مائدہ: ۴۹ - ۵۰)

اور یہ کہ تم ان کے درمیان فیصلہ کرو اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ اور ان سے بچو کہ کہیں وہ تم کو آزمائش میں نہ ڈال دیں اس کے کسی حصے سے (پھیر کر) جو اللہ نے تم تک اتارا ہے۔ سو اگر یہ روگردانی کریں تو جان لو کہ اللہ بس یہ چاہتا ہے کہ انھیں ان کے بعض گناہوں کے سبب پکڑے اور لوگوں میں سے بہتیرے نافرمان ہیں۔ کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ اور اللہ سے بہتر فیصلہ کس کا ہو سکتا ہے ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں۔

اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے دو مشترک جرائم :

احبار و رہبان کی خدائی :

اہل کتاب یہود و نصاریٰ فکر و عمل کی جن بے اعتدالیوں کا شکار ہو گئے تھے جن کی اصلاح کے لیے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، اس کے سلسلے میں قرآن ایک جامع بات یہ کہتا ہے کہ انھوں نے ایک خدا کی بندگی اور اس کی بے لاگ اطاعت کے راستے کو چھوڑ کر اپنے علماء و رہبان کو عملاً خدائی کا درجہ دے رکھا ہے۔ وہ انھیں جس راہ پر لگا دیتے ہیں وہ آنکھیں بند کر کے اس کی پیروی میں لگ جاتے ہیں۔ اور اس طرح ان کے معاملات زندگی بدترین قسم کی دینی ابتری کا شکار ہیں۔ حالانکہ انھیں حکم اس بات کا دیا گیا تھا کہ وہ اپنی پوری زندگی میں خدا اور صرف خدا کے وفادار رہیں گے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا	انھوں نے اپنے فقیہوں اور راہبوں کو اللہ کو چھوڑ کر
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ	معبود ٹھہرا لیا۔ ایسا ہی عیسیٰ بن مریم کو۔ حالانکہ انھیں
وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا	جو حکم دیا گیا تھا وہ یہ کہ بس ایک اللہ کی بندگی کریں
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ٥	اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کی ذات پاک ہے
(التوبہ : ۳۱)	اس سے جو یہ ساجھی ٹھہراتے ہیں۔

علماء و رہبان کو خدا، 'ارباب' بنانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ لوگ ان کے حضور سجدے بجا لاتے تھے اور ان کی اسی طرح پوجا کرتے تھے جس طرح بتوں اور مورتیوں کی کی جاتی ہے۔ بات یہ تھی کہ انھوں نے اپنے معاملات زندگی کا مختار انہی علماء و رہبان کو قرار دے لیا تھا۔ جس چیز کو یہ ان کے لیے حلال کہتے اسے حلال مان لیتے اور جسے حرام بتاتے اسے حرام باور کر لیتے۔ اس کے حق میں کسی صاحب خانہ سے بڑھ کر شہادت اور کس کی ہو سکتی ہے؟ یہ حضرت عدی بن حاتمؓ ہیں، احمد، ترمذی اور ابن جریر کی روایت ہے کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا آوازہ بلند ہو کر بات ان کے کانوں تک پہنچی تو یہ بھاگ کر ملک شام چلے گئے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ نصرانی ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ کسی معرکہ میں ان کی بہن اور ان کے ساتھ ان کے قبیلہ کے بہت سے لوگ ان کے ہاتھوں قیدی ہو گئے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر احسان کیا اور بہن کو ان کے حوالہ کر دیا۔ بہن جب ان کے پاس پہنچیں تو انھیں اسلام لانے کی ترغیب دلائی۔ نیز اس بات کی کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں۔ حضرت عدی مدینہ پہنچے تو چونکہ یہ اپنے قبیلے طے کے سردار رہ چکے تھے اور حاتم طائی جن کی جود و سخا آج بھی ضرب المثل ہے ان کے باپ تھے اس لیے مدینہ میں لوگوں کے درمیان ان کی آمد کا چرچا ہوا۔ بالآخر یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے دریں حالیکہ ان

ان کے گلے میں چاندی کی صلیب لٹک رہی تھی، اور ایک خاص کیفیت کے ساتھ آیت کریمہ "اتخذوا احبارہم ورہبانہم اربابا من دون اللہ" ان کی زبان پر تھی۔ اس پر کسی سوال کرنے والے نے سوال کیا کہ آخر قرآن میں یہ بات کیونکر کہی گئی جبکہ وہ معروف معنوں میں ان کی عبادت اور پرستش نہ کرتے تھے۔ "قال فقلت لهم انهم لم يعبدوهم" اس کے جواب میں حضرت عدی بن حاتم نے فرمایا:

بلى انهم حرموا عليهم الحلال واحلوا لهم الحرام فاتبعوهم فذلك عبادتهم اياهم[1]

ہاں انھوں نے ان کے اوپر حلال کو حرام کیا اور ان کے لیے حرام کو حلال ٹھہرایا۔ سو یہی ان کا ان کی عبادت کرنا ہے۔

یہی وجہ ہے جو قرآن نے ان کے سامنے بندگی رب کے کلمۂ سواء کی دعوت میں اس اہم دفعہ کو بھی شامل رکھا کہ اب ایک خدا کو چھوڑ کر کسی دوسرے انسان کو عملاً خدائی کا درجہ نہ دیا جا سکے گا۔

قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَقُولُوا۟ ٱشْهَدُوا۟ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ۔ (آل عمران ۶۴)

کہو اے اہل کتاب آؤ ایک بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے۔ یہ کہ ہم بس (ایک) اللہ کی بندگی کریں اور ہم میں کے کچھ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو معبود نہ ٹھہرائیں اب اگر یہ منہ پھیرتے ہیں تو کہو کہ گواہ رہو کہ ہم ماننے والے ہیں۔

۲۔ <u>عبادت طاغوت</u>: اس کے ساتھ ہی قرآن نے اہل کتاب یہود و نصاریٰ کا ایک جرم عبادت طاغوت، طاغوت کی بندگی قرار دیا ہے:

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُم بِشَرٍّ مِّن ذَٰلِكَ مَثُوبَةً عِندَ ٱللَّهِ ۚ مَن لَّعَنَهُ ٱللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ ٱلْقِرَدَةَ وَٱلْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ ٱلطَّٰغُوتَ ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ عَن سَوَآءِ ٱلسَّبِيلِ ۝

(مائدہ ۵: ۶۰)

کہو کیا میں بتاؤں کہ اللہ کے نزدیک اس سے بدتر انجام کس کا ہے۔ اس کا کہ جس پر اللہ کی پھٹکار ہوئی اور اس کا غضب نازل ہوا اور اس نے ان میں سے بندر اور سور بنا دئے۔ (اور یہی تھے) جنھوں نے طاغوت کی بندگی کی۔ یہ جگہ کے لحاظ سے سب سے بدتر اور سیدھے راستہ سے سب سے دور بھٹکے ہوئے ہیں۔

جس کے ایک معنیٰ امام رازیؒ نے یہی فقہاء و علماء لکھے ہیں:

وقيل الطاغوت الاحبار

اور کہا گیا ہے طاغوت کے معنی ہیں علماء و فقہاء۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ۲/ ۳۴۸

اس تعلیل کے ساتھ کہ:

وَکلّ من اطاع احدا فی معصیۃ اللّٰہ فقد عبدہ[1]

اور جو کوئی اللہ کی نافرنی کے معاملہ میں کسی کی پیروی کرے تو ضرور اس نے اس کی بندگی (عبادت) کی۔

قرآن نے کہا کہ آخری رسول اور آخری کتاب کے آجانے کے بعد تم فکر و عمل کی ان بے اعتدالیوں سے نکل کر ہی انکار خدا اور کفر کے انجام سے اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہو سکتے ہو۔ توراۃ اور انجیل میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ آخری کتاب کے آجانے کے بعد تمام معاملات میں اسی کی بے لاگ پیروی ضروری ہوگی۔ توراۃ اور انجیل کا حق ادا کرنے کی بس یہی ایک صورت ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ محض کفر کا راستہ ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (مائدہ ۲۔ ۶۸)

کہو اے اہل کتاب تم کسی چیز پر نہیں یہاں تک کہ تم توراۃ اور انجیل کو ٹھیک قائم کرو، ساتھ ہی اس چیز (قرآن) کو جو تمہارے رب کی طرف سے تم تک اتارا گیا ہے۔ اور ضرور ان میں سے بہتوں کو بڑھائے گی وہ چیز جو تم تک اتاری گئی ہے تمہارے رب کی طرف سے سرکشی اور انکار میں۔ تو تم اب کافر لوگوں پر افسوس نہ کرو۔

فرمایا کہ اہل کتاب ہوش میں آجائیں۔ آخری کتاب کو اپنا دستور حیات بنا کر ہی وہ دنیا و آخرت میں فلاح یابی کی توقع کر سکتے ہیں۔ ایسا کرکے وہ آخرت کے اجر بے پایاں سے تو شاد کام ہوں گے ہی ان کی دنیا کی زندگی بھی مسرتوں کا گہوارہ بن جائے گی فرمایا کہ آخری کتاب کی بے لاگ پیروی ہی ایمان اور تقویٰ کی راہ پکڑنے کی واحد ضمانت ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۭ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَاۗءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝ (مائدہ: ۶۶)

اور اگر اہل کتاب ایمان لائیں اور ڈریں تو ہم ضرور ان سے ان کی برائیوں کو دور کریں۔ اور انھیں داخل کریں ہمیشگی کے باغات میں۔ اور اگر یہ ٹھیک قائم کریں توراۃ اور انجیل کو اور اس چیز (قرآن) کو جو ان تک ان کے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے تو وہ ضرور کھائیں اپنے اوپر اور اپنے پیروں کے نیچے سے۔ ان میں ایک گروہ جادۂ اعتدال پر ہے۔ اور ان میں زیادہ تر برا ہے جو یہ کرتے رہے ہیں۔

[1] مفاتیح الغیب: ۳/۳۷۴

اخلاق حسنہ

حکیم محمد اسلم صدیقی

اخلاقیات سے متعلق چند عنوانات کے تحت، احکام قرآن و حدیث اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں چند ضروری اُمور، مستند اور معتبر حوالوں کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔ یہ امور ایسے ہیں جن سے ہمارا روزمرہ سابقہ پڑتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال ہو تو ان کے مطالعہ سے بہت کچھ فائدے کی امید کی جاتی ہے۔

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"تمہارے لیے مفید تھی سیکھنی چال رسول کی" (احزاب رکوع ۳)

اور "اے محمدؐ! تم اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو"۔ (قلم رکوع: ۱)

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ہدایت فرماتا ہے کہ رسولؐ کی زندگی کو اپنے لیے نمونۂ عمل بنائیں اور اسی کے مطابق اپنی زندگی کو سنواریں۔ اور دوسری آیت میں آنحضورؐ کے اخلاق کریمانہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ یہ اعلان فرمارہا ہے کہ آپؐ اخلاق کے عظیم مرتبہ پر فائز ہیں۔ اس لیے آپؐ کے ماننے والوں کو آپؐ ہی کے اخلاق کی پیروی کرنی چاہیے اور اسی کو مشعلِ راہ بنانا چاہیے۔ اس کی پیروی کے بغیر زندگی کامیاب اور بامراد نہیں ہوسکتی۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "مجھے اخلاق کی خوبیوں کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے"

حضرت عائشہ صدیقہؓ جو بحیثیت زوجۂ محترمہ نبویؐ، آنحضورؐ کی گھریلو زندگی کے شب و روز کی رازداں تھیں، ان سے ایک بار کچھ لوگوں نے آنحضورؐ کے اخلاق کے متعلق دریافت کیا، تو آپ نے ان لوگوں سے فرمایا۔ "کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ حضور کا اخلاق مجسم قرآن تھا۔" (۲)

حضرت عائشہؓ مزید فرماتی ہیں "آنحضورؐ کی کسی کو برا کہنے کی عادت نہ تھی۔ برائی کے بدلے میں کبھی برائی نہیں کرتے تھے بلکہ "عفو اور درگذر" سے کام لیتے تھے۔ کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملہ میں

انتقام نہیں لیا۔ آپ بے حد نرم دل تھے (۳)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نرم دلی کی صفت میں ارشاد ربانی ہے:

"سو اللہ ہی کی رحمت ہے جو تو نرم دل مل گیا ان کو (آل عمران رکوع ۱۷)

آپؐ کی نرم دلی کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت فرماتا ہے جو نوع انسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے۔

آغاز وحی کے بعد جب آنحضورؐ سراسیمہ و پریشان گھر پہنچے اور اپنی سب سے زیادہ محبوب اور وفا شعار زوجۂ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے نزول وحی کا واقعہ بیان کیا اور اپنی پریشانی اور حیرانی کا اظہار کیا تو انھوں نے آنحضور کو ان الفاظ میں تسلی دی۔ "ہرگز نہیں! خدا کی قسم!! خدا آپؐ کو کبھی غمگین نہ کرے گا۔ آپؐ صلۂ رحم کرتے ہیں۔ مقروضوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔ مہمانوں کی مدارت کرتے ہیں۔ حق کی حمایت کرتے ہیں اور مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔ (۴)

حضرت خدیجہؓ کی یہ کتنی جامع اور سچی شہادت ہے، آنحضورؐ کے خلق عظیم کی وسعت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ہمہ گیری کے متعلق۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

آنحضورؐ کے اخلاق کا دائرہ صرف آپؐ کے گھر اور خاندان والوں تک محدود نہ تھا، بلکہ وہ تو آپؐ کی حیات طیبہ کے ہر گوشہ میں، پوری طرح جاری و ساری تھا اور ہر معاملہ میں نمایاں اور درخشاں تھا۔ اور مثل آب شیریں و باد بہاری عام تھا۔ کیا اپنے و بیگانے۔ چھوٹے بڑے مفلس و نادار اور خوش حال و دولت مند غلام اور آقا اور کیا دوست اور دشمن۔ حالتِ امن ہو یا جنگ۔ غرض کہ ہر موقع پر اور زندگی کے ہر دائرہ میں آپؐ کا خلق عظیم کارفرما تھا۔ اور یہی جناب آنحضورؐ کی شان رحمۃ للعالمینی کا وصف خاص تھا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ جب میں نے یمن کے سفر کے لیے بحیثیت قاضی اپنا پیر سواری کی رکاب میں رکھ لیا تو اس وقت آنحضورؐ نے جو آخری وصیت مجھے کی تھی وہ یہ تھی "(معاذؓ) لوگوں کے لیے اپنے اخلاق کو بہتر بناؤ۔ یعنی بندگانِ خدا کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آؤ (۵)

آنحضور کا یہ بھی ارشاد ہے کہ "کامل ایمان والے مومن وہ ہیں جو اپنے اخلاق میں سب سے اچھے ہوں اور تم میں سب سے زیادہ اچھے لوگ وہ ہیں، جو اپنی بیویوں کے حق میں سب سے اچھے ہوں" (۶)

آپؐ کے ارشاد سے واضح ہوتا ہے کہ خوش خلقی کی جانچ کے معیار کا صحیح محل اور مقام دراصل گھریلو زندگی ہے اور اس میں مرکزی حیثیت بیوی کی ہے۔

ایفاءِ عہد :۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"اے ایمان والو! پورا کرو عہدوں کو" (مائدہ رکوع ۱)

ایفائے عہد ایک بہت بڑا اور اہم اخلاقی وصف ہے معاشرتی زندگی میں اس کی بڑی قدر و قیمت ہے کاروبار لین دین، قول و قرار معاملات جنگ و صلح، ان سب میں ایفاء عہد کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کیونکہ ایفاء عہد پر اعتماد اور بھروسہ کیا جاتا ہے۔ اگر ایفاء عہد نہ کیا جائے اور عہد و پیمان پر قائم نہ رہا جائے تو معاشرتی نظام میں ابتری پھیل جائے گی۔ اس وصف سے انفرادی و اجتماعی و قومی و ملی معاملات میں برابر سابقہ پڑتا ہے۔

ایفائے عہد کے متعلق آنحضورؐ کے دشمن بھی آپؐ کے اس وصف کے مقر و معترف تھے۔

چنانچہ قیصر روم نے ابو سفیانؓ سے جبکہ وہ آنحضورؐ کے دشمنوں کی صفِ اول میں شامل تھے، آنحضور کے متعلق جو سوالات کیے تھے ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ "کیا کبھی محمدؐ نے بدعہدی بھی کی ہے؟" ابو سفیان نے جواب دیا تھا کہ "نہیں" (۷)۔

ابو سفیانؓ نے قیصر کے دربار میں اس کے سوالات کے جواب میں آپؐ کے ایفاء عہد کے علاوہ بھی بہت سے اوصاف حمیدہ کا اقرار و اعتراف کیا تھا۔

صلح حدیبیہ کی شرائط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ مکہ سے اگر کوئی مسلمان مدینہ جائے گا تو اہل مکہ کی طلب پر اس کو واپس کر دیا جائے گا۔ عین اس وقت جبکہ معاہدہ کی شرائط لکھی جا رہی تھیں، ابو جندلؓ پابہ زنجیر اہل مکہ کی قید سے بھاگ کر وہاں پہنچے اور فریادی ہوئے لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی ضبط و تحمل کے ساتھ ابو جندلؓ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا "ابو جندل صبر کرو۔ ہم بدعہدی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ عنقریب تمہارے لیے کوئی راہ پیدا فرمائے گا۔" (۸) تمام اصحابہ اس منظر کو دیکھ کر تڑپ گئے اور خود جناب رسول اکرمؐ کو بھی نہایت درجہ رنج و غم تھا مگر عہد سے پیچھے نہیں ہٹے اور ابو جندلؓ کو دشمنوں کے حوالے کر دیا۔ آنحضورؐ کے ایفاء عہد کے علاوہ صبر و تحمل کی یہ کیسی تابناک مثال ہے۔ حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا:

"جب کسی آدمی نے اپنے بھائی سے آنے کا وعدہ کیا اور اس کی نیت بھی تھی کہ وعدہ پورا کرے گا، لیکن (کسی وجہ سے) وہ مقررہ وقت پر نہیں آیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔" (۹)

تواضع و انکسار: قرآن کہتا ہے۔

"اور جھکا اپنے بازو ایمان والوں کے لیے" (حجر۔ رکوع آخر)

بازو جھکانا، انکسار و تواضع اور فروتنی کے لیے بطور کنایہ کہا گیا ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"اللہ تعالیٰ نے مجھ کو وحی بھیجی ہے کہ تم تواضع یعنی فروتنی اختیار کرو کہ کوئی ایک، دوسرے پر فخر نہ کرے اور کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے" (۱۰)

حضرت عمر فاروقؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا۔

"مسلمانو! میری تعریف حد سے زیادہ نہ کرو، جس طرح عیسائیوں نے ابن مریمؑ کی تعریف کی ہے۔ کیونکہ میں خدا کا بندہ ہوں۔ بس تم میری نسبت اتنا ہی کہ سکتے ہو کہ محمدؐ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں" (۱۱)

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہؐ عصا ٹیکے ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم آپؐ کے لیے (احتراماً) کھڑے ہو گئے آنحضورؐ نے (دیکھا تو) فرمایا۔" جس طرح عجمی لوگ ایک دوسرے کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اس طرح تم نہ کھڑے ہوا کرو۔" اور فرمایا "میں خدا کا بندہ ہوں بیٹھتا ہوں جس طرح بندے بیٹھتے ہیں" (۱۲)

ایک بار ایک صحابی نے آنحضورؐ کو "یا خیر البریہ" "اے بہترین خلق" کہہ کر مخاطب کیا تو آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا۔" وہ ابراہیمؑ تھے" (۱۳)

آنحضورؐ کا یہ فرمانا آپؐ کا غایت درجہ تواضع و انکسار اور فروتنی کی عادتِ کریمہ کی وجہ سے تھا صلی اللہ علیہ وسلم۔

عفو و درگذر: ارشاد خداوندی ہے۔

۱۔ "عفو اور درگذر کر لوگوں سے (آل عمران، رکوع ۱۴)

۲۔ اور عادت کر درگذر کی اور حکم کر نیک کام کرنے کا اور کنارہ کر جاہلوں سے" (اعراف، رکوع ۲۴)

اور ۳۔" چاہیئے کہ معاف کریں اور درگزر کریں" (نور۔ رکوع ۲)

جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس بات پر اتفاق کلی ہے اور آپؐ کی زندگی کے تمام مبارک واقعات اس امر کے شاہد ہیں کہ آنحضور صلی اللہ نے کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہؐ نے کبھی کسی سے ذاتی معاملہ میں بدلہ نہیں لیا۔ سوا اس کے کہ احکام الٰہی کی توہین کی گئی ہو" (۱۴)

حضور کریم صلی اللہ علیہ کا ارشاد گرامی ہے:

"قیامت کے دن ایک پکارنے والا پکار کر کہے گا کہ" وہ لوگ کہاں ہیں جو لوگوں کے قصور معاف کر دیا کرتے تھے۔ وہ اپنے پروردگار کے حضور آئیں اور اپنا انعام لے جائیں"۔ کیونکہ ہر مسلمان جس کی یہ عادت تھی، جنت میں داخل ہونے کا مستحق ہے۔ (۱۵)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ: ایک شخص آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی "یا

رسول اللہ! میں اپنے خادم (غلام یا نوکر) کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں ؟ آنحضورؐ نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہے۔ اس شخص نے پھر وہی سوال کیا کہ" یارسول اللہ! میں اپنے خادم کو کتنی دفعہ معاف کروں؟"

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:" ہر روز ستر بار" (۱۶) آنحضورؐ کے ارشاد مبارک سے عفو ودرگذر کی اہمیت واضح ہوتی ہے جب اپنے خادم کے قصور کو ہر روز ستر بار معاف کیے جانے کی ہدایت فرمائی جارہی ہے تو ظاہر ہے کہ اور دوسرے لوگوں کی خطا اور قصور کو معاف کرنے اور اس سے درگذر کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہے

اوپر کی تینوں آیتوں میں بھی عفو اور درگذر کی تلقین کی گئی ہے

صبر وشکر اور کفرانِ نعمت :- قرآن کہتا ہے:

۱۔" اگر تم صبر کرو اور پرہیزگاری کرو تو یہ ہمت کے کام ہیں" (آل عمران رکوع ۱۹)

۲۔ اے ایمان والو! صبر کرو اور مقابلہ میں مضبوط رہو اور لگے رہو" (آل عمران رکوع آخر)

یعنی اگر کامیاب اور بامراد ہونا ہے اور دنیا و آخرت میں سرخرو ہونا چاہتے ہو تو سختیاں اور مصائب پر ثابت قدم رہتے ہوئے طاعت پر مستحکم رہو۔ گناہوں سے بچو اور دشمن کے مقابلہ میں استحکام اور حوصلہ مندی دکھلاؤ۔ اور یہ سب باتیں صبر طلب ہیں۔

۳۔ " مدد مانگو اللہ سے اور صبر کرو۔ بیشک زمین ہے اللہ کی اس کا وارث کردے جس کو چاہے اپنے بندوں میں" (اعراف، رکوع ۱۵) یہ وراثت زمین اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام عظیم ہے۔ یعنی زمین پر اللہ کی خلافت۔

اور ۴۔ سو تم مجھ کو یاد رکھو، میں یاد رکھوں تم کو اور احسان مانو میرا اور ناشکری مت کرو۔ (بقرہ رکوع ۱۸)

یعنی تم ہم کو زبان سے، دل سے، ذکر و فکر میں غرضیکہ ہر طرح یاد کرو اور میری اطاعت میں لگے رہو۔ ہم تم کو یاد کریں گے۔ یہ کس قدر لطف و کرم سے بھرپور ارشاد الٰہی ہے۔ اپنے ان بندوں سے جو اس کو یاد کرتے ہیں۔ ایسے خوش بختوں کو وہ، خود بھی یاد رکھنے کی بشارت دے رہا ہے۔ اور مزید لطف و کرم یہ کہ ہم کو نئی نئی نعمتوں سے سرفراز فرمائیں گے۔ مزید ۵۔ یہ بھی ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ ہماری نعمتوں کا شکر خوب ادا کرتے رہو اور ہماری نعمتوں کی ناشکری اور معصیت سے بچتے رہو۔

اب اصل ارشاد الٰہی پڑھئے:

" اگر تم شکر کروگے، البتہ زیادہ دوں گا تم کو اور اگر ناشکری کروگے تو البتہ میرا عذاب سخت ہے" (ابراہیم رکوع ۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جو شخص صبر کرنے کی کوشش کرے گا خدا اس کو صبر بخشے گا اور صبر سے زیادہ بہتر اور بہت سی بھلائیوں کو سمیٹنے والی بخشش اور کوئی نہیں ہے۔" (۱۷)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "جب تم میں سے کوئی شخص ایسے شخص کو دیکھے جو مال و دولت اور جسمانی بناوٹ یعنی شکل و صورت میں اس سے بڑھا ہوا ہے (اور اس وجہ سے اس کے دل میں حرص و طمع اور شکوہ پیدا ہو) تو اس کو چاہئے کہ کسی ایسے بندے کو دیکھے جو ان چیزوں میں اس سے کمتر ہو۔" (۱۸)

آنحضورؐ نے اس لیے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اپنے سے کمتر کو دیکھ کر حرص و طمع اور شکایت کے بجائے اس کو اپنی حالت پر دل میں، صبر و شکر کا جذبہ پیدا ہوگا۔

جود و سخا اور ایثار : آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت میں جود و سخا اور ایثار کی صفت محمود بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ "جناب رسول اللہؐ تمام لوگوں سے سخاوت میں آگے تھے اور خصوصاً ماہ رمضان میں تو آپؐ کی سخاوت بہت بڑھ جاتی تھی۔ تمام عمر آنحضورؐ نے کسی کے سوال پر "نہیں" کا جواب نہیں دیا۔" (۱۹)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "میں تو صرف دینے، تقسیم کرنے والا خزانچی ہوں اور دینا اللہ تعالیٰ ہے۔" (۲۰)

ایک دفعہ ایک شخص آپؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ دور دور تک آپ کی بکریوں کا ریوڑ پھیلا ہوا ہے۔ اس نے آنحضورؐ سے درخواست کی اور آپؐ نے بلا توقف، پورا ریوڑ اس کو بخش دیا۔ اس شخص نے اپنے قبیلے میں جا کر لوگوں سے کہا "(لوگو) اسلام قبول کر لو۔ محمدؐ ایسے فیاض ہیں کہ مفلس ہو جانے کی پرواہ نہیں کرتے۔" (۲۱)

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص سے کوئی چیز خریدتے اور قیمت ادا کرنے کے بعد وہ پھر اسی کو بطور تحفہ عطا فرما دیتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ سے آنحضورؐ نے ایک اونٹ خرید فرمایا اور اسی وقت اس کو ان کے بیٹے عبداللہ کو آپؐ نے عطیہ کر دیا۔ (۲۲)

حضرت جابرؓ کے ساتھ بھی آپؐ نے ایسا ہی سلوک فرمایا تھا۔ (۲۳) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو حکم ہے کہ تم دوسروں پر خرچ کرتے رہو، میں تم پر خرچ کرتا رہوں گا۔" (۲۴)

ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ باندیاں آئیں یہ سن کر آپ کی چہیتی صاحبزادی

حضرت فاطمہ الزہرؓا آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تاکہ آپؐ سے ایک باندی مانگیں، مگر حیا مانع ہوئی۔ خود کچھ عرض نہ کرسکیں تو حضرت علیؓ نے آپ کی ترجمانی کی اور عرض کی کہ "فاطمہؓ خود چکی پیستی ہیں اس کی وجہ سے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے ہیں اور مشکیزہ کے بوجھ سے سینہ پر نیلے داغ پڑ گئے ہیں۔ کچھ باندیاں آئی ہیں ان میں سے اگر ایک عطا فرمائی جائے تو فاطمہؓ کو کچھ راحت میسر ہوگی"۔ آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ "ابھی صفہ والوں کا انتظام نہیں ہوا ہے جب تک ان کا بندوبست نہ ہو جائے کسی طرف توجہ نہیں کرسکتا"(۲۵) یہ تھا آنحضور کا مثالی ایثار کہ چہیتی بیٹی کی جائز ضرورت کے باوجود آپؐ نے اصحاب صفہ کو ان پر ترجیح دی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اسی طرح ایک موقعہ پر حضرت علیؓ نے کسی چیز کی درخواست کی تو آنحضورؐ نے فرمایا "یہ نہیں ہوسکتا کہ میں تم کو دوں اور اہل صفہ کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ وہ بھوک سے اپنا پیٹ چھپاتے پھریں"(۲۶)

آنحضورؐ کے اس مثالی ایثار و کردار اور ارشادات کا یہ اثر تھا کہ آپؐ کے صحابہ بھی جود و سخا اور ایثار کے وصف سے متصف تھے۔ خود وہ اور ان کی بیوی بچے، بھوکے رہ جاتے اور جو کچھ ہوتا وہ دوسرے حاجت مندوں کو کھلا دیتے تھے۔

چنانچہ حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ وہ خود، اور ان کی بیوی بچے سب رات میں بھوکے سوئے اور گھر میں جو کچھ تھا، وہ سب آنحضورؐ کے ایک بھوکے مہمان کو اپنے یہاں لاکر کھلادیا صبح کو جب یہ آنحضورؐ کی بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان کے اس ایثار پر یہ بشارت سنائی کہ "تم دونوں (میاں بیوی) نے میرے مہمان کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ بات اللہ کو پسند آئی"(۲۷) اسی موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی۔

" اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں دوسروں کو اگرچہ خود انھیں سخت بھوک ہو۔" (حشر۔ رکوع ۱)

کفایت شعاری اور اسراف: ارشاد ہوا:

(۱) "اور بے جا خرچ نہ کرو۔ اس (اللہ) کو، خوش نہیں آتے، بے جا خرچ کرنے والے"، (انعام۔ رکوع ۱۷)

۲۔ " اور مت اڑا بے جا اڑانا۔ بیشک اڑانے والے بھائی ہیں شیطان کے" (بنی اسرائیل۔ رکوع ۳)

اور ۳۔ " اور نہ رکھ اپنا ہاتھ بندھا ہوا اپنی گردن کے ساتھ (بخل سے) اور نہ کھول دے اس کو بالکل کھول دینا (اسراف بیجا سے) پھر تو بیٹھ رہے الزام کھایا ہارا ہوا"۔ (ایضاً)

حضرت ابن عباس وانس اور ابو امامہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

" میانہ روی کی چال چلنا، (یعنی نہ بخل کرنا اور نہ فضول خرچی کرنا، بلکہ سوچ سمجھ کر اور احتیاط کے ساتھ ہاتھ روک کر، کفایت شعاری اور انتظام و اعتدال کے ساتھ ضرورت کے موقعوں پر مال خرچ کرنا یہ بھی آدھی کمائی ہے۔ جو شخص (خرچ کرنے میں اس طرح) درمیانی چال اختیار کرے وہ، محتاج نہیں ہوتا۔ اور فضول اڑانے میں زیادہ مال بھی باقی نہیں رہتا۔" (۲۸)

اسراف اور کفایت شعاری کے متعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی امت کے لیے یہ کتنی اعلیٰ درجہ کی، مشفقانہ نصیحت اور ہدایت ہے کفایت شعاری اور اعتدال کے ساتھ ضرورت کے وقت خرچ کرنے سے مال میں برکت ہوتی ہے اور دل کو طمانیت اور سکون بھی حاصل ہوتا ہے۔ برعکس اس کے، فضول خرچی اور بے جا صرف کرنے والے عموماً نام و نمائش کے لیے ایسا کرتے ہیں اور بالآخر تنگ دستی اور پریشانیوں کا شکار ہو کر اپنی دنیا خراب کر لیتے ہیں اور عقبیٰ بھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اسراف کرنے والے ناپسند ہیں اور ان کو شیطان کا بھائی فرمایا ہے۔

اسراف کی طرح بخل کرنے والوں کی بھی اللہ تعالیٰ نے مذمت کی ہے اور رسول اللہؐ نے بھی اس کی ممانعت فرمائی ہے۔

دشمنوں کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن سلوک :۔ کفار مکہ نے آنحضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں پر کیا کچھ نہ ظلم و ستم ڈھائے، وہ ہم سب کو معلوم ہیں اور بالآخر ان کے مظالم سے تنگ آ کر، بحکم الٰہی، آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو گھر بار، آل و اولاد سب کو چھوڑ کر ترک وطن (ہجرت) کرنا پڑا۔

لیکن ایک مرتبہ جب حضرت ثمامہ بن اثال نے اپنے علاقہ کا غلہ "مکہ" والوں پر بند کر دینے کا اعلان کیا تو وہی دشمن، حضورؐ کے دربار رحمت و رافت میں فریادی ہوئے کہ "اگر یمامہ سے غلہ نہ آیا تو ہم لوگ بھوک سے مر جائیں گے۔" رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثمامہ کو کہلا بھیجا کہ "غلہ کی فراہمی بند نہ کریں۔" آپ کے حکم سے پھر ان ظالموں کے وہاں غلہ پہنچنے لگا۔ (۲۹)

فتح مکہ کے دن اسلام کے بدترین دشمن، پوری طرح رسول کریمؐ کے رحم و کرم پر تھے اور آپؐ کا ایک اشارہ، ان سب کو خاک و خون میں ملا سکتا تھا۔ لیکن رحمت دو عالمؐ نے ان سبھوں کے کے ساتھ کیا سلوک فرمایا؟ ظالم اور ستم پیشہ جباران قریش، اپنے ظالمانہ کرتوت کی وجہ سے لرزاں اور شرم و ندامت سے آپؐ کے سامنے سر نیچا کیے کھڑے تھے۔ آپؐ نے ان سے پوچھا "تمہیں معلوم

ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں"؟

ان لوگوں نے دبی اور سہمی زبان سے جواب دیا۔

" اے صادق! اے امین!! تم ہمارے شریف بھائی اور شریف بھائی کے لڑکے ہو ہم نے تمہیں ہمیشہ رحمدل پایا ہے"

اب سنئے۔ رحمت دوعالم صلی اللہ وسلم نے کیا ارشاد فرمایا؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: " آج میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا۔" آج تم پر کچھ الزام نہیں"(یوسف رکوع ۱۰) جاؤ تم سب آزاد ہو" (۳۰)

پیکر رحمت ورافت نے ان سب کو، بیک جنبشِ زبانِ اقدس آزاد تو کر دیا مگر دیکھا یہ گیا کہ وہ سب زندگی بھر کے لیے آپؐ کے بندۂ بے دام اور جاں نثار بن گئے۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ" جو تم پر ظلم کرتا ہو اس سے درگذر کرو" (۳۱)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ۔" سب سے بہتر صدقہ یہ ہے کہ آدمی ان قرابت داروں کے ساتھ سلوک کرے، جو اس کی دشمنی کو اپنے سینوں میں دبائے ہوئے ہوں"۔ (۳۲)

یعنی جن کے دل ہمارے خلاف دشمنی سے بھرے ہوئے ہوں، ان کے ساتھ بھی جو سلوک کیا جائے وہ اچھا ہونا چاہیے اور اس کی دشمنی سے متاثر نہ ہونا چاہیے۔

یہی تعلیم ہمارے محبوب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

صدق و امانت: قرآن نے کہا:

" بیشک! اللہ فرماتا ہے تم کو کہ پہنچا دو امانتیں، امانت والوں کو" (النساء رکوع ۸)

آنحضورؐ کی صداقت اور سچائی کا تو، ابوجہل بھی باوجود شدید دشمن ہونے کے معترف اور قائل تھا۔ وہ کہتا تھا کہ" محمدؐ! میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا، البتہ جو کچھ کہتے ہو اس کو صحیح نہیں سمجھتا"(۳۳) اسی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔" ہم جانتے ہیں کہ اے پیغمبر! کافروں کی باتیں تم کو غمگین کرتی ہیں۔ کیونکہ وہ تجھ کو جھٹلاتے نہیں۔ البتہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں"۔ (انعام رکوع ۴)

اوپر ابوجہل کا قول آنحضورؐ کی صداقت کے متعلق درج ہے۔ اب آنحضورؐ کے دوسرے بڑے دشمن کا بھی اعتراف سنئے۔

قیصر روم نے بھرے دربار میں، ابوسفیانؓ سے پوچھا تھا کہ" تمہارے یہاں جو مدعی پیدا ہوا ہے" اس

کو اس دعوے سے پہلے کبھی تم نے دروغ گو بھی پایا ہے؟"
ابوسفیان نے کہا "نہیں"
قیصر نے اس گفتگو کے آخر میں جو تقریر کی اس میں اس نے کہا: "میں نے تم سے پوچھا کہ تمہارے نزدیک وہ کبھی دروغ گوئی کا بھی مرتکب ہوا؟ تم نے کہا کہ نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ خدا پر افترا باندھتا تو وہ آدمیوں پر افترا باندھنے سے کب باز رہتا" (۲۴)
آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راست گوئی کے متعلق آپ اوپر پڑھ آئے ہیں کہ آپؐ کے بڑے بڑے دشمن بھی، آپ کو "صادق القول" کہتے تھے۔ اسی طرح وہ آپؐ کی امانتداری کے بھی معترف تھے اور آپؐ کو امین کا لقب دے رکھا تھا۔
چنانچہ ہجرت والی شب میں، آنحضورؐ نے مکہ میں حضرت علیؓ کو اسی لیے چھوڑا تھا کہ جب صبح ہو تو مکہ والوں کی امانتیں ان کے سپرد کر کے مدینہ آئیں۔ (۲۵)
سبحان اللہ! وہ دشمن بھی جو آپؐ کی جان کے درپے تھے، وہ اپنی امانتیں آپؐ ہی کے پاس رکھنے میں محفوظ سمجھتے تھے۔ گویا مکہ میں ان دشمنوں کی نظر میں بھی آپؐ سے زیادہ معتبر اور لائقِ اعتماد امین کوئی نہ تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔
حضرت عبدالرحمن بن ابی قرادؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن وضو کیا تو صحابہ آپؐ کے وضو کا پانی لے لے کر اپنے چہروں اور جسموں پر ملنے لگے۔ آنحضورؐ نے دیکھا تو صحابہ سے پوچھا۔ "تم کو کیا چیز اس فعل کے کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور کون سا جذبہ، تم سے یہ کام کراتا ہے"؟ صحابہ نے عرض کیا "یارسول اللہ! اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت۔" ان کا یہ جواب سن کر، آپ نے فرمایا "جس شخص کو یہ خوشی ہو اور یہ چاہے کہ اس کو اللہ اور اس کے رسول سے حقیقی محبت ہو یا یہ کہ اللہ اور اس کے رسول اس سے محبت کریں تو، اسے چاہئے کہ جب وہ بات کرے تو ہمیشہ سچ بولے اور جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو ادنیٰ خیانت کے بغیر اس کو ادا کرے۔" (۳۶) یعنی آنحضورؐ نے اللہ اور اپنے ساتھ حقیقی محبت کرنے والوں کے لیے سچ بولنے اور امانت داری کی سخت تاکید فرمائی ہے۔
شرم وحیا: احادیث میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم، دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔ اور شرم وحیا کا اثر آپؐ کی ایک ایک ادا سے ظاہر ہوتا تھا۔ کبھی کسی کے ساتھ بدکلامی نہیں کی۔ بازار میں تشریف لے جاتے تو چپ چاپ نظریں جھکائے گذر جاتے تبسم

کے علاوہ کبھی آپؐ کے لب مبارک خندہ وقہقہہ سے آشنا نہ ہوئے۔

بھری مجلس میں جب کوئی بات ناگوار گذرتی تو لحاظ و مروت اور حیا سے زبان مبارک سے کچھ نہ فرماتے البتہ چہرۂ انور کے اثر سے آپؐ کی ناگواری ظاہر ہوتی اور آپؐ کے صحابہ متنبہ ہو جاتے تھے۔

ایک بار بچپن میں تعمیر کعبہ کے موقعہ پر، آنحضورؐ بھی بڑوں کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ کسی طرح آپؐ کی چادر کھل گئی تو فرطِ حیا سے آپ بے ہوش ہو گئے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ "ہر دین کا ایک اخلاق ممتاز ہوتا ہے۔ ہمارے دین کا ممتاز اخلاق، حیا ہے" (۳۷) فرمایا کہ "ایمان کی ستر سے بھی کچھ اوپر شاخیں ہیں۔ ان میں سے آپؐ نے حیا کے متعلق فرمایا کہ: "حیا ایمان کی اہم شاخ ہے"۔ (۳۸)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ حیا کی صفت رکھنے والا انسان برائیوں اور فحش و معاصی سے دور رہتا ہے۔ کیونکہ حیا ان برے کاموں سے روکتی ہے۔ جس میں حیا نہیں ہوتی وہ بے حیائی اور فحاشی میں ملوث ہو جاتا ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو ہلاک کرنا چاہتا ہے (یعنی اخلاقی اور دینی ہلاکت میں مبتلا کرنا چاہتا ہے) تو اس سے حیا چھین لیتا ہے۔ جب اس میں حیا نہیں رہتی تو وہ لوگوں کی نظروں میں حقیر و مبغوض بن جاتا ہے۔ جب اس کی حالت اس نوبت کو پہنچ جاتی ہے تو پھر، اس سے امانت کی صفت چھین لی جاتی ہے۔ جب اس میں امانت داری نہیں رہتی تو وہ "خیانت درخیانت" میں مبتلا ہونے لگتا ہے۔ اس کے بعد اس سے صفت رحمت اٹھالی جاتی ہے۔ پھر تو وہ پھٹکارا مارا مارا پھرنے لگتا ہے جب تم اس کو اس طرح مارا مارا پھرتا دیکھو تو وہ وقت قریب آجاتا ہے کہ اب اس سے "رشتۂ اسلام" ہی چھین لیا جائے۔ (۳۹)

غور کرنے اور عبرت کی بات ہے کہ ایک نعمتِ "حیا" سے محرومی سے بندہ کن کن اخلاق رذیلہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ شرف نعمتِ ایمان سے بھی محرومی قریب ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

حواشی: (۱) اسوۂ رسول اکرم ص۵۵ (ڈاکٹر عبدالحی کراچی) (۲) سیرت النبیؐ حصہ دوم ص۲۸۷ (۳) و (۴) ایضاً (۵) اسوۂ رسول اکرمؐ ص۵۴۳ (۶) اسلامی معاشرہ ص۲۲۲ (مولانا یوسف اصلاحی) (۷) سیرت النبی حصہ دوم ص۳۲۹ (۸) ایضاً ص۳۵۰ (۹) اسوۂ رسول اکرم ص۵۵۱ (۱۰) ایضاً (۱۱) ایضاً ص۶۶ (۱۲) ایضاً (۱۳) سیرت النبی حصہ دوم ص۳۳۷ (۱۴) ایضاً ص۳۵۵ (۱۵) اسوۂ رسول اکرم ص۵۵۸ (۱۶) ایضاً (۱۷) ایضاً ص۵۵۴ (۱۸) ایضاً (۱۹) سیرت النبی حصہ دوم ص۳۰۸ (۲۰) ایضاً ص۳۰۹ (۲۱) و (۲۲) (۲۳) ایضاً (۲۴) اسوۂ رسول اکرم ص۵۵۶ (۲۵) سیرت النبی حصہ دوم ص۳۴۳ (۲۶) ایضاً (۲۷) شمع رسالت کے چند پروانے (راقم) (۲۸) اسوۂ رسول اکرم ص۵۵۷ (۲۹) اسلامی معاشرہ ص۵۴ (۳۰) اسوۂ رسول اکرم ص۵۹ (۳۱) رسالہ اصلاح ص۳۲ (مولانا افضال الحق قاسمی) (۳۲) ایضاً ص۳۱ (۳۳) سیرت النبی حصہ دوم ص۳۴۰ (۳۴) ایضاً (۳۵) اسوۂ رسول اکرم ص۶۶ (۳۶) ایضاً ص۵۴۰ (۳۷) ایضاً ص۵۴۹ (۳۸) ایضاً ص۱۴۹ (۳۹) ایضاً ص۵۴۹

اسلامی معاشرہ کا مزاج

محمد مسعود عالم قاسمی

انسان جس معاشرہ میں رہتا ہے اس پر اپنا کوئی اثر ڈال سکے یا نہ ڈال سکے، وہ بہرحال اس کا اثر قبول کرتا ہے انسان کی سیرت و کردار کی تشکیل میں اس کے معاشرہ کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ ایک بچہ محض اپنی جسمانی نشو و نما کے لیے ہی معاشرہ کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ اس کی ذہنی و فکری، اخلاقی اور روحانی نشو و نما بھی معاشرہ کی رہین منت ہوتی ہے۔ پرورش اور نگہداشت کے ساتھ ہی بچہ لاشعوری طور پر ان روایات کے سانچہ میں ڈھل جاتا ہے جو معاشرہ میں جاری و ساری ہوتی ہیں۔ اس کے فکر و عمل کی بالعموم وہی نہج ہو جاتی ہے جو سماج کے ارکان کی ہوتی ہے، وہی چیزیں وہ سیکھتا ہے جو بڑوں کی جانب سے اس کو منتقل کی جاتی ہیں اور وہی خصوصیات وہ اخذ کرتا ہے جو سماج کے غالب حصہ میں اثر و نفوذ پیدا کر چکی ہوتی ہیں، اور اس طرح انسان ایک مشترک طریقہ زندگی کو اس ڈھنگ سے اختیار کر لیتا ہے کہ وہ اس کا ذاتی سرمایہ بن جاتا ہے، جس کی حفاظت کرنا، فروغ دینا، جس کے لیے جدوجہد کرنا اور اسے اپنے تعارف کا ذریعہ بنا لینا اس کا نصب العین بن جاتا ہے۔ چونکہ تہذیب اپنے غالب مفہوم کے اعتبار سے سماج کے ارکان کے طریقۂ حیات کا نام ہے، اس لیے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ سماج جو چیز نئی نسلوں تک منتقل کرتا ہے وہ تہذیب ہے سیکھنا اور حصہ لینا اس سماجی عمل کے اہم جزو ہیں۔ اور یہی چیز ہے جو اگلوں کا سرمایہ نئی نسلوں تک بحفاظت منتقل کرنے میں معاون ہے۔ چنانچہ علم عمرانیات جن عناصر اربعہ سے مرکب ہے "تہذیبی ورثہ" ان میں اہم ترین عنصر شمار کیا جاتا ہے۔ اس لیے تہذیب سے کلی واقفیت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس معاشرہ کا بھی مطالعہ کیا جائے جہاں تہذیب متشکل ہوتی ہے۔ معاشرہ تہذیب کا مستقر ہوتا ہے اور اس کی بقا و ارتقا کا ذریعہ بنتا ہے اس میں تہذیب کے نقش و نگار ابھرتے ہیں اور اعمال و مراسم میں ڈھل کر ایک سانچہ بناتے ہیں۔

انسانی اجتماعیت کی ابتدا جہاں سے ہوتی ہے اسلام اسی کو معاشرہ کا نقطۂ آغاز قرار دیتا ہے

انسان کی اجتماعیت پسندی ہی اسلامی معاشرہ کا سنگ بنیاد ہے۔ اس معاشرہ کا بنیادی ادارہ خاندان ہے۔ اور خاندان مرد اور عورت سے وجود میں آتا ہے۔ اسی لیے اسلام کے معاشرتی نظام میں سب سے زیادہ اہمیت خاندانی نظم وضبط اور اس کے قیام واستحکام کو حاصل ہے۔ مرد وعورت کے تعلقات کی نوعیت ان کے دائرہ عمل اور حدود کار کی تعین پر زور دیا جاتا ہے، مرد وعورت کی پاک اجتماعیت اور ہمدردانہ تعاون سے یہ کارخانہ حیات سرگرم عمل ہے۔ اسلام کے مخاطب یہ دونوں الگ الگ بھی ہیں اور اجتماعی حیثیت سے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ مقصد اور نصب العین کے لحاظ سے اسلام نے ان دونوں میں کوئی تفریق نہیں کی ہے دونوں کو مساوی المرتبہ قرار دیا ہے قرآن کا ارشاد ہے۔

وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (النساء:۱۲۴)

اور جو نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔

مگر چونکہ ان دونوں کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں اور قوت کار یکساں نہیں ہے اس لیے لازما ان کا میدان کار بھی الگ ہونا چاہئے اور ذمہ داریاں بھی حسب صلاحیت ہونی چاہئیں۔ چنانچہ اسلام نے ان دونوں کے دائرہ کار کو اس طرح متعین کیا ہے کہ عورتوں کو معاشی ذمہ داریوں اور سیاسی وملکی انتظامات یا ان جیسی دشوار ذمہ داریوں سے بچا کر خاندانی نظام کے استحکام پر مامور کیا ہے۔

دوسری طرف بہ مشکل ذمہ داریاں مردوں کو سونپی گئی ہیں۔ جو ان کے قوائے عمل اور فطری رجحان کے عین مطابق ہے۔ عورت فطری اسباب کی بنا پر مرد کی رفاقت، کفالت، اور اس کی دست گیری کی محتاج ہے اور اسی لیے اللہ نے مردوں کو عورتوں کا قیم اور نگران بنایا ہے۔ اسلام اس ظلم کو گوارا نہیں کرتا کہ عورت دو ذمہ داریاں اٹھائے اور مرد صرف ایک جبکہ وہ توانا بھی ہے۔

معاشرہ کے اس بنیادی ادارہ سے وہ افراد مہیا ہوتے ہیں جن سے نظام انسانی کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ افراد معاشرہ کے لیے اینٹ کی طرح ہوتے ہیں جن میں باہمی تعلق اور گہری وابستگی کا پایا جانا لازم ہے۔ یہ ربط گویا وہ سمنٹ ہے جو کسی عمارت میں استعمال کی جانے والی اینٹوں کو جوڑ کر ایک مضبوط مکان بنا دینے کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔ اگر یہ ربط اور وابستگی نہ ہو تو اجتماعیت بے جان اور قوت وتوانائی سے محروم ہو کر بالآخر منتشر ہو جائے گی۔ اسی تعلق سے معاشرہ ایک اکائی کی شکل اختیار کرتا ہے اسی لیے اسلامی معاشرہ میں باہمی تعلقات کی استواری، آپس کے برتاؤ اور سلوک کی عمدگی اور انسانی برادری کے رکن ہونے کی حیثیت سے لوگوں پر عائد ہونے والے حقوق اور فرائض کی ادائیگی کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔

اگر فرد کو مرکز تسلیم کر کے اس کے تعلقات اور اضافتوں کے سلسلہ کا تجزیہ کیا جائے تو فطری طور پر اس کے والدین اور اہل و عیال اس مرکز سے زیادہ قریب اور وابستہ ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کے حسن سلوک، صلہ رحمی اور دیکھ بھال کے اولین حق دار یہی لوگ ہوں گے ان کے لیے جو حقوق قرآن و حدیث میں متعین کیے گئے ہیں اسی کے مطابق ان سے سلوک کیا جائے اپنے ذاتی میلان کی وجہ سے کسی کے ساتھ زیادتی اور کسی کے ساتھ کمی کا معاملہ کرنا اس معاشرہ کے مزاج کے منافی ہے۔ اور یہ فیصلہ انسان کر بھی نہیں سکتا کہ کون اس کے حق میں زیادہ نفع بخش ہے۔ قرآن کہتا ہے:

اٰبَاۤؤُکُمْ وَاَبْنَاۤؤُکُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ لَکُمْ نَفْعًا (النساء: ۱۱)

تم نہیں جانتے کہ تمہارے والدین اور تمہاری اولاد میں کون زیادہ مفید ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل و عیال اور والدین کے حقوق پر یکساں زور دیا ہے،

حضرت عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انسان اپنے اہل و عیال کے سلسلہ میں خاص طور سے جواب دہ ہوگا (ترمذی)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اکمل المومنین ایمانا احسنهم خلقا و الطفهم باهله (ایضاً)

مومنین میں کامل ایمان ان کا ہے جن کے اخلاق اچھے ہیں اور جو اپنے اہل و عیال پر زیادہ مہربان ہیں۔

یاں بچوں کی تعلیم و تربیت والدین کا بنیادی فریضہ ہے، اور اسی ذریعے سے تہذیب و ثقافت ان کو منتقل کی جا سکتی ہے آنحضورؐ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ،

ما نحل والد ولدا من نحل افضل من ادب حسن (ایضاً)

والد اپنے بچے کو حسن ادب سے زیادہ بہتر کوئی تحفہ نہیں دیتے۔

اسلام کی نظر میں خاندان ایسا بنیادی ادارہ ہے جہاں سے صحت مند اقدار کی افزائش اور اشاعت ہوتی ہے۔ والدین کو ایک طرف یہ حکم ہے کہ وہ بچوں کی ذہنی، جسمانی، اخلاقی اور روحانی نشوونما اور تربیت پر توجہ دیں تاکہ اسلامی تہذیب نئی نسل میں فطری انداز میں پیدا ہو سکے، دوسری طرف اولاد کو بھی حکم ہے کہ وہ والدین کی فرماں برداری کریں اور ان کی نافرمانی نہ کریں اگر وہ ان کی غلط تربیت نہیں کر رہے ہیں۔ ان کی محبت و شفقت حاصل کرنے کے ساتھ ان سے سیکھنے اور تربیت حاصل کرنے میں کوتاہی نہ کریں تاکہ جو امانت وہ ان کے سپرد کریں اس کی حفاظت کرنے اور اس کو فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

اس شخص کی ناک خاک آلود ہو یہ بات آپ نے تین مرتبہ فرمائی، صحابہؓ نے پوچھا! اے اللہ کے رسولؐ کس کی ناک خاک آلود ہو؟ آپ نے فرمایا، اس شخص کی جس نے اپنے والدین کو بڑھاپے کی حالت میں پایا (ایک کو یا دونوں کو) اور ان کی خدمت کر کے جنت میں نہ داخل ہوا (مسلم) ایک دوسری روایت میں والدین کی نافرمانی کو بڑے گناہوں میں شمار کیا گیا ہے (ترمذی)

اسلام کی ان بنیادی معاشرتی تعلیمات کی معنویت کو سمجھنے کے لیے معاصر مغربی معاشرہ پر ایک نظر ڈالنا مفید ہوگا جہاں خاندان کی تباہی کا ایک دردناک پہلو یہ ہے کہ والدین اور اولاد کا مقدس رشتہ بھی محض ایک کاروباری معاملہ بن کر رہ گیا ہے۔ والدین اپنے بچوں کی پرورش خود نہیں کرتے بلکہ پیدا ہوتے ہی نوزائیدہ کو بچوں کے ہسپتال (Nursery) میں داخل کر دیتے ہیں یا دایہ کے حوالہ کر کے اپنی راہ الگ کر لیتے ہیں۔ پھر یہی بچے جب بڑے ہو جاتے ہیں تو چونکہ ماں باپ کی محبت و شفقت سے پوری طرح آشنا نہیں ہوتے اس لیے اپنے بوڑھے والدین کی خدمت کرنے کے بجائے بوڑھوں کی اقامت گاہوں (old age homes) میں داخل کر کے عہد شباب کی مصروفیات میں محو ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اب تو بہت سے بیٹے ماں باپ کی پٹائی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ کتنی المناک ہے یہ زندگی اور کتنا کربناک ہے یہ معاشرہ؟ یہی وجہ ہے کہ یہ معاشرہ آج نسلی خلا یعنی (Generation gap) کا شکار ہوتا جا رہا ہے

دوسری اضافت رشتہ داروں کی ہے۔ والدین اور اولاد کے بعد رشتہ دار ہی انسان کے تعلقات اور قرابت میں زیادہ جڑے ہوتے ہیں، اسلام نے والدین کے ساتھ قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق کی ادائیگی پر خاطر خواہ توجہ دلائی ہے۔ اسلام کی نظر میں رشتوں ناطوں کی پاسداری محض ایک سماجی ضرورت ہی نہیں بلکہ اہم اسلامی فریضہ بھی ہے، چنانچہ ارشاد ہے

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (النساء: ۳۶)

اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایہ سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے اور اپنے ماتحت لونڈی اور غلاموں سے احسان کا معاملہ رکھو۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک شخص نے عرض کیا، اے اللہ کے رسولؐ میرے کچھ رشتہ دار ہیں جن کے حقوق میں ادا کرتا ہوں اور وہ میرے حقوق ادا نہیں کرتے، میں ان کے ساتھ

حسن سلوک کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں میں ان کے ساتھ حلم و بردباری سے پیش آتا ہوں اور وہ میرے ساتھ جہالت برتتے ہیں آپ نے فرمایا اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو گویا تم ان کے چہروں پر سیاہی پھیر رہے ہو اور اللہ ان کے مقابلہ میں ہمیشہ تیرا مددگار ہے جب تک اس حالت پر قائم رہو گے (مسلم)

اضافت کی تیسری بنیاد ہمسائگی ہے۔ ہمسایہ خاندان کی طرح اگرچہ کوئی ادارہ نہیں ہوتا مگر سماجی زندگی میں اس کی اہمیت خاندان جیسی ہی ہوتی ہے بلکہ بعض حالات میں اس سے بھی زیادہ۔ ہمسایہ کئی طرح کا ہوسکتا ہے مثلاً رشتہ دار ہمسایہ، اجنبی ہمسایہ، عارضی ہمسایہ وغیرہ ہمسائگی کا پاس و لحاظ، اسلام میں بڑی نیکی کا کام ہے جبرئیل امین ہمسایہ کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق ادا کرنے کی اس قدر تاکید کرتے تھے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شبہ ہونے لگتا تھا مبادا ان کو وراثت میں بھی شریک کردیا جائے۔ (بخاری و مسلم)

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یومن واللہ لا یومن واللہ لا یومن قیل من یارسول اللہ قال الذی لا یومن جارہ بوائقہ (مسلم)	وہ مومن نہیں ہوسکتا بخدا وہ مومن نہیں ہوسکتا پوچھا گیا اے اللہ کے رسول کون مومن نہیں ہوسکتا، آپ نے فرمایا وہ شخص جس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ ہو۔

ایک حدیث میں آنجناب ؐ نے یہاں تک تنبیہ فرمائی۔

لیس المومن الذی یشبع وجارہ جائع الی جنبہ (بیہقی فی شعب الایمان)	وہ شخص مومن نہیں ہے جو خود تو پیٹ بھر کھالے اور اس کے پہلو میں اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔

اس اضافت میں اب وہ لوگ آتے ہیں جن میں ایمان اور اسلام قدر مشترک ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ سماجی معاملات میں یہ چوتھے درجہ پر ہیں بلکہ یہ بات صرف ترتیب حقوق کے لحاظ سے کہی گئی ہے ورنہ اسلام اور ایمان کا رشتہ اتنا اہم اور مقدس ہے کہ بعض اوقات خونی رشتے بھی اس پر قربان کردیئے جاتے ہیں۔ قدیم عرب کا معاشرتی ڈھانچہ خونی رشتوں پر استوار تھا، فرد خاندان سے پہچانا جاتا تھا۔ اور خاندان ہی فرد کا محافظ اور وجہ اتحاد تھا، اسلام نے ان رشتوں کا احترام ضرور کیا اور صلہ رحمی کا بے نظیر سبق بھی سکھایا مگر ان کی اولیت ختم کردی اور اس کی جگہ ایمان کو نقطہ اتحاد اور سماجی اصولوں کا معیار قرار دیا، اس طرح خونی رشتوں پر دینی اخوت کو غالب کردیا۔

چنانچہ مومن آپس میں بھائی ہیں۔ ان کی اخوت نے ان کو باہم ہمدرد و مددگار محافظ اور غم گسار بنایا ہے یہ ایک

دوسرے کے لیے مخلص اور خیر خواہ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

تری المومنین فی تراحمھم وتعاطفھم	ایک دوسرے سے محبت رحمت اور نرمی کے معاملہ
وتوادھم کمثل الجسد اذا اشتکی	میں مومن کی مثال ایک جسم کی ہے جس کے کسی ایک
عضو تداعی لہ سائر الجسد فی	حصہ میں تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم بخار اور پریشانی
السھر والحمی (متفق علیہ)	میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اسلامی معاشرہ کی تعمیر اسی وقت ممکن ہے جب اس کے افراد میں باہمی محبت، ایثار وتعاون اور خیر خواہی پورے طریقہ پر موجود ہو ورنہ ایسا سماج جس کے افراد ایک دوسرے کے غم سے بے گانہ اور ایک دوسرے کے کام آنے سے جی چراتے ہوں نہ ان میں دوسروں کی مصیبت کا لحاظ اور پاس ہو اور نہ ہی وہ اپنی خواہشات پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دے سکتے ہوں بلکہ ہر شخص اپنی جگہ ایک بے شعور پتھر کی طرح جامد ہو گیا ہو اس میں اسلامی تہذیب کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ ایسے معاشرہ کی قبرستان اور اس کے مکینوں کی لاشوں سے زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ بس میں حرکت تو ہے مگر جان نہیں۔ اس اخوت اور برادری کا تقاضا مساوات اور برابری ہے، رنگ ونسل اور علاقہ وجغرافیہ کی بنا پر ان میں کوئی کسی سے بڑا ہونے کا دعویدار نہیں بن سکتا، جو چیز ان کو ایک دوسرے پر فوقیت عطا کرتی ہے وہ تقویٰ اور خدا ترسی ہے یہ اسلامی معاشرہ کا آفاقی کردار ہے۔ اس لیے ایک مومن ——— دوسرے مومن کا مذاق نہیں اڑا سکتا، اس کی تحقیر وتذلیل نہیں کر سکتا، نہ اسے برے نام سے یاد کر سکتا ہے اور نہ پیٹھ پیچھے اس کی غیبت کر سکتا ہے۔ وہ ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا جس سے اخوت کی دیوار میں شگاف پیدا ہو اور معاشرہ میں انتشار برپا ہو۔ قرآن کریم میں ہے۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو نہ مرد دوسرے مرد کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں گے وہ ظالم ہیں۔ اے لوگو جو ایمان لائے بہت گمان کرنے سے بچو کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں تجسس نہ کرو، اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا۔ دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو اللہ سے ڈرو اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے" (الحجرات: ۱۲-۱۱)

اس اخوت کا مطالبہ یہ ہے کہ اہل ایمان آپس میں حسن ظن سے کام لیں۔ کسی بھائی کے متعلق اگر کوئی ناپسندیدہ بات معلوم ہو تو فوراً ہی اس پر یقین نہ کر لیں اور اس کی تشہیر شروع کر دیں۔ کیونکہ حدیث کے بموجب

کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع (مسلم)

آدمی کو جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی کو بیان کرنے لگے۔

بلکہ ہر حال میں اپنے بھائی کا لحاظ رکھیں، ممکن حد تک اس کا دفاع کریں اور اس کی سیرت و کردار کو مجروح ہونے سے بچائیں، تا آنکہ روز روشن کی طرح یہ واضح نہ ہو جائے کہ اب اس کا بھائی اس کا مستحق نہیں رہا ہے۔ اسلام یہاں تک تاکید کرتا ہے اگر کسی مومن سے کوئی گناہ سرزد ہو یا وہ کسی عیب کا شکار ہو گیا ہو تو دیکھنے والے مومن پر ضروری ہے کہ وہ اس کی پردہ پوشی کرے۔ ایک مومن کے لیے یہ بھی روا نہیں ہے کہ ایک دوسرے مومن کی سیرت و شخصیت کو مجروح ہوتا دیکھے اور یہ سوچ کر خاموش رہے کہ اسے دوسروں سے کیا مطلب اور دوسرے کے معاملات میں دخل دینے کی کیا ضرورت؟ بلکہ اس وقت بھی اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے بھائی کے وقار کو مجروح ہونے سے بچائے اور اس کے معاملہ میں خیر خواہی سے کام لے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ○ (نور - ۱۲)

جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا اسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا۔ اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

من اغتیب عندہ اخوہ المسلم وھو یقدر علی نصرہ فنصرہ نصرہ اللہ فی الدنیا والاخرۃ فان لم ینصرہ وھو یقدر علی نصرہ ادرکہ اللہ فی الدنیا والاخرۃ۔ (شرح السنۃ)

جس شخص کے سامنے اس کے مسلمان بھائی کی غیبت کی گئی اور وہ اس کی مدافعت کر سکتا تھا اور کی تو اللہ اس کی دنیا اور آخرت میں مدد کرے گا اور اگر قدرت کے باوجود اس نے مدافعت نہیں کی تو اللہ اسے دنیا اور آخرت دونوں جگہ پکڑ لے گا۔

اسلام معاشرہ کی شیرازہ بندی کے لیے ان قیمتی اصولوں کے ساتھ اجتماعیت کا احساس بھی افراد میں پیدا کرتا ہے۔ معاشرہ کسی ایک فرد کا رہین منت نہیں ہوتا بلکہ مجموعہ افراد کا مشترکہ سرمایہ ہوتا ہے، ہم سماجی زندگی کے بہت سے امور میں فرد اپنی صلاحیت اور قوت پر بھروسہ کرکے زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ وہ قومی ورثہ اور سماجی عطیات سے استفادہ کرنے پر مجبور ہے، اس لیے اس سے وابستگی بھی اس کے لیے ناگزیر ہے، چنانچہ اسلام کی نظر میں معاشرہ کا قیمتی سرمایہ افراد کا شعور اجتماعیت اور ان کی معاشرہ سے قلبی وابستگی ہے، اگرچہ ابتدا کے لحاظ سے جبلی اور فطری ہے مگر ایک نظام ایک طریقہ عمل کی حیثیت سے اختیاری ہے، اسلام نے اس وابستگی کو پختہ کرنے کے لیے موثر ہدایات دی ہیں۔ قرآن کہتا ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران: ۱۰۳)

سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ (انفال: ۴۶)

آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الشیطان ذئب الانسان کذئب الغنم یاخذ الشاذۃ الناحیۃ القاصیۃ (احمد)

شیطان انسان کا بھیڑیا ہے جس طرح بکریوں کا دشمن بھیڑیا ہوتا ہے، وہ اپنی بکریوں کو دبوچتا ہے جو الگ اور دور ہو جاتی ہیں اور کنارہ کشی اختیار کر لیتی ہیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

المومن الذی یخالط الناس ویصبر علی اذاھم خیر من الذی لم یخالط الناس ولم یصبر علی اذاھم (مسلم)

وہ مومن جو لوگوں میں گھل مل کر رہتا ہے اور ان کی ایذا رسانیوں پر صبر کرتا ہے اس مومن سے بہتر ہے جو لوگوں سے گھل مل کر نہیں رہتا اور ان کی اذیتوں کو برداشت نہیں کرتا۔

واقعہ یہ ہے کہ جس معاشرہ کو "بنیان مرصوص" یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار بننا ہو وہ بغیر اپنے افراد کی دلی وابستگی اور باہمی محبت کے کبھی وجود میں نہیں آسکتا۔

افراد میں اجتماعیت کا احساس اور شعور ہونے کے علاوہ قرآن دس صفات کا ان میں ہونا لازم قرار دیتا ہے۔ اور یہی صفات ہیں جو ان کے معاشرہ کو آئیڈیل بناتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے۔

إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (الاحزاب: ۳۵)

بالیقین جو مرد و عورتیں مسلم ہیں، مومن ہیں، مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزے رکھنے والے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔

اسلام، ایمان، اطاعت و فرماں برداری، صدق، صبر، اللہ سے ڈر، صدقہ، روزہ، پاکدامنی،

اور ذکر خدا۔ یہ دس صفات جس معاشرہ کے ارکان میں پائی جائیں درحقیقت وہ معاشرہ اسلامی کہلانے کا مستحق ہے اسی سے منطقی طور پر یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ کوئی معاشرہ محض مسلم اکثریت کی اقامت گاہ ہونے کی بنا پر اسلامی نہیں ہو جائے گا۔ جب تک اس میں مذکورہ خصوصیات جلوہ گر نہ ہوں۔ مشہور مفسر قرآن سید قطب شہیدؒ کہتے ہیں کہ

"ایسے لوگوں کا معاشرہ اسلامی نہیں ہوسکتا جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ اگر اس معاشرہ کا قانون اسلامی شریعت نہیں ہے۔ اگرچہ اس میں نمازیں پڑھی جاتی ہوں روزے رکھے جاتے ہوں، حج کیا جاتا ہو، اسی طرح وہ معاشرہ بھی اسلامی نہیں ہے جو اپنی طرف سے اللہ کے مقرر کردہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح کردہ اسلام کے علاوہ کوئی اور اسلام گھڑ لیا ہو اور اس کا نام ترقی یافتہ اسلام رکھ دیا ہو"۔　(معالم فی الطریق ص ۱۰۵)

گویا اسلامی معاشرہ اس ماحول کا نام ہے جس میں قوانین و رسوم اور اخلاق و عادات سب کچھ احکام خداوندی کے تابع ہوں۔ باہمی تعلقات کی بنیاد بھی خدا ہو، اور دوستی و دشمنی کا معیار بھی وہی ہو جہاں ایک دوسرے کو اس کی طرف رغبت دلائی جاتی ہو اور اس کے ... ایک دوسرے کی خبرگیری کی جاتی ہو اور افراد کی وابستگی اپنے نظام زندگی سے ان موتیوں کی طرح ہو جو ایک دھاگہ میں پرو دیئے گئے ہوں۔

(بقیہ ص ۵۵ کا)

تو آپ نے اپنے ہاتھ کو اپنے کان اور آنکھ پر رکھا اور فرمایا کہ:

السمع امانۃ والبصر امانۃ (۳)　　　کان امانت ہے، آنکھ امانت ہے۔

مزید براں اگر یہ چیزیں روزے کی امانتوں میں سے نہ ہوتیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرماتے کہ:

فلیقل إنی صائم"　　　تو کہہ دے کہ بھائی میں روزہ سے ہوں۔

یعنی کہ میں نے اپنی زبان کو بطور امانت کے جمع کر دیا ہے تاکہ اس کی حفاظت ہو تو تمہارا جواب دے کر میں اسے وہاں سے نکال کیونکر سکتا ہوں؟

پس معلوم ہوا کہ ہر عبادت کا ایک ظاہر اور ایک باطن اور ایک چھلکا اور ایک گودا ہے۔ اور اس کے چھلکے کے بھی مختلف درجات ہیں اور ہر درجہ کے مختلف طبقات ہیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے کہ تم گودے کو چھوڑ کر صرف چھلکے پر قناعت کرتے ہو یا اس کے برعکس اپنے کو ارباب خرد میں شامل کرکے ان کے راستہ پر چلنے کو پسند کرتے ہو؟

روزہ — امام غزالیؒ کے خیالات

سلطان احمد اصلاحی

نماز اور زکوٰۃ کے بعد 'روزہ' اسلامی عبادات کا تیسرا اہم ترین رکن ہے۔ جس کی اہمیت اور جس کے فضائل معلوم ہیں۔ آج کی مجلس میں 'روزہ' کے سلسلے میں امام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) کے خیالات کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔ امام غزالیؒ کی مشہور زمانہ تصنیف 'احیاء علوم الدین' جو چار ضخیم جلدوں میں ہے۔ اس کی پہلی جلد میں 'روزہ' کے 'اسرار' کی بحث ص ۲۳۰ سے ۲۳۹ تک نو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں روزہ کے احکام اور اس کے ظاہری آداب کا بھی حصہ شامل ہے۔ اس حصہ سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم اس کے فضائل اور اس کے باطنی شروط و آداب کے ترجمہ و تلخیص پر اکتفا کریں گے۔ اسلامی فلسفۂ حیات کی نمائندہ کتابوں کی کوئی مختصر سے مختصر فہرست بھی بنائی جائے تو اس میں احیاء العلوم، کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ امام غزالیؒ نے اس کتاب کو اپنی شان و شوکت اور طمطراق کی زندگی کو خیرباد کہنے کے بعد عمر کے آخری ایام میں زہد و تقشف اور رجوع الی اللہ کی انتہائی بڑھی ہوئی کیفیات کے ساتھ تصنیف فرمایا ہے۔ کتاب کے دوسرے مباحث کے علاوہ 'روزہ' کے سلسلے میں بھی مصنف کی ان کیفیات کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس بحث کی روشنی میں "احیاء" کے سلسلے میں اس چلتے ہوئے خیال کی بھی نفی ہوتی ہے کہ وہ موضوعات اور کمزور روایات کا مجموعہ ہے۔ امام غزالیؒ دوسرے تمام دیدہ ور اسلامی مفکرین کی طرح اصلاً قرآن کریم اور صحیح احادیث ہی سے استدلال کرتے ہیں۔ بعد میں ضمناً کہیں کمزور اور ضعیف احادیث بھی آجاتی ہیں۔ اہل نظر نا واقف نہیں ہیں کہ جب مسائل پر تفصیل کر بحث کرنی پڑتی ہے تو پھر صرف صحاح کی روایات سے کام نہیں چلتا۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم کے یہاں بھی یہ رنگ نمایاں ہے۔ اسی چیز نے ہمارے فقہاء کو بھی ضمناً کمزور اور ضعیف احادیث سے استدلال کے لیے مجبور کیا۔ ہمارے پیش نظر 'احیاء علوم الدین' کا مکتبہ تجاریہ کبریٰ، مصر کا نیا ایڈیشن ہے جو مطبعۃ الاستقامۃ، قاہرہ کا چھپا ہوا ہے۔ اس کے ذیل میں علامہ عراقی (م ۸۰۶ھ)

کی احیاء کی احادیث کی تخریج ' المغنی عن حمل الاسفار فی الاسفار ' بھی ہے۔ اسی کی روشنی میں احادیث کے مختصر حوالے بھی ہم پیش کرتے جائیں گے۔ بحث کے دوران کوئی چیز وضاحت طلب ہوگی تو اس کو الگ سے فٹ نوٹ کے ذریعہ واضح کریں گے۔ وما توفیقنا الا باللہ۔ اصل میں آیتیں سادہ تھیں۔ حوالوں کا اضافہ ہمارا ہے۔ (س)

روزہ کی اہمیت اور اس کے فضائل :-

روزہ ایمان کا چوتھائی حصہ ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے

الصوم نصف الصبر (۱) — روزہ آدھا صبر ہے۔

نیز آپ کے فرمان :

الصبر نصف الایمان (۲) — صبر آدھا ایمان ہے۔

کا یہی تقاضا ہے۔ پھر روزے کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ دوسرے تمام ارکان میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اسے اپنی نسبت کا شرف عطا کیا ہے۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نقل کیا ہے :

کل حسنة بعشر امثالها الی سبعمائة	ہر نیکی کا بدلہ دس گنے سے سات سو گنے تک ہوگا،
ضعف الا الصیام فانه لی	سوائے روزہ کے کہ وہ خاص میرے لیے ہے
و أنا اجزی به (۳)	اور میں اس کا بدلہ خاص طور پر دوں گا۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم	ضرور صبر کرنے والوں کو ان کا بدلہ بے حد حساب
بِغَيْرِ حِسَابٍ (زمر ۱)	دیا جائے گا۔

معلوم ہے کہ روزہ نصف صبر ہے۔ پس جب آیت میں ' صبر اختیار کرنے والوں ' کو بے پایاں اجر کی بشارت دی گئی ہے تو روزہ رکھنے والے ' صابرین ' کو بھی بے حد حساب اجر و انعام سے نوازا جائے گا۔ مزید براں روزہ کے فضائل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات بہت کچھ کافی ہیں :

والذی نفسی بیدہ لخلوف — اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے

---

(۱) ترمذی، ابن ماجہ ، روایت ابوہریرہؓ (۲) ابونعیم فی الحلیہ والخطیب فی التاریخ من حدیث ابن ابن مسعود بسند حسن (۳) بخاری و مسلم ۔ روایت ابوہریرہ

فم الصائم اطيب عند الله من ريح المسك يقول الله عز وجل إنما يذر شهوته وشرابه لاجلی فالصوم لی وانا اجزی بہ[۱]

. . . .

روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی مہک سے بھی زیادہ خوشبودار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ اپنی خواہش اور اپنے کھانے پینے کو محض میری خاطر چھوڑتا ہے۔ تو روزہ خاص میرے لیے ہے۔ اور اس کا بدلہ بھی میں خاص طور پر الگ سے دوں گا۔

نیز فرمایا:

للجنة باب يقال له الريان لا يدخله الا الصائمون وهو موعود بلقاء الله تعالیٰ فی جزاء صومہ[۲]

جنت کا ایک دروازہ ہے جس کا نام 'ریان' ہوگا۔ اس میں سے صرف روزہ دار داخل ہوں گے۔ اور ایسے شخص کے لیے اپنے روزہ کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ کی ملاقات یقینی ہے۔

دوسرے موقعہ پر فرمایا:

للصائم فرحتان فرحة عند افطاره و فرحة عند لقاء ربہ[۴]

روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی اس کے روزہ کھولتے وقت اور دوسری خوشی اسے اپنے مولیٰ سے ملاقات کے وقت حاصل ہوگی۔

نیز ارشاد ہوا:

لكل شئ باب و باب العبادة الصوم (۵)

ہر چیز کے لیے ایک دروازہ ہوتا ہے۔ عبادت کا دروازہ روزہ ہے۔

اور فرمایا:

نوم الصائم عبادة (۶)

روزہ دار کا سونا بھی عبادت ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا دخل رمضان فتحت ابواب الجنة و غلقت ابواب النار وصفدت

جب رمضان کا مہینہ شروع ہوجاتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند

---

(۱) حوالہ سابق، حدیث بالا کا ایک حصہ۔ (۲) اس موقعہ پر غالباً طباعت کی غلطی سے جزاء صومہ، الف کے بغیر چھپ گیا ہے ہم نے اصل کو بحال کر دیا ہے۔ (۳) متفق علیہ، روایت سہل بن سعدؓ، بخاری و مسلم، روایت ابوہریرہ۔ (۵) اخرجہ ابن المبارک فی الزہد بسند ضعیف (۶) امالی ابن مندہ، نیز ابو منصور دیلمی فی مسند الفردوس و فیہ سلیمان بن عمرو النخعی احد الکذابین۔

الشیاطین وینادی منادیا باغی الخیر هلم ویا باغی الشر اقصر (۱)

کر دیئے جاتے ہیں، اور شیطانوں کو بیڑیاں لگادی جاتی ہیں۔ اور ایک پکارنے والا پکارتا ہے کہ اے بھلائی کے چاہنے والے آگے بڑھو اور اے برائی کا قصد کرنے والے باز آجاؤ۔

حضرت وکیع اللہ تعالیٰ کے قول :

كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ (حاقہ : ۲۴)

کھاؤ اور پیو مزے لے کر اپنے اس عمل کے بدلہ جو تم نے پچھلے دنوں میں انجام دیئے۔

کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ اس سے مراد روزے کے دن ہیں۔ اس لیے کہ یہی دن ہوتے ہیں جس میں کہ وہ لوگ کھانے پینے کو چھوڑے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جن دو طرح کے افراد پر فرشتوں سے بازی لے جانے پر ان سے فخر کا اظہار کرتا ہے، ان میں سے ایک دنیا سے بے رغبتی اختیار کرنے والا ہے تو دوسرا روزہ دار۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ان دونوں کو اسی طرح بیان کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا :

إن الله تعالى يباهي ملائكته بالشاب العابد فيقول: ايها الشاب التارك شهوته لاجلي المبذل شبابه لي أنت عندي كبعض ملائكتي (۲)

اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے روبرو فخر کا اظہار کرتا ہے عبادت گذار نوجوان پر۔ پس فرماتا ہے کہ، اے نوجوان جو اپنی خواہش کو میری خاطر چھوڑنے والا اور اپنی جوانی کو میرے لیے جاں نثار کرنے والا ہے تو میرے نزدیک میرے بعض فرشتوں کے مانند ہے۔

اسی طرح روزہ دار کے سلسلے میں حدیث قدسی کے حوالہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

يقول الله عز وجل: انظروا يا ملائكتي الى عبدي ترك شهوته ولذته وطعامه وشرابه من اجلي (۳)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : اے میرے فرشتو میرے اس بندے کو دیکھو اس نے اپنی خواہش، اپنی پسند اور اپنے کھانے اور پینے کو میری خاطر چھوڑ رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا قول ہے :

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (سجدہ ۱۷)

تو کسی شخص کو نہیں معلوم کہ ان کے لیے نگاہوں کی ٹھنڈک کا سامان کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے۔ اس کا

(۱) ترمذی، ابن ماجہ والحاکم وصححہ۔ اصلہ متفق علیہ۔ (۲) اخرجہ ابن عدی من حدیث ابن مسعود بسند ضعیف۔ (۳) اس حدیث کے اصل الفاظ ہیں : یقول اللہ تعالیٰ للملائکۃ یا ملائکتی انظروا الی عبدی ترک شهوته ولذته وطعامه وشرابه من اجلی۔

بدلہ جو عمل یہ (دنیا میں) کرتے رہے تھے۔

کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کا عمل 'روزہ' تھا۔ اس لیے کہ دوسرے موقعہ پر اس بے پایاں اجر کا مستحق 'صبر اختیار کرنے والوں' (صابرین یعنی روزہ داروں) کو قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ (زمر: ۱۰)	ضرور صبر اختیار کرنے والوں کو ان کا بدلہ بے حد و حساب دیا جائے گا۔

پس روزہ دار کو اپنے اس عمل کا بڑا بے پایاں اجر ملے گا اور اسے بے حد و حساب انعامات سے نوازا جائے گا۔

روزہ کو جو یہ مقام ملا ہے تو وہ بجا طور پر اس کا مستحق ہے۔ اس لیے کہ روزہ خاص اس کے لیے ہے اور اس سے اس کو خصوصی نسبت حاصل ہے۔ اگرچہ دوسری تمام عبادات بھی اسی کے لیے ہیں۔ لیکن نسبت کا شرف خاص روزہ ہی کو حاصل ہے۔ جیسا کہ بیت اللہ شریف کو اس نے اپنی خاص نسبت کا شرف بخشا ہے اگرچہ تمام کی تمام زمین اسی کی ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ اول یہ کہ روزہ باز رہنے اور چھوڑنے کا نام ہے۔ اور یہ اپنی جگہ پر ایک راز ہے۔ اس میں کسی عمل کا صدور نہیں ہوتا جس کا مشاہدہ کیا جا سکے۔ طاعت و عبادت کے دوسرے تمام اعمال مخلوق کے مشاہدہ میں آتے ہیں اور وہ انھیں دیکھتے ہیں لیکن روزے کو اللہ عزوجل کے سوا کوئی نہیں دیکھتا۔ پس یہ ایک باطنی عمل ہے جو اول و آخر 'صبر' سے عبارت ہے۔ دوم یہ کہ یہ اللہ کے دشمن کو زیر کرنے کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ اس لیے کہ شیطان لعین جس واسطہ سے انسان کی راہ مارتا ہے وہ "شہوات و خواہشات" ہیں، یہ خواہشات کھانے پینے سے زور پکڑتی ہیں۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

إن الشيطان ليجري من ابن آدم مجرى الدم فضيقوا مجاريه بالجوع (۱)	آدم کی اولاد کے اندر شیطان دوڑتا ہے جیسا کہ رگوں کے اندر خون دوڑتا ہے۔ تو اس کے راستوں کو بھوک کے ذریعہ تنگ کرو

نیز اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضؓ سے فرمایا:

داومي قرع باب الجنة، قالت بماذا؟ قال صلى الله عليه وسلم بالجوع (۲)	جنت کے دروازے کو برابر کھٹکھٹاتی رہو، بولیں کیسے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بھوک سے۔

---

(۱) متفق علیہ من حدیث صفیہ دون قولہ: "فضیقوا مجاریہ بالجوع"۔ (۲) اخرجہ احمد من حدیث ابی ہریرۃ بنحوہ

پس جب روزہ کو شیطان کو اکھاڑ پھینکنے، اس کی راہوں کو مسدود کرنے اور اس کے منافذ کو
نگ کرنے میں خاص دخل ہے، تو بجا طور طور پر اسے اللہ تعالیٰ سے خصوصی نسبت بھی حاصل ہونی
لہئے۔ اللہ کے دشمن کو اکھاڑ پھینکنے کا مطلب دوسرے لفظوں میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی مدد کرنا ہے۔
ر جو اللہ تعالیٰ کا مددگار ہوگا، وہ خود اس کی مدد سے شادکام ہوگیا۔ جیساکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

إِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ (محمد: ۷)	اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جمائے گا۔

س جب بندے کی طرف سے کوشش اور جد وجہد سے پہل ہوتی ہے تو اللہ عزوجل کی طرف
ے اسے ہمہ جہتی ہدایت کا بدلہ نصیب ہوتا ہے۔ جیساکہ فرمایا ہے،

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (عنکبوت: ۶۹)	اور جو لوگ ہمارے معاملہ میں جد وجہد کریں گے ہم ضرور ان کو اپنی راہیں دکھائیں گے۔

ز ارشاد ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (رعد: ۱۱)	اللہ کسی گروہ کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود جو چیز ان کے پاس ہے (یعنی خواہشات کی فراوانی) اس کو نہ بدل دیں۔

آیت کریمہ میں جس تبدیلی 'تغیر' کا تذکرہ ہے اس کا مطلب ہے خواہشات کی فراوانی۔ اور یہ شیطانوں
چراگاہ اور ان کا سبزہ زار ہے۔ جب تک یہ ہرا بھرا اور سرسبز و شاداب رہے گا ان کا یہاں آنا جانا لگا
ہے گا۔ اور جب تک ان کا آنا جانا لگا رہے گا بندے کے لیے اللہ عزوجل کا جلال بے نقاب نہیں ہو سکتا،
ر وہ اس کی ملاقات سے دور ہی رہے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

لولا ان الشياطين يحومون على قلوب بني آدم لنظروا الى ملكوت السموٰت (۱)	اگر ایسا نہ ہوتا کہ شیاطین اولاد آدم کے دلوں کے اوپر منڈلاتے ہوئے تو وہ ضرور آسمانوں کی بادشاہت کا منظر دیکھتے۔

اس طرح روزہ عبادت کا اولین باب قرار پاتا ہے۔ اور یہ وہ ڈھال ہے کہ اس کے بغیر کوئی
س شیطان کے چو مکھے حملوں سے بچاؤ نہیں کر سکتا۔

---

۱ اخرجه احمد من حديث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ۔

روزہ کے اسرار اور اس کے باطنی شروط و آداب

جاننا چاہیے کہ روزہ کے تین درجے ہیں۔ عوام کا روزہ، خواص کا روزہ اخص الخواص کا روزہ۔ عوام کا روزہ تو یہ ہے کہ آدمی پیٹ اور شرمگاہ کو ان کی پسند سے باز رکھے، جیسا کہ اس کی تفصیل معلوم ہے۔ خواص کا روزہ یہ ہے کہ آدمی، کان آنکھ زبان، ہاتھ، پیر اور دوسرے تمام اعضاء و جوارح کو گناہوں سے دور رکھے۔ اور اخص الخواص کا روزہ یہ ہے کہ انسان کا دل پست مطالبات اور دنیوی افکار سے روزہ دار بن جائے اور وہ اللہ عزوجل کے سوا جو کچھ ہے اس سے بالکلیہ دست بردار ہو جائے۔ اور یہ روزہ ٹوٹ جاتا ہے اگر اللہ عزوجل اور روز آخرت کے سوا آدمی کی سوچ کسی اور چیز میں لگ جائے۔ اسی طرح دنیا کی سوچ سے بھی یہ روزہ جاتا رہتا ہے۔ سوائے اس دنیا کے جو دین کے لیے طلب کی جائے۔ اس لیے کہ پھر تو یہ آخرت کا توشہ بن جاتی ہے۔ دنیا سے اس کا تعلق باقی نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ اہل دل حضرات کا کہنا ہے کہ

---

(۱) حضرات صوفیاء کے یہاں دینی حقائق کی توجیہ و تشریح کے سلسلے میں عام طور پر اس طرح کی تقسیمات سے بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ علامہ ابن قیم نے "مدارج السالکین" میں بھی یہی انداز اختیار کیا ہے۔ بسا اوقات اس انداز بیان سے اجنبیت محسوس کی جاتی ہے۔ لیکن واقعہ ہے کہ یہ قرآن وسنت کی تصریحات کے عین مطابق ہے۔ قرآن میں خود "السابقون السابقون" اور "اصحاب المیمنہ" نیز "مقتصد" اور "سابق بالخیرات" وغیرہ کی تقسیم کی گئی ہے۔ اسی طرح مخصوص کلامی پس منظر سے قطع نظر کر کے واقعہ ہے کہ آدمی کا ایمان گھٹتا اور بڑھتا ہے۔ احادیث کے اندر اس کی صراحت موجود ہے۔ یہاں تک بعض اعمال کے سلسلے میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ ان کے ارتکاب کے وقت مومن کا ایمان رخصت ہو جاتا ہے۔ نماز باجماعت کے درجات میں بیس اور ستائیس کا جو فرق کیا گیا ہے، اس کی توجیہ بھی یہی کی گئی ہے کہ اس کا تعلق نمازی کے خشوع وخضوع اور اس کے رجوع الی اللہ کی کیفیت کی کمی بیشی سے ہے۔ روزہ کے سلسلے میں امام موصوف کی یہ تقسیم بھی اسی اصول کے ماتحت ہے۔ فرق مراتب زندگی کا مسلمہ ہے۔ دینی تقاضوں کی ادائیگی میں بھی یہ فرق مراتب اسی طرح قائم ہے۔ البتہ یہاں دروازہ کھلا ہوا ہے اور معاملہ اختیاری ہے۔ پس عوام وخواص کی تقسیم سے اجنبیت محسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہر شخص اپنے کو خواص ہی نہیں اخص الخواص کے مرتبے تک پہنچانے کی کوشش کرے۔ (باقی صفحہ ۲۹ پر)

جس کی محنت اور توجہ دن کی تگ و دو میں اس پر لگے کہ شام کو وہ کس چیز سے روزہ کھولے گا تو اس پر ایک گناہ لکھ دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ اللہ عزوجل کے فضل پر اعتماد اور اس کی وعدہ کی ہوئی روزی پر یقین کی کمی کا نتیجہ ہے۔ یہ مرتبہ حضرات انبیاء صدیقین اور اللہ کے خاص مقرب بندوں کا ہے۔ اور یہ چیز لفظی موشگافیاں کرنے کی نہیں بلکہ عملاً برتنے کی ہے۔ اس لیے کہ اس کا مطلب ہے کہ آدمی اپنی پوری توجہ اللہ عزوجل پر لگا دے اور غیر اللہ سے نگاہیں بالکل پھیر لے۔ ایسا کر کے آدمی اپنے کو اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مصداق بنا لیتا ہے:

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ (انعام: ۹۱)

کہو کہ اللہ ہی سب کچھ ہے۔ پھر انھیں چھوڑ دو کہ وہ اپنی یاوہ گوئیوں میں لگے رہیں اور کھیل کود کرتے رہیں۔

(۲) خواص کا روزہ تو یہ صالحین کا روزہ ہے۔ اور اس کا مطلب ہے کہ آدمی اپنے اعضاء و جوارح کو گناہوں سے دور رکھے۔ اس کی تکمیل چھ باتوں کی انجام دہی پر موقوف ہے۔ اول یہ کہ آدمی نگاہ کو پھیرے اور اسے پھیل کر دیکھنے سے باز رکھے ہر اس چیز کی طرف جو کہ مذموم اور ناپسندیدہ ہو، اسی طرح ہر اس چیز کی طرف جو قلب کو مشغول کرے اور اللہ عزوجل کی یاد سے غافل کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

النظرة سهم مسموم من سهام ابليس لعنه الله فمن تركها خوفا من الله آتاه الله عز وجل ايمانا يجد حلاوته في قلبه (۱)

نگاہ ابلیس لعین کے تیروں میں سے ایک زہر میں بجھا ہوا تیر ہے۔ تو جو کوئی اللہ کے ڈر سے اسے غلط جگہ استعمال کرنا چھوڑ دے گا تو اللہ تعالیٰ اسے وہ ایمان عطا کرے گا کہ اس کی حلاوت کو وہ اپنے دل میں محسوس کرے گا۔

حضرت جابر حضرت انس سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ نے فرمایا:

خمس يفطرن الصائم الكذب والغيبة والنميمة واليمين الكاذبة والنظر بشهوة (۲)

پانچ چیزیں ہیں جو روزہ دار کو بے روزہ کر دیتی ہیں۔ جھوٹ، غیبت، چغل خوری، جھوٹی قسم اور شہوت بھری نگاہ۔

دوم یہ کہ آدمی زبان کو یاوہ گوئی، جھوٹ، غیبت، چغلخوری، درشتی اور لڑائی جھگڑے سے محفوظ رکھے۔ اسے چپ رہنے کا خوگر کرے اور اسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی یاد اور قرآن کی تلاوت میں مصروف رکھے

(۱) اخرجه الحاكم وصحح اسناده من حديث حذيفه (۲) اخرجه الازدي في الضعفاء من رواية جابان عن انس قال ابو حاتم الرازي هذا كذاب۔

(الف) اصلاً موٹو ہم کا) "وفي ذلك فليتنافس المتنافسون"۔ امام موصوف نے یہاں جو تقسیم کی ہے، جیسا کہ آگے کی تفصیل سے واضح ہوگا دینی نصوص سے اس کی باقاعدہ تائید ہوتی ہے۔ (س)

تو یہ زبان کا روزہ ہے۔ حضرت سفیان کہتے ہیں کہ غیبت روزے کو فاسد کرتی ہے۔ بشر بن حارث نے ان سے اس کی روایت کی ہے۔ اسی طرح لیث مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ دو خصلتیں ہیں جو روزے کو فاسد کر دیتی ہیں۔ ایک غیبت، دوسرے جھوٹ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

إنما الصوم جنة فإذا كان احدكم صائما فلا يرفث ولا يجهل وان امرؤ قاتله أو شاتمه فليقل إني صائم إني صائم (۱)

روزہ تو (گناہوں سے بچنے) کی ڈھال ہے تو جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو وہ گالم گلوچ نہ کرے نہ نادانی کا کام کرے، اگر کوئی شخص اس سے لڑائی کرے یا بدزبانی پر آمادہ ہو تو کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں، میں روزہ سے ہوں۔

نیز روایت میں آتا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو عورتوں نے روزہ رکھا۔ دن کے آخر میں بھوک اور پیاس نے انھیں سخت بے قرار کر دیا یہاں تک کہ قریب تھا کہ وہ اپنی جان ہی گنوا بیٹھیں تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آدمی بھیجا کہ انھیں روزہ توڑنے کی اجازت مل جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس ایک پیالہ بھیجا اور کہلا بھیجا کہ ان دونوں نے جو کچھ کھایا ہے وہ اس میں قے کریں۔ تو ان میں سے ایک نے جو قے کیا تو وہ تازہ خون اور تر گوشت تھا۔ اور دوسری نے بھی اسی طرح قے کی۔ لوگوں کو اس پر بڑا تعجب ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ اس چیز کو کھانے سے باز رہیں جسے اللہ نے ان کے لیے حلال کیا تھا لیکن اس چیز کو کھاتی رہیں جسے اللہ نے ان کے اوپر حرام قرار دیا تھا۔ یہ دونوں مل کر ایک پاس بیٹھیں اور دنیا بھر کے لوگوں کی غیبتیں کرتی رہیں۔ تو یہ ان ہی لوگوں کا گوشت ہے جو انھوں نے کھایا۔" (۲)

سوم یہ کہ ہر وہ چیز جو ناپسندیدہ ہو کان کو اس کی طرف دھیان لگانے سے باز رکھے۔ اس لیے کہ ہر وہ چیز جس کا کہنا حرام ہے اس کی طرف کان لگانا بھی حرام ہے۔ اسی لیے اللہ عزوجل نے (جھوٹ) سننے والے اور حرام کھانے والے کو یکساں درجہ میں رکھا ہے۔ فرمایا:

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (مائدہ ۵: ۴۲)

جھوٹ کے بڑے سننے والے اور حرام کے بڑے کھانے والے۔

نیز ارشاد ہوا:

---

(۱) بخاری و مسلم، روایت ابو ہریرہؓ (۲) اخرجہ من حدیث عبید مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسند فیہ مجہول۔

لَوۡلَا یَنۡهٰهُمُ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ عَنۡ قَوۡلِهِمُ الۡاِثۡمَ وَاَكۡلِهِمُ السُّحۡتَ (مائدہ: ۶۳) — کیوں نہ انھیں (اہل کتاب کو) ان کے علما و فقہا ان کو گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے منع کرتے۔

پس غیبت پر خاموش رہنا حرام ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّكُمۡ اِذًا مِّثۡلُهُمۡ (نساء: ۱۴۰) — (اگر تم بری بات پر خاموش رہو) تو بیشک تم بھی انہی جیسے ہو۔

اور اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

المغتاب والمستمع شریکان فی الاثم (۱) — غیبت کرنے والا اور اسے سننے والا دونوں گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔

چہارم یہ کہ اپنے دوسرے اعضا و جوارح کو گناہوں سے باز رکھے۔ ہاتھ اور پاؤں کو ناپسندیدہ چیزوں اور جگہوں سے دور رکھے۔ افطار کے وقت پیٹ کو مشتبہ چیزوں سے دور رکھے۔ اس لیے کہ روزہ جس کے معنیٰ ہی یہ ہیں کہ آدمی حلال کھانے سے اپنے کو باز رکھے، اس کی معنویت بالکل ختم ہو جائے گی اگر آدمی افطار حرام چیز پر کرے۔ ایسے روزہ دار کی مثال تو اس شخص کی سی ہوگی جو ایک کوٹھی بنائے اور پورے شہر کو ویرانے میں تبدیل کرے۔ اس لیے کہ حلال کھانا محض اپنی زیادتی کی وجہ سے نقصان دہ ہوتا ہے اپنی جنس کی وجہ سے وہ ایسا نہیں ہوتا۔ روزہ اسی کو کم کرنے کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ ایک شخص جو زیادہ مقدار میں دوا کے استعمال کو چھوڑے کہ وہ نقصان کرے گی، اس کے بجائے اگر وہ زہر کھانے لگے تو وہ بے وقوف ہی ہوگا۔ حرام وہ زہر ہے جو دین کو برباد کر دیتا ہے۔ اور حلال وہ دوا ہے جس کی کم مقدار فائدہ مند ہے۔ اور زیادہ ہو جائے تو نقصان کرتی ہے۔ روزہ کا مقصد اسی کو کم کرنا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

کم من صائم لیس من صومہ الا الجوع والعطش (۲) — کتنے ہی روزہ دار ہیں کہ انھیں اپنے روزہ سے بھوک پیاس کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

تو کہا گیا ہے کہ یہ وہی شخص ہے جو حرام پر افطار کرتا ہے، دوسرا قول ہے کہ یہ وہ شخص ہے جو حلال کھانے سے تو اپنے کو باز رکھتا ہے لیکن لوگوں کی غیبت کر کے ان کے گوشت پر افطار کرتا ہے جو حرام ہے۔ ایک اور بات یہ کہی گئی ہے کہ یہ وہ آدمی ہے جو اپنے اعضا و جوارح کو گناہوں سے محفوظ نہیں رکھتا ہے۔

پنجم یہ کہ حلال کھانے کو افطار کے وقت ضرورت سے زیادہ نہ کھالے۔ اس طور پر کہ اس کا پیٹ

---

(۱) نسائی، ابن ماجہ، بروایت ابوہریرہؓ (۲) حدیث غریب، وللطبرانی عن حدیث ابن عمر بسند ضعیف بمعناہ۔

بالکل بھول جائے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس پیٹ بڑھ کر کوئی دوسری چیز مبغوض نہیں جو حلال سے ضرورت سے زیادہ بھر گیا ہو۔ روزے سے اللہ کے دشمن کو زیر کرنے اور شہوت کو توڑنے کا فائدہ کیونکر حاصل ہو سکتا ہے۔ جبکہ روزہ دار افطار کے وقت دن بھر کی بھوک پیاس کی ساری کسر پوری کرلے، بلکہ بسا اوقات انواع واقسام کے کھانوں سے اس سے بھی آگے نکل جاتا ہے؟۔ یہاں تک کہ عادت بن گئی ہے کہ کھانے پینے کی نوع بہ نوع کی چیزیں رمضان کے لیے اکٹھا کرلی جاتی ہیں۔ اور تنہا اس میں کھانے پر اتنا خرچ ہو جاتا ہے جو دوسرے کئی مہینوں کو ملا کر نہیں ہوتا۔ معلوم ہے کہ روزہ کا مقصود معدہ کو سکھانا اور خواہش کو توڑنا ہے تاکہ نفس کے اندر تقوی کے راستہ پر چلنے کے لیے مضبوطی پیدا ہو جائے۔ اس کے برعکس جب معاملہ یہ ہو کہ معدہ کو صبح سے شام تک بھوکا رکھا جائے یہاں تک کہ جب اس کی کھانے کی خواہش خوب بھڑک جائے اور اشتہا خوب بڑھ جائے پھر اسے رنگ برنگ کے لذیذ کھانے کھلائے جائیں اور اسے خوب شکم سیر کیا جائے، تو اس کی لذت دوچند ہوتی اور اس کی قوت کئی گنا بڑھ جاتی ہے اور اس کے اندر خواہشات کا وہ طوفان اٹھتا ہے جس کے بہت دبے رہنے کی توقع تھی اگر معاملہ پرانی عادت کے مطابق رہا ہوتا۔ پس روزہ کی روح اور اس کا راز شہوانی قوتوں کو کمزور کرنا ہے جو انسان کو برائیوں کی طرف پلٹانے میں شیطان کا سب سے بڑا ہتھکنڈہ ہیں اس کو حاصل کرنے کی اس کے سوا دوسری صورت نہیں کہ کھانے کو کم کیا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ آدمی روزے کے دنوں میں بھی اتنا ہی کھائے جتنا کہ وہ اس سے پہلے کی راتوں میں کھاتا تھا جبکہ وہ روزے سے نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بجائے اگر وہ افطار سے سحر تک میں صبح سے شام تک کے پورے کھانے کی کسر نکالنی شروع کردے تو اسے روزے کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ روزہ کے آداب میں سے ہے کہ دن میں زیادہ نہ سوئے تاکہ اسے بھوک اور پیاس کا احساس رہے اور جسمانی قوتوں کی کمزوری کو محسوس کرتا رہے۔ اس صورت میں اس کے قلب کے اندر صفائی پیدا ہوگی۔ اور چاہئے کہ ہر اگلے دن میں اس کی جسمانی کمزوری بڑھتی رہے یہاں تک کہ اس کے لیے تہجد اور دوسرے اوراد و وظائف پر عمل آسان ہو جائے۔ امید ہے کہ اس کے بعد شیطان اس کے قلب پر منڈلانا چھوڑ دے گا اور اسے آسمان کی بادشاہت کا نظارہ دکھائی دینے لگے گا۔ (روزہ میں) جس لیلۃ القدر کی بات کی جاتی ہے وہ یہی رات ہے جس میں کہ اس بادشاہت کی کچھ جلوہ نمائی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کے قول۔ اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ (قدر: ۱) (بیشک ہم نے اسے (قرآن کو) لیلۃ القدر میں اتارا ہے) سے یہی رات مراد ہے۔ جس کے دل اور جس کے سینے کے درمیان کھانے کی خلیج حائل ہوگی وہ اس رات سے دور رہے گا۔ اور جو اپنے معدہ کو خالی رکھنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو ظلمت کے حجاب کو ہٹانے

کے لیے صرف یہی چیز کافی نہ ہوگی یہاں تک کہ اس کی توجہ غیر اللہ سے ہٹ کر پوری طرح اللہ کے لیے نہ ہو جائے یہی معاملہ کا اصل سرا ہے اور اس سب کی بنیاد یہ ہے کہ کھانے کو کم سے کم کیا جائے ۔

ششم یہ کہ افطار کے بعد اس کا قلب سراپا اضطراب اور امید و بیم کے بیچ اٹکا ہوا ہو اس لیے کہ اسے نہیں معلوم کہ اس کا روزہ مقبول ہوتا ہے اور وہ مقربین میں شامل قرار پاتا ہے یا وہ اس پر لوٹا دیا جاتا ہے اور اسے مبغوضین میں جگہ ملتی ہے ؟ دوسری تمام عبادات کے سلسلے میں بھی جب آدمی ان سے فارغ ہو یہی کیفیت ہونی چاہیے ۔ حضرت حسن بصری سے روایت ہے کہ ان کا گذر کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جو ہنس رہے تھے تو آپ نے فرمایا کہ: اللہ نے رمضان کے مہینے کو اپنی مخلوق کے لیے مقابلہ کا نشان قرار دیا ہے جس کے ذریعہ وہ اس کی طاعت و بندگی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو کچھ لوگ سبقت لے گئے اور وہ کامیاب ہو گئے اور کچھ لوگ پیچھے رہ گئے اور وہ ناکام ہوئے ۔ پس تعجب اور سخت تعجب ہے اس ہنسنے والے کے لیے جو کھیل کود میں مصروف ہے ایک ایسے دن جس میں کہ سبقت لے جانے والے فائز المرام ہوئے اور بطالت پسندوں کا ناکامیاں مقدر بنیں ۔ خدا کی قسم اگر غفلت کا پردہ ہٹ جائے تو خوب کار اپنی خوب کاری کی وجہ سے مصروف ہو جائے اور بدکار کو اپنی بدکاری کی وجہ سے فرصت نہ رہے ۔ مطلب یہ کہ جس کا عمل مقبول ہوگا اس کو اس درجہ خوشی ہوگی کہ اس کا کھیل کود میں جی نہ لگے گا اور راندۂ درگاہ ٹھہرنے والے کی حسرت و ندامت اس کے اوپر ہنسی کے دروازے کو بند کر دے گی ۔ اسی طرح حضرت احنف بن قیس سے آتا ہے کہ ان سے کہا گیا کہ آپ بہت بوڑھے اور عمر رسیدہ ہیں ۔ روزہ رکھنے سے آپ کی کمزوری بہت بڑھ جائے گی تو کیوں نہ اس کے بجائے آپ فدیہ کی رخصت پہ عمل کریں ، تو انھوں نے فرمایا کہ میں ایک لمبے سفر کے لئے اسے زادِ راہ بنا کر رکھ رہا ہوں ۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طاعت و عبادت پر صبر کرنا اس سے بہت آسان ہے کہ آدمی اس کے عذاب پر صبر کرنے کو اپنے کو تیار رکھے ۔ روزہ کے یہی اسرار اس کے باطنی معانی ہیں ۔

پس اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ اگر آدمی اپنے کو صرف پیٹ اور شرمگاہ کی خواہش سے باز رکھنے پر اکتفا کرتا ہے اور ان بلند معانی کو چھوڑ دیتا ہے تو فقہا نے کہا ہے کہ اس کا روزہ صحیح ہو جائے گا تو اس کا کیا مطلب ہے ؟ تو معلوم ہونا چاہیے کہ فقہائے ظاہر ظاہری شرطوں کو جن دلائل سے ثابت کرتے ہیں وہ ان دلائل سے بہت کمزور ہیں جنھیں ہم نے ان باطنی شرائط کے بیان میں ذکر کیا ہے خاص طور سے غیبت اور اس جیسی دوسری چیزوں کے سلسلے میں ۔ ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رکھنے کی ہے کہ فقہائے ظاہر کا منصب ہی یہ ہے کہ وہ عام طور پر غافلوں اور دنیا پر مرنے والوں کو وہ احکام بتادیں جن پر وہ آسانی سے عمل کریں ۔ جہاں تک علمائے آخرت کا سوال ہے تو ان کے لیے کسی عمل کے صحیح ہونے کا مطلب ہے کہ وہ مقبول ہو جائے اور مقبول

ہونے کا مطلب ہے کہ اصل مقصود تک رسائی ہو جائے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ روزے سے مقصود اللہ عزوجل کے اخلاق عالیہ میں سے ایک اخلاق سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا ہے۔ اور وہ ہے صمدیت (جس کا مطلب ہے کہ آدمی بے ہمہ اور باہمہ ہو جائے) نیز اس کا مقصد ہے کہ خواہشات سے اپنے کو دور رکھنے میں تا بہ حدامکان ملائکہ کی پیروی اختیار کی جائے اس لیے کہ وہ خواہشات نفسانی سے بالکل پاک ہیں۔ انسان کا درجہ جانوروں کے درجہ سے اوپر ہے۔ اس لیے کہ عقل کی روشنی کے ذریعہ اسے خواہشات کو توڑنے پر قدرت حاصل ہے۔ البتہ فرشتوں سے اس کا درجہ نیچے ہے اس لیے کہ اس کے اوپر خواہشات کا غلبہ ہوتا رہتا ہے اور ان کے خلاف برابر کشمکش میں لگا ہوتا ہے۔ پس جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ خواہشات میں ڈوبتا ہے تو وہ اسفل سافلین میں گر جاتا ہے اور جانوروں کی صف میں مل جاتا ہے۔ اور جب جب وہ شہوات و خواہشات کو زیر کر لیتا ہے تو اعلیٰ علیین کے مرتبہ تک پہنچ جاتا ہے اور فرشتوں کی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے۔ فرشتے اللہ عزوجل کے مقرب ہیں۔ جو کوئی ان کی پیروی کرے گا اور ان کے اخلاق سے مشابہت اختیار کرے گا، انہی کی طرح وہ بھی اللہ سے قریب ہو جائے گا۔ اس لیے کہ قریب کا ہم رنگ بھی قریب ہی ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہاں جس قربت کی گفتگو ہے وہ مکانی قربت نہیں بلکہ اخلاق و اوصاف کی قربت کی ہے۔ جب ارباب خرد اور اہل دل حضرات کے ہاں روزے کا یہ راز ہے تو اس کا کیا فائدہ ہے کہ دوپہر کے کھانے کو موخر کر کے شام کے وقت دو کھانے ایک ساتھ کھالے اور دن بھر دوسری شہوات و خواہشات میں ڈوبا رہے؟ اگر اس کا کوئی فائدہ ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمانے کا کیا مطلب ہے!

کم من صائم لیس من صومہ الا الجوع والعطش (۱) — کتنے ہی روزہ دار ہیں کہ انھیں اپنے روزہ سے سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

اسی لیے حضرت ابوالدرداء نے کہا کہ: سمجھدار (بے روزہ داروں) کا سونا اور ان کا کھانا پینا کیا خوب ہے کیوں کہ وہ ناسمجھوں کے روزے اور ان کی شب بیداری کی عیب چینی نہیں کرتے۔ جو لوگ یقین و تقویٰ کی دولت سے مالامال ہیں ان کی ذرہ کے برابر عبادت، ان لوگوں کی پہاڑوں کے مانند عبادت سے زیادہ افضل اور گراں قدر ہے جو ان کیفیات سے عاری ہیں۔ اسی لیے بعض علماء نے کہا ہے کہ کتنے بے روزہ دار ہیں جو بے روزہ ہیں اور کتنے بے روزہ ہیں جو روزہ دار ہیں۔ روزہ نہ رہ کر بھی روزہ رہنے والا وہ ہے جو چاہے کھائے پیئے لیکن اپنے اعضاء و جوارح کو گناہوں سے محفوظ رکھے۔ اور روزہ

---

(۱) نسائی، ابن ماجہ، حوالہ سابق۔

رکھ کر بھی بے روزہ دار وہ ہے جو بھوکا اور پیاسا تو رہتا ہے لیکن اپنے اعضاء جوارح کو گناہوں کے لیے کھلی چھوٹ دیدیتا ہے۔ جو کوئی روزہ کی حقیقت اور اس کے راز کو سمجھ لے گا اس کے لیے اس کا سمجھ لینا (APPZ-REASON) کرنا کچھ مشکل نہیں کہ اس کی مثال جو اپنے کو کھانے اور بیوی سے خاص تعلق سے باز رکھتا ہے البتہ گناہوں میں اپنے کو لت پت کرکے اپنے روزے کو برابر توڑتا رہتا ہے، اس شخص کی سی ہے جو وضو میں اپنے اعضاء پر تین تین بار مسح کرتا ہے تو ظاہر میں تو وہ گنتی کو ٹھیک طور پر پورا کر رہا ہے لیکن اہم تر چیز جو غسل ہے وہ اسی کو چھوڑ رہا ہے تو اس کی اس جہالت کی وجہ سے اس کی نماز اس پر لوٹا دی جائے گی۔ اور وہ شخص جو کھاپی تو رہا ہے لیکن ناپسندیدہ چیزوں سے اپنے کو دور رکھ کر اپنے اعضاء و جوارح سے وہ روزہ دار ہے تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو (وضو میں) اپنے اعضاء کو ایک ایک بار دھوئے تو اس کی نماز انشاء اللہ مقبول ہو جائے گی اس لیے کہ وہ اصل کو مضبوط پکڑے ہوئے ہے اگرچہ وہ افضل کو چھوڑ رہا ہے۔" اور جو کوئی ان دونوں ہی چیزوں کو جمع کرتا ہے تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنے ہر عضو کو تین بار دھوتا ہے تو وہ اصل اور فضل دونوں پر ایک ساتھ عمل کرتا ہے۔ اور اصل کمال کا یہی درجہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

إن الصوم امانة فليحفظ احدكم امانته (۱)	روزہ امانت ہے تو چاہیئے کہ تم میں سے ہر شخص اس کی حفاظت کرے۔

اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تلاوت فرمائی۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا (نساء، ۵۸)	بیشک اللہ حکم دیتا ہے کہ تم امانتوں کو امانت والوں کے سپرد کرو۔

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

---

(۱) یہاں امام موصوف روزہ دار کے لیے گناہوں اور برائیوں سے بچنے کی ترغیب کے جس خاص پس منظر میں گفتگو کر رہے ہیں، اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی شخص سے جو صدقہ و خیرات کرکے احسان جتلادے یہ کہا جائے کہ اس سے تو تمہارا صدقہ خیرات نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ تو ظاہر ہے کہ صدقہ خیرات نہ کرنا کرنے سے بہتر نہیں ہو جائے گا بلکہ اصل مقصود اس سے لگی ہوئی دوسری برائی کی قباحت کو ظاہر کرنا ہے۔ یہی مطلب یہاں ہے کہ روزہ رکھنا اور نہ رکھنا دونوں برابر نہیں ہے۔ بلکہ مطلب ہے کہ روزہ دار کو اپنی عبادت کی عظمت کا خیال کرکے گناہوں سے بچنے میں بہت مبالغہ سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ واللہ اعلم (س)

(۱) اخرجہ الخرائطی فی مکارم الاخلاق من حدیث ابن مسعود، واسنادہ حسن۔

تنقید وتبصرہ :-

اتحاد و ملت اور نظم امارت و قضا

از حکیم ابوالحسن عبید اللہ رحمانی ۔ صفحات ۶۴۔

شائع کردہ :۔ مرکزی دارالقضا ، الجامعۃ السلفیہ بنارس ، سال اشاعت ، جنوری ۱۹۸۶ء

جامعہ سلفیہ بنارس نے ٹائپ میں بہت ہی اچھے کاغذ اور صفائی کے ساتھ اس رسالہ کو شائع کیا ہے۔ مصنف نے اتحاد امت و ملت اور نظم امارت وقضا کی اہمیت وضرورت کو قرآن وسنت کی تصریحات کے ساتھ بڑے دردمندانہ انداز میں ثابت کیا ہے۔ بزرگوں کے بعض مشہور واقعات سے بھی اس سلسلے میں استدلال کیا گیا ہے۔ رسالہ کے آغاز میں مشہور محدث علامہ عبیداللہ رحمانی حفظہ اللہ کا تاثر ہے جو اس کا بہترین تعارف ہے۔ رسالہ " اتحاد امت ..... الخ" میری نظر سے گذرا ، اس میں امارت وقضاء اور اسلامی بیت المال کے قیام کی ضرورت پر مناسب انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس بارے میں میرا یہ موقف ہے کہ نظم امارت و قضا اور اسلامی بیت المال کا قیام اہم ترین ضروریات و واجبات دین میں سے ہے ، لہٰذا میری دلی خواہش ہے کہ جماعت اہل حدیث بالخصوص اور عامۃ المسلمین اس دینی ضرورت کو سمجھیں اور اس نظام کو سمجھیں اور برپا کریں " الخ ص ۲۔ امید کہ اہل حدیث اور دوسرے حلقے علامہ کے اس مشورہ پر پوری طرح عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔

جزئیات دین پر بیجا شدت اور غلوئے ماضی میں اس امت کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ آج حالات کی شدت اور زمانہ کے تھپیڑوں کو سہنے کے باوجود بھی امت قرآن وسنت کی سیدھی سچی شاہراہ کو پکڑنے میں کامیاب نہیں ہو پارہی ہے۔ جزئیات کے غلو میں بعض حلقوں کا جوش کچھ سرد ہوا تو کچھ دوسرے حلقے اسی پرانی شدت کو دوبارہ لوٹانے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات دوسرے حلقوں کو صاف طور پر چھیڑنے اور اکسانے کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ واقعہ ہے کہ اتحاد امت کا کام کہنے سے زیادہ بہت کچھ برتنے کا ہے۔ جس کا لازمی تقاضا ہے کہ دین کے نام پر بہت سی ان چیزوں میں نرمی اور لچک اختیار کی جائے جنھیں ان کی اصل جگہ سے ہٹا کر غلط طور پر کفر وایمان کا مسئلہ قرار دے لیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جذبات وتحفظات کی قربانی دے کر دین کے اندر کلیات وجزئیات یا بالفاظ دیگر اصل وفرع کی صحیح ترتیب کو بحال کیا جائے۔ دعا ہے کہ رسالہ جس جذبے سے لکھا گیا ہے ، اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔ قیمت درج نہیں۔ غالباً مفت تقسیم کے لیے ہے۔ مصنف اور ناشر دونوں اس خدمت پر شکریہ کے مستحق ہیں۔ (س)

جلد ۶ ✶ جون ۱۹۸۷ء مطابق شوال، ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ ✶ شمارہ ۶

فہرست مضامین

● سالانہ زر تعاون -/۵۵ روپے ● (بیرون ہند) -/۲۲۵ روپے انڈین ● فی شمارہ = 5/ روپے ●

سرخ نشان، علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لئے فوری زرسالانہ ارسال فرمائیں یا اگلا شمارہ کسی اطلاع کے نہ ملنے پر بذریعہ وی۔پی ارسال کیا جائے گا۔

پرنٹر، پبلشر، محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی ۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "زندگی نو" ۱۵۲۵، سوئی والان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا گیا۔ فون: ۲۷۳۲۴۸ ★ ۲۶۵۳۱۳

اشارات،

ملک وملت کے چند قابل توجہ مسائل

مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی حفظہ اللہ

اس وقت ہمارا ملک مختلف طرح کے نہایت سنگین حالات ومسائل سے دوچار ہے جو اس کے مستقبل کے لیے ایک زبردست خطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔
اسی کے ساتھ یہاں کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کو بھی کچھ خاص طرح کے حالات ومسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جن کا ان ملکی حالات سے بھی گہرا تعلق ہے اور جن کے پیدا ہونے میں خود ان کی اپنی غفلتوں اور کوتاہیوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ ذیل میں ان دونوں طرح کے حالات ومسائل اور ان کے مناسب تدارک پر کچھ مختصر گفتگو کی گئی ہے، امید ہے اہل فکر اور ملک وملت کے بہی خواہ حضرات اس پر غور وفکر فرمائیں گے۔

دو اہم ملکی مسائل

۱۔ اخلاقی بحران ملک کو درپیش مسائل میں دو مسئلے بطور خاص قابل ذکر اور لائق توجہ ہیں۔ اول یہ کہ ملک کی اخلاقی حالت روز بروز زبوں سے زبوں تر ہوتی جارہی ہے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ جن لوگوں پر اصلاح حال کی سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، آئے دن خود ان کے بارے میں بھی ایسے ایسے انکشافات سامنے آتے رہتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس حمام میں شاید سبھی ننگے ہیں۔ اگرچہ امت مسلمہ سے تعلق رکھنے والوں کی اخلاقی حالت دوسروں کی بہ نسبت بہرحال کچھ اچھی ہی کہی جاسکتی ہے لیکن پھر بھی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ خیر امت ہونے کی بنا پر ان کے اخلاق کا جو معیار ہونا چاہئے تھا وہ اس سے فروتر ہے درآنحالیکہ اس نسبت سے ان کی ذمہ داری صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ خود اونچے اخلاق و کردار کے پابند ہوں بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں کو بھی سبق پڑھائیں۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور

شہادت حق امت مسلمہ کا خصوصی فریضہ ہے جس سے غفلت قیامت کے روز سخت ترین بازپرس کی موجب ہوگی اور اس کا ایک یہ پہلو بھی ہمارے لیے پوری طرح قابل توجہ ہونا چاہئے کہ تاریخ یہ شہادت دیتی ہے کہ بداخلاقی و بداعمالی ایک خاص حد سے گذرنے کے بعد ہمیشہ تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی رہی ہے اور ہماری کتاب ہدایت قرآن پاک میں بھی اس کی طرف جابجا اشارے کیے گئے ہیں۔ اور اسی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ :

اِنَّمَا الْاُمَمُ الْاَخْلَاقُ مَا بَقِیَتْ ــ فَاِنْ هُمُوْ ذَهَبَتْ اَخْلَاقُهُمْ ذَهَبُوْا

"امتیں اس وقت تک باقی رہتی ہیں جب تک ان کا اخلاق باقی رہتا ہے۔ اگر ان کا اخلاق جاتا رہے تو وہ بھی فنا ہوکر رہیں گی"

ـــــــــ اور اسی ملک کے باشندے ہم مسلمان بھی ہیں،

اس لیے اس کا اچھا یا برا جو بھی انجام ہوگا، ہم اس سے اپنے کو کسی حال میں الگ نہیں کرسکتے۔ ایک حدیث کے مضمون کے مطابق ہم سب گویا ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، وہ اگر ڈوبی تو اس کے ساتھ سبھی ڈوبیں گے اور کوئی بھی نہ بچ سکے گا۔ اس لیے اس صورت حال کی اصلاح کے سلسلے میں ہر شخص کو اپنی اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس ہونا چاہئے۔

۲۔ امن و امان کا مسئلہ دوسرا قابل ذکر اور قابل توجہ مسئلہ ملک کے امن و امان کا ہے اس پہلو سے بھی صورت حال اتنی خراب ہوچکی ہے کہ گاؤں ہو یا شہر، سفر ہو یا حضر ـــ ہر جگہ ہر شخص کو یہ فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ معلوم نہیں کس وقت اس کی جان و مال کو کوئی جوکھم پیش آجائے۔ چوری، ڈاکہ اور قتل روزمرہ کا معمول بن گیا ہے اور فرقہ وارانہ فسادات کا تو ایک تانتا بندھا ہوا ہے جو رکنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ اس وقت بھی ملک کے متعدد مقامات فسادات کی زد میں ہیں۔ اور جہاں بظاہر امن قائم ہے وہاں بھی صورت حال کچھ ایسی ہے کہ کوئی معمولی سی بات فساد کا پیش خیمہ بن سکتی ہے اور چشم زدن میں وہاں کا امن و امان غارت ہوسکتا ہے۔

اس صورت حال کے پیدا ہونے میں بہت سے اسباب کا دخل ہے جن میں اکثریت کی جارحیت پسند جماعتوں کی حد سے بڑھی ہوئی جارحیت پسندی اور فتنہ انگیزی اور ان کی روک تھام کے سلسلہ میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی غفلتوں، کوتاہیوں اور ان کے ساتھ عام ارباب سیاست کی دسیسہ کاریوں اور شاطرانہ چالوں کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے اور یہ اس پر ہر طرح نفرت و ملامت کے مستحق ہیں لیکن اس کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس پر ہمیں ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ پچھلے دنوں بعض مقامات پر جو حادثات رونما ہوئے ہیں وہاں کے

اس وقت کے حالات کے پیش نظر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر مسلمان ان موقعوں پر اپنے جذبات کو پوری طرح قابو میں رکھتے اور صبر و ضبط سے کام لیتے تو یا تو وہ پیش نہ آتے یا بہت زیادہ شدت و وسعت اختیار نہ کرتے۔ مگر میری اس بات کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ ہر موقع پر ایسا ہی ہوتا ہے اور مسلمانوں کو ہر جگہ اور ہر موقع پر سب کچھ سہتے رہنا چاہئے۔ میں تو یہ رائے رکھتا ہوں کہ بعض اوقات اپنی جان پر کھیل جانے کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور جہاں حکومت اپنے شہریوں کے جان و مال کے تحفظ کا بند و بست نہ کر سکے وہاں مجبوراً انھیں خود اس کا بند و بست کرنا بھی پڑتا ہے۔ اپنی دفاع میں کسی کے ہاتھوں کسی کا قتل ہو جائے تو شرعاً و قانوناً وہ قابل عفو سمجھا جائے گا اور حدیث کی رو سے اپنی جان و مال و عزت کی حفاظت میں کوئی مارا جائے تو اسے شہادت کا درجہ حاصل ہوگا۔ البتہ اس سے ہر حال میں پرہیز ہونا چاہئے کہ کسی غیر متعلق شخص کو اس کے ہاتھوں کوئی نقصان پہنچے۔

میں درحقیقت یہاں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اشتعال انگیزیوں کے مواقع پر بھی حتی الوسع صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اور جذبات سے بے قابو تو کسی حال میں بھی نہیں ہونا چاہئے جبکہ وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ جہاں بھی فساد رونما ہوتا ہے وہاں اس کا بدترین خمیازہ ہر حال میں انھیں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ پھر ملک کے اس حالت تک پہنچنے میں خود ہمارے اپنے فرض منصبی سے غفلت اور کوتاہی کا بھی ضرور کچھ نہ کچھ ہاتھ ہے۔ اس کو بھی دھیان میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس سے جذبات کو قابو میں رکھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

مسلمانوں کے مخصوص مسائل

مسلم پرسنل لا مسلمانوں کو اس وقت مخصوص طور سے جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان میں ایک نہایت اہم سنگین مسئلہ یہ ہے کہ ان کا پرسنل لا جو ان کے عقیدہ کے مطابق ان کی شریعت کا نہایت اہم جزو ہے اور جس کے بقاء و تحفظ پر ان کے ملی تشخص و امتیاز کا بہت کچھ انحصار ہے، اس وقت اسے طرح طرح کے خطرات سے دوچار کر دیا گیا ہے۔ شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے ایک غلط فیصلہ کی وجہ سے مسلمانوں میں جو اضطراب اور بے چینی پیدا ہوئی تھی مسلم خواتین (تحفظ حقوق بعد از طلاق) قانون پاس کر کے اس کا ایک گونہ مداوا فراہم کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۵ بدستور قائم تھی بلکہ اس قانون میں بھی بعض خاص حالات میں اسے بروئے عمل لانے کی گنجائش بھی مہیا کی گئی تھی۔ اس لیے اب اسی دفعہ ۱۲۵ کی بنیاد پر سپریم کورٹ نے سائرہ بانو (سپانو کیرلا) کی طرف سے

دائر ایک مقدمہ میں ایک اور ایسا فیصلہ صادر فرما دیا ہے جو کئی پہلوؤں سے سخت تکلیف دہ اور قابل اعتراض ہے اور اس معنی میں تو وہ صریح طور سے احکام شریعت سے متصادم نظر آرہا ہے کہ اس کی رو سے دوسرے نکاح کی صورت میں پہلی بیوی شوہر سے الگ رہتے اور حقوق زوجیت ادا نہ کرتے ہوئے بھی نان و نفقہ کے مطالبہ کا حق رکھتی ہے۔ اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ خود مسلم خواتین (تحفظ حقوق بعد از طلاق) قانون کے خلاف بھی کئی درخواستیں سپریم کورٹ کے زیر سماعت ہیں اور مزید براں اس کے روبرو کئی ایک ایسی درخواستیں خود کچھ نام نہاد مسلمان مردوں اور عورتوں کی طرف سے پیش ہو چکی ہیں جن میں زیادہ وسیع بنیادوں پر قرآن و حدیث کے صریح احکام و ہدایات کو چیلنج کیا گیا ہے جن کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔

ان باتوں سے بخوبی یہ اندازہ کیا جاسکتا کہ ہمارے شرعی عائلی قانون کو ایک زبردست خطرہ خود عدالتوں کے آئے دن کے فیصلوں سے درپیش ہے اور بحالات موجودہ اس کا انسداد کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے اور غالباً اسی خطرہ کو ایک فال نیک سمجھتے ہوئے ہمارے ایک ممتاز اور ترقی پسند دانشور اور ماہر قانون نے حکومت کو یہ "ہمدردانہ" اور "دانش مندانہ" مشورہ دیا تھا کہ وہ مسلم پرسنل لا میں مداخلت نہ کرے البتہ عدالتوں کو اپنے فیصلے کے لیے آزاد چھوڑ دے۔ اور عدالتی فیصلے تو الگ رہے ـــ اب تو یہ بات بھی کھل کر سامنے آگئی ہے کہ خود حکومت کی طرف سے یکساں سول کوڈ کا ایک مسودہ پارلیمنٹ میں زیر بحث آنے والے موضوعات کی فہرست میں شامل کیا جا چکا ہے جو دیر سویر زیر بحث آکر قانون کا درجہ حاصل کر لینے والا ہے۔ اس بل کی صحیح نوعیت کیا ہے اور مجوزہ قانون لازمی ہوگا یا اختیاری ـــ یہ سب باتیں تو وقت پر معلوم ہوں گی۔ لیکن اس سے یہ بات بہر حال واضح ہو رہی ہے کہ جب تک دستور ہند میں یکساں سول کوڈ سے متعلق دفعہ ۴۴ برقرار ہے، اس کا خطرہ بدستور ہمارے سروں پر مسلط رہے گا درآنحالیکہ یہ دفعہ خود دستور کی ان دفعات کے سراسر متصادم ہے جن میں یہاں کے شہریوں اور تہذیبی اقلیتوں کو مذہبی آزادی اور تہذیبی تحفظ کی ہر طرح کی ضمانتیں دی گئی ہیں۔

بہر حال، اس سوال پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس سنگین خطرہ کا ہمیں کس طرح مقابلہ کرنا چاہیے؟ یہ مسئلہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے پچھلے اجلاس میں بہت تفصیل سے زیر غور آچکا ہے اور اس کے مداوا کے طور پر ایک حل بھی تجویز کیا گیا ہے جس پر تفصیل سے غور کرنے کے لیے ماہرین قانون کی ایک کمیٹی تشکیل دے دی گئی ہے جس کی رپورٹ کے بعد غالباً اس کے کسی آئندہ اجلاس میں

اس تجویز کو آخری شکل دے دی جائے گی۔ لیکن یہ بات پوری طرح واضح رہنی چاہئے کہ اس سے یہ سمجھنا کسی طرح بھی صحیح نہ ہوگا کہ اس تجویز کے سامنے آنے کے بعد مسئلہ جبنش زدن میں ختم ہو جائے گا۔ اس کے لیے طویل جدوجہد کی ضرورت ہوگی اور اس میں طرح طرح کی قربانیاں پیش کرنے کی بھی نوبت آسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس میں کامیابی عطا فرمائے۔

اس موقع پر یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہو رہا ہے کہ پرسنل لا کو ایک خطرہ خود ہماری طرف سے اس کی عملی خلاف ورزیوں کی بناء پر بھی پیدا ہو رہا ہے جس کا مداوا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان پورے عزم کے ساتھ یہ طے کریں کہ وہ نکاح وطلاق اور وراثت وغیرہ کے معاملات میں شریعت کے احکام پر پوری طرح عمل پیرا ہوں گے اور اس سلسلہ میں ان کے درمیان جو نزاعات پیدا ہوں گے ان کا تصفیہ وہ خود اپنی شرعی عدالتوں کے ذریعہ کرائیں گے۔ اس طرح ہمارا مسلم پرسنل لا بڑی حد تک عدالتوں کی آئے دن کی دخل اندازیوں سے محفوظ و مامون ہو جائے گا اور اس سے بڑی بات یہ ہے کہ مسلمان ہونے کی بناء پر ان احکام کی پابندی ہر مسلمان کی ایک شرعی ذمہ داری ہے اور صحیح معنوں میں ان پر عمل پیرا ہونے کی صورت ہی میں وہ مسلمان کہلائے جانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔

بابری مسجد اسی سے ملتا جلتا ایک اور مسئلہ مساجد کے تحفظ کا بھی ہے جن میں گوناگوں اسباب کی بناء پر خصوصیت کے ساتھ بابری مسجد کے مسئلے نے ایک سنگین صورت اختیار کر لی ہے اور اس کی سنگینی میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جاتا رہا ہے۔ اس کے سلسلے میں مسلمانوں کو بجا طور سے یہ شکایت ہے کہ اس کی ملکیت کے بارے میں ۱۹۴۹ء سے عدالت میں درپیش مقدمہ کا کوئی عدالتی فیصلہ اب تک نہیں کرایا گیا اور پہلے ایک سازش کے ذریعہ اس کے اندر بت رکھوا کر مسلمانوں کے لیے اسے مقفل کرا دیا گیا اور ہندوؤں کے لیے پھر بھی اندر جانے کی کچھ آزادی باقی رکھی گئی اور پھر ایک چھوٹی ماتحت عدالت کے فیصلہ کا سہارا لے کر اسے عام ہندوؤں کے لیے کھول دیا گیا اور حکومتی سطح پر ذرائع ابلاغ ریڈیو، ٹیلی ویژن کے ذریعہ اس کی پوری پوری تشہیر کی گئی۔

اور دوسری طرف متعدد ہندو تنظیمیں ہیں جنھوں نے اس کا بڑا اظہار کیا ہے کہ وہ اسے ہر قیمت پر مندر ہی بنا کر رہیں گی اور اس کے خلاف کسی عدالت کا کوئی فیصلہ یا تاریخی دلائل و شواہد ان کے لیے بے معنی ہیں، وہ کسی حال میں بھی ان کے لیے قابل قبول نہ ہوں گے۔

اس صورت حال نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش اور کشیدگی کی ایک نہایت تشویشناک صورت حال پیدا کر دی ہے جس کی سنگینی میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے اور

افسوس کی بات یہ ہے کہ مرکزی حکومت اور حکومت یو پی جن پر بہر حال، اس مسئلہ کے حل اور موجودہ صورتِ حال کے انسداد و تدارک کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اپنی مصلحتوں کی بنا پر اس کے لیے اب تک کوئی مثبت قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ نہیں کہا جاسکتا کہ پھر کل کیا ہوگا؟

مختلف حلقوں کی طرف سے اس کے حل کی ایک تجویز یہ بھی سامنے آئی تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے رہنما باہمی گفت و شنید کے ذریعہ کوئی حل نکالیں۔ لیکن اس سلسلہ میں جو کوششیں اب تک زیر عمل لائی جاچکی ہیں ان کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوسکا ہے اور نہ بظاہر اس کا کوئی امکان نظر آتا ہے کہ اس ذریعہ سے اس کا کوئی حل نکالنا ممکن ہوسکے گا اس کے علاوہ اس مسئلہ کے حل کے لیے جو اور تجویزیں ملک کی مختلف جماعتوں اور سرکردہ شخصیتوں کی طرف سے پیش ہوتی رہتی ہیں ان سے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر مسلمانوں کو ان کی ایک ایسی مسجد کی ملکیت سے محروم کردینے جس میں وہ صدیوں سے ۱۹۴۹ء تک باقاعدہ نماز پڑھتے رہے ہیں اور کسی نہ کسی بہانہ سے مندر یا قومی یادگار بنا دینے ہی کو عین تقاضائے عدل و انصاف سمجھ رہے ہیں اس دھاندھلی کا مداوا کیا ہے۔ اس کا جواب ہمیں سنجیدگی کے ساتھ اور ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنا چاہئے اور اس میں اس بات کو ضرور دھیان میں رکھنا چاہئے کہ اس قضیہ نے اب جو شکل اختیار کر لی ہے اس کے لحاظ سے بظاہر اس کی کوئی توقع نہیں ہے کہ اس کا آناً فاناً کوئی قابل قبول حل برآمد ہو۔ اس کے لیے انھیں خاص اہتمام کے ساتھ اور پوری جدوجہد کے ذریعہ، ایک ناگزیر ضرورت کے طور پر اپنے حق میں ایک مناسب فضا پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی جس کی طرف سے انھیں بہر حال مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے حق میں آواز بلند کرنے والے اب بھی خاصی بڑی تعداد میں موجود ہیں اور یہ تعداد ہماری کوششوں سے اور زیادہ بڑھ سکتی ہے۔

یہاں میں یہ عرض کردینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس کے اظہار میں کوئی باک نہیں ہونا چاہئے کہ آئندہ کسی مرحلہ پر بھی مستند شواہد اور دلائل سے یہ ثابت کردیا جائے کہ بابری مسجد خوانخواستہ کوئی مندر توڑ کر بنائی گئی ہے تو مسلمان بخوشی اسے اس جگہ کے حقیقی مالکوں کے حوالہ کردینے میں ایک لمحہ کے لیے بھی پس و پیش سے کام نہ لیں گے۔ لیکن اگر ایسا نہیں کیا جاسکتا تو پھر کوئی بھی مسلمان خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو یا ان کی کوئی بھی چھوٹی بڑی جماعت یہ حق نہیں رکھتی کہ وہ اپنے طور پر مسجد یا اس کے کسی جزء سے بخوشی دست بردار ہوکر اسے کسی مندر میں تبدیل کرنے یا اسے قومی یادگار

بنانے پر رضامندی کا اظہار کرے۔ اور اگر جبر و زور سے کام لیتے ہوئے ایسا کیا جائے گا تو وہ اپنی حد استطاعت تک بہر حال اس کی مزاحمت کریں گے۔ لیکن خدانخواستہ معاملہ اس سے آگے کا ہوا تو مجبوراً اس پر صبر بھی کر سکتے ہیں لیکن اس صورت میں دنیا دیکھ لے گی کہ ہندوستان کے سیکولرزم اور جمہوریت وغیرہ کے بلند بانگ دعووں کی عملی تعبیر کیا ہے۔ ہمارے اربابِ اختیار پر مسئلہ کا یہ پہلو بھی سامنے رہ سکے تو بہتر ہوگا۔

دو اور اہم مسئلے

ان دو مسئلوں کے ساتھ دو اور اہم مسئلے بھی ہیں جو ہماری پوری توجہ کے مستحق ہیں۔ اول اتحاد و اتفاق جو ہمارے تمام مسائل کے حل کے لیے ایک ناگزیر ضرورت ہونے کے ساتھ ہمارا دینی مطلوب بھی ہے لیکن جو بدقسمتی سے اس وقت ہمیں حاصل نہیں ہے ہمارے نہایت اہم دینی اور علمی ادارے تک انتشار اور باہمی اختلافات کے شکار ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اختلافات و نزاعات کے سدِ باب کے نام پر امارت و قضا کے قیام کے لیے جو نئی نئی کوششیں زیر عمل لائی جا رہی ہیں ان کو کچھ ایسے انداز میں سامنے لایا جا رہا ہے کہ وہ مزید اختلاف و انتشار ہی کی موجب بن رہی ہیں۔ اس طرح کے مسائل ہیں اس بات کو پوری اہمیت کے ساتھ سامنے رکھنے کی ضرورت ہے کہ امت کا اتحاد جس کا شیرازہ پہلے ہی سے منتشر ہے، مزید انتشار کا شکار نہ ہو اور بے ضرورت نئی نئی بحثیں نہ چھڑ جائیں ہمارے اتحاد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دین کی بنیادی باتوں کو اہمیت دی جائے، عقائد اخلاق اور معاملات پر زور دیا جائے جزئی اور فروعی مسائل میں جو اختلافات موجود ہیں ان اختلافات کی اپنے حدود کے اندر پوری گنجائش ہے اس لیے اس معاملہ میں سختی نہ اختیار کی جائے اور ہر ایک کو اپنے مسلک پر قائم رہنے اور اس پر عمل کی اجازت دی جائے۔ جزئی مسائل کو وہ اہمیت دینا جو بنیادی مسائل کی ہے اور ان پر ایک دوسرے کے خلاف محاذ قائم کرنا سخت نقصان دہ ہے۔

امت جن مسائل سے اس وقت دوچار ہے وہ سب کے مشترک مسائل ہیں ان کے حل کے لیے مشترکہ جدوجہد کی ضرورت ہے۔ جزئی اور فروعی مسائل کو اہمیت دینے سے یہ بڑے بڑے مسائل نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے اور اس سلسلے میں جو کوشش ہونی چاہیے وہ نہیں ہو سکے گی۔ یہ سب کا نقصان ہے۔

بعض اوقات افراد اور جماعتوں کے درمیان حسن ظن اور اخلاص کے وہ جذبات نہیں ہوتے جو ہونے چاہئیں۔ وہ ان کی چھوٹی بڑی فروگذاشت کو نظر انداز کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے۔

اس طرح فضا میں اتحاد اور یک جہتی نہیں پیدا ہو سکتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایک دوسرے کا احترام کیا جائے اور بہ تقاضائے بشریت کبھی کسی سے کسی معاملہ میں کوئی فروگذاشت ہو جائے تو عفو و درگذر سے کام لیا جائے۔ اسی طرح ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ امت کے مشترکہ مسائل کو گروہی سیاست سے بالاتر رکھا جائے۔ اگر ان مسائل کو ہر جماعت اپنے فائدہ اور دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لیے استعمال کرنا چاہے تو یہ مسائل کبھی حل نہیں ہو سکیں گے۔

دوسری اہم ضرورت اس مقصد کو پوری اہمیت کے ساتھ یاد رکھنے کی ہے جس کے لیے درحقیقت امت مسلمہ کی بعثت ہوئی ہے یعنی شہادت حق اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ اللہ تعالیٰ کا صریح ارشاد ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ۔	اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔
وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔	اور اسی طرح ہم نے تم مسلمانوں کو ایک "امت وسط" بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

درحقیقت ہمارے بہت سے مسائل اس فرض کی ادائیگی سے ہماری غفلت اور کوتاہی کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں اور ان کا صحیح حل اس کو ٹھیک طور سے انجام دینے پر منحصر ہے اور اس صورت میں ہم اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے زیادہ سے زیادہ مستحق قرار پا سکتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اِجْتِنَابَهٗ۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مقالات:

اسلامی معاشرہ میں مساجد کا کردار

محمد سعود عالم قاسمی

دنیا کے سبھی مذاہب میں عبادت کا کوئی نہ کوئی طریقہ رائج ہے اس کو بجالانے کے لیے مناسب مقامات اور جگہوں کا تعین ہوتا ہے اور عبادت گاہیں تعمیر کی جاتی ہیں۔ مذہب کے روحانی نظام میں جتنی اہمیت عبادت اور طریقہ عبادت کی ہوتی ہے اتنی ہی اہمیت عبادت گاہوں کی بھی ہوتی ہے جن میں مراسم عبودیت انجام پاتے ہیں۔ ہندوؤں کے لیے مندر مانویوں کے لیے خانگاہ، یہودیوں کے لیے بیعہ، عیسائیوں کے لیے کلیسا سکھوں کے لیے گردوارہ ان مقدس مقامات کے علامتی نام ہیں، قوموں کی مذہبی زندگی میں ان مقامات اور عبادت گاہوں کی کچھ اتنی اہمیت ہے کہ چاہے وہ زندگی بھر عبادت نہ کریں مگر عبادت گاہوں کا تقدس اور احترام ان کے دلوں سے محو نہیں ہوتا، نہ تو وہ ان کا نقصان پہونچایا جانا گوارہ کرسکتے ہیں اور نہ ان کی بے حرمتی برداشت کرسکتے ہیں۔

اسلام اللہ کے دین کا آخری اور مکمل ایڈیشن ہے۔ اور اسلامی نظام زندگی کا انحصار درحقیقت عبادت پر ہے کیونکہ انسان کا مقصد وجود جیسا کہ قرآن صراحت کرتا ہے، عبادت ہے۔ ارشاد ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات۔ ۵۶)

میں نے جنوں اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے نہیں پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

عبادت ایک وسیع اور جامع اصطلاح ہے جس کے معنی اللہ کی غیر مشروط اطاعت اور غلامی کے ہیں۔ عبادت کے اس تصور نے جائے عبادت یعنی مسجد کو وہی جامعیت عطا کردی ہے۔ اسلامی معاشرہ میں مساجد کی اہمیت صرف اسی قدر نہیں ہے جس قدر دوسری قوموں میں ان کے معابد کی ہے، بلکہ ان کا پورے اسلامی نظام حیات سے گہرا اور اٹوٹ رشتہ ہے، وہ مذہب

اسلام کا شعار ہی نہیں ہیں بلکہ اسلامی تہذیب و ثقافت اور اسلامی تمدن کی نقیب بھی ہیں. دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں مساجد کا مقام ٹھیک وہی ہے جو مقام نظام جسم میں شہ رگ کو حاصل ہے. مساجد کی اس اہمیت نے مسلمانوں کے دلوں میں عزت و احترام اور وابستگی کا جو جذبہ پیدا کردیا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ شاہ جہاں اپنے لال قلعہ کے سامنے ایک عالیشان جامع مسجد تعمیر کرتا ہے، اور تعظیم مسجد کے جذبہ سے اس کے زینوں کو اپنے سر کے تاج کی سطح کے برابر تک تعمیر کراتا ہے۔

تاریخی اعتبار سے دیکھئے تو پہلا انسان اگر پہلا نبی ہے تو ایک روایت کے مطابق مسجد کا پہلا معمار بھی ہے[1] شاہ عبدالعزیزؒ نے لکھا ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر سب سے پہلے حضرت آدمؑ نے کی تھی جس کے آثار طوفانِ نوحؑ میں مٹ گئے[2]. بہر حال یہ تو مسلّم ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا عبادت خانہ بیت اللہ یعنی کعبہ ہے جو روئے زمین کی تمام مساجد کا قبلہ اور سمت ہے . قرآن اس کی صراحت ان الفاظ میں کرتا ہے .

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ	بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے
بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۝	لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے، برکت
(آل عمران ۹۶)	والی اور تمام جہانوں کے لوگوں کے لیے مرکز ہدایت ہے

حضرت ابوذرؓ نے جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ زمین کی پہلی مسجد کون سی ہے؟ تو آپ نے فرمایا " المسجد الحرام[3] یعنی خانہ کعبہ۔

قرآن نے مسجد حرام کی قدامت بیان کرتے ہوئے اس کی شان افادیت اور اہمیت کی طرف "مبارکا وھدی" جیسے دو الفاظ میں بڑی بلاغت سے اشارہ کیا ہے . اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجد ایک طرف انسانی ہدایت کا سرچشمہ ہے اور دوسری طرف رحمت برکت اور حقیقی سعادت کا ذریعہ ہے یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پاک نفوس اصحاب کی پوری زندگی اس جدوجہد میں گزری کہ خانہ کعبہ کو اصنام پرستی کی نجاست سے پاک کر کے دوبارہ ہدایت اور سعادت کے لیے واگذار کیا جائے ،چنانچہ جیسے ہی مکہ فتح ہوا مسلمانوں نے پہلا کام کیا کہ اللہ کے اس

---

(۱) بیہقی بحوالہ ابن کثیر (۲) تفسیر عزیزی، سورہ بقرہ (۳) ابن ماجہ، ابواب المساجد

گھر کو بتوں سے نجات دلایا اور وطھر بیتی للطائفین والقائمین والرکع السجود (الحج ۲۶)
یعنی میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو، کا مدعا پورا کر دیا۔

خانہ کعبہ کی اس قدامت نے روئے زمین کی تمام مساجد کو اسی قدامت سے منطقی طور پر ربط کر دیا ہے خواہ وہ زمان و مکان کے کسی بھی حصہ میں تعمیر کی گئی ہوں۔ یعنی دنیا کے کسی گوشہ میں مسجد کے نام پر ایک سفال پوش جھونپڑی میں بھی قبلہ رو ہو کر پنج وقتی نماز ادا کرنے والے اسی سلسلۂ تاریخ اور عظمت روایت سے منسلک ہیں جس سے خانہ کعبہ کے مصلی وابستہ ہیں۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ جو پاک اور صاف ہو کر گھر سے فرض نماز کے لیے نکلتا ہے اس کا اجر محرم حاجی کے برابر ہے[۱]" اس لیے مسلمانوں کو بجا طور پر یہ کہنے کا بھی حق حاصل ہے کہ وہ دنیا کی قدیم ترین تہذیب کے علم بردار ہیں۔

دنیا کے طول و عرض میں مسلمانوں کے پھیلنے اور ان مقامات پر مساجد تعمیر کرنے کی تاریخ اور مساجد کے فن تعمیر سے جو تحقیق کا ایک بڑا موضوع ہے تھوڑی دیر کے لیے صرف نظر بھی کر لیجئے تو خود نظام مساجد کے اندر وہ زبردست روحانی، سماجی، سیاسی اور تہذیبی قوت پنہاں ہے کہ اگر اسے منکشف کیا جائے اور روبہ عمل لایا جائے تو انسانیت پھر اسی ہمہ جہت انقلاب سے روشناس ہو سکتی ہے آج سے چودہ سو سال پہلے جس کا نظارہ کر چکی ہے۔ اسلامی معاشرہ میں مساجد جو انقلاب پیدا کرتی ہیں اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم نظام مساجد کو سمجھیں اور مختلف پہلوؤں سے اس کا جائزہ لیں۔

مساجد اور اذان

مساجد کی تعمیر کا مقصد اس اذان میں مضمر ہے جو مینار مسجد سے پانچوں وقت بلند ہوتی ہے یہ اذان مومنوں کو تجدید ایمان اور تعمیر سیرت کی طرف بلاتی ہے حکم ہے کہ جب نماز کے لیے پکارا جائے تو سارے کام چھوڑ کر مسجد کا رخ کرو، اس میں نظم و ضبط ڈسپلن، وفاداری اور فرمانبرداری کا زبردست سبق ہے مولانا مودودیؒ نے اس کی تعبیر اس طرح کی ہے " اس طلبی کی پکار کو سن کر ہر طرف سے مسلمانوں کا ایک مرکز کی طرف دوڑنا وہی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے جو فوج کی ہوتی ہے، فوجی سپاہی جہاں جہاں بھی ہوں بگل کی آواز سنتے ہی سمجھ لیتے

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ صد ۱۹۲

ہیں کہ ہمارا کمانڈر ہمیں بلا رہا ہے۔ اس طلبی پر سب کے دل میں ایک ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے، یعنی کمانڈر کے حکم کی پیروی کا خیال، اور اس خیال کے آتے ہی سب ایک ہی کام کرتے ہیں یعنی اپنے اپنے کام چھوڑ کر اٹھنا ہر طرف سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جاتا" ر۱)

مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں جب اذان کی آواز سنیں تو اسے دہرائیں اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ جس حقیقت اور جس سعادت کا اعلان موذن کرتا ہے اس عمل میں دوسرے مسلمان بھی برابر شریک ہوں، اور اپنے حاکم و مالک کی کبریائی کا انہیں ہر وقت احساس رہے۔ اذان کی یہ حکمت ان ہی لوگوں کی سمجھ میں آسکتی ہے جن کا تصور مذہب خود ساختہ اور مبہم نہ ہو بلکہ واضح اور معتبر ہو

مساجد کا روحانی کردار

مساجد کا سب سے پہلا کردار روحانی حقیقت کا فروغ اور ایمانی طاقت کا پیدا کرنا ہے۔ یہاں ٹھہر کر آپ دنیا کے تمام معابد کی تاریخ کا جائزہ لیجئے یا چشم بینا ان "مقدس مقامات" کی زیارت کریجئے۔ کم وبیش تمام معابد کو ہوس ناکیوں، بدکاریوں، اور غیر اخلاقی حرکتوں کی جگہ پائیں گے۔ بہت سے مذاہب تو وہ ہیں جو اپنے معابد میں غیر اخلاقی حرکتوں کو نہ صرف برداشت کرتے ہیں بلکہ خود اس کی ترغیب فراہم کرتے ہیں۔ تاکہ اس مذہب کے لیے وہ کشش پیدا کرسکیں۔ اور یہ اخلاق باختگی مذہبی نظام کے فروغ اور اشاعت کا ذریعہ ثابت ہو (۲) دوسرے بعض مذاہب اگرچہ اس دردناک صورتحال سے دوچار نہیں ہیں لیکن جو طریقہ کار وہاں اپنایا گیا ہے وہ عریانیت اور جنسی امراض کو فروغ دینے میں کچھ کم رول نہیں ادا کرتا۔ اس کے برخلاف آپ مساجد کی طرف آیئے اسلام کے یہ عبادت خانے دیگر معابد سے قطعی مختلف اور ممتاز ملیں گے۔ ان کا ماحول انتہائی پاکیزہ اور روح پرور ملے گا۔ ان کا پہلا اصول یہ ہے کہ یہاں کی نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روکنے کا ذریعہ ہے۔ ارشاد ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (العنکبوت، ۴۵) بے شک نماز بے حیائیوں اور بری باتوں سے روکتی ہے۔ اسلام سے پہلے خانہ کعبہ کے اندر مرد و عورت عریاں طواف کیا کرتے تھے، اور اسے عبادت سمجھتے تھے (۳) اسلام نے اس حرکت پر بالکلیہ پابندی عائد کردی (۴) اس کردار کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ دیگر مذاہب میں چند مخصوص لوگ جو پنڈت، بھکشو، گرو، احبار اور پوپ یا دیگر ناموں سے جانے جاتے ہیں ان معابد کے

---

(۱) اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر ص ۱۵ (۲) ملاحظہ ہو سید قطب شہید رح کی کتاب "الاسلام ومشکلات الحضارۃ" (۳) ابن ہشام سیرت النبیؐ ۱/۲۲۰ (۴) تفسیر ابن کثیر ۱/۱۵۶

محافظ ہوتے ہیں۔ ان کے ہی ذمہ ان معابد کی نگرانی ہوتی ہے اور علاوہ ہی فریضہ عبادت انجام دیتے ہیں عام لوگ ان معابد کا رخ یا تو اس وقت کرتے ہیں جب ان کو کوئی ضرورت یا عارضہ پیش آتا ہے یا جب وہ دنیوی کاموں سے فارغ ہو جاتے ہیں اور یہ ان کی زندگی کا پرائیوٹ معاملہ ہوتا ہے۔ مگر اسلام کے مطالبات کے تحت پنج وقتی نماز کی باجماعت ادائیگی کے علاوہ مسلمانوں کے جملہ اوقات بھی مسجد کے نظام سے منضبط ہوتے ہیں اور ان کی مشغول ترین زندگی بھی اسی نظام کی پابند ہوتی ہے ارشاد باری ہے۔

فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ ۝ رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَوٰةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَوٰةِ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ ۝ (نور : ۳۶-۳۷)

اللہ کے نور سے ہدایت پانے والے) ان گھروں میں پائے جاتے ہیں جنہیں بلند کرنے کا اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے اذن دیا ہے۔ ان میں سے ایسے لوگ صبح وشام اس کی تسبیح کرتے ہیں جنھیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد اور اقامت نماز سے غافل نہیں کرتی۔

مسلمانوں میں کوئی گروہ ایسا نہیں مسجد سے جس کا تعلق زیادہ ہے اور دوسرے کا اس سے کم مسلمانوں کا پانچ مرتبہ مسجد میں حاضر ہونا اور نماز باجماعت کا اہتمام کرنا ہی دینی اور قومی شعار ہے[۱] اور وہ اسی وقت سایہ خداوندی کے حق دار ہوتے ہیں جبکہ قلبہٗ معلق بالمساجد[۲] کی شان اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں۔

مسجد کی ایک نمایاں شان یہ ہے کہ وہ اطمینان قلب اور دل کے سکون کی بہترین جگہ ہوتی ہے سکون قلب حاصل کرنے کے لیے آج کا انسان بہت کچھ کرتا ہے، بہت سے مقامات کی زیارت کرتا ہے ڈھیر سارا روپیہ صرف کرتا ہے مگر سکون قلب میسر نہیں ہوتا۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کی یاد سے اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (الرعد ۲۸) خدا کی یاد یوں تو ہمہ وقتی چیز ہے لیکن اس کی ایک متعین اور اعلیٰ شکل بھی ہے اور وہ نماز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

أَقِمِ الصَّلَوٰةَ لِذِكْرِي (طٰہٰ : ۱۴)   میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔

---

[۱] ابن قیم الجوزی، کتاب الصلوٰۃ [۲] بخاری و مسلم

ظاہر ہے کہ اقامت صلوٰۃ مسجد میں ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ سکون قلب اگر کہیں حاصل ہو سکتا تو وہ مسجد ہے، اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کو ریاض الجنۃ، یعنی جنت کی کیاریاں قرار دیا ہے[1] ایک موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ

احب البلاد الی اللہ مساجدھا و ابغض البلاد الی اللہ اسواقھا[2]

اللہ کے نزدیک دنیا کی بدترین جگہ بازار ہے اور پسندیدہ جگہ مسجد ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا ہے کہ وہ مسجد میں یکسو ہو کر اللہ کو یاد کریں اور دنیا کی یاد سے اپنے دل کو فارغ کر لیں، ارشاد ہے

وَاَقِیْمُوْا وُجُوْھَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ۥ (الاعراف ۲۹)

اور ہر مسجد کے پاس اپنا رخ اسی کی طرف کرو اور اسی کو پکارو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے

مساجد کا ثقافتی کردار

مساجد کا ایک قابل ذکر پہلو ان کا ثقافتی کردار ہے، اسلامی ثقافت یوں تو پوری زندگی سے وابستہ ہے اور مکمل زندگی کا آئینہ ہے لیکن اس کا بنیادی تعلق ان علوم سے ہے جو اسلام کے ساتھ وجود میں آئے ہیں، ان علوم کی اشاعت کے لیے بعد کے ادوار میں وسیع پیمانہ پر مدارس کا قیام عمل میں آیا، لائبریریاں بنائی گئیں، اور اکیڈمیاں وجود میں آئیں۔ مگر صدر اسلام میں ان تمام اداروں کا کام مساجد ہی سے لیا جاتا تھا بلکہ آج بھی ان کا یہ کردار بہت سے مقامات پر باقی ہے، قدیم مساجد کے ساتھ بالعموم مدرسے ہوتے ہیں جہاں قرآن و حدیث کی تعلیم دی جاتی ہے، بہت سی مسجدوں میں کتب خانوں کا اہتمام ہے اس کے علاوہ قرآن کریم، مجموعہ حدیث اور کچھ دینی کتابیں ضرور ہوتی ہیں۔ اسلام کا پہلا مدرسہ مسجد نبویؐ ہے جہاں صحابہ کرامؓ کی باضابطہ تعلیم و تربیت ہوتی تھی، اور مذاکرہ و مباحثہ ہوتا تھا، وہیں وہ چبوترہ بھی تھا جو صفہ کے نام سے مشہور ہے وہاں سے معلمین اور مبلغین مختلف مقامات پر علم دین اور مبادیات اسلام کی تعلیم و اشاعت کے لیے بھیجے جاتے تھے، ایک مرتبہ مسجد نبویؐ میں متعلمین اور ذاکرین کے دو حلقے مصروف عمل تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ذاکرین کے حلقے سے گذرے

---

[1] ترمذی، کتاب الدعوات [2] مسلم بحوالہ مشکوٰۃ

تو آپ نے ان کی ہمت افزائی کی لیکن خود متعلمین کے حلقے میں یہ کہکر تشریف فرماہوئے کہ "بعثت معلما" یعنی میں معلم بناکر بھیجا گیا ہوں[۱]۔ مسجد میں وحی الہٰی کی کتابت بھی انجام پاتی تھی۔ مسجد کا استعمال علم دین ہی کے لیے نہیں بلکہ سنجیدہ اور پاکیزہ شعروشاعری کے لیے بھی ہوتا تھا۔ حسان بن ثابتؓ کے لیے خود نبی اکرمؐ نے ممبر فراہم کیا تھا[۲] اور فرمایا تھا حسان تمہارے اشعار مشرکوں کو تیر کی طرح لگتے ہیں۔ اور حضرت عمرؓ نے مسجد کے جنوبی حصہ میں ایک کشادہ صحن صاف کرادیا تھا جس کا نام بطیحا رکھا اور فرمایا جس کو بیت بازی کرنی ہو وہ اس صحن میں بیٹھ جایا کرے[۳]

مساجد کا سماجی کردار: ان مساجد کا سب سے اہم پہلو ان کا سماجی کردار ہے۔ سماجی زندگی پر ان کی اثر اندازی کو سمجھنے کے لیے قرن اول کی مسجد نبویؐ کا ہی مطالعہ کیجئے، وہاں آپ دیکھیں گے کہ اوقات نماز کے علاوہ مسجد کا ایک گوشہ اگر ذاکرین اور متعلمین کے لیے خالی ہے تو دوسرا گوشہ سماجی اور معاشرتی امور کی انجام دہی کے لیے موجود ہے[۴] وہاں مریضوں کے لیے خیمہ بھی نصب ہے[۵] اور محتاجوں اور ضرورت مندوں کے لیے مال اور سامان زندگی کی تقسیم بھی عمل میں آرہی ہے[۶] نکاح کی مبارک اور پرمسرت مجلس بھی منعقد ہورہی ہے[۷] اور طلاق و لعان کے فیصلے بھی صادر کیے جارہے ہیں[۸] روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل اور معاملات پر غور و خوض بھی ہورہا ہے اور دیگر امور کے لیے مشورے لیے جارہے ہیں، وہاں دعوت طعام بھی دی جارہی ہے اور قبول کی جارہی ہے، امانتیں بھی رکھی جارہی ہیں[۹] اور مسجد کی عزت اور احترام کے پورے جذبات کے ساتھ خورد و نوش کے انتظامات بھی ہورہے ہیں[۱۰]۔ گویا یہ مسجد معاشرتی زندگی کے کلی اور جزدی سارے معاملات کے ساتھ ایک تعلق رکھتی ہے اور ان کو رُخ دینے میں اپنا رول ادا کرتی ہے، مساجد کے اس کردار نے اسلامی سماج میں ایک ایسی روح پھونک دی ہے کہ زندگی کا ہر مسئلہ اپنے حل کے لیے مسجد کی طرف رخ کرنے کی دعوت دیتا ہے، اور سماجی زندگی کو دینی زندگی سے الگ کرکے دو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھے جانے کی نفی کرتا ہے، اور چونکہ مسجدیں مسلمانوں کی ہر آبادی اور تقریباً ہر محلہ میں پائی جاتی ہیں

---

[۱] بخاری، باب الحلق والجلوس فی المسجد [۲] ترمذی ابواب الادب [۳] شاہ ولی اللہ، فقہ عمر، باب المساجد [۴] بخاری، باب القسمۃ و تعلیق القنو [۵] ایضاً، الخیمۃ فی المسجد للمرضی، [۶] ایضاً باب القسمۃ [۷] ایضاً کتاب الصلوۃ [۸] ایضاً باب القضا واللعان فی المسجد [۹] ابن ماجہ، کتاب المساجد [۱۰] ایضاً باب الاکل فی المسجد

اس لیے وہ مسلم سوسائٹی کے لیے مرکز اعصاب (Nerve Centre) کا مقام رکھتی ہیں۔

مساجد کا سیاسی کردار

اور اب ذرا مسجد کے سیاسی کردار کا بھی مطالعہ کر لیجئے، دیندار مسلمانوں کے لیے سیاست ایک گویا شجر ممنوعہ بن گئی ہے کیونکہ سیاست کا استعمال جن مقاصد کے لیے ہوتا ہے اور جو طریقہ اپنایا جاتا ہے، اس کی گندگی ظاہر ہے کوئی دیندار برداشت نہیں کرسکتا، آج کی سیاست بدنام زمانہ میکیاویلی کے اخلاق اور انسانیت سوز نظریات پر مبنی ہے۔ مگر اسلام جس نظام زندگی کے نفاذ کا داعی ہے خود اس کے اندر سے ایک سیاست رونما ہوتی ہے جس کی بنیاد اللہ کی حاکمیت طاغوت سے برأت اور مخلوق کی کفالت ہے۔ اس سیاست کی فکری بنیاد قرآن فراہم کرتا ہے اس کی عملی تشکیل سرورِ عالم کے افعال اور اقوال سے ہوتی ہے اور مسجدیں اس میں موثر کردار ادا کرتی ہیں۔ مسجد نبوی ہی کو دیکھئے وہاں ایک طرف مجاہدین اسلام جنگی مشقیں یعنی فوجی پریڈ کر رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اس کا مشاہدہ فرماتے ہیں[۱] اور دوسری طرف جنگی قیدیوں کو وہاں لاکر باندھا بھی جاتا ہے[۲] وہاں سے میدان جنگ پر جانے والوں کو ہدایات بھی دی جاتی ہیں اور حاکموں اور عاملوں کے نام فرامین بھی جاری ہوتے ہیں اور غنائم کی تقسیم اور احتساب کا عمل بھی جاری ہے[۳] اب دوسرے پہلو سے دیکھئے مسجد کو محراب بھی کہا جاتا ہے۔ محراب اصلاً اس قوس نما سائبان کا نام ہے جہاں امام فریضۂ امامت انجام دیتا ہے۔ محراب حرب کا اسم آلہ ہے یہ لفظی اشتراک معنوی اشتراک کی طرف اشارہ کرتا ہے جو حرب اور محراب یعنی مسجد اور جنگ میں ہے۔ یعنی مسجد کا ایک رُخ انقیاد اور سجدہ ریزی کا ہے تو دوسرا پہلو طاغوت کے ساتھ جنگ اور ظالموں سے مقابلہ آرائی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث اس اشتراک کو اور واضح کرتی ہے۔

لیس بشیئ احب الی اللہ من قطرتین قطرۃ دموع من خشیۃ اللہ وقطرۃ دم تھراق فی سبیل اللہ[۴]	اللہ کو ان دو قطروں سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں ہے ایک قطرۂ آنسو جس کی وجہ اللہ کی خشیت ہے اور دوسرا قطرہ خون جو اللہ کی راہ میں بہایا جائے۔

---

[۱] بخاری، باب اصحاب الحراب فی المسجد [۲] ایضاً باب دخول المشرک فی المسجد [۳] ایضاً باب القسمۃ

[۴] ترمذی، فضائل جہاد

پھر نماز کا ایک اہم اصول صف بندی ہے جو نماز کا ایک حصہ ہے[1]۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حکمت یہ بتائی ہے کہ اس سے دل سیدھے رہتے ہیں اور صف میں کجی دلوں میں پھوٹ پیدا کر دیتی ہے۔ استووا ولا تختلفوا فتختلف قلوبکم[2] اور ٹھیک یہی اصول میدان جنگ میں بھی مطلوب ہے گویا یہ ایک سبق ہے جو صلوٰۃ مسجد اور محاذِ جنگ دونوں میں مشترک ہے قرآن کہتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ (الصف۔ ۴)

اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ لڑتے ہیں گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

وكانت مواضع الائمة ومجامع الامة هي المساجد فان النبي صلى الله عليه وسلم اسس مسجده المبارك على التقوى ففيه الصلوة والقرأة والذكر وتعليم العلم والخطب وفيه السياسة وعقد الولاية والديات وتأمير الامرا وتعريف العرفا وفيه يجتمع المسلمون عنده لما اهمهم من امر دينهم ودنياهم[3]

امت کا مجمع اور ائمہ کی جگہیں مساجد ہی تھیں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد مبارک کی بنا تقویٰ پر اٹھائی تھی، اس میں نماز، قرأت، ذکر، تعلیم اور خطبے ہوتے تھے اور اسی میں سیاست، عہدوں کی تقرری، قصاص و دیت کے فیصلے بھی ہوتے تھے، امرا اور عرفا کا تقرر بھی ہوتا تھا اور اسی میں مسلمان اپنے دینی اور دنیوی معاملات کے لیے اکٹھا بھی ہوتے تھے۔

مختصر یہ ہے کہ مسجد ایک ایسا مرکز ہے جو تمام شعبہائے زندگی کو کنٹرول کرتا ہے۔

انسانی زندگی پر مساجد کے اثرات

مساجد کی شان اور عظمت ان کے مادی وجود اور ہمہ جہت کرداروں کے علاوہ ان اثرات سے بھی آشکارا ہوتی ہے جو انسانی زندگی پر پڑتے ہیں۔ سب سے پہلا اثر جو انسانی زندگی پر یہ مسجدیں ڈالتی ہیں وہ اجتماعیت کا جذبہ اور احساس ہے۔ مسجد کا قیام اسی لیے عمل میں آتا ہے کہ اس

[1] مسلم کتاب الصلوۃ [2] ایضاً [3] بحوالہ دعوۃ الحق، رباط جولائی ۱۹۸۳ء احیار رسالۃ المسجد

میں نماز با جماعت ادا کی جائے فرض نمازوں کا مزاج بھی یہی ہے کہ وہ جماعت کے ساتھ ادا کی جائیں، اسی لیے قرآن و حدیث میں صرف نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ "اقامت صلوٰۃ" کا حکم دیا گیا ہے اور اقامت کا مفہوم جماعت ہے چنانچہ فضیلت کے اعتبار سے جماعت کی نماز انفرادی نماز سے ۲۷ گنا زیادہ ثواب کا باعث ہے[1]۔ مقبولیت کے لحاظ سے جماعت ترک کرنے والوں کی نماز بغیر عذر شرعی کے معتبر نہیں اگرچہ فرضیت ساقط ہو جاتی ہے[2]۔ عمومی حیثیت سے دیکھیے تو مسجد میں آنے والے جب پانچوں وقت ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ان کے تعلقات میں غیر شعوری طور پر اضافہ ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے حالات سے باخبر ہوتے ہیں، باہم جڑتے ہیں اور ان میں آپس میں مدد اور خیر خواہی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر کوئی جماعت سے غیر حاضر ہو تو اس کے متعلق کسی بیماری یا کسی عارضہ کا شبہ پیدا ہوتا ہے پھر یہ تشویش غم گساری اور باہمی تعاون کے جذبہ کو مہمیز فراہم کرتی ہے۔ نیز جماعت کا ایک اصول یہ ہے کہ وہ بغیر امام کے معتبر نہیں اور امامت کا معیار یہ ہے کہ امام علم و فہم اور تقویٰ میں ممتاز ہو جماعت کا یہ اصول عمومی زندگی کے انضباط اور ارتباط کا مطالبہ کرتا ہے اور ایک متحدہ جماعتی زندگی گذارنے کا محرک بن جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ	اور نماز قائم کرو اُن مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ
الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ	جنھوں نے اپنا اپنا دین الگ بنا لیا ہے اور گروہوں
وَكَانُوْا شِيَعًا (الروم: ۳۲)	میں بٹ گئے ہیں۔

پانچ نمازوں کے علاوہ ایک نماز جمعہ بھی ہے، یہ ہفتہ کی عید ہے، اسی لیے کسی بڑی مسجد میں ادا کی جاتی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہر چھوٹی اجتماعیت بڑی اجتماعیت کا حصہ اور اس سے ہم رشتہ ہوتی ہے، اس کا ایک پہلو خطبہ ہے، اس میں دین کے احکام، حالات حاضرہ میں مسلمانوں کی ذمہ داریاں، کرنے کا کام اور مسائل و مشکلات پر قرآن و سنت سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔ گویا یہ نماز اجتماعی زندگی کو مستقیم نہج عطا کرتی ہے۔ مساجد کے اس اثر کو محفوظ کرنے کے لیے حضور اکرمؐ نے منافقین کی بنائی ہوئی "مسجد ضرار" کو منہدم کروا دیا، اس کی وجہ ابن عربی مالکی یہ بتاتے ہیں:

---

[1] مسلم، کتاب الصلوٰۃ [2] ایضاً

انھم کانوا جماعۃ واحدۃ فی مسجد واحد فارادوا ان یفرقوا شملھم فی الطاعۃ وینفردوا عنھم للکفر والمعصیۃ وھذا یدلک علی ان المقصد الاکثر والغرض الاظھر من وضع الجماعۃ تالیف القلوب والکلمۃ علی الطاعۃ وعقد الذمام والحرمۃ بفعل الدیانۃ حتی یقع الانس بالمخالطۃ وتصفو القلوب من وضر الاحقاد والحسائد[1]

سارے مسلمان ایک جماعت تھے اور ایک مسجد کے مصلی تھے منافقین نے چاہا کہ طاعت میں ان کا شیرازہ منتشر کر دیں اور ان سے علیحدہ رہ کر کفر و معصیت کو فروغ دیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدائی نظم جماعت کا مقصد یہ ہے کہ دلوں میں ارتباط، طاعت میں یک رنگی اور شیرازہ بندی قائم رہے تاکہ باہم انسیت اور محبت پیدا ہو اور کینہ و کپٹ اور نفرت سے دل پاک رہیں ۔

ان نمازوں کے علاوہ اجتماعیت کا بڑا سرچشمہ حج ہے جو روئے زمین کی پہلی مسجد میں ادا کیا جاتا ہے ہر صاحب ثروت پر فرض ہے کہ وہ زندگی میں ایک بار تو لازماً اس فریضہ کو انجام دے حج ان تمام اجتماعوں کا اجماع ہے، اس کا سررشتہ اللہ کے ساتھ والہانہ لگاؤ اور اس کی مرضی پر قربان ہونا یعنی بے خودی کی محویت ہے اور آخری سرا اسلامی اجتماعیت ہے گویا حج عظیم اسلامی عالمی کانفرنس ہے جو روئے زمین کے تمام مسلمانوں کو مخاطب کرتی ہے۔ اسلام کا پیغام پہونچاتی ہے اور ان کے اندر حوصلہ، قربانی، قناعت اور انابت کی روح پھونکتی ہے۔

مساجد کا دوسرا نمایاں اثر ان کے پیغام مساوات اور درس اخوت سے ظہور میں آتا ہے، روئے زمین پر ان گنت قسم کے انسان بستے ہیں۔ امیر و غریب بھی عالم و جاہل بھی، شہری و دیہاتی بھی، عقلمند و کم عقل بھی اور رنگ و نسل کے لحاظ سے مختلف بھی، ان میں اختلاف عارضی نوعیت کا ہے اور اتحاد اصولی نوعیت کا، مگر اس کو کیا کیجئے کہ عارضی شے ہمیشہ اصلی چیز پر غالب آتی رہی ہے اور انسان اور انسان میں تفریق و امتیاز کا باعث بنتی رہی ہے۔ یہ صرف اسلام ہی کا نہیں بلکہ روح انسانیت کا بھی تقاضا ہے کہ کوئی جگہ ایسی ہو جہاں انسانوں کے یہ مختلف طبقے ایک بن جانے کا سبق سیکھیں، وہاں وہ نظام جسم کی طرح ایک نظر آئیں، ایک ہی طرح سوچیں اور عمل کریں، اور

---

[1] احکام القرآن اول ص ۱۲۱

ایک ہی سوز کے سب دردمند بن جائیں۔ مساجد ایسا ہی پلیٹ فارم ہیں جہاں سب لوگ جمع ہو کر مساوات اور اخوت کے عمل کو فروغ دیتے ہیں۔ عالم جاہل سے قدم ملا کر کھڑا ہوتا ہے، امیر غریب سے مل کر کھڑا ہوتا ہے۔ قیام سجود بھی ایک ساتھ اور حرکات و سکنات بھی ایک ساتھ ہوتے ہیں، یہاں تک دست دعا بھی ایک ہی ساتھ اٹھائے جاتے ہیں۔ یہاں امیر کو اپنی دولت کا زعم نہیں رہتا، غریب کو اپنی غربت کا احساس نہیں ستاتا، شہری اپنے اطوار پر نازاں نہیں ہوتا اور دیہاتی اپنی ہیئت پر شرمندہ نہیں ہوتا، اور منظر یہ ہوتا ہے کہ؛

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز ۔۔۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے ۔۔۔ تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

مساجد کا ایک اہم اثر انسانی زندگی پر طہارت اور نفاست بھی ہے۔ اسلام نے نماز کی قبولیت کی شرط طہارت کو قرار دیا ہے[1] اور اسے نصف ایمان بتایا ہے[2] ناپاک جسم اور ناپاک کپڑے نماز کو قبولیت سے محروم کر دیتے ہیں اس پاکی کے علاوہ ہر جمعہ کو غسل کرنا ضروری ہے[3] اور ہر نماز کے لیے وضو کرنا لازمی ہے (المائدہ) اگر ایک شخص روزانہ پانچ مرتبہ اپنے جسم و لباس کی طہارت پر نظر کرے تو ظاہر ہے پاکی اور صفائی کے معاملہ میں دنیا کی ہر قوم سے وہ ممتاز ہوگا۔ اور اس ہدایت کے ساتھ زندگی گذارنے والے ایک پاکیزہ زندگی کے حامل ہوں گے۔ مسجد کا ماحول پاکیزہ رکھنے کی خاطر وہاں جنبی اور حائضہ کا داخلہ جائز نہیں[4] اس کی فضا اس قدر نازک ہے کہ لہسن اور پیاز کی بو تک قابل برداشت نہیں (۵) مسجد کی اس پاکیزہ فضا کو برقرار رکھنے اور پاکیزہ تر بنانے کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت زیادہ تاکید فرمائی ہے (۶)، قرآن نے مسجد قبا کے نمازیوں کی خوبی بیان کرتے ہوئے کہا ہے۔

فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ (التوبہ۔ ۱۰۸)

اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں

یہ مسجد صرف پاکی اور صفائی ہی کا مطالبہ نہیں کرتی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر زیب و زینت چاہتی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف: ۳۱)

اے بنی آدم ہر مسجد کے وقت اپنی زینت سے آراستہ رہو۔

---

[1] ترمذی کتاب الطہارہ [2] طبرانی معجم [3] بخاری کتاب الجمعہ [4] ایضاً کتاب الصلوۃ [5] ایضاً [6] ابن ماجہ ابواب المساجد

صحیح معنوں میں مہذب وہی لوگ کہلائیں گے جن پر یہ پاکیزہ اثرات ہوں گے۔ اور یہ مسجد سے گہری وابستگی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ مختصر یہ ہے کہ مسجد ایک ایسی تربیت گاہ ہے جہاں انسان کی روحانی، اخلاقی ثقافتی اور ہمہ جہتی تربیت ہوتی ہے۔ پھر وہ اس قابل ہوتا ہے کہ اسلام کا مطلوب انسان کامل بن سکے۔

مگر افسوس یہ ہے کہ اسلام میں مساجد کو جو مقام حاصل ہے اور انسانی معاشرہ میں جس مرکزیت کی وہ حامل ہے مسلمانوں کی غفلت کی وجہ سے وہ متاثر ہو رہی ہے۔ مسجد کی روح تو دراصل نماز ہے اور اب ترک نماز فیشن ہو گیا ہے، اسلام اور کفر کے درمیان فرق نماز کی وجہ سے تھا مگر آج مسلمانوں اور کافروں کے درمیان امتیاز کی وجہ گوشت خوری اور ناموں کا اختلاف ہو گیا ہے۔ کبھی لمبا لمبا راستہ طے کر کے لوگ مسجد میں اس لیے حاضر ہوتے تھے کہ ان کو ہر قدم پر نیکی کے حاصل ہونے کا یقین ہوتا تھا مگر آج مسجد کے پہلو میں رہتے ہوئے بہت سے بدنصیب نماز ادا کرنے نہیں آتے۔ دن اور رات کے چوبیس گھنٹے کسی لہو و لعب میں گزار دینا ان کے لیے آسان ہے مگر ایک گھنٹہ خدا کے لیے مسجد میں گزارنا مشکل ہے۔ پھر جو لوگ نماز ادا کرنے کے لیے مسجد میں حاضر بھی ہوتے ہیں تو ان میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ جن کو صحیح معنوں میں نماز کا شعور نہیں، ان کی نمازیں بے حیائیوں اور بُرے کاموں سے ان کو روکتیں، مسجد کے باہر عمومی زندگی پر ان کی نمازوں کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ مسجد میں خدائے ذوالجلال کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں، اور مسجد کے باہر طاغوت کی پیروی کرتے ہیں، وہ مسجد میں اللہ سے مدد طلب کرتے ہیں اور مسجد سے نکل کر انسانی شیطانوں کی پناہ ڈھونڈتے ہیں، وہ مسجد میں اللہ کی رضا کے طلب گار ہوتے ہیں اور مسجد کے باہر حکمران وقت کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ وہ مسجد میں اپنے بھائیوں کے قدم سے قدم ملا کر کھڑے ہوتے ہیں اور مسجد سے باہر اپنے حقیر دنیوی مفادات کی خاطر ایذارسانی اور مردم آزاری کا ارتکاب کرتے ہیں۔ گویا جو تربیت پانچ وقتوں میں ان کو مسجد میں حاصل ہوتی ہے۔ مسجد سے نکل کر وہ اس کو فراموش کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے اس متضاد رویہ کو دیکھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیش گوئی یاد آتی ہے کہ:

یاتی علی الناس زمان لایبقی من الاسلام الا اسمہ ولا یبقی من القرآن الا رسمہ مساجدھم عامرۃ وھی خراب من الھدی[1]	لوگوں پر وہ وقت بھی آئے گا جب اسلام کا صرف نام رہ جائے گا اور قرآن کا صرف رسم الخط رہ جائے گا۔ مسجدیں آباد ہوں گی مگر ہدایت سے خالی ہوں گی۔

[1] سنن دارمی، مقدمہ

مسجد کے متولی: شاید اسی صورتحال کا مظہر ہے کہ آج مساجد کے متولی وہ لوگ بنائے جاتے ہیں جو زردار ہیں یا جاہ ومنصب والے ہیں خواہ ان کو مسجد میں آکر باجماعت نماز ادا کرنے کی فرصت ہی نہ ہو اور وہ نماز اور جماعت کی روح سے نا آشنا ہی کیوں نہ ہوں اس کا نتیجہ ہے دیگر دنیاوی اداروں کی طرح مسجد کی تولیت کے بارے میں بھی جھگڑے اور فساد ا مقدمہ بازی اور احکام رسی کے افسوس ناک واقعات سننے کو ملتے ہیں۔ حالانکہ مسجد کی امامت کی طرح تولیت کا حق بھی علمار اور صالحین کو پہنچتا ہے جو دین کے مزاج آشنا ہیں، جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہے اور جو امت کی رہنمائی کے مقام پر فائز ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مساجد کی تعمیر کا حق ان لوگوں کو دیا ہے۔ جو ایمان، عمل صالح اور خوف خدا کے حامل ہیں۔ اور ان کا انتظام بھی انہی کے ہاتھوں میں دیا ہے۔ ارشاد ہے،

إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ
وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ (التوبہ ۱۸)

اللہ کی مسجدوں کے آباد کار (خادم)، تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائیں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں

مساجد کو آثار قدیمہ نہیں قرار دیا جا سکتا،

عصر حاضر کا ایک بڑا فتنہ یہ ہے کہ بہت سے ممالک میں خاص طور سے اشتراکی ممالک میں اور ہندوستان میں بھی بعض مقامات پر آثار قدیمہ کے نام پر مسجدوں کو مقفل کر دیا گیا ہے۔ نوبت یہ ہے کہ وہ مسجدیں یا تو پورے طور پر ویرانی اور کس مپرسی کا شکار ہیں یا پھر وہاں صرف زائرین اور سیاحوں کو جانے کی اجازت ہے، نماز ادا کرنے اور ذکر و تلاوت کے لیے ٹھہرنے پر پابندی عائد ہے، حالانکہ مسجدیں صرف عبادت کے لیے ہیں اور عبادت ہی کے لیے ان کا استعمال کیا جانا چاہئے، ان کو کسی بھی صورت میں آثار قدیمہ کا حصہ بنایا نہیں جا سکتا۔ آثار محفوظ کے نام پر مسجدوں پر تالا لگانا اور مسلمانوں کو ان میں نماز ادا کرنے اور ذکر و تلاوت سے روکنا اتنا ہی بڑا ظلم ہے جتنا بڑا ظلم مسجدوں کو منہدم کرنا اور اس میں تخریب کاری کرنا ہے چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے،

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ
اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا
اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا
اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ

اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور ان کی ویرانی کے درپے ہو؟ ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ ان عبادت گاہوں میں قدم نہ رکھیں، اور

وَفِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (البقرة: ۱۱۴)
اگر وہاں جائیں بھی تو ڈرتے ہوئے جائیں ان کے لیے تو دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں عذابِ عظیم۔

مفسرین نے "وسعی فی خرابہا" کے مفہوم میں مسجد کے انہدام اور اس کے تعطل دونوں کو شامل کیا ہے [۱]
علامہ رشید رضا مصری لکھتے ہیں کہ

" ای هدمها او تعطیل شعائرها ومنع عبادة اللّٰه فیها " (۲)
یعنی مسجد کو منہدم کرنا یا اس کے شعائر کو معطل کرنا اور اس میں اللہ کی عبادت کرنے سے منع کرنا۔

مسجد کو آثار قدیمہ میں شامل کرنا اس میں نماز پڑھنے سے روکنا ہے اور یہ اس کے انہدام ہی کی ایک شکل ہے۔ اسے کسی بھی صورت میں گوارا نہیں کیا جا سکتا

مسجد سے دست بردار ہونے کی اجازت نہیں:

یہاں یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ ایسی مسجد جو کسی غصب کی ہوئی زمین پر نہ تعمیر کی گئی ہو، نہ وقتی اور عارضی ضرورت کے لیے بنائی گئی ہو اور نہ کسی فتنہ اور فریب کی خاطر بنائی گئی ہو بلکہ خلوص نیت کے ساتھ تقویٰ اور خدا ترسی کے جذبہ سے تعمیر کی گئی ہو وہ ہر حال میں مسجد ہے اور ہمیشہ مسجد ہی رہے گی اس میں صرف اللہ کا نام بلند ہوگا وہاں غیر اللہ کی پرستش کبھی قابل برداشت نہ ہو گی قرآن کا ارشاد ہے۔

وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (الجن: ۱۸)
مسجدیں اللہ کے لیے ہیں لہٰذا ان میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو

مسلمانوں کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ وہ اس سے دست بردار ہو جائیں اگر کوئی اس پر ظلماً قبضہ کر لے تو وہ اس پر خاموش ہو جائیں یا اس کے انہدام پر راضی ہو جائیں یا اس کے بدلہ میں کوئی دوسری جگہ یا عمارت قبول کر لیں۔ کیونکہ اللہ کا گھر نہ تو ویران ہو سکتا ہے نہ منہدم ہو سکتا ہے اور نہ اس کو تفریحی مقام یا بت کدہ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے [۳]

---

[۱] ملاحظہ ہو روح المعانی اول ص ۳۶۳ [۲] تفسیر المنار اول ص ۴۳۲ [۳] اس وقت ہندوستان میں ان مسجدوں کے علاوہ جو محکمہ آثار قدیمہ کے حوالہ کردی گئی ہیں بہت سی وہ مسجدیں بھی ہیں جو برادران وطن کے زیر قبضہ ہیں تازہ سب سے سنگین مسئلہ بابری مسجد کا ہے۔ جس کے سلسلے میں مسلمانوں کے اس سے دست بردار ہو جانے یا اسے آثار قدیمہ کے حوالے کر دینے وغیرہ کے مختلف مشورے دیئے جا رہے ہیں۔ لیکن اسلام میں مساجد کی اس حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس کی تفصیل اوپر گزری، مسلمانوں کے لیے ان میں سے کوئی صورت قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ مزید براں اگر یہ دروازہ ایک بار کھل گیا تو پھر وہ بند ہونے کا نام نہ لے گا۔

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی راہ میں دشواریاں*

سلطان احمد اصلاحی

محترم صدر مجلس اور حاضرین کرام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سب سے پہلے تو میں اس موقع پر اپنے اس احساس کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ ملت اسلامیہ ہند اپنی مشکلات اور مسائل کے باوجود علم وفن کی آبیاری اور اس کی ترویج واشاعت میں جو مثبت اور تعمیری کوشش انجام دے رہی ہے، مرکز فروغ سائنس (علی گڑھ) کے زیر اہتمام دینی مدارس اور سائنسی تعلیم کے موضوع پر منعقد ہونے والی یہ سہ روزہ کانفرنس بھی جس کا ایک اہم اور قابل قدر حصہ ہے، یہ کوششیں بڑی لائق قدر اور قابل ستائش ہیں۔ آج کی دنیا میں بجا طور پر علم کو طاقت کا سرچشمہ باور کیا جاتا ہے۔ اسلام جو آج سے چودہ سو سال پہلے زندگی سے دین ودنیا کی تفریق کو مٹا کر علم کے دائرے سے بھی اس تفریق کو ختم کر چکا ہے، اس کے نقطۂ نظر سے اگر رضائے الٰہی کا پاک محرک شامل ہو تو علم کی خدمت اور اس کے راستے کی ہر کاوش اور جد وجہد سے دنیا کی بھلائی اور کامیابی کے ساتھ آخرت کی ــــ زندگی میں بھی فوز وفلاح اور بہت کچھ سرخروئی کی امید کی جا سکتی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری ان کوششوں میں بیش از بیش اس بنیادی محرک کو شامل فرمائے۔ مسلمان اگر اس ملک کی ناگزیر اکائی ہیں تو ان کی فلاح وبہبود کی نسبت سے کی جانے والی کوششوں کا ایک رخ ملکی اور قومی بھی ہے۔ اس مجلس مذاکرہ کی اس نوعیت کو بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اپنے اس اولین احساس کے ساتھ سیمینار کے منتظمین کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے اس مجلس میں اظہار خیال کا موقع عنایت فرمایا۔

* یہ مقالہ مرکز فروغ سائنس، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے "دینی مدارس اور سائنسی تعلیم" کے موضوع پر منعقد کردہ سہ روزہ کانفرنس ۲۶-۲۸ مارچ ۱۹۹۵ء میں اس کی پہلی نشست میں پڑھا گیا۔

محترم حضرات ! ہندوستان میں عربی مدارس کے اندر سائنس کی تعلیم اور اس سے متعلقہ مسائل مدارس کے نصاب تعلیم کی اصلاح اور ان پر نظر ثانی اور مدارس عربیہ کو ایک مرکزی نظام سے جوڑنے وغیرہ جیسے مسائل سے بہت آگے کی بات ہے جواب تک عام طور پر مدارس کی نسبت سے ملت کے اہل نظر کے غور و فکر کے محور ہیں۔ ابھی جبکہ ملت اسلامیہ ہندان مسائل سے بھی فارغ نہیں ہو سکی تھی کہ آج کی مجلس میں ہمیں مدارس کے اندر سائنسی تعلیم کے نئے اور کسی قدر اچانک مسئلہ پر غور و فکر کرنا ہے۔ محترم حضرات ! اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کسی بھی نئی تجویز و تحریک کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے، اور اسی صورت میں شاید اسے تجویز و ترمیم کا نام بھی دیا جاسکے گا ورنہ وہ تو تبدیلی اور تنسیخ ہوگی، کہ وہ متعلقہ ادارے کی بنیاد، اس کے مزاج اور اس کے پیش نظر مقاصد کو ادنیٰ درجہ میں بھی مجروح کئے بغیر، ان مقاصد کو زیادہ بہتر طریقے پر بروئے کار لانے میں معاون اور مددگار ہو سکے۔ عربی مدارس کے اندر سائنسی تعلیم کی اس نئی تجویز و تحریک کی معقولیت و افادیت بھی اسی صورت میں ظاہر ہو سکے گی جبکہ واضح ہو سکے کہ ہندوستان میں عربی مدارس کے قیام کی بنیادی غرض و غایت اور ان کے پیش نظر مقاصد سے یہ تجویز و تحریک کس قدر ہم آہنگ ہے۔ اس کے لیے ہمیں ہندوستان مدارس عربیہ کے قیام کے پس منظر پر ایک نظر ڈالنی ضروری ہے۔

ہندوستان میں مدارس عربیہ کے قیام کا پس منظر :

محترم حاضرین ! ہندوستان میں مدارس عربیہ کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس لیے ہم اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان کے تین بڑے مدارس، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنو اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کے پس منظر میں اپنی گفتگو کو مرکوز رکھیں گے۔ لیکن ان کے پس منظر کو بھی سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستان میں فی الجملہ مدارس کے نظام کا پس منظر پیش نظر رہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ ہندوستان میں انگریزی عملداری سے پہلے دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان، گجرات، جون پور، لکھنؤ، خیرآباد، پٹنہ، اسی طرح مدارس اور بنگال وغیرہ کے بہت سے مقامات علم و فن کا مرکز تھے۔ اور وہاں مسلمانوں کے بڑے بڑے مدارس قائم تھے۔ جنھیں مسلمانوں نے چھ سو سال سے اپنے خون جگر سے سینچا تھا۔ اور ان کے سلاطین اور امراء نے ان کے پھیلے ہوئے اخراجات اور ضروریات کے لیے بڑی بڑی جائدادیں اور اوقاف مقرر کئے تھے[1]۔ ان مدارس میں جو نصاب تعلیم جاری تھا

[1] سید محبوب رضوی : تاریخ دیوبند/۲۰۵۔ شائع کردہ، علمی مرکز دیوبند طبع دوم ۱۹۷۲ء

وہ مسلمانوں کی دینی و دنیوی دونوں قسم کی ضروریات کے لیے خود کفیل تھا۔ جس میں دینی علوم تفسیر و حدیث اور فقہ و کلام کے شانہ بہ شانہ اس وقت کی ضرورت کے دنیوی علوم ریاضی، منطق، فلسفہ ہیئت اور فارسی ادب وغیرہ بھی چیزیں شامل تھیں۔ ان مدارس میں تعلیم پانے والے لوگ اپنے ذوق اور ضرورت کے مطابق دینی یا دنیوی راہوں میں سے جس کا چاہتے تھے انتخاب کر لیتے تھے۔ وہ مسند دعوت و ارشاد اور منصب افتاء پر بھی فائز ہوئے تھے اور ایوان حکومت کی زینت بھی یہی لوگ بنتے تھے۔ انگریزی حکومت کے آغاز تک یہی صورت قائم رہی۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے نصف تک بے شمار علماء اعلیٰ سرکاری منصبوں پر ہمیں فائز دکھائی دیتے ہیں۔[1] ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان پر علا اپنا تسلط قائم کر لینے کے بعد انگریزوں نے متعین مقاصد کے تحت منصوبہ بند طریقے پر قدیمی مدارس کے اس نظام کو تہ و بالا کیا اور بالواسطہ اور بلاواسطہ ایسی صورتیں اختیار کی گئیں جن سے خاص طور پر مسلمانوں کے خالص دینی علوم روزافزوں اضمحلال کا شکار ہو گئے۔ مشرقی زبانوں کی جگہ انگریزی ملک کی سرکاری زبان قرار پائی۔ اور حکومت کی سرپرستی میں قدیم مدارس کی جگہ نئے کالجوں اور نئے مدرسوں کو فروغ ملا۔ جن میں یورپ سے درآمد کردہ جدید علوم کو بالادست پوزیشن حاصل ہو گئی۔ اسی اثناء میں یورپ صنعتی انقلاب سے آشنا ہو چکا تھا۔ چنانچہ فلسفہ اور سیاست و سماجیات کے علاوہ خالص سائنسی علوم اپنے پورے تہذیبی پس منظر کے ساتھ نئے نظام تعلیم کا لازمی جز قرار پائے۔ یہ حالات چل ہی رہے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے آخری طور پر مسلمانوں کی قسمت پر ہتھوڑا چلا دیا۔ جس میں مسلمانوں کی نام نہاد حکومت کے خاتمہ کے ساتھ انگریز اور انگریزی تہذیب نے اپنے پنجے اور بھی مضبوط گاڑ لیے اور سیاسی شکست کے ساتھ مسلمانوں کی ذہنی و فکری شکست بھی اپنی آخری حدود کو چھونے لگی۔ انگریز جنھوں نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا اور جو اصلاً انھیں کو اپنا حریف سمجھتے تھے، انھوں نے ان کو علمی اور تہذیبی طور پر نہتا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ جس کی اس سے کارگر کوئی صورت نہ تھی کہ مسلمانوں کو قرآن و حدیث اور ان سے متعلقہ علوم سے دوری اور محرومی کی کھڈ میں گرا دیا جائے۔ اور ان کو ان کے اصل سرچشمہ قوت سے بے بہرہ کر دیا جائے۔ یہی کچھ حالات تھے جبکہ ۱۸۶۷ء میں قصبہ دیوبند میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ جو صحیح معنوں میں روایتی طرز کا کوئی مدرسہ نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر علمی و فکری تحریک کا عملی مظہر تھا جو دراصل ۱۸۵۷ء کی مسلمانوں کی ناکامیوں کی

---

[1] حوالہ سابق ۱/۳۴۱

ثانی کے لیے قائم کیا گیا تھا[۱] اور جس کے ذریعہ ہندوستان میں غدر کے بعد بقاء اسلام اور تحفظ کی صورتوں کا پیدا کرنا پیش نظر تھا[۲] ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے بعد مدارس دینیہ کے قیام کا یہی مخصوص پس منظر تھا۔ جس کے نظام میں پیدا ہو جانے والی بعض خامیوں اور کمزوریوں کی تلافی کے لیے آگے ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کا قیام عمل میں آیا۔

مدارس عربیہ اور سائنس: نئے ہندوستان میں مدارس عربیہ کے قیام کے اس مخصوص پس منظر کا تقاضا ہے کہ ان کا نصاب تعلیم معروف دینی علوم قرآن و حدیث اور ان کے متعلقات تک محدود نہ رہے۔ اس لیے کہ اغیار کے مقابلہ میں مسلمانوں کو باشوکت بنانے اور بنائے رکھنے کے لیے ناگزیر ہے کہ دین کے ساتھ دنیاوی طور پر بھی وہ پوری طرح مضبوط اور مستحکم ہوں۔ ظاہر ہے کہ نئے علوم اور نئی سائنس و ٹکنالوجی کے حصول کے بغیر اس کا تصور بھی کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ مدارس کے نظام کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ نظری طور پر فلسفہ جدیدہ اور سماجیات و اقتصادیات ہی نہیں خالص سائنسی علوم (PURE SCIENCES) کو بھی ان کے اندر سمونے کی پوری گنجائش موجود ہے۔ بلکہ جہاں تک دارالعلوم دیوبند کا سوال ہے وہ نظری سے آگے عملی طور پر اس کا تجربہ بھی کر چکا ہے۔ "طب" کا خالص سائنسی علم ہونا مسلم ہے۔ دارالعلوم کی ۱۲۹۵ھ کی روداد سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں "طب یونانی" کی تعلیم کا باقاعدہ نظم کیا گیا تھا۔ اور مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اول اس علم کی کتابیں پڑھاتے تھے"[۳] اس خالص سائنسی علم کو پورا وسعت دینا بھی پیش نظر تھا۔ چنانچہ اسی روداد میں آگے یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ:

" اس فن لطیف کے لیے ایک بڑا کتب خانہ کتب و بیاض ہائے معتبرہ حکمائے حاذق و اطبائے "کامل" نبض و "آلات عمدہ جراحی وغیرہ طبیب و جراح تجربہ کار کا واسطے سکھانے طریقہ طب و فن جراحی وغیرہ کے نہایت ضرور ہے"[۴] اس سے بھی آگے حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ "اپنے بعض مخصوص تلامذہ کو سائنس جدید کی کتابیں پڑھاتے تھے"۔ مزید براں آپ کا کہنا تھا کہ: "اب علماء کو قدیم فلسفہ و ہیئت کے ساتھ جدید فلسفہ و ہیئت کو بھی حاصل کرنا چاہیے"[۵] دوسرے ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ

---

[۱] مناظر احسن گیلانیؒ: سوانح قاسمی جلد دوم/۲۲۶۔ شائع شدہ: دارالعلوم دیوبند نیشنل پرنٹنگ پریس، دیوبند
[۲] سوانح قاسمی، حوالہ سابق/۲۲۳ [۳] حوالہ مذکور/۳۲۸۔ [۴] سوانح قاسمی دوم/۳۲۹
[۵] حوالہ سابق/۳۰۱

موصوف دینی نصوص کی توجیہ و تشریح میں بھی اپنی ان سائنسی معلومات سے فائدہ اٹھاتے تھے[1] جہاں تک ندوۃ العلما کا سوال ہے تو معلوم ہی ہے کہ وہ "الی الاسلام من جدید اور دین القدیم النافع والجدید الصالح" کا علمبردار ہے۔ ظاہر ہے کہ نئے دور میں سائنس و ٹکنالوجی کے بغیر اسلام کی خدمت کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ ندوۃ العلماء کے قیام کے جو اغراض و مقاصد بیان کیے گئے ہیں ان کے اندر صاف طور پر وہ دفعات موجود ہیں جن سے اس کے نصاب تعلیم کے لیے سائنس و ٹکنالوجی کی ضرورت کو آسانی کے ساتھ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ندوہ کے قیام سے مدارس عربیہ کے نظام کے جس خلا کو پُر کرنا پیش نظر تھا اس کی اولین دفعہ میں اس کمی کا اظہار کیا گیا تھا کہ: جو طلبہ علوم عربیہ سے فارغ ہوتے ہیں وہ "امور انتظامی دنیا اور معیشت" سے محض ناواقف رہتے ہیں[2] کون نہیں کہے گا کہ "امور انتظامی دنیا اور معیشت" سے ناواقفیت کی کمی کو فی زمانا سائنس و ٹکنالوجی کے بغیر پورا کیا جا سکتا ہے۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کے دستور میں بھی ایسی دفعات موجود ہیں جن سے اس کے نظام تعلیم میں سائنس و ٹکنالوجی کی پوری گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔ دفعہ ۴۔ میں مدرسہ کا مقصد ان لفظوں میں واضح کیا گیا ہے: "اصلی مقصد اس مدرسہ کا مسلمانوں کی مذہبی اور دنیوی تعلیم ہے، اور بوقت تو بیچ مذہبی تعلیم کو مقدم رکھا جائے گا"[3] ظاہر ہے جس مدرسہ کا مقصد مسلمانوں کی مذہبی اور دنیوی تعلیم دونوں ہو اس کے نصاب تعلیم سے سائنس و ٹکنالوجی کے علوم کو غیر متعلق کیونکر کہا جا سکتا ہے۔ جبکہ صحیح تر لفظوں میں آج یہی علوم دنیوی علوم کے سرخیل اور ان کے قافلہ سالار ہیں مزید براں معلوم ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں آج بھی تعلیم کے علاوہ معاشی مقاصد کے لیے طلبا کو خطاطی، خیاطی اور جلد سازی وغیرہ صنعتیں بھی سکھلائی جاتی ہیں[4]۔ مدرسۃ الاصلاح کے دور اول میں بھی وہاں اس طرح کی صنعتوں کا تجربہ کیا جا چکا ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ جب سائنس کو عملی طور پر (Practical) اختیار کر لیا گیا تو نظری طور پر (Theoretical) اسے اختیار کرنے میں تامل کیوں کر ہو سکتا ہے۔

نئے علوم سے دوری کی بنیادی وجہ: لیکن معلوم ہے کہ مدارس کے نظام میں نظری طور پر سائنس و ٹکنالوجی اور نئے علوم کی پوری گنجائش

۱۔ اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، علوم عقلیہ میں علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی بصیرت، مقالہ ڈاکٹر محمد فاروق بخاری، ایران جلد ۱۳ (۱۹۸۶ء)
۲۔ سید محمد الحسنی، سیرت مولانا سید علی مونگیری ۱۱۹/۔ مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ بار اول اپریل ۱۹۶۴ء ۳۔ دستور العمل مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ منظور کردہ ۱۳ دسمبر ۱۹۲۵ء مطبوعہ حمیدیہ پریس، سرائے میر ۴۔ تاریخ دیوبند/۳۴۹۔ حوالہ ایڈیشن

کے باوجود عملی طور پر یہ علوم ان کے نصاب تعلیم کا جزو نہ بن سکے۔ اس کی وجہ کوئی ذہنی وفکری رکاوٹ نہیں۔ بلکہ اس کا تعلق خالص حکمت عملی اور لائحہ عمل سے ہے۔ اس کے لیے ہمیں خاص طور پر دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم کے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ جس میں اس مسئلہ پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مدارس کے قیام سے مسلمانوں کی زندگی کے جس خاص خلا کو پر کرنا مقصود ہے، اصلا توجہ اسی پر مرکوز رہنی چاہئے۔ مزید براں ایک ہی وقت میں مختلف مقاصد کا حصول لیاقت اور شخصیت کو منتشر کرنے اور "طلب الکل فوت الکل" کا مصداق ہوتا ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ دارالعلوم کے اندر قدیم وجدید دونوں علوم کو یکساں اہمیت کے ساتھ داخل نصاب کیوں نہ کیا گیا، حضرت قاسم العلوم مولانا نانوتویؒ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ آج بھی قدیم وجدید کے مسئلہ میں ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے بہت کچھ کافی ہے۔ خود ہی یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ "اور علوم جدیدہ کو کیوں نہ شامل کیا گیا۔" پھر جوابی تقریر ارشاد ہوتی ہے "منجملہ دیگر اسباب کے بڑا سبب اس بات کا تو یہ ہے کہ "تربیت عام ہونا خاص اس پہلو کا لحاظ چاہئے، جس کی طرف سے ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو" آگے اس کی تشریح فرماتے ہیں کہ: "سوا اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانۂ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی ہاں علوم نقلیہ (یعنی خالص دینی واسلامی علوم) کا یہ تنزل ہوا کہ ایسا تنزل بھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا ہوگا"۔

"ایسے وقت میں رعایا (یعنی مسلمان عوام۔س) کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا تحصیل حاصل نظر آیا" صرف بجانب علوم نقلی (یعنی خالص اسلامی ودینی علوم) اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعداد علوم مروجہ اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے (انعطاف) ضروری سمجھا گیا۔[1] جس کا صاف مطلب تھا کہ دارالعلوم کے اندر اصل توجہ تو خالص دینی علوم پر مرکوز رہے گی۔ ضمناً حسب ضرورت نئے علوم بھی سیکھ لئے جائیں گے۔ جس کی اس وقت کے نصاب میں حالات کے لحاظ سے پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی تھی۔ جیسا کہ حضرت نانوتویؒ نے فرمایا تھا کہ "علوم نقلیہ، اور ان کے ساتھ علوم دانش مندی کو داخل تحصیل کیا"[2] اس کے بعد جو فضلاء نئے علوم میں مزید دستگاہ اور اختصاص پیدا کرنا چاہیں ان کے لیے طریقہ یہ تجویز کیا گیا کہ مدرسے سے فارغ ہونے کے بعد وہ نئے مدارس میں جاکر ان علوم

---

[1] سوانح قاسمی دوم صفحات ۲۷۷ تا ۲۸۰ طبع مذکور

[2] ایضاً /۲۸۱۔

کی تکمیل کریں۔ فرمایا گیا تھا کہ یہی طریقہ "کار اس مقصد کے لیے زیادہ موثر اور کارگر ہوگا" "اس کے بعد (یعنی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد) اگر طلبہ مدرسہ ہذا، مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں بات زیادہ مؤید ثابت ہوگی"[1]

اس پوری گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ مدارس کی فضا کو تو خالص دینی علوم کے لیے خاص ہونا چاہئے اور دیگر علوم کی آمیزش سے ان کے خاص ماحول کو درہم برہم (ڈسٹربڈ) نہ ہونا چاہئے بعد میں جو لوگ نئے علوم میں کمال پیدا کرنا چاہیں وہ نئے مدارس اور کالجوں میں جا کر اپنی تشنگی کو رفع کریں۔ آگے اسی نکتہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا ہے اور یہی حصہ اس مضمون کا اصل حاصل ہے کہ: "زمانۂ واحدہ میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعثِ نقصان استعداد ہے"[2] جس کی تشریح کرتے ہوئے صاحب سوانح نے بجا طور پر کہا ہے کہ اس اصول کی رعایت ملحوظ رکھنے کا مطلب ہوگا کہ آدمی اپنے کو طلب الکل فوت الکل کا مصداق بنائے[3]۔ اسی ضمن میں صاحب سوانح کی یہ وضاحت بھی بڑی قیمتی ہے کہ:

"آخر استادوں کے ایک حلقہ میں جن علوم و مسائل کی قدر و قیمت طلبہ پر واضح کی جاتی ہو، اور معاً دوسرے حلقے میں پہنچنے کے ساتھ ان ہی کے وزن و وقار سے طلبہ کو خالی الذہن کر دیا جائے، اثبات و نفی کے اس قصہ میں اگر ہر دو کی "نفی" ہوتی رہے تو ان دو مخالف طریقۂ تعلیم کا خود ہی سوچئے دوسرا انجام ہی کیا ہو سکتا ہے۔"[4]

اور واقعہ ہے کہ یہ وہ حقیقت ہے جس پر آج ہماری ڈیڑھ سو سال کی تعلیمی تاریخ شاہد عدل ہے یونیورسٹیوں کے ساتھ دینیات و مشرقیات کی پیوندکاری اس طویل مدت میں ان میدانوں کے دو چار ماہرین بھی نہ پیدا کر سکی جنھیں انگلیوں ہی پر گنا جا سکے۔

افسوس ہے کہ دارالعلوم دیوبند خود حضرت نانوتویؒ کے تجویز کردہ نصاب پر زیادہ دنوں عمل نہ کر سکا۔ جس کی رو سے چھ سال کی قلیل مدت میں مدرسہ کے نصاب کو مکمل کر کے طالب علم اوسطاً سولہ سال کی عمر میں فارغ ہو کر بعد میں نئے مدارس اور یونیورسٹیوں سے حسب دلخواہ نئے علوم سے سیرابی کر سکتا تھا۔ حالات کے دباؤ سے دارالعلوم کا نصاب غیر ضروری درسیات سے بوجھل ہوا جس کے نتیجے

---

[1] حوالہ سابق [2] سوانح قاسمی، حوالہ سابق/ ۲۸۳ [3] سوانح قاسمی دوم/ ۲۸۲ [4] حوالہ سابق/ ۲۸۴ [5] محولہ بالا/ ۲۸۶

میں لازمی طور پر مدت تعلیم میں اضافہ کرنا پڑا۔ اور پھر دوسری رکاوٹوں کے ساتھ عمر کی زیادتی کے ساتھ لمبی لمبی داڑھیوں[1] کے ساتھ فضلاء مدرسہ کو نئے جامعات میں طالب علم بن کر رہنا مشکل ہوگیا۔[2] سچ یہ ہے کہ اپنے اور پرائے ہوئے منطق وفلسفہ وغیرہ کے اس بوجھ کو ہلکا کر کے جس کے سلسلے کی پرانی رکاوٹیں اب بالکل دور ہو چکی ہیں اگر ملت اسلامیہ ہند حضرت نانوتوی کے تیار کردہ نصاب تعلیم پر عمل پیرا ہو سکے تو قدیم وجدید کے مسئلہ کو حل کرنے کی آج اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہے۔ مدارس اپنے موضوعات کے لیے یکسو رہیں اور کالج اور یونیورسٹیاں نئے علوم کا مرکز بنیں۔ اور دونوں جگہ کے پیاسے الگ الگ کنوؤں پر جاکر اپنی پیاس بجھائیں۔ اس موقع پر یہ عرض شاید بے محل نہ ہوگی کہ مدارس کے فضلا کی طرف سے یونیورسٹیوں سے استفادہ کی مثالیں تو پہلے بھی کم نہ تھیں اور آج جو صورت حال ہے وہ تو سامنے ہی ہے کہ مدارس کی پوری پوری کھیپ یونیورسٹیوں میں آرہی ہے۔ کاش کہ یونیورسٹیوں کے فضلا بھی دینی علوم کی پیاس بجھانے کی خاطر مدارس کے کنوؤں کا رخ کرتے۔ افسوس کہ ماضی میں بھی اس کی مثالیں شاذ ونادر ہی ہیں لیکن آج تو یہ جنس بالکل عنقا دکھائی دیتی ہے۔

مدارس دینیہ کے جدید علوم اور سائنس وٹکنالوجی سے اصلاً دور رہنے کے آئیڈیل کو یونیورسٹیوں میں مروج طریق تعلیم کی روشنی میں بھی آسانی کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے۔ آج کے نئے نظام تعلیم میں مضامین کے انتخاب اور ان کے امتزاج (combination) کو بجا طور پر غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے جس طالبعلم کو مثال کے طور پر آگے انجینئرنگ یا ایم۔ بی بی۔ ایس کے کورس میں لے جانا پیش نظر ہو اس کے لیے آرٹ کے موضوعات کا انتخاب نہیں کیا جاتا۔ بلکہ شروع ہی سے اس کے لیے سائنس سائڈ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ پھر جب ایک ہی کیمپس میں مضامین کا خاص امتزاج اور خاص انتخاب دوسرے علوم وفنون کی طرف سے بے اعتنائی اور ان کی بے وقعتی کی دلیل نہیں تو اگر کسی اصول کو مدرسہ اور یونیورسٹی کے درمیان منطبق کر دیا جائے تو اس میں قباحت کا کونسا پہلو ہے؟ جبکہ تجربہ کہتا ہے کہ تمام سہولیات کے باوجود آج تک مشرقیات کو یونیورسٹیوں کی فضا راس نہ آئی۔

مالیات کا مسئلہ: مدارس کے نظام میں خاص طور پر سائنس وٹکنالوجی کو داخل نہ کرنے کے سلسلے میں دوسری بڑی رکاوٹ مالیات کا مسئلہ ہے۔ مذکورہ بالا سب سے اہم اور قابل لحاظ

---

[1] حوالہ مذکور / ۲۹۱ [2] حوالہ سابق

دشواری سے اگر تھوڑی دیر کے لیے نگاہیں پھیر بھی لی جائیں تو سوال یہ ہے کہ مدارس کے اندر ان مضامین کو پڑھانے والے کہاں سے آئیں گے۔ اب تک کا تجربہ کہتا ہے کہ یونیورسٹی کے فضلاء مدارس میں ملنے والے قلیل مشاہروں پر کام نہیں کر سکتے۔ مصارف اور وسائل کا مسئلہ مدارس کا بڑا اہم اور حقیقی مسئلہ ہے۔ ان کی نسبت سے کسی بھی تجویز و ترمیم میں اسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے۔ اور واقعہ ہے کہ دوسری چیزوں کے علاوہ خاص طور پر وسائل کی یہی کمیابی ہے جو تاریخ وغیرہ جیسے ان علوم سے وہ ہاتھ سمیٹے رہے ہیں جو ہمیشہ سے مسلمانوں کی خصوصی دلچسپی کا موضوع رہے ہیں۔ اس مسئلہ کا کوئی دوسرا قابل اطمینان اور پائدار حل اس کے سوا نہ ہوگا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرح مدارس بھی سرکاری سرپرستی قبول کرلیں اور ان سے باقاعدہ ایڈ لینے لگیں۔ ظاہر ہے کہ مدارس کے لیے یہ چیز ان کی معنوی موت کے مرادف ہوگی۔ اگر وہ ان مقاصد کے ساتھ جینا چاہتے ہیں جن کے لیے کہ ان کا قیام عمل میں آیا ہے تو یہ چیز ہرگز ہرگز ان کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت اور دستور ہند کی کوئی بہتر سے بہتر تعبیر و تشریح بھی اس سلسلے میں انھیں مطمئن نہیں کر سکتی۔ صاف بات ہے کہ لینے والا ہمیشہ دینے والے سے نیچا ہی ہوتا ہے اور جو دیتا ہے وہ دینے کے ساتھ ہی لینے والے پر اپنا استحقاق بھی قائم کرلیتا ہے۔ نظری دلیلوں سے آگے اس کے لیے خود مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مثال ہی کافی ہے۔ حکومت کی امداد یافتہ ہونے کے باعث سرکار اس کے معاملات میں جیسی کچھ دخیل ہے وہ سامنے کی بات ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے اصول ہشتگانہ میں جنھیں بجا طور پر الہامی کہا جاتا ہے حضرت قاسم العلوم نے اس کی آخری دفعات میں یہ جو کہا تھا کہ: "سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے"، نیز یہ کہ: "تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے ناموری نہ ہو، بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائداری کا سامان معلوم ہوتا ہے"۔[1] جس کی مزید تشریح موصوف نے دوسرے موقعہ پر اس طرح فرمائی تھی کہ: "دارالعلوم اس وقت تک مستقل رہے گا جب تک کہ اس کی آمدنی غیر مستقل رہے گی۔ لیکن جس وقت اس کی آمدنی کا ذریعہ مستقل ہو جائے گا، اسی وقت دارالعلوم کی بنیاد غیر مستقل ہو جائے گی"[2] واقعہ ہے کہ ہندوستان کے تمام مدارس کے لیے یہ مسئلہ ان کی زندگی اور موت کا مسئلہ معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مدرسہ میں ان لوگوں کا چندہ بہتر نہ سمجھا نہ گیا۔ جو حسن نیت

---

[1] فوٹو کاپی اصول ہشتگانہ، سوانح قاسمی دوم ص ۲۲۱ کے بالمقابل [2] سوانح قاسمی دوم/۲۲۱۔

کی دولت سے مالا مال نہ ہوں تو پھر حکومت کی امداد کی قباحت تو بدرجہ اولیٰ معلوم ہے۔ جس کی صراحت بھی کردی گئی ہے۔ مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کی بنیاد بھی مسلمان عوام کے چندوں پر رکھی گئی ہے۔ اور اکابر سے سنا گیا ہے کہ اس کے معمار اول استاذ امام مولانا حمیدالدین فراہیؒ امراء و روٗسا قوم کے بالمقابل جن کے مالی معاملات بالعموم مشتبہ ہوتے ہیں، مسلمان غرباء کے چھوٹے چھوٹے چندوں کو زیادہ ترجیح دیتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ مدارس دینیہ کی اکثریت آج بھی کم و بیش اسی آئیڈیل کو اختیار کیے ہوئے ہے۔

ملازمت کی دشواری: مدارس دینیہ میں سائنسی نصاب کے اجراء میں دوسری بڑی قابل لحاظ رکاوٹ ملازمت کی دشواری کی ہے۔ مانا کہ دوسری تمام دشواریوں پر قابو پالیا گیا اور مدارس سے بڑے بڑے سائنس داں پیدا ہو کر نکلنے لگے تو سوال یہ ہے کہ بازار میں ان کی کھپت کا کیا سامان ہوگا۔ آج کے حالات میں بھی خالص مدارس کے فضلاء کی خاص طور پر دینیات اور مشرقیات میں ان موضوعات میں یونیورسٹیوں کے ڈگری ہولڈرس پر برتری مسلم ہے۔ لیکن اپنی استعداد کی بناء پر ملازمت کے لیے پوری طرح اہل ہونے کے باوجود ضابطوں کی رکاوٹ سے اس کے لیے غیر اہل ہونے کی بناء پر انھیں اپنی عمر عزیز کا بڑا قیمتی حصہ یونیورسٹیوں کی نذر کرنا پڑتا ہے۔ جو اکثر و بیشتر انھیں بے سمت بنائے بغیر نہیں رہتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسی صورت حال سے مدارس سے فارغ شدہ سائنس کے فضلاء کو بھی دوچار ہونا پڑے گا۔ کیا یہ بات ملک و قوم کے مفاد میں ہوگی کہ ایک موضوع پر اہلیت (com pe tence) پیدا کرلینے کے باوجود رسمی ڈگریوں کے حصول پر جوانی کے مزید دس سال کھپائے جائیں۔ مدارس کے فضلا کو اپنی قدر و قیمت کا احساس نہ ہو اور وہ اس "وادی تیہ" سے گزر بھی جائیں تو غالباً سائنس کے "بامقصد" فاضلین کے لیے اس مرحلہ کو عبور کرلینا آسان نہ ہوگا۔ اس مسئلہ کا ایک ہی حل ہے کہ مدارس کو یونیورسٹیوں کا ضمیمہ بنادیا جائے تاکہ سند کی اعتباریت سے ان کے فضلا کے لیے آگے کی راہیں ہموار ہو جائیں۔ اس سے بہتر تو یہی ہوگا کہ مدارس کے نظام ہی کو ختم کرکے ملت کو تعلیم کے ایک اضافی بار سے بچالیا جائے۔ لیکن غالباً قوم اس کے لیے تیار نہ ہوگی؟

مدارس کا الحاق: مدارس دینیہ کے اندر سائنسی نصاب، جیسا کہ عرض کیا گیا، بہت آگے کی بات ہے، اس وقت مدارس عربیہ کے یونیورسٹیوں سے الحاق کی جو صورت ہے وہ خود غالباً ست زیادہ قابل اطمینان نہیں ہے۔ موجودہ حالات میں تعلیم کا وسط اور اس کی طرف

رجحان میں جو اضافہ ہوا ہے، اس کی وجہ سے عام طور پر مدارس سے طلبہ کم عمری میں فارغ ہونے لگے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ علم کی ناپختگی کے ساتھ وہ عمر کی ناپختگی لئے یونیورسٹیوں میں داخل ہوتے ہیں اور یہاں کی ہنوز جدیدیت زدہ فضا میں بہت جلد اپنا رنگ بدل کر نیا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ کرتا اور ٹوپی تو ان کی اتر ہی رہی ہے، اکثر اوقات داڑھیاں بھی صاف ہو جاتی ہیں۔ تجربہ کہتا ہے کہ اس داخلہ کا بڑا محرک نئے علوم میں کمال سے زیادہ ملازمت اور معاش کے بہتر وسائل کی تلاش ہوتی ہے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں مدارس عربیہ کا قیام اس غرض کے لیے نہیں ہوا۔ اس مقصد کے لیے مدارس کی کمی پہلے بھی نہ تھی۔ اور اب تو پورے ملک میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کا جال بچھا ہوا ہے نئے کالجوں کی موجودگی میں جو الگ عربی مدارس کا قیام عمل میں آیا تو جیسا کہ آپ نے تفصیلات میں دیکھا ان کا بنیادی محرک قوم کو خالص دینی علوم سے جوڑ کر ان کے اندر علمی و فکری اور ذہنی و تہذیبی بیداری کو برقرار رکھنا اور اسے فزوں تر کرنا تھا۔ مولانا قاسمؒ کے دکھائے ہوئے منصوبے کے تحت مدارس دینیہ سے فراغت کے بعد نئے علوم میں مہارت پیدا کرنے کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے فائدہ اٹھایا جائے لیکن یہ بات درست اسی وقت ہوگی جبکہ نئے مدارس میں داخلہ کا یہی بنیادی اور اصل محرک ہو۔ جبکہ موجودہ حالات میں بظاہر اصول یہ چیز شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے واقعہ ہے کہ مدارس کے یونیورسٹیوں سے الحاق کے جواز کی اس کے سوا دوسری صورت نہیں ہو سکتی کہ فضلاء مدارس عربیہ یورپ کے ایجاد کردہ نئے علوم و فنون میں مہارت کو اپنا مطمح نظر بنائیں۔ اور ان کا براہ راست مطالعہ کرکے قرآن و سنت کی روشنی میں ان کی تجدید کا سامان کریں۔ خالص سائنسی علوم کو اگر وہ اپنا موضوع بناتے ہیں تو اس دائرے میں بھی انھیں اسلام کی روح سے آشنا کرکے ان کو نیا رنگ اور آہنگ عطا کریں۔ اس سے ہٹ کر خالص مادی اور معاشی نقطۂ نظر سے مدارس دینیہ کے فضلاء کے یونیورسٹیوں میں داخلے کی صورتیں نکال لی جائیں تو بہر حال مدارس کے پیش نظر مقاصد سے اس کا دور کا واسطہ نہ ہوگا۔ مدارس کے فضلا کا اصل میدان قومی و ملی ادارے اور قومی تحریکات اور جماعتیں ہیں۔ محض معاشی فراغت کی تلاش میں اپنے اصل میدان سے فرار کو حوصلہ مندی کا تقاضا مشکل ہی سے قرار دیا جا سکتا ہے۔ نئے علوم کو اسلامی رنگ دینے کی نسبت سے یونیورسٹیوں اور جدید جامعات میں فضلا مدارس کا داخلہ نہ صرف جائز بلکہ عین مطلوب اور جیسا کہ تفصیل گزری مدارس کا عین مقصود ہے۔ لیکن یہ چیز بڑی جاں فشانی اور منصوبہ بندی کی طالب ہے۔ جس کی ایک ہی صورت ہے کہ مدارس اپنے فضلا کا داخلہ یونیورسٹیوں میں ایک متعین پروگرام کے تحت کرائیں۔

اوران کی علمی وفکری نگرانی کا مستقل نظام قائم کریں۔ جبکہ تادم تحریر مدارس کی طرف سے اس کی طرف کوئی خاص توجہ ہوتی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ شدید ضرورت ہے کہ آج مدارس دینیہ مزید غور وفکر سے اس کے لیے مستقل تدبیریں نکالیں اور اس کے لیے ایک جامع اور ہمہ گیر منصوبہ تیار کریں۔ لیکن خدانخواستہ اگر اس کی صورتیں نہیں نکل پاتی ہیں تو خود یہ مسئلہ غور کرنے کا ہے کہ آیا مدارس کا یونیورسٹیوں سے الحاق دین و ملت کے مفاد اور مدارس کے پیش نظر مقاصد سے ہم آہنگ ہے بھی یا نہیں ؟

قابل عمل صورت : مدارس اور سائنسی تعلیم کی نسبت سے قابل عمل صورت یہی مناسب نظر آتی ہے کہ مدارس کا اصل موضوع اور مرکز توجہ تو خالص دینی علوم قرآن وحدیث اور فقہ و کلام وغیرہ کو ہی ہونا چاہئے۔ ضمنی طور پر زمانہ کے رجحانات سے ہم آہنگ رکھنے کے لیے اگر مدارس کی ترجیحات اجازت دیں تو جنرل سائنس کے لیے ایک آدھ گھنٹیوں کی تجویز قابل غور ہو سکتی ہے۔ اس کا فیصلہ بھی حالات کے لحاظ ہی سے ہوگا کہ یہ تعلیم کتابوں کے ذریعہ ہو یا مختلف اوقات میں لیکچرس وغیرہ کے ذریعہ اس کی تلافی کی جا سکتی ہے۔ مدارس دینیہ کے ساتھ اصل خیر خواہی یہ ہے کہ ان کے جو اپنے موضوعات اور ترجیحات ہیں ان کی بہتری اور ان کو زیادہ سے زیادہ موثر اور مفید بنانے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ اور اس کے لیے مدارس کے موجودہ نظام میں جزوی ترمیمات کافی ہیں کسی بڑی چھلانگ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مرکز فروغ سائنس وغیرہ جیسے اداروں کو مدارس میں سائنسی تعلیم کے اجراء کے بجائے اردو زبان میں سائنس وریاضی وغیرہ کے نئے نصاب وغیرہ کی تیاری پر زیادہ کوشش صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ ان شاء اللہ پرائمری درجات کی حد تک مدارس عربیہ کے لیے بھی اس نصاب سے فائدہ اٹھانے میں کوئی تامل اور رکاوٹ نہ ہوگی نیا نصاب اگر مدارس میں داخل نصاب نہ بھی ہو سکا تو باذوق فضلاء مدرسہ انشاء اللہ خارجی اوقات میں ان سے کسی نہ کسی حد تک ضرور ہی فائدہ اٹھالیں گے ۔

آخر میں یہ عرض کر دینا بڑی بے انصافی ہوگی کہ سائنسی علوم اور سائنس وٹکنالوجی میں مہارت امت مسلمہ پر بطور فرض کفایہ کے ہے۔ کہ اگر اس کے ایک طبقے نے ان علوم میں دست گاہ پیدا کرلی جس سے اسلام اور مسلمانوں کی ضروریات کی تکمیل ہو جائے تو پوری امت اس ذمہ داری سے سبک دوش ہو جائے گی۔ لیکن قرآن کی ناظرہ تعلیم اور دین کی بنیادی تعلیمات سے آگاہی ہر مسلمان کے لیے فرض عین کا درجہ رکھتی ہے جس میں کوتاہی آخرت میں بڑی پکڑ کی موجب ہے۔ اس لیے مسلمان دانشوروں کے لیے مدارس میں سائنس سے زیادہ غور طلب مسئلہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں قرآن اور دین کی بنیادی تعلیمات کا ہے۔ ان کی اولین اہمیت کا بھی شدت سے احساس رکھنے اور اس کے لیے مناسب عملی تدابیر اختیار کرنے کی بھی ایسی ہی بلکہ اس سے زیادہ ہی ضرورت ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم.

تربیت اولاد کی اہمیت

سید معین الدین نادری

رائٹر نے "ڈیلی چین" کے حوالہ سے خبر دی ہے کہ شنگھائی کے ایک سکنڈری اسکول کے طالب علم نے جوئے کا قرضہ چکانے کے لیے پہلے ایک رقم گھر سے چرائی پھر ماں باپ دونوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے موت کی نیند سلا دیا۔ اخبار کا کہنا ہے کہ گذشتہ اپریل میں یہ دہرا قتل جوئے کے نتیجے میں ایک طویل سلسلۂ جرائم کا حصہ تھا جو برابر دراز ہوتا جارہا ہے۔ گذشتہ سال ۷۰,۰۰۰ افراد قمار بازی کی علت میں سزایاب ہوئے۔ یہ تعداد ۱۹۸۵ء کی تعداد سے کچھ زیادہ ہے۔ حالانکہ اس جرم کے سدباب کے لیے برابر چھاپے پڑتے رہتے ہیں" (ٹائمز آف انڈیا، نئی دہلی یکم مارچ ۱۹۸۷ء صفحہ ۹)

(۱) بچوں کے گرد وپیش فتنوں کی گھنی فصل

یہ واقعہ ہے کہ دور فتن بڑوں ہی کے لیے نہیں بچوں کے لیے بھی گوناگوں آفتوں اور آزمائشوں سے پُر ہے۔ بچے آج اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پا رہے ہیں جس میں ہر قدم پر انھیں روز افزوں خطرات کا سامنا ہے۔ کوئی جگہ خطرات اور ہلاکتوں سے محفوظ و مامون نہیں، گھر بازار اور درسگاہ ہر جگہ مختلف اور متنوع قسم کی ہلاکتیں ان کا تعاقب کر رہی ہیں۔ ان میں سے جو فتنہ سب سے زیادہ تباہی اور بچوں کے مستقبل کی بربادی کا باعث بنا ہوا ہے وہ اخلاقی بگاڑ سیرت اور کردار کا مسخ ہونا اور شخصیت کا غلط اور غیر فطری خطوط پر ارتقار پذیر ہونا ہے۔

مخرب اخلاق فلمیں، ناپسندیدہ ریڈیو فیچر، فحاشی، عریانی، تشدد اور اباحیت کو ہوا دینے والے ٹیلیویژن پروگرام، ایسے ہی مواد پر مشتمل لٹریچر، بلیو فلموں کے ویڈیو کیسٹ، بے سمتی کا شکار ناقص نظام تعلیم اور بے مقصد اسکولی مشاغل بری صحبت ــــ تاریکیاں دبیز تر ہوتی جارہی ہیں۔ لغزشیں، جمود، بے کیفی (FRUSTRAION) تشدد اور جھگڑالو پن کا بڑھتا ہوا رجحان اس صورت حال کے منطقی ثمرات و نتائج ہیں۔ ذہین اور نسبتاً باشعور بچے ایسا محسوس کر رہے ہیں جیسے کوئی

بھٹکا ہوا راہی کسی صحرائے ناپیداکنار میں پھنس گیا ہو اور نکلنے کی راہ نہ مل رہی ہو۔
ان کا حال اور بھی بدتر ہے جنھوں نے ہیجان، تاریک اور گندے ماحول میں آنکھ کھولی ہے اور اسی میں رہ رہے ہیں، مایوسی، پست حوصلگی، گھٹن اور بے حسی ان کا مقدر بن کر رہ گئی ہے۔

(۲) موجودہ فتنہ زا صورت حال کے اسباب اور ملت کی ذمہ داری

فتنوں کی یہ فصل کیسے اور کیوں گھنی ہو گئی اور ہوتی جا رہی ہے اس کے بیان کے لیے تو دفتر چاہئے ایجاز و اختصار کے ساتھ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ موجودہ عبرتناک اور افسوسناک صورتحال، نظام فکر، سیاسی و معاشی عوامل اور تاریخی اسباب کے مخلوط اور پیچیدہ عمل کے علاوہ (جہاں تک مسلمان بچوں کا تعلق ہے) خود والدین کی دین سے دوری، زاویہ نگاہ اور خیال و عمل کے مرکز و محور کی تبدیلی، معیار زندگی کی بلندی و پستی کا مادہ پرستانہ مغربی تصور، نظام تعلیم جس کی رگ و پے میں ایک مخصوص تہذیب کی روح کو منصوبہ بند طریقے سے جاری و ساری کیا گیا ـــ زمین پر قبضہ فوجوں کے ذریعے کیا جاتا ہے ذہنوں پر نظام تعلیم کے ذریعے ـــ اور ملت مسلمہ کی بحیثیت مجموعی اپنی ذمہ داری سے غفلت کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ اس صورت حال نے پوری ملت کو دنیا و آخرت دونوں کے سیاق و سباق اور دینی و تہذیبی تشخص اور تسلسل کے لحاظ سے بڑی اندیشہ ناک اور ہلاکت زا پوزیشن میں رکھ دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہر بچہ (دین) فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے والدین اس کو مجوسی اور نصرانی بناتے ہیں" (حدیث)، یعنی مسلمان بچے اخلاق و عادات کے پہلو سے اور ذہنی اعتبار سے آج جس ڈگر پر ہیں اور دینی و تہذیبی تشخص اور تسلسل کو جو اندیشہ ناک اور ہلاکت زا صورت حال درپیش ہے اس نے انفرادی طور پر والدین کو اور اجتماعی طور پر ملت اسلامیہ کو مواخذۂ آخرت کے ہولناک مقام پر کھڑا کر دیا ہے۔

روایتی دینی مدارس سے لے کر جدید قسم کی معیاری درس گاہوں تک نتائج و اثرات کے لحاظ سے صورت حال یکساں ہے۔ نئی نسل ملت کا گراں ارز سرمایہ اور دینی و ثقافتی تسلسل کی ضمانت ہے۔ اس سرمائے کا تحفظ نقش پذیر عمر ہی سے صحیح خطوط پر اس کی تربیت کے ذریعہ ہو سکتا ہے ان صحیح خطوط کی نشاندہی اور رہنما ہدایات بھی قرآن و حدیث میں موجود ہیں اور تربیت اولاد کی اہمیت و فرضیت کی صراحت و وضاحت بھی۔

(۳) تربیت اولاد کی اہمیت و فرضیت قرآن و حدیث میں

قرآن و حدیث کی روشنی میں اہل و عیال کی معاشی کفالت ہی نہیں، دینی و اخلاقی اصلاح بھی ضروری ہے۔ غذا، لباس اور رہائش

کی ضرورت و اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے مگر فکرِ صحیح، پختہ کردار، بلند اور پاکیزہ سیرت، اعلیٰ اخلاق، نیکی اور تقویٰ اور تہذیب و شائستگی کی اہمیت کم نہیں کیا کچھ زیادہ ہی ہے اس لیے کہ یہی صفات انسان کی بنیادی شناخت ہیں اور یہی انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہیں، ان کے بغیر کوئی معاشرہ مہذب اور باوقار معاشرہ کہلانے جانے کا فی الواقع مستحق نہیں قرار پاتا۔ مزید یہ کہ ان صفات سے خالی معاشرہ اور افراد سیل حوادث کی رہگزر اور ہمہ جہتی، زوال و ادبار کا مسکن بنے رہتے ہیں۔

قرآن پاک کا حکم ہے: " اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آتش دوزخ سے بچاؤ۔ وہ آتش دوزخ جس کا ایندھن انسان بھی ہوں گے اور پتھر (اصنام) بھی۔

جہنم سے بچنا، بچانا کوئی " لمحاتی عمل" نہیں ہے ایک "لمبا سفر ہے جو اخلاق و عادات، رہائش اور لباس اور طرز عمل کی شاہراہ پر" ہوش سنبھالنے سے لے کر زندگی کی آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔ ایک مقرر راستے پر انحراف کے بغیر چلتے رہنا، کچھ اصول و آداب کی بغیر انقطاع پابندی کرنا۔ کچھ باتوں کو ترک کرنا اور کچھ کے اختیار کرنے کا فیصلہ کرنا، اس مقصد کے حصول کے لیے لازمی اور اور ناگزیر ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا " ہم اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے کیسے بچائیں؟" آنحضرت ؐ نے فرمایا "جن باتوں سے اللہ نے تم کو منع کیا ہے اُن سے تم ان کو منع کرو اور جن باتوں کا اس نے حکم دیا ہے ان کا تم انکو حکم دو۔ یہ چیز ان کے جہنم سے بچنے کا ذریعہ بن جائے گی" (آلوسی روح المعانی بحوالہ تفہیم القرآن)

عام طور پر اولاد کو دولت کا سہارا اور عیش و راحت، فخر و مباہات کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ سطحی مقاصد ہیں۔ اولاد کی خواہش فطری ہے۔ پیغمبروں نے بھی اولاد کی خواہش کی ہے مگر خدا پرست، خوش کردار اور صالح اولاد کی۔ یہ بات اس ہدف کا تعین کرتی ہے جو تربیت اولاد کا مقصود و مطلوب ہونا چاہیے۔ اس ہدف کا تعین ان نصائح سے بھی ہوتا ہے جو لقمان نے بیٹے کو کی ہیں۔ اور جو سورۂ لقمان (۳۱) میں وارد ہوئی ہیں۔

(۴) تربیت کے اصول اور رہنما ہدایات

احادیث میں تربیت اولاد کی ہدایات بھی ہیں، اس کے واضح خطوط بھی اور ان آداب و اطوار کی صراحت بھی جو بچوں کی شخصیت اور کردار کو صحیح خطوط پر ارتقاء پذیر کرسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ذمہ داری کی صراحت بھی کی گئی ہے اور مواخذۂ آخرت کی وضاحت بھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ کی روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تبارک وتعالیٰ کسی بھی بندے کو کچھ لوگوں کا نگران بناتا ہے، خواہ ایسے اشخاص کی تعداد کم ہو یا زیادہ، قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ اس بندے سے ان کے بارے میں یقیناً سوال کرے گا (یہ سوال) کہ اس نے ان پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم نافذ کیا یا اسے یوں ہی ضائع کر دیا بالخصوص اس کے گھر والوں کے بارے میں (مسند احمد) "بہترین تحفہ جو کوئی باپ بیٹے کو دے سکتا ہے اچھی تربیت ہے:" ایک صاع صدقہ کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی اپنے بیٹے کی (صحیح) تربیت کرے" (حدیث) تربیت اولاد کی ایک صاع (جنس) کے صدقے پر ترجیح معنی خیز ہے یعنی اولاد کر ایسی نیکی ہے جس کی ہموزن کوئی مادی شے نہیں ہوسکتی۔

ہر شخص اپنی اولاد کو خوش حال دیکھنا چاہتا ہے۔ جائز حدود میں یہ بات غلط نہیں ہے اولاد کو آسائش، مال و دولت اور مادی وسائل فراہم کرنا درست ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے لیکن اس سے زیادہ خود اولاد کے مفاد میں یہ ہے کہ اس کے اخلاق کو سنوارا جائے اور صحیح تعلیم و تربیت کے ذریعے اس کو اس قابل بنایا جائے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ اسلام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

تربیت اولاد کے لیے ضروری ہے کہ اولاد کے ساتھ بہترین اخلاقی رویہ اختیار کیا جائے۔ اخلاق اور تہذیب و شرافت سے انسان میں بہترین اخلاقی قدریں ابھرتی ہیں اور اس کی انسانیت نشوونما پاتی ہے۔

بدمزاج والدین اولاد کے خلاف نفرت کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں اور ایسا سلوک کرتے ہیں جیسے وہ ناقابل اصلاح ہیں اس طرز عمل سے بچے کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس کو رسوا کیا جا رہا ہے۔ یہ احساس اس کو تباہ کرکے رکھ دیتا ہے۔ احادیث میں بچوں کے ساتھ شریفانہ رویہ اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے تاکہ وہ سمجھیں کہ اس کے سرپرست اُن کو باعزت مقام دے رہے ہیں۔ اس برتاؤ سے بچے کے اندر اوپر اٹھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے لیکن اس رویئے میں ذرا سی بے احتیاطی بچے کو خودپرست اور مغرور بھی بنا سکتی ہے اس لیے بچوں کو غلط کاموں سے بچانے کی اور اصلاح و تربیت کی بھی فکر کرنی چاہیے۔

درشتی و نرمی بہم در بہ است ⁂ چو جراح و فاصد کہ مرہم نہ است (سعدی)

سختی و نرمی دونوں کا ملا جلا ہونا بہتر ہوتا ہے جیسے جراح اور فاصد خون نکالنے کے لیے فصد لگانے والا کہ دونوں زخمی کرتے ہیں مگر ساتھ ہی زخم پر مرہم بھی رکھتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اپنی اولاد کے ساتھ عزت و احترام کا معاملہ کرو اور اچھے ڈھنگ سے ان کی تربیت کرو" آنحضرتؐ نے خود بچوں کی تربیت ہمیشہ نصیحت و شفقت سے کی غلطی سے اجتناب کی تاکید کی اور غلطی سے بچنے کے احساس کو پروان چڑھایا حضرت انسؓ دس سال کی عمر سے بیس سال کی عمر تک تقریباً دس سال خدمت اقدس میں رہے۔ اس پورے دور کے بارے میں فرماتے ہیں" میں نے دس برس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی سعادت حاصل کی لیکن اس سارے عرصے میں آپ نے کبھی زجر و توبیخ نہ فرمائی اور نہ کبھی آپ نے مجھ سے یہ فرمایا کہ فلاں کام تم نے کیوں کیا اور فلاں کام کیوں نہ کیا" حضرت انسؓ خود اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز شفقت سمجھ میں آسکے فرماتے ہیں" ایک مرتبہ آپ نے ایک کام سے ایک جگہ مجھے بھیجا (پہلے) میرا ارادہ گو وہاں جانے کا تھا لیکن میں نے (جی میں) کہا" خدا کی قسم میں وہاں نہیں جاؤں گا" پھر گھر سے نکل کر چند لڑکوں کے پاس پہنچا جو راستہ میں کھیل رہے تھے تھوڑی دیر میں آنحضرتؐ وہاں تشریف لائے، پیچھے سے میری گردن پکڑی، میں نے پلٹ کر دیکھا تو آپ مسکرا رہے تھے فرمایا" بیٹے! جہاں میں نے تمہیں کام سے بھیجا تھا تم وہاں گئے نہیں؟" میں نے عرض کیا "حضور، ابھی جا رہا ہوں"

بچوں کی خامیوں پر نہ ٹوکنا اور ان کی بڑی سے بڑی غلطی کو بچپن کی نادانی قرار دے کر نظر انداز کرنا بھی درست نہیں۔ یہ طرز عمل دور اندیشی کے منافی ہے۔ اس طرح بری عادتیں جڑ پکڑ جاتی ہیں۔ ابتدا میں کسی بھی غلط روی پر روک لگانا آسان ہوتا ہے ایک مدت گذرنے کے بعد ان کی اصلاح ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتی ہے۔

سرچشمہ شاید گرفتن بمیل　　　　چو پُر شد نشاید گذشتن بہ پیل

سرچشمے کو سلائی سے روکا جا سکتا ہے لیکن جب وہ دریا بن جائے تو ہاتھی بھی اس سے نہیں گذر سکتا۔

ایک بار صدقے کی ایک کھجور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے منھ میں رکھ لی۔ آپ نے فوراً شفقت سے انہیں ٹوکا اور اس کھجور کو کھانے سے باز رکھا۔ بچے نادانی، ناواقفیت یا طفلانہ بے خیالی میں کوئی کام کر رہے ہوں تو پُر حکمت اور مؤثر تدبیر اصلاح یہی ہے کہ پیار و محبت سے انھیں اس کام سے باز رکھا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریق تربیت و اصلاح تھا۔

(۵) جسمانی سزا جسمانی سزا کو بعض لوگ نچلے طبقے کا شعار قرار دیتے ہیں یہ خیال صرف ایک حد تک ہی درست ہو سکتا ہے۔ کچھ لوگ جسمانی سزا کو ہر حال میں اور قطعاً نادرست

قرار دیتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو ہر کوتاہی (چھوٹی ہو یا بڑی) پر زد و کوب ہی کو کارگر حکمت عملی تصور کرتے ہیں۔ یہ دو انتہائیں ہیں۔ بہترین راہ اعتدال، تحمل اور توازن کی راہ ہے۔ بچوں کی تربیت لطف و محبت کے ساتھ اور ہمدردانہ انداز میں ہونی چاہئے لیکن اصلاح نہ ہو رہی ہو اور سختی ناگزیر ہو تو اتنی سختی ضروری ہے جتنی سختی اصلاح حال کی ضرورت کا تقاضا ہو لیکن یہ عمل نفرت و بیزاری اور غیظ و غضب کے زیر اثر نہ ہونا چاہئے اس کی پشت پر جذبۂ شفقت، دردمندی اور بہی خواہی کو کیفیت محرک بہر حال موجود ہونا چاہئے "حسب استطاعت و مقدرت اپنے اہل و عیال پر خرچ کرو لیکن جہاں تک تربیت کا تعلق ہے (سروں پر) عصا کو لہراتے رکھو (سزا کا اندیشہ قائم رکھو) اور اللہ کے معاملے میں انھیں ڈراتے رہو (حدیث)

تربیت ہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ایسا رویہ نہ اختیار کیا جائے کہ بچے نڈر ہو جائیں اور ان کو غلط روی سے باز رکھنا مشکل ہو جائے۔ ان کی مادی ضروریات پورا کرنے میں فراخ دل ہونا چاہئے ——— لیکن ان کی اخلاقی نگرانی بھی سخت ہونی چاہئے۔ مذکورہ بالا ارشاد نبوی کا یہی ماحصل ہے۔

اولاد کی تعلیم و تربیت سے متعلق احادیث میں وارد ہونے والی رہنما ہدایات (GUIDE-LINES) کی حیثیت محض مشورے یا سفارش کی نہیں ہے۔ نبی اس لیے بھیجا ہی جاتا ہے کہ اللہ کی سند سے اس کی اطاعت کی جائے۔ تربیت اولاد کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کے ارشادات احکام کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی پابندی ہر مسلمان پر لازم ہے اور جن کی رعایت کوئی بھی فرد یا قوم ملحوظ رکھے بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔

(۵) اسلام میں تعلیم و تربیت کا تصور | اسلام میں تعلیم و تربیت کا تصور محدود نہیں بلکہ ایک جامع و مانع تصور ہے۔ ایک ایسی تعلیم و تربیت جو ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہونے کے ساتھ اسلام کے تصور انسانیت اور اس کے بنیادی مزاج سے مطابقت رکھتی ہو۔ عہد حاضر کے مطالبات سے ہم آہنگ ہونا ایک مبہم اصطلاح ہے۔ غیر مشروط اور غیر محدود ہم آہنگی مسلمان کا مطلوب و مقصود نہیں ہو سکتی۔

احادیث میں ہدایت کی گئی ہے کہ اولاد کو تیراکی اور تیراندازی کی تعلیم دی جائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو لکھا "تم لوگ بچوں کو تیراکی اور گھوڑ سواری سکھاؤ۔ ضرب الامثال اور اچھے اشعار یاد کراؤ"۔ تیراکی صحت و تندرستی

ہی کے لیے ضروری نہیں خطرات کے مقابلے کی اہلیت پیدا کرنا ہے۔ تیراندازی اس زمانے کے وسائل جنگ میں تھی۔ اب جن چیزوں نے اس کی جگہ لے لی ہے ان کو اختیار کرنا چاہئے ضرب الامثال اور اچھے اشعار کی اہمیت زبان و بیان اور ادب ہی کے نقطۂ نظر ہی سے نہیں ذہنی تربیت اور سیرت کی تشکیل کے نقطۂ نظر سے بھی ہے۔

(۷) ظروف و احوال کا لحاظ ضروری ہے مگر:

آج کے تمدنی، معاشرتی اور سیاسی حالات دور اول سے مختلف ہیں اس لیے ان میدانوں میں قدیم علوم و فنون کار آمد نہیں ہوسکتے۔ دانش مندی کا تقاضا ہے کہ ظروف و احوال کو نظر انداز نہ کیا جائے جدید علوم و فنون کی تعلیم دی جائے لیکن سارا کام اسلام کے مخصوص فکری نظام اور پختہ عقائد کی بنیاد پر ہو تب ہی فلاح دارین بطور ثمر اور نتیجے کے وجود پذیر ہوسکے گی۔

ہندوستان میں اشاعت اسلام

سید اسماعیل لاہوری ۳۹۵ھ میں بخارا سے تشریف لائے۔ آپ کی مجلس وعظ میں ہزاروں آدمی آتے اور فیض یاب ہوتے تھے۔ آپ کا بیان اس قدر مؤثر ہوتا تھا کہ ہر روز سینکڑوں آدمی مشرف بہ اسلام ہوتے تھے۔ جب یہ پہلے پہل لاہور میں تشریف لائے ہیں اور پہلے جمعہ کو آپ نے منبر پر بیان کیا ہے۔ تو دو سو پچاس آدمی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ دوسرے جمعہ کو پانچ سو پچاس آدمی مشرف بہ اسلام ہوئے تیسرے جمعہ کو ایک ہزار کفار و مشرکین زمرہ اہل توحید میں داخل ہوئے۔ اسی طرح آپ کے ذریعہ سے نہایت کثرت سے لوگ داخل اسلام ہوتے رہے آپ کی وفات ۴۴۵ھ میں لاہور میں واقع ہوئی۔ (از کتاب تاریخ الاولیاء جلد اول)

اسی طرح حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حاجی ہود چشتی، شیخ علی رواتی وغیرہ قدس سرہم العزیز اور ان کے خلفاء کے ذریعے سے لاکھوں بلکہ کروڑوں آدمی مشرف بہ اسلام ہوئے کتاب دعوت اسلام میں فقط حضرت خواجہ اجمیری قدس سرہ العزیز کے ذریعہ سے ۹۰ لاکھ مسلمان ہونے والوں کی تعداد لکھی گئی ہے۔ ص ۲۰۰۔

(مولانا سید حسین احمد مدنیؒ: ارشادات، مضامین اور تقریریں۔ ناشر مکتبہ دینیہ، دیوبند)

تنقید وتبصرہ:

نظریہ ادب اور ادیب   از: شاہ رشاد عثمانی، صفحات ۱۳۵، قیمت بیس روپے
اشاعت دسمبر ۱۹۸۵ء   ناشر: دارالکتاب، بیاکی بیہ گنج، گیا (بہار)

کتاب کے مصنف کے متعلق بزرگ اردو نقاد جناب ڈاکٹر عبدالمغنی نے اپنے پیش لفظ میں کہا ہے "رشاد عثمانی ایک صالح و مستعد نوجوان ادیب اور ناقد ہیں۔ انھوں نے ادب کا مطالعہ ذوق وشوق سے کیا ہے۔" اس میں شک نہیں کہ زیر نظر مجموعہ مضامین میں رشاد عثمانی نے اپنے مطالعہ ادب کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ جو دراصل ان کے دور طالب علمی کی یادگار ہیں۔ مصنف نے بی۔اے آنرز (اردو) میں داخلہ لیا تو ان کو ادب کے وسیع اور ہمہ جہت مطالعہ کا موقع ملا۔ جس میں غالب و اقبال کے علاوہ سرسید، حالی، شبلی، محمد حسین آزاد، سید سلیمان ندوی، رشید احمد صدیقی اور عبدالماجد دریا آبادی وغیرہ کو انھوں نے خاص طور پر پڑھا۔ یہ مضامین اسی مطالعہ کے دوران لکھے گئے۔ اور ملک کے مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوئے۔ اب انھیں کو یکجا کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔

اردو ادب کے سلسلے میں مصنف نے بجا طور پر کہا ہے: "یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ جدید اردو ادب پر اسلامی فکر و اقدار نے گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ ہمارے ادب کی جڑیں صالح روایات، صحت مند افکار، اخلاقی اقدار اور دین وتہذیب کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ لیکن موجودہ ادبی اجارہ داری نے، جس کی تشکیل ترقی پسندی اور جدیدیت نے کی ہے، اس عظیم ادبی پہلو کو دبا کر رکھ دیا ہے۔ اور آج صورت حال یہ ہے کہ اردو ادب میں اسلامی اثرات و روایات کی بات سے ایک طنزیہ مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیل جاتی ہے۔" الخ ص ۸۔ اردو ادب کی اس نامطلوب اجارہ داری کو توڑتے ہوئے مصنف نے زمانۂ حال کے ان ادیبوں اور شاعروں اور ان کے فن پاروں کا مطالعہ اور تعارف پیش کیا ہے جو صحیح سمت سفر کے پابند اور صالح ادبی روایت سے منسلک ہیں۔ اور جنھیں اس میں شک نہیں کہ اردو ادب کے کسی بھی بازار میں انتہائی کھرے سکوں کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس مقصد سے ہر صنف سخن میں ایک ایک شخصیت کا انتخاب کیا گیا ہے۔ تنقید میں عبدالمغنی، غزل میں حفیظ میرٹھی، نظم میں سہیل زیدی، طنز و مزاح میں م۔ نسیم۔ آگے اردو افسانے میں تعمیری رجحانات، اور دور جدید کی نعتیہ شاعری میں مجموعی حیثیت سے مقصدی ادب کے نمائندوں پر کلام کیا گیا ہے۔ اردو افسانے میں خاص طور پر محمود فاروقی سعد گیلانی، م نسیم، ابن فرید، آثم مرزا اور ابوالخطیب کے کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے ——— اور نعتیہ شاعری میں دور جدید کے لوگوں میں ماہر القادری، نعیم صدیقی، عروج قادری اور حفیظ میرٹھی وغیرہ زیر بحث آئے ہیں۔

آخر میں ان ناموں کی فہرست ہے جنھیں طوالت کے باعث مصنف زیر بحث نہیں لا سکے ہیں۔ ان میں ابوالمجاہد زاہد، عامر عثمانی اور عزیز بگھروی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آخر میں اختر اورینوی کا ناول "حسرت تعمیر" اور عابد حسین کا ڈرامہ "پردۂ غفلت" بھی چونکہ مقصدی ادب کے نمایندہ تھے اس لیے انھیں بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

واقعہ ہے کہ مصنف نے ان مضامین کے ذریعہ جدید اردو دنیا کی ایک بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ اردو زبان نے اپنی مختصر سی عمر میں مسائل و مشکلات کے باوجود جو بے پناہ اور ہمہ جہت ترقی کی ہے دنیا کی کم ہی زبانوں میں اس کی مثال مل سکے گی۔ لیکن خاص طور پر ادھر آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد اس کے افق میں جو وسعت اور فکر میں جو بلندی آئی ہے، حق یہ ہے کہ اس نے اسے پورے عالمی ادب میں انتہائی امتیازی مقام کا حامل بنا دیا ہے۔ ان مضامین کے ذریعہ مصنف نے اسی سلسلے کے کچھ ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں کو منظر عام پر لانے کی کوشش ہے، جن کو اردو ادب کے نام نہاد اجارہ دار ہو سکتا ہے ادیب اور ادیبوں کے دائرے میں شامل نہ سمجھیں لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا کام اور ان کا نام حقیقی اردو ادب کے اعتبار کی ضمانت ہے۔ آج گفتگو اردو ادب کی ہو اور اس میں حفیظ میرٹھی ابوالمجاہد زاہد، سہیل زیدی، عزیز بگھروی، عبدالمغنی، ابن فرید، احمد سجاد اور م نسیم کا نام آئے، فن اور فن کار کی اس سے بڑھ کر نا قدری اور کیا ہو سکتی ہے۔ حفیظ میرٹھی نے اردو غزل کو جس مقصدیت فکری بلندی اور وسعت ذہنی سے ہمکنار کیا ہے اردو کے بہت سے قدیم اساتذہ کے کلام میں بھی یہ رنگ آسانی سے نظر نہ آئے گا۔ ان کے ساتھ ابوالمجاہد زاہد اور سہیل زیدی وغیرہ کا کلام اردو ادب کی آبرو ہے جس کی قدر نہ کرنا خود اپنی نا قدری کے مرادف ہے۔ مصنف اپنی طالب علمانہ ضرورت اور طالب علمانہ افتاد کے پیش نظر غالباً "ادب اور ادیب" کے اس دائرے کو زیادہ آگے نہ بڑھا سکے لیکن کم از کم ایک مضمون کی حد تک اس مجموعہ کی تشنگی بہرحال باقی ہے۔ بات اردو ادب کی ہو اور محمود فاروقی، نعیم صدیقی اور اسعد گیلانی زیر بحث آئیں، اور مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا صدر الدین اصلاحی، سید احمد عروج قادری ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی مولانا محمد فاروق خاں، مولانا وحید الدین خاں اور مولانا جلال الدین عمری کا کوئی ذکر نہ ہو تو اس بزم میں بڑی کمی محسوس ہوتی ہے امید کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کمی کو دور کیا جا سکے گا۔ مائل خیرآبادی، ابو سلیم عبدالحی اور مولانا محمد یوسف اصلاحی وغیرہ کے کاموں کا مختصر ہی لیکن تذکرہ ضرور آنا تھا۔ ہمارے خیال میں اگر مصنف اس کام کو اپنے لیے نقش اول تصور کریں اور آگے اردو ادب کے مکمل اور بھرپور جائزہ کا اہتمام کر سکیں تو اس سے وقت کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوگی۔ اور اس کے ذریعہ اردو ادب کے ایک بڑے خلا کو پُر کیا جا سکے گا۔

اس سے قطع نظر یہ مجموعۂ مضامین اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہے۔ جسے امید ہے خاص طور پر صالح ادب کے حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ طباعت صاف ستھری اور بہتر ہے۔ صفحات کے لحاظ سے قیمت البتہ کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ (س)

روداد سالانہ اجلاس مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند

منعقدہ ۱۹ر تا ۲۵ر اپریل ۱۹۸۶ء

جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ کا سالانہ اجلاس زیر صدارت امیر جماعت مولانا ابو اللیث صاحب ندوی اصلاحی ۱۹ر تا ۲۵ر اپریل ۱۹۸۶ء جماعت کے مرکز واقع دہلی ۶ میں منعقد ہوا۔

نشست کا آغاز روزانہ قرآن کریم یا حدیث نبوی کی تذکیر سے ہوتا تھا۔

افتتاحی کلمات. محترم امیر جماعت نے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی اس میں سب سے پہلے اس بات پر روشنی ڈالی کہ گذشتہ سال تھوڑے تھوڑے وقفوں سے شوریٰ کے تین چار اجلاسوں کے بعد جن کا آخری اجلاس اواخر دسمبر میں ہوا تھا، پھر اتنی جلد شوریٰ کا ایک اور اجلاس طلب کرنے کے محرکات کیا ہیں اس ضمن میں انھوں نے دستوری حیثیت سے مالی سال کے اختتام پر مرکزی مجلس شوریٰ کے سالانہ اجلاس کی اہمیت و ضرورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ واضح فرمایا کہ ان کے نزدیک یہ اجلاس طلب کرنے کے لیے اس سے بھی کچھ زیادہ اہم تقاضا موجودہ حالات کا بھی تھا جن سے ان کی مراد ملک کے عام حالات سے بھی ہے اور خود جماعت کے اندرونی حالات سے بھی۔ اس کے بعد تفصیل سے پہلے ملکی حالات اور ان کے قابل غور پہلوؤں کی طرف شوریٰ کی توجہ مبذول فرمائی۔ اس سلسلہ میں ملکی امن و امان، فرقہ وارانہ فسادات، تحریک بازیابی بابری مسجد اور اس کا اتار چڑھاؤ اور کچھ اسمبلیوں کے گذشتہ انتخابات کے نتائج و اثرات وغیرہ پر تفصیل سے اظہار خیال فرمایا۔

محترم امیر جماعت نے اپنی تقریر کے آخر میں بڑی دل سوزی سے ارکان شوریٰ کو نظم جماعت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ باہر کے مسائل سے کہیں زیادہ اہمیت ہمارے اپنے اندرونی نظم جماعت کے حالات کی ہے۔ ہمیں پوری طرح یکسو ہو کر کوشش کرنی چاہئے کہ جماعت کا قدم صحیح رخ پر آگے بڑھتا رہے۔ ہمیں رفقاء جماعت کے حالات پر پوری طرح نظر رکھنی چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ نظم کی کیفیت کیا ہے۔

اور پالیسی پروگرام کے مطابق کس حد تک عمل ہوتا ہے اور ساتھ ہی دعا بھی کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی و مدد فرمائے۔

جماعت کی سالانہ رپورٹ: جماعت اسلامی کی سالانہ کارگذاری بابت ۸۷-۱۹۸۶ء پر مشتمل رپورٹ پیش ہوئی۔ اس کے سلسلہ میں بعض وضاحتی سوالات ہوئے اور ان کا جواب دیا گیا۔ مرکزی بیت المال کی آمد و صرف کا گوشوارہ اور آڈیٹر کی آڈٹ رپورٹ پڑھ کر سنائی گئی۔ رپورٹ کے سلسلہ میں شعبہ مالیات کی جانب سے جو وضاحتیں تحریر کی گئی تھیں انھیں بھی پڑھ کر سنایا گیا اس کے بعد ارکان مجلس نے توثیق فرمائی۔

لوکل باڈیز کے انتخابات میں ووٹ کا استعمال: طے پایا کہ ارکان جماعت اسلامی ہند لوکل باڈیز اور گرام پنچایتوں کے انتخابات میں اپنے ووٹ کا استعمال کر سکیں گے تاکہ جماعت کے میقاتی پروگرام کے بعض اجزاء خاص طور پر خدمت خلق اور ملکی مسائل وغیرہ کے سلسلہ میں ووٹ کا استعمال مدد و معاون ہو سکے۔ ووٹ کا استعمال درج ذیل شرائط کے ساتھ ہوگا:-

۱۔ اس امیدوار کے حق میں ووٹ کا استعمال نہ کیا جائے گا جس کا رویہ اسلام دشمنی یا مسلم دشمنی کا ہو۔

۲۔ اس امیدوار کے حق میں ووٹ کا استعمال کیا جا سکے گا جس کے اوصاف درج ذیل ہوں:-

* بلا لحاظ مذہب و ملت اپنے حلقہ تعارف میں ایک سچے اور اچھے بھلے شخص کی حیثیت سے جانا مانا جاتا ہو اور اس سے ایفائے عہد کی توقع ہو۔
* وہ وعدہ کرے کہ وہ منتخب ہونے کے بعد نسل، برادری اور علاقہ و زبان کی عصبیت سے اوپر اٹھ کر عوام کی خدمت کرے گا اور کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جو مختلف تہذیبی اکائیوں کے درمیان بغض و عناد یا منافرت کے جذبات کو بڑھاوا دیتے ہوں۔
* سماجی اور شہری سہولتوں کی فراہمی کے سلسلہ میں علاقہ / بستی / محلہ کی حقیقی ضرورت کو مقدم رکھے گا۔
* زندگی میں اخلاقی بگاڑ لانے والی تمام چیزوں کو اپنے متعلقہ ادارہ کے ذریعہ ختم کرانے کی بھرپور کوشش کرے گا مثلاً جوا، شراب، بدکاری وغیرہ کے اڈوں کا خاتمہ اور اپنے محلہ / بستی / علاقہ کو رشوت وغیرہ کی لعنت اور ظلم و زیادتی سے محفوظ رکھنے کے لیے کوشاں رہے گا۔
* اپنی بستی / علاقہ میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی، امن و امان کی برقراری اور جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کو اپنی اولین ذمہ داری سمجھے گا۔
* مختلف فرقوں کے مذہبی مقامات، عبادت گاہوں اور ان سے متعلق جائدادوں کی حفاظت اور ان کی اصل حیثیت کی برقراری کے لیے بھرپور سعی کرے گا۔

* اس امر کی پوری کوشش کرے گا کہ اس کے متعلقہ ادارہ سے آدمی کو انصاف حاصل کرنے میں تاخیر نہ ہو اور کوئی مصنوعی رکاوٹ آڑے نہ آئے اور اگر کوئی ضابطہ اس راہ میں مانع ہو گا تو اسے تبدیل کرانے کی کوشش کرے گا۔
* باہمی نزاع کے معاملات میں کوشش کرے گا کہ کوئی فیصلہ فریقین کے پرسنل لا کی خلاف ورزی پر منتج نہ ہو۔
* تعلیمی طبی اور زرعی سہولتوں کی فراہمی کے سلسلہ میں کوشش کرے گا کہ کوئی حقدار اپنا حق پانے سے ضعیفی و پسماندگی یا اقلیتی فرد ہونے کے باعث محروم نہ رہ جائے
* اجتماعی امور، ثقافتی سرگرمیوں کے سلسلہ میں اس پہلو پر نگاہ رکھے گا کہ اس کے ذریعہ سماج میں کسی ایسی چیز کو در آنے کا موقع نہ ملے جو بے حیائی، فحاشی و بداخلاقی اور منکرات کے فروغ کا سبب بن سکے۔
* یتیموں بیواؤں معذوروں اور محتاجوں کی خدمت اور خبرگیری کے معاملہ میں کوتاہی نہیں کرے گا۔
* ارضی و سماوی حادثات کے موقعوں پر مظلوموں اور مصیبت زدہ لوگوں کی امداد و اعانت کی بھرپور کوشش کرے گا۔
* معاشی طور پر لوگوں کو اوپر اٹھانے اور بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے کے سلسلہ میں گھریلو صنعتوں کے قیام کی اور حکومت کی ترقیاتی اور امدادی اسکیموں سے ان کے لیے استفادہ کی صورتیں نکالنے کی پوری کوشش کرے گا۔

بابری مسجد بازیابی تحریک پر جماعت کا موقف: پی۔ٹی۔آئی کی ایک گمراہ کن خبر سے جماعت کے موقف کے بارے میں بعض حلقوں میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی تھی اور خود رفقاء جماعت کی طرف سے اس ضمن میں جو وضاحتیں طلب کی گئی تھیں، ان کے پیش نظر شعبۂ تنظیم کی جانب سے ایک مختصر تحریر پیش کی گئی اور باہمی تبادلۂ خیال میں مزید وضاحت بھی کی گئی۔ تفصیلی واقفیت کے بعد ارکان شوریٰ نے اپنا یہ تاثر نوٹ فرمایا کہ شعبۂ تنظیم کی وضاحتوں کے بعد مسئلہ کے تمام متعلقہ پہلو سامنے آگئے ہیں اور یہ اطمینان ہو گیا ہے کہ جو موقف اختیار کیا گیا وہ درست یا کم از کم فی الجملہ درست تھا۔

مشاہرہ کے گریڈوں پر نظر ثانی: ہمہ وقتی کارکنوں کے مشاہروں کے گریڈوں پر نظر ثانی کی گئی، گرانی الاونس کو بنیادی مشاہرہ میں شامل کیا گیا اور ان کے ابتدائی اسکیل، سالانہ اضافہ اور آخری اسکیل کی کچھ مقدار بڑھا دی گئی۔

* تنظیمی حلقے اپنے اپنے دائروں میں اپنے کارکنوں کے لئے ضوابط اور ان کے مشاہروں کے

اسکیل وغیرہ خود طے کرسکتے ہیں اداران امور میں مرکز کے طے کردہ ضابطوں اور اسکیل وغیرہ کے پابند نہیں ہیں۔

★ مرکزی مجلس شوریٰ نے تنظیمی حلقوں سے سفارش کی ہے کہ وہ گرانی اور اپنے مالی وسائل کے پیش نظر اپنے ہمہ وقتی کارکنوں کے لیے مشاہرہ کے گریڈ مقرر کریں اور انھیں حتی الوسع ضروری سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کریں۔

★ مشاہروں کے نئے گریڈوں اور جماعت کی دوسری ضرورتوں کی وجہ سے بجٹ پر جو قابل لحاظ اثر پڑے گا اس کے پیش نظر تنظیمی حلقے اپنے اپنے بجٹ میں خصوصی اعانت برائے مرکز کے طور پر ایک رقم مختص کریں۔

سالانہ بجٹ : جماعت کا سالانہ بجٹ ۸۶-۸۷ء منظور ہوا۔ کل آمدنی کا تخمینہ -/Rs 12,83,460 کل صرف کا تخمینہ =/Rs 14,04,000 خسارہ =/Rs 1,20,540

قراردادیں ، ملک و ملت کو ان دنوں جو حالات درپیش ہیں ان کے سلسلہ میں ارکان شوریٰ نے اپنے اپنے خیالات واحساسات ظاہر کئے (۱) بابری مسجد بازیابی تحریک (۲) قرآن مجید کے خلاف غلط پروپیگنڈا اور ناروافیصلہ (۳) یکساں سول کوڈ (۴) اخلاقی بحران اور فسادات کی بڑھتی ہوئی رو پر خاص طور سے اظہار خیال ہوا ان موضوعات پر باقاعدہ قراردادیں بھی منظور ہوئیں۔ جو اخبارات میں پہلے ہی شائع ہوچکی ہیں۔

والسلام
افضل حسین (قیم جماعت)

مرکزی مجلس شوریٰ
جماعت اسلامی ہند کی قراردادیں

مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۲ تا ۲۵ر اپریل ۱۹۸۷ء میں حسب ذیل قراردادیں منظور کی ہیں۔

۱۔ قرآن پاک

جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس برادران وطن کے ایک مخصوص حلقہ کی ان کوششوں کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے جن کا مقصد قرآن کریم کی آیات کو سیاق وسباق سے کاٹ کر اکثریت کے سادہ لوح افراد کو بدگمانیوں میں مبتلا کرنا اور یہ تاثر دینا ہے کہ قرآن کریم مسلمانوں کو لوٹ مار، قتل وغارت اور غیرمسلموں سے شدید نفرت کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ صورت حال اس لیے اور بھی تشویش انگیز بن گئی ہے کہ کچھ دنوں پہلے دہلی کی ایک عدالت نے ایک ایسا فیصلہ کیا جسے بنیاد بناکر کچھ لوگ یہ ثابت کرنے میں لگے رہے ہیں کہ یہ اعتراضات درست ہیں۔ اس سے پہلے کلکتہ ہائی کورٹ میں بھی قرآن کریم پر پابندی عائد کرنے کے سلسلے میں ایک درخواست دی گئی تھی، جسے سماعت کے لیے داخل بھی کرلیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں کچھ نام نہاد دانشور قرآن کریم کی من مانی تعبیر و تفسیر کرکے لوگوں کو مسلسل گمراہ کررہے ہیں جس کی ایک بہت بھونڈی مثال شاہ بانو کیس کے فیصلہ میں بھی سامنے آچکی ہے۔

مجلس شوریٰ ان مذموم اور منصوبہ بند کوششوں کے خلاف اپنے دلی افسوس اور رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے حکومت سے پرزور مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اس طرح کی حرکتوں کا نوٹس لے اور لوگوں کو یہ موقع نہ فراہم کرے کہ وہ مسلمانوں کی دل آزاری کے ساتھ ساتھ اسلامی دنیا میں ہندوستان کی رسوائی کا سبب بن سکیں۔

۲ اخلاقی بحران

انتہائی دکھ کے ساتھ یہ ماننا پڑتا ہے کہ ملک میں مجموعی اخلاقی حالت اس حد تک گر چکی ہے کہ ایک عام آدمی بھی اسے محسوس کرنے لگا ہے۔ اور یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ فکر و تصور کی نوعیت اور کیفیت ہو یا اخلاق و کردار کی بلندی و پستی، یہ سب چیزیں اوپر سے نیچے کی طرف چلتی ہیں اور اسی بنیاد پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ نیچے سے اوپر تک چھوٹے بڑے سبھی لوگ بے اختیار ہوں یا با اختیار فکری انتشار اور اخلاق و کردار کے بحران میں مبتلا ہیں۔ اس کیفیت کو صرف اخلاقی زوال سے تعبیر کرنا کافی نہیں۔ دراصل یہ اخلاقی بحران ہے۔ زندگی کے بنیادی تصورات اور مطلوبہ اخلاقی اوصاف میں ہم آہنگی ہونی چاہئے اگر یہ نہ ہو تو فکر و عمل میں لازمی طور پر تضاد پایا جائے گا جسے اخلاقی بحران سے کم کچھ اور کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ اور اس حالت سے کسی بہتری کی امید رکھنا عبث ہے۔

اگر اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ معاشرہ کا پورا جسم داغ داغ ہے۔ ان پھوڑوں پر پھائے رکھ دینا کافی نہیں ہے۔ بلکہ ہمت کرکے اس معدہ کا علاج کرنا ضروری ہے جس کی صحت خراب ہونے کی وجہ سے خون میں فساد پیدا ہو گیا ہے اور نتیجہ میں جسم کے ہر حصہ پر پھوڑے نظر آرہے ہیں۔ مرکزی مجلس شوریٰ کا یہ احساس ہے کہ سماج کے ہر گوشہ میں بڑھتا ہوا کرپشن، نقلی دواؤں کا کاروبار چور بازاری، خوردنی اشیا تک میں ملاوٹ، جہیزی اموات وغیرہ اس بحران کی واضح علامتیں ہیں انھیں مجموعی طور پر خود غرضی، بے اعتمادی اور سطحیت پسندی کے تین دائروں میں سمیٹا جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ ان خرابیوں کے ساتھ صرف مادی ترقی ملک و سماج کو آگے نہیں بڑھا سکتی۔ خود غرضی اور بے اطمینانی کی اس عام فضا نے لوگوں کو خود اعتمادی اور یقین کی دولت سے محروم کر دیا ہے جس کی تلافی نہ تو فوجی طاقت سے ہو سکتی ہے نہ سائنس، ٹکنالوجی اور صنعت و تجارت کی ترقی کے ذریعہ۔ یہی کیفیت سطحیت کی بھی ہے۔ مثلاً فرقہ پرستی، تعصب اور فسادات کے مسئلہ کو لے لیجئے، ان سے نالاں تو سب ہیں لیکن کوئی بھی گہرائی میں اتر کر ان کے سرچشمہ تک پہنچنے کے لیے تیار نہیں۔

جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ اس صورت حال کو انتہائی تشویش کی نظر سے دیکھتی ہے اور ملک و ملت کے بابصیرت افراد سے نہایت دردمندی سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اپیلوں، ملامتوں اور کورے اندیشوں سے آگے بڑھ کر مرض کے اصل اسباب کی تشخیص پر توجہ صرف کریں۔ جماعت اسلامی اہل ملک کو اخلاقی بحران کے اس مسئلہ پر مسلسل متوجہ کرتی رہی ہے اور یہ کہتی رہی ہے کہ ہمارے سماج میں پائی جانے والی تمام خرابیوں اور گراوٹوں کی جڑ ہے جسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے بغیر

زندگی میں خیر و فلاح کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔

۳۔ فرقہ وارانہ فسادات

ملک کے مختلف علاقوں میں یہاں وہاں آئے دن ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات پر مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند گہری تشویش کا اظہار کرتی ہے اور ملک کے تمام باشندوں سے بلا تفریق مذہب و ملت یہ اپیل کرتی ہے کہ وہ اخوت، محبت، رواداری اور انسانی قدروں کو پامال ہونے سے بچائیں فرقہ وارانہ فسادات کی بڑھتی ہوئی لہر سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ نفرت اور تشدد کا روگ سماج کی رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور اگر اس کا بروقت علاج نہ کیا گیا تو یہ پورے سماج کو مفلوج و ناکارہ بنا کر رکھ دے گا۔ یہ فسادات جہاں ملک کی نیک نامی پر بٹہ لگا رہے ہیں وہیں ملک کے روشن مستقبل کی راہ میں رکاوٹ بھی بن رہے ہیں ان فسادات سے تعمیر و ترقی کا چلتا ہوا پہیہ جہاں رک جاتا ہے وہیں ان کے شعلوں سے جان و مال کا جو نقصان ہوتا ہے وہ حقیقت میں ملک ہی کا نقصان ہوتا ہے کسی اور کا نہیں۔

ان فسادات کے پس منظر میں بین اقوامی سطح پر قوموں کو باہم مل جل کر رہنے کی تلقین اور امن و محبت کا انسانی پیغام جو ہم دیتے رہتے ہیں وہ عملاً اپنی روح اور اثر آفرینی کھو دیتا ہے۔ ہمارا ملک مختلف مذہبی، تہذیبی اور لسانی اکائیوں کا گہوارہ کہلاتا ہے۔ ہم پر امن بقائے باہم کی ایک اچھی تصویر پیش کر سکتے تھے۔ لیکن افسوس ہم ایسی تصویر پیش کرنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے۔ یہ ذمہ داری دوسروں سے کہیں زیادہ حکومت پر عائد ہوتی ہے کہ وہ حالات کو سدھارنے اور ملک کو فرقہ وارانہ فسادات کے عذاب سے نجات دلانے کی کوشش کرے۔ مجلس شوریٰ یہ محسوس کرتی ہے کہ حکومت فسادات کی روک تھام اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے سلسلے میں جو یقین دہانیاں کراتی رہتی ہے اسے وہ پوری نہیں کر سکی۔ اس کی سرد مہری اور تغافل کا رویہ بھی مفسد عناصر کی حوصلہ افزائی کا سبب بن رہا ہے۔ اس ضمن میں ایک تشویش انگیز بات یہ بھی سامنے آرہی ہے کہ سرکاری عملہ کا رویہ دن بدن جانب دارانہ ہوتا جارہا ہے اور اسے سدھارنے کی پوری ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے اور غالباً اسے اس کا احساس بھی ہے اور اسی احساس کے تحت وزارت داخلہ میں وزیر مملکت مسٹر پی چدمبرم لوک سبھا میں دوبار اعلان کر چکے ہیں کہ فسادات کے لیے براہ راست پولیس اور انتظامیہ کے افسران کو ذمہ دار گردانا جائے گا مجلس شوریٰ یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اس یقین دہانی پر نیک نیتی کے ساتھ عمل کیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ مجلس شوریٰ ملک کے تمام مذہب پسند افراد سے بھی یہ اپیل کرتی ہے کہ آگے بڑھ کر حالات کو سنبھالنے اور مذہب کو

رسوا ہونے سے بچانے کی کوشش کریں۔ ورنہ مذہب مخالف طاقتیں اسی کے سہارے نفس مذہب کے خلاف ذہنوں کو مسموم کر کے مذہب و اخلاق کا رشتہ زندگی سے کاٹ سکتی ہیں، جیساکہ دنیا میں کئی جگہوں پر یہ ڈرامہ اسٹیج کیا جا چکا ہے۔ اور مذہب کو سیاست سے الگ کرنے کی آوازیں یہاں بھی سنائی دینے لگی ہیں جو اس بات کی غماز ہیں کہ سیاست اپنے تمام پاپوں کا بوجھ مذہب کے سر ڈال کر اپنے آپ کو دودھ کی دھلی ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

۴ اختیاری یکساں سول کوڈ

حکومت کے اس ارادہ ہی سے کہ وہ پورے ملک کے لیے یکساں سول کوڈ لانا چاہتی ہے مسلمانان ہند بے چینی اور اضطراب میں مبتلا تھے لیکن اب اس اعلان کے بعد کہ وہ جلد ہی پارلیمنٹ میں اس مقصد سے ایک بل پیش کرنے والی ہے، ان کے اضطراب میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے اس لیے کہ یہ ان کے دینی تشخص کے لیے ایک سنگین خطرہ ہے اور صریح طور پر دین میں مداخلت ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دین سے ان کے رشتہ کو کاٹ پھینکنے کی ایک منظم سازش ہے۔ پھر یہ دستور ہند کی اس یقین دہانی کے بھی خلاف ہے کہ ملک کی ہر تہذیبی اکائی کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور اس کے شخصی و عائلی قوانین محفوظ ہوں گے۔ لیکن حکومت کے اس اعلان سے دستور کی اس یقین دہانی کی صریح خلاف ورزی ہو رہی ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کے لیے حکومت اس قدر بے چین کیوں ہے! اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا مقصد عورتوں کے حقوق کی حفاظت ہے اور مرد و زن میں برابری پیدا کرنا ہے۔ حالانکہ یہ بات بار بار واضح کی جا چکی ہے کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیئے ہیں وہ دنیا کے کسی دستور نے نہیں دیئے ہیں۔ اس نے عورت اور مرد کے تعلق کو بہت ہی معقول اور مضبوط بنیادوں پر قائم کیا ہے اور ظلم و زیادتی کے سارے ہی راستے بند کر دیئے ہیں۔

ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ ملک کے اتحاد و یکجہتی کے لیے ضروری ہے کہ یہاں کے مختلف طبقات کے عائلی قوانین میں یکسانیت ہو۔ لیکن یک جہتی پیدا کرنے کا یہ ایک غیر فطری اور غیر عملی طریقہ ہے۔ یہ بات حکومت کو یاد رکھنی چاہئے کہ ہر طبقہ کو اپنے مذہب اور اپنے عائلی قوانین سے بڑا گہرا قلبی تعلق ہوتا ہے۔ اور وہ کسی حال میں اس سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر اسے اس سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے اندر تشویش اور ردعمل کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس سے یک جہتی تو نہیں بے چینی ہی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اگر حکومت یک جہتی پیدا کرنے کے لیے اپنے ارادہ میں مخلص ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس غیر فطری طریقہ کو چھوڑ کر صحیح اور فطری طریقہ اختیار کرے، وہ یہ کہ پورے

ملک میں یہ احساس پیدا کرکے کہ یہاں ہر طبقہ اپنے عائلی قوانین پر عمل کرنے کا حق رکھتا ہے۔ ازروئے دستور اسے اس کی آزادی حاصل ہے۔ ملک کے دوسرے طبقات کو اسے برداشت کرنا چاہئے اور اس پر انھیں اعتراض یا تبدیلی کا حق حاصل نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یکساں سول کوڈ اختیاری ہوگا۔ ایک غلط چیز کا فیصلہ کرنا اور اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دینا سراسر غیر دانش مندانہ حرکت ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے لیے اختیاری سول کوڈ بھی کسی پہلو سے قابل قبول نہیں ہے۔ کیونکہ کسی مسلمان کو اسلام نے اس کا اختیار ہی نہیں دیا ہے کہ وہ اسلام کے کسی قانون کو اختیاری سمجھے اور اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کی اسے آزادی حاصل ہو۔ حکومت کو یہ محسوس کرنا چاہئے کہ شاہ بانو کیس کے سلسلے میں سپریم کورٹ نے قرآن و سنت کے نصوص کے خلاف جو غلط فیصلہ دیا تھا اس نے ملک کے طول و عرض میں پوری امت کو بے چینی میں مبتلا کر دیا تھا حالانکہ اس فیصلہ کا تعلق عائلی قوانین کے صرف ایک پہلو سے تھا۔ اس سے حکومت کو مسلمانان ہند کے جذبات کا اندازہ کر لینا چاہئے کہ وہ اپنے پورے عائلی قوانین کے خاتمہ کو کس طرح برداشت کر سکتی ہے۔ اس سے امت مسلمہ میں ایسا ردعمل بھی پیدا ہو سکتا ہے جس کو کنٹرول کرنا مشکل ہوگا۔ لہٰذا جماعت اسلامی ہند کی مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس حکومت سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے اس ارادہ پر عمل کی کوشش نہ کرے۔ نیز مسلمانوں کو دستور ہند کی دفعہ ۴۴ سے مستثنیٰ قرار دے تاکہ آئے دن یہ خلفشار نہ پیدا ہو اور مسلمانان ہند سے بھی یہ اپیل کرتا ہے کہ جو عائلی قوانین ان کے دین کا اہم حصہ ہیں اور انھیں کی وجہ سے ان کا ملی و تہذیبی تشخص باقی ہے اور جن کے تحفظ کے لیے وہ ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے آمادہ ہیں، انھیں وہ پوری طرح اپنی زندگی میں نافذ کریں اور کسی کو یہ کہنے کا موقع فراہم نہ کریں کہ خود مسلمان ان قوانین کی بے حرمتی اور ان کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ یہ بات انھیں فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ ان کی دنیا اور آخرت کی کامیابی اللہ کے اس دین سے وابستہ ہے جس کا ایک حصہ عائلی قوانین بھی ہیں۔

۵۔ بابری مسجد کا مسئلہ

بابری مسجد کے مسئلہ نے نہ صرف پورے ہندوستانی مسلم سماج کو قلبی اضطراب اور پریشانیوں اور نوع بہ نوع اندیشوں کے گھیرے میں لے لیا ہے بلکہ گذشتہ ایک سال سے اس نے جو نیا موڑ لیا ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ تہذیبی جارحیت کے علم بردار اپنے مذموم مقاصد کو فرقہ وارانہ منافرت کی خلیج کو وسیع کرکے حاصل کرنا چاہتے۔ ان طاقتوں کا یہ رویہ جمہوری نظام

اور قانون کی حکمرانی کے لیے بھی چیلنج بنتا جارہا ہے، زور زبردستی سے کسی چیز پر قبضہ کرلینا اور کسی کو اس کے قانونی حق سے محروم کر دینا یہ جنگل کا قانون ہے۔ مہذب انسانی دنیا کا نہیں۔ مہذب دنیا نے اسے تسلیم کرنے سے ہمیشہ انکار کیا ہے لیکن اس کے باوجود تہذیبی جارحیت پسند طاقتیں اس مسجد کو بہانہ بناکر مسلم اقلیت کے خلاف منافرت کے جذبات کو شعلہ فشاں بنانے کی کوشش میں رات دن لگی ہوئی ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تاریخ کی صورت بھی مسخ کی جارہی ہے۔ اس طرح جو ماحول بن رہا ہے وہ شہری امن وامان کے پیش نظر بھی انتہائی خطرناک ہے۔

مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند جہاں اس بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ کشیدگی پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتی ہے وہیں ملک وملت کے بہی خواہوں اور خیر پسندوں سے یہ امید بھی کرتی ہے کہ وہ آگے آئیں اور کشیدگی کے اس ماحول کو امن وامان اور سلامتی کے ماحول سے بدلنے کی بھرپور کوشش کریں یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ امن وسلامتی کے ماحول ہی میں افہام وتفہیم یا آئینی اور قانونی راہ اپنا کر اختلافی مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے۔ امن اور سلامتی کا یہ ماحول ملک کی مادی ترقی اور باشندوں کی روحانی واخلاقی بلندی کے لیے بھی ایک ناگزیر شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موقع پر مجلس شوریٰ افسوس کے ساتھ اپنے اس احساس کا اظہار بھی ضروری سمجھتی ہے کہ اس مسئلہ کے سلسلہ میں حکومت نے ابتدا ہی سے شعوری یا غیر شعوری طور پر جو رویہ اختیار کیا ہے اس سے فرقہ پرست عناصر کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ مسجد بابری کا یہ قضیہ تقریباً ۳۸ سال سے عدالت میں زیر سماعت ہے لیکن ملکیت کے فیصلہ سے پہلے ہی ڈسٹرکٹ کورٹ کے ذریعہ جب مسجد کا تالا کھولا گیا تو نشر واشاعت کے تمام ذرائع سے لوگوں کو یہی اطلاع دی گئی کہ رام جنم بھومی کا تالہ کھول دیا گیا ہے۔ اس طرح ملی اور غیر ملکی رائے عامہ کو غلط تاثر دیا گیا۔ اس سے بہر حال تہذیبی جارحیت پسند عناصر کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

مجلس شوریٰ حکومت سے یہ امید کرتی ہے کہ وہ اپنے سیکولر کردار کے پیش نظر اس طرح کے معاملات میں کوئی ایسا رویہ نہیں اپنائے گی جس سے کسی مذہبی اکائی کے اندر یہ احساس ہو کہ اسے اس بنیادی حقوق سے محروم کیا جارہا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ حکومت سے یہ مطالبہ بھی کرتی ہے کہ وہ عبادت گاہوں اور مذہبی مقدس مقامات کی حفاظت کے لیے ایک مرکزی قانون بناکر اس بات کو یقینی بنادے کہ ملک کی آزادی کے وقت عبادت گاہوں اور مقدس مقامات کی جو حیثیت رہی ہے اسے برقرار رکھا جائے گا اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ مرکزی مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس ملک کے تمام باشندوں سے عام طور پر اور مسلمانوں سے خاص طور پر گذارش کرتا ہے کہ تہذیبی جارحیت پسند عناصر نے ملک میں فرقہ وارانہ

منافرت پھیلانے کے لیے جو ــــــــــ جو جال پھیلایا ہے اس سے ہوشیار رہیں اس لیے کہ اس سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں وہی اصل مسئلہ بن جاتے ہیں اور حقیقی مسئلہ پیچھے چلا جاتا ہے۔

ان تمام باتوں کے ساتھ مجلس شوریٰ اپنی اس رائے کا اظہار بھی ضروری سمجھتی ہے کہ مسجد بابری کا مسئلہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے انتہائی اہم اور نازک مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ میں انصاف حاصل کرنے کے لیے ہمیں پوری پوری کوشش کرنی چاہیے اور ملک کے باشندوں کو مسئلہ کی اصل حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے افہام وتفہیم کی تمام پرامن، آئینی و قانونی ذرائع کو استعمال کرنا چاہیے۔ انفرادی اور اجتماعی ملاقاتوں، کتابچوں اور پمفلٹوں، مشترکہ میٹنگوں اور سیمنار وغیرہ منعقد کرکے تہذیبی جارحیت پسندوں کے پھیلائے ہوئے اندھیرے کو دور کرنے کی کوشش مسلسل اور اس پیمانہ پر ہونی چاہیے کہ ملک کی بڑی آبادی اس مسئلہ کی اصل حقیقت سے آگاہ ہو جائے۔ نیز اس سلسلہ میں اکثریت کے صاف ذہن افراد کا تعاون بھی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

مجلس شوریٰ حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ بابری مسجد کے تقدس کو بحال کرنے، اس کے اندر رکھی ہوئی مورتیوں کو ہٹانے اور مسلمانوں کو اس میں نماز ادا کرنے کے سلسلہ میں جو قانونی رکاوٹ کھڑی کر رکھی ہے اسے دور کرے۔

جاری کردہ: شعبۂ نشر و اشاعت جماعت اسلامی ہند

MONTHLY
ZINDGI-E-NAU
1525, SUIWALAN
NEW DELHI-110002

Regd. No. D.NO. (DN)-348
R.N. NO. 42893/84
JUNE 87

صرف ٹائیٹل دہلی آرٹ پریس میں چھپا